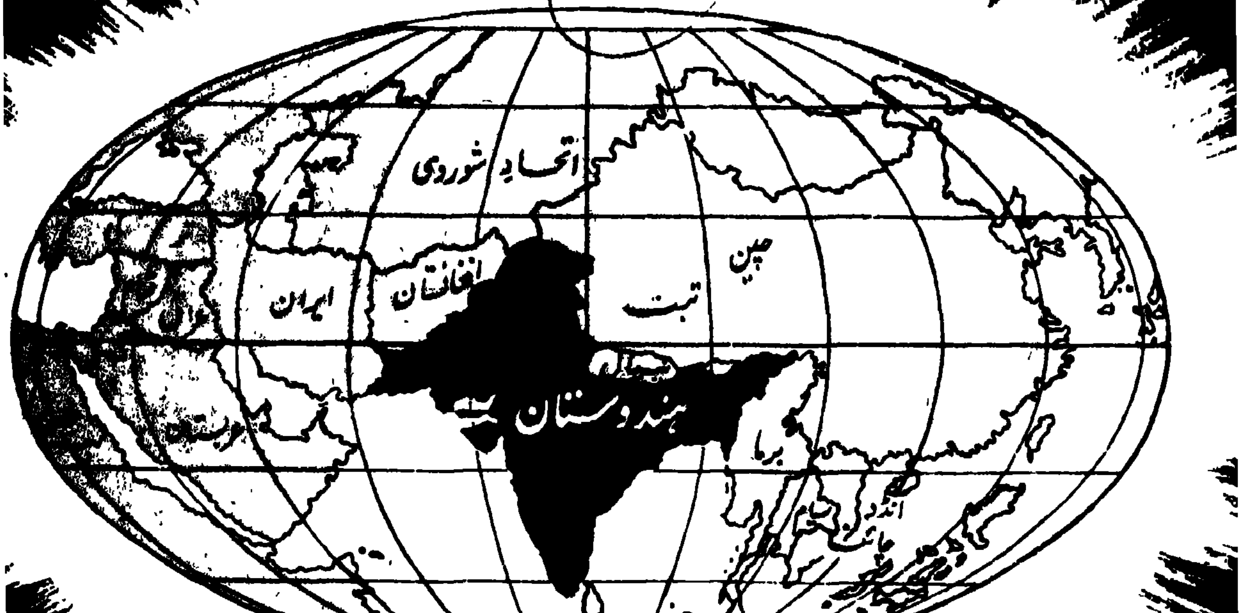
آجکل



غزل

میں ہی فقط نہ خستۂ درد نہاں ہوا
میرا شریک حال مرا راز داں ہوا

یوں یک بیک تصرف برق تپاں ہوا
فکر چمن ہوئی نہ غم آشیاں ہوا

صیاد تیرا اس میں بتا کیا زیاں ہوا
مانا کہ زیر دام کوئی پرفشاں ہوا

دیر و حرم کی قید نہ تھی راہ شوق میں
میں نے نماز عشق ادا کی جہاں ہوا

منزل نما تھیں میرے لئے سب رکاوٹیں
ہر سنگ راہ مجھکو ترا آستاں ہوا

بیرون دل گیا نہ کبھی حال درد دل
خود نالہ محو لذت سوز نہاں ہوا

باہم کشش ہے دونوں کے دونوں ہیں مضطرب
میری جبیں ہوئی کہ ترا آستاں ہوا

لائینگی رنگ اسکی تلون مزاجیاں
نامہربان بھی ہوگا وہ جب مہربان ہوا

شکر خدا غرور سے میں پاک ہوگیا
جو ناز زہد تھا وہ نیاز نہاں ہوا

کیوں لوگ نکتہ چینی پر آمادہ ہوگئے
وحشت مجھے کمال کا دعوی کہاں ہوا



وحشت کلکتوی

ہندوستان کے مشہور شاعر خان بہادر سید رضا علی وحشت کلکتوی خاندانی اعتبار سے دہلوی لیکن عرصہ دراز سے کلکتے میں سکونت پذیر ہیں ۔ اسی لئے کلکتوی کہلاتے ہیں ۔ اوائل عمر ہی میں سخن گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوگئی تھی ۔ آپ کا پہلا دیوان ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا جسے مولانا حالی ، علامہ شبلی اور جناب ظہیر دہلوی نے بہت پسند فرمایا ۔ ۱۹۳۱ء میں سرکار سے خان بہادر کا خطاب ملا ۔ ۱۹۳۶ء تک گورنمنٹ اسلامیہ کالج کلکتہ میں پروفیسر رہے ۔ شاعری کا لطیف مشغلہ ابھی تک جاری ہے ۔ چنانچہ آپکی تازہ ترین غزل اسی صفحے کی زینت ہے ۔ آپکی شاعری سے متعلق جناب وفا راشدی کا مقالہ اسی اشاعت میں ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے ۔


HAMDARD OINTMENT
HEALING, SOOTHING & ANTISEPTIC
ہمدرد مرہم
رجسٹرڈ
हमदर्द मरहम
DELHI
یہ حیرت انگیز مرہم زخم کو بھرنے کے بعد نشان یا داغ باقی نہیں رہنے دیتا
خواہ کتنی ہی احتیاط کی جائے لیکن یہ ضروری نہیں ہو کہ آپ کو یا آپ کے کسی بچے کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ دنیا تمام تر حوادث کا مجموعہ ہے نا معلوم کتنے حادثے پیش آتے ہیں مثلاً گھر کے کام کاج کے وقت خراش آسکتی ہے کوئی حصہ جل سکتا ہے یا چاقو سے کٹ سکتا ہے اسی طرح آپ کا بچہ کھیل کود میں یا اسکول میں گر پڑتا ہے۔ اس کے گھٹنے زخمی ہو سکتے ہیں۔ اس کی کہنیاں چھل سکتی ہیں۔ یہ حادثے بظاہر معمولی ہیں مگر ان سے غفلت برتنا کسی طرح مناسب نہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے موقعوں پر فوراً تھوڑا سا ہمدرد مرہم استعمال کیا جائے ہمدرد مرہم کا یہ خاصہ ہے کہ یہ فوراً کھال کی ساخت میں داخل ہو جاتا ہے اور جراثیم کو ہلاک کر دیتا ہے اور سکون بخشتا ہے اور زخم کو جلد سے جلد بھر دیتا ہے اور پھر کوئی نشان یا داغ باقی نہیں رہنے دیتا۔
حیوانی چربیوں سے بالکل پاک — خالص نباتی تیلوں سے بنا ہوا
ہمدرد مرہم
ہمیشہ استعمال کیجیے
ہر جگہ فروخت ہوتا ہے

B. A. 500



منگا لیجئے

اپنی لڑکیوں کو سگھڑ بناؤ

قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے

قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری

جس میں سینکڑوں انگریزی کے حروف کاڑھنے کے لئے فلور باسکٹ۔ چیر بیک کرسی کی گدیاں۔ میزپوش کا حسین مرکز۔ میزپوش کے کئی دل پسند ڈیزائن سینٹر میزپوش پر ناشپاتی۔ رس بھری۔ خوبانیاں۔ آلو۔ مختلف دل کش مرکز۔ میزپوش کے کونے۔ ٹی ٹیبل۔ چادروں کی بیلیں حسین و دلفریب کونے۔ شلوار کی بہترین و حسین بیلیں۔ جو فرانسیسی طرز کے ہیں۔ کرتوں کی دل کش بیلیں۔ انگریزی بوڈر۔ جمپر کی خوبصورت بیلیں۔ گلاب کی بیلیں۔ دوپٹہ کی بیلیں۔ چھوٹی خوبصورت پتیاں اور بیلیں۔ گریبان کی حسین و جمیل بیلیں۔ قمیص کے بوڈر۔ انگور کے پتوں کی بیلیں۔ مختلف بوٹے۔ جمپر کے حسین گلے۔ کرتے کے خوبصورت گلے۔ بچوں کے حسین بب۔ کروشیا کا کام۔ کروشیے کی بیلیں کروشیا میزپوش پر اور مونوگرام۔ تولیہ پر کروشیا۔ گلدان پر کروشیا۔ خوشہ انگور کروشیے میں۔ کروشیے کی نفیس بیلیں۔ دوسوتی کا کام۔ شکریہ۔ انگریزی فقرے۔ عید مبارک۔ خوش آمدید۔ مزاج شریف۔ شب بخیر۔ موتیوں کا کام۔ جالی کا کام۔ کشائی کا کام۔ سلمے ستارے کا کام۔ تارکشی کا کام۔ بکری کا کام۔ ڈبٹ وائٹ ٹیموں کے اشعار۔ غرضیکہ رضیہ سلطان بیگم۔ دہلوی سینکڑوں قسم کی حسین و جمیل چیزیں۔ "رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری" میں آپ کو ملیں گی۔ آپ اپنی لڑکیوں۔ بیویوں۔ بہنوں کو تحفتہً دیکر اپنے گھر کو گلزار بنالیں۔ آپ کا دل گھر میں لگے گا۔ نئی شادی شدہ لڑکیوں کا بہترین مشغلہ ہے۔

سائز بڑا۔ قیمت مجلد (۲؍۱۲) محصول آٹھ آنے (۸؍) دو جلدوں پر محصول دس آنے لگتا ہے جو اس کے ساتھ

لعل و گوہر قیمت ۱۲؍	امت کی مائیں قیمت ۱؍۸	باپ کا خط بیٹی کے نام قیمت ۱۲؍	رضیہ کا شاہی دسترخوان	قیمت ۲؍۸	رضیہ کے خطوط قیمت ۱؍۸	تازیانہ قیمت ۱؍	فاطمہ کا لال قیمت ۱؍

تحفہ دینے کیلئے ضرور منگائیے

تمام کتابیں منگانے پر محصول ڈاک معاف

پتہ: نیا کتاب گھر اردو بازار۔ دہلی سے طلب فرمائیے

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ پرچہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۴ نمبر ۱ | ۱۵ جنوری ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی، بی اے علیگ، ایل ایل بی

نائب مدیران: راجیندر ناتھ شیدا ایم اے — فضل حق قریشی دہلوی — مشیر احمد ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

علی گڑھ کی سلور جوبلی

وہ مختصر سی درسگاہ جس کی بنیاد اب سے پون صدی پیشتر سرسید احمد خاں مرحوم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے بمقام علی گڑھ ۱۸۷۵ء میں رکھی تھی، آج ترقی کے سب زینے طے کر کے اس منزل مقصود تک پہنچ گئی ہے جس کا خواب سرسید نے دن ہوتے ہوئے دیکھا ہوا تھا۔ ایک طالب علم کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس خواب کی ابتدائی تعبیر تو چند سال بعد سامنے آ گئی تھی جب انگلو اورینٹل کالج دو قدم آگے بڑھ کر انٹرمیڈیٹ اور پھر ۱۸۸۱ء میں ڈگری کالج ہو گیا۔ ابتدا میں اساتذہ کی تعداد محض سات اور طلباء کی تعداد بھی انگلیوں پر گنے جانے کے لائق تھی لیکن ڈگری کالج ہونے کے بعد جب اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے ہو گیا تو اس کی شہرت بڑھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے طلباء کی تعداد دو سے قریب پہنچ گئی ... ایک زبردست تعلیم ہونے کے علاوہ بہت بڑی ترقی ... انہوں نے ہندوستان کے تعلیمی معیار میں نشاۃ الثانیہ کی روح پھونکی اور یہاں کے نظام تعلیم کو جدید ترین ... میں منضبط کیا کہ جہالت کی تاریکی گوشۂ گمنامی میں جا کر چھپ گئی ... مشرق و مغرب کو جو بہت سے مفکرین کے خیال ... بھی مل نہیں سکتے، اسقدر نزدیک کر دیا کہ ... ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہو جانے ... ادارے کو نقصان عظیم پہنچا۔ تاہم نواب محسن الملک نے ... قدم بڑھایا ... ذمہ داری قبول کرتے ہی سرسید احمد ... قائم کیا تاکہ ... علی گڑھ کو ایک قومی یونیورسٹی ... کافی رقم جمع ہو گئی لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں تقریباً بیس سال لگ گئے۔ چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء ...

اب اس یونیورسٹی میں علم کے سبھی شعبوں میں ... کی بہترین سہولتیں مہیا ہیں۔ سارے ملک میں صرف یہی ایک جگہ ہے جہاں طالب علم بی اے کی ڈگری لینے کے بعد بھی جغرافیہ کا مزید مطالعہ کر سکتا ہے۔ تجربہ گاہوں میں جدید ترین آلات موجود ہیں۔ اس یونیورسٹی کے ماتحت اساتذہ کی تربیت کا ایک کالج، ایک انجینئرنگ کالج، عورتوں کی تعلیم کا ایک کالج اور کئی ہائی اسکول جاری ہیں۔ پچاس ہزار روپے کے سرمایہ سے ایک آرٹ گیلری بھی قائم ہو گئی ہے۔ ابھی بہت سے مشہور مصوروں کے شاہکار رکھے ہیں جن کی بہت سی ... لائبریری میں ... کے علاوہ تقریباً چار ہزار ... ہیں۔ محققین کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو رہی ہیں ... علی گڑھ میں میڈیکل کالج قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے جس پر تقریباً ساٹھ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ مختلف طبقات کے ذریعہ کافی رقم اس ضمن میں جمع ہو چکی ہے سب سے زیادہ گرانقدر رقم حضور نظام دکن نے عنایت فرمائی ہے۔

یونیورسٹی کی عمارت نہایت شاندار ہے اور اس کی مسجد کے گنبد و مینار اس سے بھی زیادہ بلند اور پرشکوہ ہیں۔ عبادت گاہ ہونے کی حیثیت سے قطع نظر یہ اس لحاظ سے بھی قابل یادگار ہے کہ اس میں وہ مقدس ہستی زیر زمین آرام فرما ہے جس کی عملی کوششوں نے خواب کے وجود میں لانے کی صورت پیدا کی تھی۔

اب یونیورسٹی کے قیام کو ۲۵ سال ہونے کی خوشی میں اس کے ارباب حل و عقد سلور جوبلی منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ جس طرح یہ یونیورسٹی ہندوستان میں اپنی نظیر آپ ہے، اسی طرح اس کا تاریخی جشن بھی بے مثل رہے گا۔

ایران و ہندوستان کے مابین تجارت

اس میں شک نہیں کہ جنگ کی ... ایران اور ہندوستان میں ... ضرورت پر سرکاری کنٹرول قائم ہے اور کوئی ایک ملک دوسرے کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا لیکن بہت جلد جب یہ پابندیاں دور ہو گی تو باہمی تجارت ... سرے سے قائم ہو جائے گا۔ ایران میں صنعت و حرفت نے ... ترقی نہیں پائی ہے اس لئے جنگ سے پہلے بھی اسے دوسرے ملکوں کا ... پڑتا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے علاوہ جرمنی اور جاپان بھی اسے ضروریات پورے کرتے تھے۔ اب چونکہ یہ دونوں ملک گوشۂ گمنامی میں جا پڑے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان اس زرین موقع سے فائدہ اٹھائے اور ایران میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کرے۔ لڑائی سے پہلے ایران سوتی کپڑے، کپڑا اور چمڑا رنگنے کے مسالے، سیمنٹ، شکر، چائے، کپاس سے بنی ہوئی چیزیں، ... ادویات، مصالحے، صابن، بجلی کا سامان وغیرہ ہندوستان سے منگاتا تھا۔ ورنہ ...

دیغں زعفران، کھجوریں، بادام، پستہ، گوند، کشمش، قالین، دریاں، معدنی روغن اور تمباکو وغیرہ ہندوستان بھیجا تھا بعہد ماضی میں ایران کا مال خریدنے کے سلسلے میں ہندوستان کی حیثیت کافی اہم رہی ہے۔ تاہم تجارتی کمشنر کا مشورہ ہے کہ آئندہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات استوار رکھنے کی صورت یہی ہے۔ ہندوستان جتنا کچھ اس وقت ایران کا مال زیادہ خریدے اس کے ساتھ ساتھ ایران میں بھی ہندوستان کے مال کی مانگ زیادہ رہے گی لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ایرانیوں کے مذاق سلیم اور جمالیاتی حس میں کافی ترقی ہو چکی ہے اور وہ ہندوستان کا صرف وہی مال خریدیں گے جو نفیس، عمدہ اور اعلیٰ ہو۔ وہاں غیر معیاری چیزوں کی کھپت مشکل ہے۔

افغانی طلبا ہندوستان میں

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں حکومت افغانستان نے چودہ طلبا کو سرشتے کا کام سیکھنے کے لئے ہندوستان بھیجا تھا۔ ان کی تربیت کا انتظام حکومت ہند کے محکمہ رسد نے کیا۔ ان چودہ میں سے چھ طلبا تعلیم ختم کر کے کابل جا چکے ہیں اور دو کابل جانے والے ہیں۔ باقی چھ ایبٹ آباد کے علاقے میں ابھی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی ایک سال اور جاری رہیگا۔ حکومت افغانستان تربیت کے واسطے مزید طلبا بھیجنے کے لئے مستعد ہے لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔

یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ ۱۹۴۲ء میں تین افغانی طلبا لائلپور (پنجاب) کے زراعتی کالج میں داخل کئے گئے تھے۔ ان کی تعلیم ابھی جاری ہے۔ اس سال دو اور کا داخلہ عمل میں آگیا۔ اسی طرح اس سال ایک اور افغانی طالب علم کو لاہور کے ویٹرنری کالج میں داخل کیا ہے نیز ڈیرہ دون والے جنگلاتی تعلیم کے کالج میں افغانی طلبہ کے لئے دو نشستیں مخصوص کر دی گئی ہیں جن کا زمانہ تعلیم اپریل ۱۹۴۶ء سے شروع ہوگا۔ ایک افغانی طالب علم کو لاسلکی کے ذریعہ پیغام رسانی کے طریقے سکھائے گئے اور وہ پندرہ ماہ تک تجربات حاصل کرنے کے بعد گذشتہ ماہ جون میں واپس چلا گیا۔

ہندوستانی طلبا غیر ملکوں میں

سمندر پار ملکوں میں جا کر اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کی مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں نے ۵۹۰ وظائف عطا کئے ہیں۔ ان میں سے مرکزی حکومت ۳۵۴ کا اور صوبجاتی حکومتیں ۲۳۶ کا انتظام کرینگی۔ فی الحال ہندوستانی طلبا کے لئے انگلستان، ریاستہائے امریکہ اور کنیڈا جا کر تعلیم حاصل کرنی ممکن ہے تاہم حکومت اس کوشش میں ہے کہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی میڈیکل درسگاہوں میں بھی چند جگہیں ہندوستانی طلبا کے لئے حاصل کر لی جائیں۔ اس سلسلہ میں طلبا کا انتخاب ان کی تعلیمی لیاقتوں اور تحقیقی یا عملی تجربوں کو مد نظر رکھ کر کیا گیا ہے نیز اس فرقہ وارانہ تناسب کا بھی لحاظ رکھا ہے جو حکومت ہند نے مقرر کر رکھا ہے تاہم اچھوت ذات کے سلسلے میں اس اصول سے کسی قدر انحراف کرنا پڑ گیا کیونکہ مقررہ معیار کے مناسب طلبا نہیں مل سکے۔ سفارش کی گئی ہے کہ آئندہ طلبا کے انتخاب کا کام

پبلک سروس کمیشن کے سپرد کر دیا جائے۔ سرکاری رپورٹ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حیرت ہے اس سلسلے میں کسی قسم کی سفارشیں نہیں پہنچائی گئیں اور اس لئے امید ہے کہ آئندہ ممبروں کو تحریر کرنے کا دستور بالکل مٹ جائیگا۔

جاپان میں شہنشاہیت کا مستقبل

جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیتو نے اپنے مشیران کار سے گفتگو کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا: میں محسوس کر رہا ہوں کہ جنگ کی ذمہ داری اخلاقی نقطہ نظر سے مجھ پر عائد ہوتی ہے اور اس لئے میں چاہتا ہوں کہ بہت جلد تاج و تخت سے دست بردار ہو جاؤں۔ جنرل میک آرتھر اور دوسری ذمہ دار ہستیوں نے شہنشاہ کے اعمال نامے کا جائزہ لے لیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ شہنشاہ کو "مجرم جنگ" قرار نہیں دیا جائیگا تاہم اس کے لئے تاج و تخت سے دستبردار ہو جانا مفید ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا لڑکا اکی ہیتو تخت نشین ہوگا لیکن ابھی اس کی عمر ۱۲ سال ہے اس لئے ریجنٹ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ غالباً یہ فرض موجودہ شہنشاہ کے تیسرے بھائی شہزادہ تاکا متسو کو انجام دینا ہوگا۔ امریکی حکومت کا خیال ہے کہ کمسن شہنشاہ کی تعلیم جاپان کی بجائے امریکہ میں ہو تاکہ جمہوریت کے احساسات نشو و نما پائیں اور ملک گیری کی ہوس پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ ایسی صورت میں امریکہ کی یونیورسٹی "ہارورڈ" اس کے لئے مفید رہیگی۔ اسوقت بھی اکی ہیتو جاپانی مدرسے میں تعلیم پا رہا ہے لیکن اس کی زندگی بالکل تنہائی میں بسر ہو رہی ہے۔ وہ روزانہ صبح کو سات بجے اٹھ کر اپنے باپ کی قد آدم تصویر کے سامنے جھک جاتا ہے۔ مدرسے میں دوسرے لڑکوں سے اس کی بات چیت نہیں ہوتی سوا اس کے وہ کسی سے نہیں ملتا۔ کھانا بھی تنہا کھاتا ہے اور والدین سے شاذ و نادر ہی ملاقات ہوتی ہے۔

چین کی خانہ جنگی اور صدر ٹرومین

چین کی موجودہ خانہ جنگی کو موضوع سخن بناتے ہوئے صدر ٹرومین نے فرمایا کہ اب اسے زیادہ عرصے جاری رہنا نہیں چاہیئے کیونکہ اس طرح تمام دنیا کے نظام امن و عافیت پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایک ایسی قومی کانفرنس بلائی جائے جس میں چین کی تمام اہم سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوں تاکہ امکانات مس تحت پر گفتگو کی جا سکے۔ تمام متحدہ اقوام خصوصاً ریاستہائے متحدہ کا فرض ہے کہ وہ عملی طور پر ایسی صورت پیدا کرائیں کہ اہل چین اپنے اندرونی اختلافات کو جلد سے جلد دور کرنے کے لئے تل جائیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں امریکہ نے ایک ڈپلومیٹ مشن کے طور پر جنرل جورج مارشل کو چین بھیجا ہے تاکہ چین کی قومی حکومت کے دستوں اور اشتراکیوں میں سمجھوتے کی کوشش کی جائے۔ جنرل موصوف کی روانگی کے بعد صدر ٹرومین نے پر زور لفظوں میں فرمایا کہ ریاستہائے متحدہ جنرل چیانگ کائی شیک کی قومی حکومت کو چین کی باقاعدہ حکومت تسلیم کئے رہیگی کیونکہ صرف اسی کے زیر اہتمام سارے چین میں اتحاد پیدا کرنے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ خانہ جنگی ختم ہو کر

امن وعافیت کی فضا قائم ہوتی ... ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کا موقع ملے گا۔ ان جاپانی دستوں کو جو اب بھی منتشر حالت میں پڑے ہوئے ہیں ملک بدر کیا جائے گا۔

روس کی آبادی میں اضافہ

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے کچھ عرصے قبل روس کی مردم شماری کی گئی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ ملک کی کل آبادی ساڑھے سترہ کروڑ کے قریب ہے۔ اس کے بعد ملک کی سرحدوں میں اضافہ ہو جانے سے کل آبادی بقدر دو کروڑ اور بڑھ گئی۔ دوران جنگ میں بہت سے شہری اور فوجی موت کے گھاٹ اتر گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ... پیدائش اطفال کی رفتار اس قدر تیز رہی کہ جانی نقصان پورا ہونے کے بعد بھی غیر معمولی کثرت حیرت انگیز کہی جا سکتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر اس وقت مردم شماری نئے سرے سے کی جائے تو کل آبادی ۲۰ کروڑ سے کسی طرح بھی کم نہیں رہے گی۔

برازیل کا قہوہ

برازیل میں اچھا بڑی کثرت سے قہوہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد بہت سی فالتو مقدار دوسرے ملکوں میں بھیج دی جاتی تھی ... وہ ... جسے کوئی بھی کسی قیمت پر خرید نہیں کر سکتا تھا تلف کر دی جاتی تھی ... جنگ کے دوران میں جہاں اور بہت سی چیزوں کو نئے نئے طریقے ... کرنے کی صورتیں معلوم ہوئی ہیں قہوہ پر بھی طبع آزمائی کی گئی چنانچہ قہوہ ... کو پیس کر ایک خاص مسالے کی صورت میں جسے "کیف لائٹ" کے نام سے ... اس قابل بنا لیا گیا ہے کہ اس سے سامان آرائش اور ... تیار کی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نئی تحقیق سے برازیل کی تجارتی ... فائدہ ہوگا اور وہ چیز جو اب تک محض بیکار سمجھ کر ضائع کر دی جاتی تھی ... کام آنے لگ جائے گی۔

روسی اقدامات سے نئے شبہات

ایران اور ترکی کے معاملات میں روسی اقدامات نے جو صورت اختیار کر رکھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیسری جنگ عظیم چھڑ جائے تو کوئی تعجب نہیں ... کے سیاسی حلقوں پر بری طرح اثر انداز ہو رہے ہیں انہیں شبہ ہو رہا ہے کہ روس آئندہ مشرق وسطی کے ممالک کو ... بنائے گا۔ انہیں یقین ہے کہ اگر تین بڑی قوتوں نے مل کر ایران کے موجودہ مسائل حل نہ کئے تو روس اور ترکی میں جھگڑا ہو جانا ... ہے اور اس کے بعد مشرق وسطی کے ممالک محاذ جنگ بنے بغیر نہ رہ سکیں گے ... مسٹر بیون کی اس معقول رائے سے متفق ہیں کہ برطانیہ سیدھے سادے ... سے یہ دریافت کرے کہ آخر اس کا منشاء کیا ہے۔ کرد قوم کے ہزاروں ... عراق اور شام میں آباد ہیں۔ اگر انکو روس کی طرف سے پشت پناہی مل گئی اور انہوں نے کوئی ہنگامہ برپا کر دیا تو ان دونوں حکومتوں کا مستقبل ... فی الحال کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

کیونکہ واقعات بڑی تیزی کے ساتھ تغیر پذیر ہو رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہو جائے۔

ملایا کا ربڑ

ملایا میں ربڑ کی پیداوار کو نئے سرے سے ترقی دینے کے لئے انتہائی کوشش کی جا رہی ہے۔ صرف قومی زندگی کو سدھارنے اور بحال رکھنے کے لئے ہی اس کی اہمیت کو مدنظر نہیں رکھا گیا بلکہ مقصد یہ بھی ہے کہ جلد سے جلد دنیا بھر کی منڈیوں میں مال پہنچا کر اتحادی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ ملایا میں ربڑ کا کچھ پرانا ذخیرہ ہاتھ لگ گیا ہے جو جاپانیوں کی تباہ کاریوں سے بچ گیا تھا۔ اس کی مقدار کا اندازہ پچاس ہزار ٹن لگایا گیا ہے۔ حکومت کی منظوری سے ربڑ کی ایک لمیٹڈ کمپنی بن گئی ہے جو رفاہ عامہ کا کام انجام دے گی۔ غیر سرکاری اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ ربڑ کے جنگلات کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا ہے۔ اب سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مزدوروں کی فراہمی سے متعلق ہے جن کی تعداد جاپانی تسلط کے بعد سے گھٹ کر بہت ہی کم ہو گئی ہے۔

ربڑ کی کاشت کرنے والوں کو بڑی عجلت کے ساتھ واپس بلانے کا اہتمام کیا جا چکا ہے۔ خیال یہ ہے کہ منتظمین کی واپسی سے قبل ابتدائی کام ضرور پورے کر لئے جائیں۔ ربڑ کی پیداوار کے ساتھ ساتھ ٹن نکالنے کا انتظام بھی بڑی تیزی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

جنرل پیٹن کی وفات

ساٹھ سال کے بوڑھے جنرل جارج اسمتھ پیٹن کا جو زمانۂ جنگ میں ... متحدہ کی تیسری فوج کے کمانڈر تھے انتقال ہو گیا۔ سسلی کے ایک چھوٹے سے شہر کے قریب ان کی موٹر ایک ٹرک سے اتفاقاً ٹکرا گئی جس سے وہ بری طرح زخمی ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ موصوف کو امریکہ کے عسکری رہنماؤں میں بڑا ممتاز درجہ حاصل تھا۔ شمالی فرانس سے جرمنی میں بے تحاشہ فوجیں گھسانے کا سہرا انہی کے سر رہا۔ شمالی افریقہ اور تیونیشیا میں بھی ان کے کارنامے قابل ذکر رہے۔ یہ کیلیفورنیا کے ایک شہر سان گیبریل میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۰۹ء سے برابر امریکی فوج میں شامل رہے۔ ان کی فطرت ظلم و ستم کی طرف کبھی مائل نہیں ہوئی لیکن میدان جنگ میں ان کی دلیری اور بہادری کو ایزنہاور تک نے سراہا ہے۔ وہ اپنی ظاہری ڈھنگ حالت اور بلند آواز سے ہر شخص پر اپنا رعب جما لیتے تھے۔ انھیں آخر وقت تک مطالعے کا شوق رہا۔ شاعری اور فلسفے کے خاص شوقین تھے۔

مضمون نگار حضرات مضمون صاف اور خوشخط ارسال فرمائیں۔

دو غزلیں

ثاقب لکھنوی

دل پر داغ جور و کشش تھے گلستانوں کے
دامنوں میں وہ چراغ آج ہیں ویرانوں کے

دیکھو او دیدۂ تر کام سے سیلاب سرشک
یوں نوا فسانے سُنا کرتے ہو طوفانوں کے

آرزو میں تھیں کہ ہر شخص کے ہوں زیب گلو
چاک ہونا تھا مقدر میں گریبانوں کے

بندشیں طول امل کی ہیں قیامت اے دل
پھنس نہ جانا کہیں جنجال میں ارمانوں کے

غمگساری کی توقع تو کجا حال یہ ہے
لوگ سائے سے حذر کرتے ہیں دیوانوں کے

خون دل صرف غم عشق ہوا کیا کرتا
چہرے اترے ہوئے دیکھا کیا مہمانوں کے

آدمی نام کے ہم ہیں بھی۔ تو کیا ہیں ثاقب
ذی شرف وہ ہیں۔ جو مصداق ہیں انسانوں کے

آگ یہ کیسی لگی ہے سینۂ دلگیر میں
چھالے آتے ہیں نظر آئینۂ تقدیر میں

رنگ اُلفت چاہتا ہے مٹ کے بھی اپنی نمود
کوہکن کا خون لہراتا ہے جوئے شیر میں

وائے محرومی خدنگ ناز آتا تھا کہ دل
ہو کے ٹکڑے اُڑ گیا کوسوں ہوائے تیر میں

طالع بد کی نحوست کا نہ تھا کوئی علاج
سامنے آیا جو لکھا تھا مری تقدیر میں

خود پرکھ لیں اہل فن شاید نظر آئے کہیں
فرق ثاقب کی زباں میں اور زبان میر میں

وحشت کی شاعری

وقار راشدی

سید رضا علی وحشت کے جد امجد حکیم غالب علی مرحوم نے اپنے وطن آبائی دہلی سے نکل کر ہوگلی (بنگالہ) میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے پدر بزرگوار مولوی شمشاد علی ہوگلی میں پیدا ہوئے۔ حکیم صاحب مرحوم بھی شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔

سید رضا علی بتاریخ ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم کلکتہ کی مشہور درسگاہ مدرسہ عالیہ کے شعبۂ انگریزی میں ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں انٹرنس پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے سلسلۂ تعلیم کو جاری نہ رکھا لیکن بطور خود مطالعہ کتب سے ایک امتیازی استعداد و قابلیت پیدا کی۔ ابتدائی دور شعر گوئی میں جو وقت ملتا اس کو مشاغل ادبی میں صرف فرماتے تھے۔ شیخ علی حزیں۔ مولانا جامی۔ غالب۔ غنیمت۔ ولی دکنی۔ اور ملک الشعرا صادق خاں اختر کے کلام پر آپ کے محققانہ تبصرے مستقل ادبی مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اگرچہ آپ نے یونیورسٹی کی کوئی سند حاصل نہیں کی لیکن انگریزی لٹریچر سے آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ اس زبان کی مستند ادبی اور تاریخی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہی ہیں اور متعدد علمی و ادبی مضامین آپ کی نوک قلم سے نکل کر انگریزی جرائد کے ذریعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ تک آپ پرشین آفس "امپیریل ڈپارٹمنٹ" میں چیف مولوی کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اس فرض کو دس سال تک انجام دیا۔ ۱۹۳۱ء میں سرکار کی طرف سے خطاب "خان بہادر" تفویض ہوا۔ ۱۹۴۲ء سے اب تک لیڈی براؤن کالج کلکتہ کی عہدۂ پروفیسری پر مامور ہیں۔

۱۸۹۶ء یعنی ۱۵ سال کی عمر سے آپ شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد حضرت ابوالقاسم شمس کلکتوی مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں جب حضرت شمس نے رحلت فرمائی تو بجز ذوق سلیم کے آپ کا کوئی رہنما نہ رہا۔ موزونی طبع بھی رہبر صادق کا کام کرتی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا وحشت نے اپنے استاد کی روش کو چھوڑ کر مرزا غالب کے انداز بیان کو پسند کیا اور تتبع فرمانے لگے۔

اس تتبع میں آپ کس درجہ کامیاب ہوئے وہ دیوان کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ آپ کی طبیعت کا میلان اردو سے زیادہ فارسی کی جانب تھا مگر چونکہ اس زبان میں کوئی ہمصفیر نہ رہا اس لئے فارسی گوئی کم کر دی۔ ابتداءً طبیعت کسی قدر دقت پسند تھی لیکن اب اس روش سے بالکل اجتناب ہے۔

آپ قدیم تغزل کے دلدادہ ہیں۔ فارسی ترکیبوں سے اکثر کام لیتے ہیں جس سے کلام میں ایک دلکشی اور رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ اس خاص روش میں آپ کو وہ کمال حاصل ہے جو غالب کے بعد شاید کسی کو نصیب ہوا ہو۔ ماہنامہ "نگار" لکھنؤ کے فاضل مدیر حضرت نیاز فتحپوری اپنے ۱۹۴۰ء کے خاص نمبر میں "بزم نگار" کے زیر عنوان عہد حاضر کے مستند اساتذۂ سخن پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:—

"وحشت بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اردو تغزل میں فارسی ترکیبوں کو گوارا اور خوشنما صورت سے استعمال کرنا وفا رامپوری کی طرح ان کا خاص کارنامہ ہے۔ پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت پہنچاتا ہے تو غزل کو بالکل برباد کر دیتا ہے لیکن وحشت کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ ان کے یہاں یہ سب کچھ بہت توازن اور سلامت روی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس حیثیت سے بڑی عزت کے مستحق ہیں۔"

موجودہ دور کی شاعری میں آپ کا شمار ان مغتنم نفوس میں ہے جن کے دم سے اعتبار فن باقی ہے۔ حیات کی سچی نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورتگری کا نام شاعری ہے اور یہی معیار قدما کا تھا۔ اور آپ نے اس کو پیش نظر رکھا ہے۔ آپ کے دیوان میں کہیں کہیں پیچیدہ بیانی کی مثالیں ملتی ہیں مگر عموماً آپ نے لطف بیان کو مضمون آفرینی پر ترجیح دی ہے۔ غور سے دیکھنے والا بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ایک شعر میں مکمل مضمون ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کا دیوان ندرت مضامین، پرواز تخیل، اور حسن استعارہ کے دلفریب نقوش کی فراوانی سے نگارخانۂ چین بنا ہوا ہے اور بقول شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مرحوم۔

"آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرز ادا آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔"

آپ کی فطری متانت کا اثر آپ کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ آپ کا کلام ایسے جذبات سے جو تہذیب و شائستگی کے خلاف تصور کئے جاتے ہیں بالکل پاک ہے۔

۱۹۱۰ء میں مولانا وحشت کا ایک دیوان شائع ہوا جس میں اکثر غزلیں ابتدائی مشق کے زمانہ کی ہیں۔ دیوان کے اخیر میں فارسی کلام بھی ہے۔ اردو اور فارسی دونوں کا مجموعہ اکثر اصناف سخن پر حاوی ہے۔ جس سے مولانا کی

ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب "دیوان وحشت" چھپ کر منظر عام پر آیا تو مولانا حالی، مولانا شبلی، وفا رامپوری، نظم طبا طبائی، ظہیر دہلوی (شاگرد ذوق) اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، آزاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، نثر لکھنوی اور ڈاکٹر محمد اقبال جیسے ماہرین فن اور نقادان سخن نے دیوان پر تبصرے فرماتے ہوئے اس کا اعتراف کیا کہ وحشت نے غالب کے تتبع کا حق ادا کر دیا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ طوالت کے خوف سے ذیل میں مختصر طور پر چند اقوال و اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں تتبع غالب کی طرف اشارہ ہے۔

مولانا صفی لکھنوی فرماتے ہیں:۔

بروش غالب دہیر آمدہ — شاعر بے مثل و لہمیت در زدہ
از اثر طبع سخن گوئے او — فارسیش غازۂ اردوئے او

حضرت ظہیر دہلوی (یادگار ذوق) کا خیال ہے:۔

"آپ کے غالب ثانی ہونے میں کوئی کلام نہیں"

مولانا شوق قدوائی لکھنوی لکھتے ہیں:۔

"آج کل ہندوستان میں حضرت غالب اور میر کی تقلید کرنے والے زبان کے دعوے سے اکثر پائے جاتے ہیں مگر کلام کے رنگ سے کم۔ میں نے کم کا لفظ صرف اس بنا پر لکھا کہ پوری تقلید حضرت غالب کے رنگ کی حضرت وحشت ہی نے کی ہے اور ان کی ذات واحد ہی کم کے لفظ کی مصداق ہو سکتی ہے (مخزن مئی ۱۹۱۰ء)

حضرت محشر لکھنوی رقمطراز ہیں:۔

"تقلید مرزا غالب مرحوم میں جس قدر مشق کی ہے اس کی خوبصورتی اور حسین تصویریں صفحات دیوان پر جا بجا پائی جاتی ہیں۔ فارسی ترکیبوں کے صرف کرنے میں خداداد طبیعت کو سلیقہ خاص عطا ہوا ہے۔ سب سے بالا تر اور لائق تحسین یہ امر ہے بلکہ اس کو مشق کمال یا کمال مشق کہنا چاہئے کہ فارسی بندشوں میں ادائے خیال کے وقت کسی مقام میں کہیں الجھن نہیں جو مضمون ہے موتی کی طرح صاف جو تخیل ہے وہ بالکل پاک اور پاکیزہ۔ یہی طریقہ بلاغت کی جان اور یہی انداز فصاحت کی روح ہے (معیار لکھنوی مئی ۱۹۱۰ء)

آج سے چالیس سال پیشتر جبکہ وحشت نے تتبع غالب میں طبع آزمائی شروع کی تھی اپنے متعلق یہ پیشین گوئی کی تھی اور واقعات مابعد نے ثابت کر دیا کہ پیشین گوئی کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔

ترے انداز سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت
کہ مقدر ہے ترا غالب دوراں ہونا

غالب کا انداز بیان انھیں اس درجہ مرغوب خاطر ہے اور اس کے تتبع میں اس قدر محو ہیں کہ اس حقیقت کا اظہار فخر سے کرتے ہیں۔

نکتہ پردازی میں وحشت پیرو غالب ہوں میں
سرمہ توتیا ہوں در فشعلۂ آواز سے

اس راہ کی دشواری پیش نظر ہے پھر بھی آرزو کی خلش توسن طبع کے لئے مہمیز ہے۔

وحشت ہمیں تتبع غالب سے ہے آرزو۔
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بایں ہمہ دشواری اللہ نے آپ کی آرزو پوری کی اور ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے کلام میں غالب کا رنگ غالب ہے اور تتبع غالب کا آپ نے حق ادا کر دیا ہے۔ چنانچہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد رشید مولنا الطاف حسین حالی آپ کے کلام کے متعلق آپ کے دیوان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جب مرزا غالب مرحوم اپنی موروثی پنشن کے متعلق گورنمنٹ ہند میں استغاثہ کرنے کی غرض سے کلکتے گئے تھے اس وقت اہل کلکتہ نے ان کے فارسی کلام پر اعتراض کیا مگر آپ نے مرزا کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی کا مقابلہ کیسی ہی سختی کے ساتھ کیا جائے آخر کار وہ اپنا نقش لوگوں کے دلوں پر جمائے بغیر نہیں رہتی۔ اگر انصاف سے دیکھئے تو مرزا کا تتبع کرنا درحقیقت ہم لوگوں کا حق تھا مگر آپ نے ہمارا یہ حق ہم سے چھین لیا۔ سچ ہے

دوراں باخبر در حضور و نزدیکاں بے بصر دور

تکلف برطرف اگر مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے مستثنیٰ کر دیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بلا شائبہ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہو سکتا۔"

ذیل میں مرزا غالب اور مولانا وحشت کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے اہل ذوق بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وحشت کا کلام تتبع غالب میں کیا مرتبہ رکھتا ہے تخیل اور حسن بیان کا نہایت کامیاب نمونہ ملاحظہ ہو۔

آئینہ خیال تھا عکس پذیر راز کا — طور شہید ہو گیا جلوۂ دلنواز کا

اس مطلع کے ہر ٹکڑے پر غور کیجئے پھر شعر پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالئے

حضرتِ کلیم نے نکتہ عجب سمجھا دیا — ورنہ حریف میں بھی تھا اس مژہ دراز کا

حضرت غالب اس واقعہ کو کسی اور ہی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

دیر ملا تھا راہ میں کعبہ کو ہم نکل گئے
جذبۂ شوق تھا ہمیں مارغ حسن کو ہوا تھا نہ کا

ابھی ہے جبکہ آپ سے انداز عنوان بنا بنا
نہیں ہے یہ بھی لیتا تھا خبر جو ہاتھ دل پر تھے

نہایت فطری و پُر اثر تخیل ہے جس سے بیتابی صبر نما ہو سکتی ہو۔

مبارک ہو مجھے موقع فریب تازہ کھانے کا
کیا ہے پھر مرے پیمان شکن نے وعدہ آنے کا

لفظی برجستگی مبارک باد ہے! "میرے پیمان شکن" سے جو بات پیدا ہو گئی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

محبت کا عشق میں پُرشور طوفاں بن کے اٹھے ہیں
ہمیں آتا نہیں انداز راز دل چھپانے کا

نگہ ایسی نہیں کی تھی جو بیتاب کرنے دل میں
خیال آتا جو کچھ تو دستِ محبت سے سر اٹھانے کا

واقعی تیمارداری کی دل فریبی ایسی ہی ہوتی ہے۔ شیخ علی حزیں مرحوم کا ایک شعر ہے:-

شب زاشتیم بزم خوشے باخیالِ تو
هوشم خراب لذتِ گفت و شنید بود

میر کا یہ مطلع بہت مشہور ہے:-

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا مگر حضرت وحشت نے بھی خوب مطلع کہا ہے:-

غیر ہوتا تو غم تیرا ہمدم رہا — وائے وہ دل جس میں تیرا غم رہا
ہائے تیری آشنا بیگانگی — مدتوں میں بھی ترا محرم رہا

معشوق کی بیگانہ خوئی کا مضمون کس درجہ لطیف پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے:-

ہائے وہ عالم کسی کے حسن کا — دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا

حسن کا عالم بیان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے شاعر صرف یہی کہہ کے رہ جاتا ہے کہ "دیدنی تھا مجھ پہ جو عالم رہا" مگر دیدار کی لذت بھی تو بیان نہیں ہو سکی۔ اس لئے شاعر کہتا ہے مجھ پر جو عالم رہا "دیدنی تھا"۔ شاعر بطور خود کچھ نہیں کہتا مگر سمجھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہ شعر نہیں عالمِ حیرت کی تصویر ہے۔

جان دینے سے مجھے دادِ وفا تھی مطلوب
بیوفا چار گھڑی بھی تو پشیماں نہ رہا

جان سی پیاری چیز دے کر عاشق صرف داد دینا چاہتا ہے مگر معشوق کو پشیمانی تک نہیں۔ کس قدر پُرحسرت شعر ہے۔

شوق کا عالم مرا تو نے نہیں دیکھا ہنوز
بے حیا تجھ کو حیا کا امتحاں ہو جائیگا

حضرت وحشت فرماتے ہیں:-

بیکسی پردہ دار درد ہوئی — خیر گزری کہ اپنا گھر نہ ہوا

غالب کا مشہور شعر ہے:-

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

غالب غربت کی موت کو پردہ پوش بیکسی فرماتے ہیں اور وحشت خود بیکسی کو پردہ دار درد فرماتے ہیں۔ انداز بیان میں دونوں کے ندرت اور برجستگی ہے۔

دل کہ اک عمر ترا میکدۂ ناز رہا — ہائے اس خانۂ آباد کا ویراں ہونا

میکدۂ ناز کس قدر کیف انگیز ترکیب ہے!

اللہ اللہ یہ کافر نظری کا عالم — زیب دیتا ہے تجھے دشمنِ ایماں ہونا

"کافر نظری" کی ترکیب اور دوسرے مصرع کی برجستگی قابلِ داد ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار تو بالکل غالب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

دل کو مرغوب ہدف تیر کا تیرے بننا
سر کو منظور تری تیغ کے قرباں ہونا

کیا نظر آئے اسے جس کو نظر آیا ہو
تیرے رخ پر تری زلفوں کا پریشاں ہونا

میر کی زبان اور تخیل کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

بہت حسرت افزا ہے شمعِ مزار — بجھایا مجھے جب جلایا چراغ
بگڑے جو اپنی بات تو قسمت کے کیا بنے — آئے کسی پہ دل تو طبیعت کیا کریں

ہاں نہ دینا فرصتِ نظارہ اے شانِ جمال
ہوش کھونے ہی کی خاطر ہوش میں آیا ہوں میں

ان کے آنے کا بھروسہ ہو نہ ہو — راہ ہم ان کی مگر دیکھا کریں

محویتِ شوق کی انتہائی کیفیت کو حسرت انگیز انداز میں بیان فرمایا اور دونوں شعروں کا سوز و گداز اور ترنم ملاحظہ فرمائیے۔ بھاشا کا لطف آئیگا۔

خوشی کی تجھے زندگانی مبارک — مجھے زندگی سے خفا کرنے والے
نہ ہو رنج سے میرے افسردہ خاطر — مجھے رنج میں مبتلا کرنے والے

اس صید ناتواں کو جو چھوٹا ہو دام سے
آزاد کیوں کہوں کہ گرفتار بھی تو ہے

حضرت مبارک عظیم آبادی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

تو نے صیاد کچھ اس طرح سے آزاد کیا
جو چلے چھٹ کے قفس سے وہ گرفتار چلے

غالب کا شعر ہے:

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوء ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

وحشت فرماتے ہیں:

زباں کو آشنا کر آج ذوقِ آتشِ تر سے
کہ لذت یاب ہونا ہے تجھے کل آبِ کوثر سے

مرزا کے شعر میں کسی قدر پیچیدگی لیکن برجستگی ہے اور مولانا کے شعر میں صفائی اور زورِ استدلال ہے۔

آجکل ہماری نظم و نثر میں فارسی ترکیبوں کی بھرمار ہے مگر ان میں غالب کا رنگ کہاں۔ برعکس اس کے کلامِ وحشت ملاحظہ فرمائیے۔ اسلوبِ بیان میں وہی برجستگی، بندشوں میں وہی پختگی اور ترکیبوں میں وہی بانکپن اور برجستگی۔ الفاظ کی نشست اس قدر بے تکلف اور مناسب ہے کہ روح کو بالیدگی ہوتی ہے۔ جو مصرعہ ہے ڈھلا ہوا، جو شعر ہے اعلیٰ صناعی کا مکمل نمونہ۔ دور ازکار مبالغوں فرسودہ تخیلات اور مذموم اشارات سے آپ نے اپنے دامن کو کبھی آلودہ ہونے نہ دیا۔

مولانا وحشت غزل گوئی کے علاوہ صنفِ رباعی اور جدید طرز کی نظم میں بھی قدرت رکھتے ہیں لیکن غزل ہی کی طرف آپ کی توجہ بیشتر رہی ہے صرف دو رباعیاں اور ایک نظم کے دو بند پیش کئے جاتے ہیں۔

گو اس سے طبیعت اپنی گھبراتی ہے — تو بہ شکنی وہی چلی جاتی ہے
بے توبہ مجھے بخش دے اے ربِ کریم — اب توبہ تو کرتے ہوئے شرم آتی ہے

بے تجھ نہ جام غم پیا تھا میں نے — یہ کام تو جان کر کیا تھا میں نے
انجام یہ کچھ نہ جو رو یا تھا بہت — جس روز کہ تجھ کو دل دیا تھا میں نے

مرزا غالب مرحوم کی یاد میں فرماتے ہیں:

ظہوری ہو کہ طالب تیرے دل کا راز کیا سمجھے
ادا دانی کو تیری عرفیِ شیراز کیا سمجھے
حزیں بیچارہ وہ فکرِ چمن پرواز کیا سمجھے
تری ترکیب کیا جانے ترے انداز کیا سمجھے

ہوا ہے رشک افزائے عجم ہندوستاں تجھ سے
بنی یہ سرزمیں دلّی کی گویا اصفہاں تجھ سے
عبارت تیری کیا ہے سرمۂ تضمین ہے گویا
کلام جاں فزا اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا
جو تیرا نالہ ہے وہ نالے کی تاثیر ہے گویا
حکایت ہے ترے لب پر غمِ جانسوزِ ہجراں کی
اڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی

اردو شاعری جس قدر مولانا وحشت کی رہینِ منت ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن فارسی شاعری بھی آپ کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں کیونکہ آپ کا کلام فارسی زبان میں بھی موجود ہے جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو فارسی سے بھی ایک فطری مناسبت ہے۔ فارسی زبان اپنی جن خصوصیات کے لئے ممتاز ہے وحشت کے کلام میں بھی وہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ فارسی میں شعر کہنا دشوار نہیں مگر فارسیت پیدا کرنا مشکل ہے۔ ہندوستانی فارسی شعرا کے کلام سے ہندیت کی بو نہیں جاتی۔ مگر آپ کا شمار ان چند شعرا میں ہے جن کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔

دلم از مستیِ آں نرگسِ مستانہ می رقصد
کہ از ذوقِ سروش کعبہ و بتخانہ می رقصد
نہ تنہا از لبِ ساقی ہمیں پیمانہ می رقصد
برقص آیند چوں ساغر کشاں میخانہ می رقصد
کرامیں سا کیسوی بہم سرآراستن دارد
کہ یا رب در کفِ مشاطہ امشب شانہ می رقصد
چو از حد بگذرد سوزِ محبت رشک را سوزد
ببزمِ سوختن پروانہ با پروانہ می رقصد
ہمانا شوخیِ نازش مرا تعلیم فرماشد
تپید در سینہ دل گوئی کہ بیتابانہ می رقصد
خوشا آں محفل کہ روشن می کند شمعِ جمالِ او
سپند آسا دراں جا وحشتِ دیوانہ می رقصد

سلام

فصاحت جنگ جلیل

خواب میں آئیں نظر زہراؑ کے پیارے رات کو
یا خدا چمکیں ہمارے بھی ستارے رات کو

شامیوں کے ظلم یاد آ کر رلاتے ہیں ہمیں
ہم بسر کرتے ہیں دریا کے کنارے رات کو

حارثِ کمبخت نے جانی نہ ان کی قدر ہائے
آ گئے تھے اس کے گھر میں دو ستارے رات کو

لاشۂ فرزندِ حیدرؑ کی حفاظت کے لئے
شیر اک پھرتا تھا دریا کے کنارے رات کو

سونے والو صبحدم باغِ جہاں سے کوچ ہے
گریۂ شبنم یہ کہتا ہے پکارے رات کو

کیا قیامت تھی شبِ عاشورہ پوچھو چرخ سے
اشک بن بن کر برستے تھے ستارے رات کو

باپ سے چھٹنا قیامت ہے سکینہؑ کے لئے
نیند سے اب چونک کر کس کو پکارے رات کو

صبح کو دیکھا تو پھر پھر کر اسی جا تھا قیام
کربلا سے بارہا حضرت سدھارے رات کو

کہتی تھی بانوؑ نہ کیوں اختر شماری میں کروں
یاد آتے ہیں مری آنکھوں کے تارے رات کو

دیکھئے کیا حال ہوتا ہے سحر تک اے جلیل
شمع ساں ہم بھی ہیں رونے پر اتارے رات کو

غزل

محمد ضامن علی ضامن

دو وضع کی اک منزل جانانہ بنا دے
دل کو کبھی کعبہ کبھی بتخانہ بنا دے

مجذوب خراباتی و دیوانہ بنا دے
یہ عشق ہے کیا جانیے کیا کیا نہ بنا دے

اجمال کی تصویر مرے اشک ہیں لیکن
دل چاہے تو ہر قطرہ کو افسانہ بنا دے

کیا کہیے سوا اس کے کہ آباد رہے وہ
ارمان بھرے دل کو جو ویرانہ بنا دے

جوشِ دلِ آشفتہ کا یہ فیض ہے ورنہ
افسانۂ الفت پہ یہ پروانہ بنا دے؟

دیوانوں کے انداز جنوں بھائے ہیں تم کو
یہ سیر تمہیں خود ہی تماشا نہ بنا دے

آجائے دمِ نزع جو وہ رشکِ مسیحا
بیمار کی ہر سانس کو افسانہ بنا دے

یہ حسنِ عمل حسنِ طبیعت پہ ہے موقوف
کعبہ کرے دل کو کہ صنم خانہ بنا دے

ہے جستجو اس حسنِ جہاں تاب کی ضامن
شمعِ دلِ سوزاں کو جو پروانہ بنا دے

میر کی زندگی کے چند نئے پہلو

خواجہ احمد فاروقی

میر اقلیمِ غزل کے تنہا تاجدار ہیں۔ اُن کی زندگی اور شاعری میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ میر کی سیرت نے اُن کے اندازِ و اسلوب میں بڑی مدد دی ہے۔ وہ "قیامت کا سا ہنگامہ" اور "آگ کی سی لپٹ" جو اُن کے کلام میں ہے اس کے حقیقی اسباب اُن کی زندگی اور نفسیاتی حقائق ہی میں مل سکتے ہیں۔

میر کو ابتدا ہی سے گوناگوں مصائب و آلام برداشت کرنا پڑے۔ جب ان کی عمر دس برس کی تھی، سید امان اللہ کا انتقال ہوا۔ یہ میر کے والد کے خاص مرید اور کامل درویش تھے۔ میر اِن کو ہر جگہ "عم بزرگوار" لکھتے ہیں۔ میر کی ابتدائی تعلیم و تربیت انھوں نے ہی کی تھی۔ میر کو بھی ان سے بڑی محبت و عقیدت تھی۔ اسی لئے اس بے وقت موت سے بے حد متاثر ہوئے۔ خود لکھتے ہیں:۔ "من کہ بغل پروردہ او بودم۔ ہر آنچہ خود را بادی گفتم۔ بادمی خوردم۔ بادمی خفتم۔ بزبانِ یادی کردم و شبہا فریاد و فغاں کردم" (ذکرِ میر ص ۱۴)

والد سمجھاتے تھے کہ اللہ کے کام میں کسے دخل ہے۔ تم درویش زادہ ہو دل مضبوط رکھو لیکن ان کا رنج کم نہ ہوتا تھا۔ ابھی چچا کا زخم تازہ تھا کہ باپ بھی راہیِ عدم ہوئے۔ باپ کے مرنے سے میر کے اوپر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بڑے بھائی محمد حسن نے بے مروتی کی۔ باپ کا اثاثہ صرف تین سو کتابیں تھیں وہ انھوں نے خود لے لیں۔ اب میر بالکل نادار، لاوارث اور بے یار و مددگار تھے۔ باپ نے تین سو قرض بھی چھوڑے تھے اور یہ وصیت کی تھی کہ جب تک قرض ادا نہ ہو تجہیز و تکفین نہ کرنا۔ اس مصیبت کے وقت کمل خاں نے جو سید امان اللہ کے مرید تھے، ۵۰۰ روپے سے مدد کی۔

باپ کے مرنے کے بعد میر کو تلاشِ معاش کی فکر ہوئی۔ شروع میں اطرافِ اکبرآباد میں پھرتے رہے لیکن جب کوئی صورت کامیابی کی پیدا نہیں ہوئی تو دلی کا سفر اختیار کیا۔ وہاں بھی قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا! لیکن کچھ عرصہ کے بعد خواجہ محمد باسط کی وساطت سے امیر الامرا صمصام الدولہ کے حضور میں، جو میر کے والد کے معتقد تھے، رسائی ہو گئی اور انھوں نے میر کا روزینہ مقرر کر دیا۔ اب ذرا معاش کی طرف سے بے فکری ہو گئی۔ میر لکھتے ہیں:۔ "آں روزینہ می یافتم نان و نمک می خوردم۔ و بسر می بردم" (ذکرِ میر ص ۶۲) لیکن یہ آسائش دیرپا نہیں تھی۔ امیر الامرا نادر شاہ کے ہنگامہ و آشوب میں قتل کر دئے گئے، اور میر پھر بے کار اور پریشان روزگار ہو گئے (۱۱۵۱ھ) اس لئے مجبوراً اکبرآباد آئے لیکن وطن میں بھی کسی نے التفات نہیں کیا۔ خود لکھتے ہیں:۔ "درکسانیکہ پیش درویشِ خاک پائے مراحل بصر می ساختند یک بار از نظر انداختند۔" (ذکرِ میر ص ۶۳) اربابِ وطن کی اس درجہ بے التفاتی معنی خیز ہے۔ ناچار میر دوبارہ دلی آئے [۱] اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ساتھ (جو محمد حسن کے خالو تھے) رہنے لگے۔ وہ بھی محمد حسن کے سکھانے پر کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے درپئے آزار ہو گئے۔ میر لکھتے ہیں کہ

"آں عزیز دنیادار واقعی بود نظر بخصومت ہمشیر زادہ خود بمن اندیشید ..... جفتی اوا گر بتفصیل بیان کردہ آید دفترے جداگانہ می باید۔ خاطر گرفتہ من گرفتہ تر شد سودا کردم۔ دل تنگم تنگ تر گردید۔ وحشتے پیدا کردم ..... شائستۂ کفارہ گیری شدم۔ زندانی و زنجیری شدم" (ذکرِ میر ص ۶۴-۶۵)

حیرت ہے کہ خان آرزو جن کا ذکر تمام تذکرہ نویسوں نے ادب کے ساتھ کیا ہے، اور جن کے متعلق خود میر نے "نکات الشعرا" میں "استاد و پیر و مرشد بندہ" [۲] لکھا ہے اس درجہ ظلم و ستم روا رکھیں کہ میر کی حالت بالکل مجنونانہ و سودائیانہ ہو جائے اور وہ "زندانی و زنجیری" کر دئے جائیں! میر نے بھی کوئی قوی سبب اس کشیدگی اور دیوانگی کا ظاہر نہیں کیا ہے۔ یہ خاموشی بھی "معنی دار" کے تحت آتی ہے۔

صاحب شعر الہند نے بہار بے خزاں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ میر

"بشہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود، در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت آخر عشق او خاصیت مشک پیدا کردہ۔ می خواست کہ بخیہ بہ چارسوے رسوائی کند۔ حسن بے پردہ بجلوہ گری درآید" [۳]

بہت ممکن ہے کہ خان آرزو کو اسی تعشق طبع کی ناگواری ہو، بھائی نے اسی لئے میر کو "فتنۂ روزگار" لکھا ہو۔ "خاطر گرفتہ من، گرفتہ تر شد، سودا کردم" کی وجہ یہی ہوا اور عقیدت مندانِ میر محمد علی کی بے التفاتی اور بے رخی کا بھی ایک سبب یہی ہو۔

میر جب تک زندہ رہے یہ غمگینی اور وارستہ مزاجی باقی رہی۔

---

[۱] آسی نے سالِ ولادت ۱۱۳۵ھ اور سالِ وفات ۱۲۲۵ھ مانا ہے (کلیاتِ میر ص ۱۰)

[۲] بقول آسی تقریباً ۱۱۵۲ھ میں۔ نکات الشعرا ص ۱۲، ذکرِ میر ص ۱۳ اور نظرات

[۳] شعر الہند ۱ ص ۵۵۔

"تا آخر حیات طوق محبت در گردن و سلسلہ دیوانگی بر پا داشت"

(میر پا بے حزاں)

میر کی طبیعت ان اتفاقات واقع ہوئی تھی۔ دلی میں بھی ان کو اسی طرح کے مواقع ملے تھے۔ دیوانیوں سے چھٹے تو جب دلی سے باہر ہوگئی تو ایک مکان میں پہنچ کر پچھلی صحبتوں کو یاد کرتے ہیں۔

"ہر گاہ معشوق ... در بر [illegible] ماندم ... داشتم۔
[illegible] می سینہ ... کرسینہ ... پرخوں
[illegible] ... انداختم با سلسلہ ... پیاں
می بودم ... پیوستہ ... می بودم" سلہ

میر کو جو تعلیم ابتدا میں ملی تھی وہ بھی یہی تھی:

"اے پسر عشق بورز ... بے عشق زندگانی وبال ست
دل باختہ عشق بودن ... عشق ... بسوزد" سلہ

میر کے دیوان میں بھی جا بجا اسی قسم کے اشارے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل بھی عشق کا زخم خوردہ تھا اور میر کے یہاں اسی آگ کے شعلے ہیں جو زبان قلم سے نکلے ہیں:

[illegible] ہو	... روز و شب حال کیا ہے
[illegible]	چپکے چپکے میری ہم اٹھ کے کب سے چلے
تمام ... [illegible] نزار	تیرا تو میر غم میں عجب حال ہوگیا
[illegible] بھی	در ... مندی میں گئی ساری جوانی اسکی
[illegible]	جی خود بہ خود ... ہم کاہے کو کھپا جاتا

غزل کی ... زیادہ وضاحت نہیں ہوتی لیکن میر کا یہ انداز دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف ہے اور رسمی و تقلیدی نہیں کہا جاسکتا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ~

... میری نہیں محبت میں	تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
... اب تک تو ذکر ہے ہمارا	... فسانہ محبت مشہور ہے ہمارا

میر نے درد دل کے پردہ میں اپنے جذبات و واردات بیان کئے ہیں۔

خود فرماتے ہیں: ~

... آفت ... پیشہ عشق پیشہ	پردے میں سامنے مطلب اپنے ادا کرے ہے
کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا	وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میر کو ... ناکامی ہوئی۔ ان کی زندگی کے ایوان میں ایک زلزلہ سا آگیا ... ایک تارک شب اٹھا۔ اس سے ان کی شاعری کو

سلہ ذکر میر ص ۱۰۰ سلہ ایضاً ص ۵۔

توجہ ہوئی لیکن ان کی طبیعت پر حزن و یاس کا رنگ چھا گیا۔ میر کے اندر ... کہ انتشار اور دیر آشنا ہونے کی نفسیاتی وجہ بھی یہی شکست اور مایوسی ہے: ~

سیکڑوں حرف ہیں گرہ دل کی — پر کہاں پائیے لب اظہار

میر کے یہاں دبے ہوئے صنفی رجحانات بھی ملتے ہیں جن کی گشتہ تمنائیں جنسی ... میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ ان کے ہاں "طفلان" ... اور "دلی کے کج کلاہ لڑکوں" کا ذکر ہراتے بیت نہیں ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی تمام دلربا ادا ؤں پہ غور کیا تھا: ~

کیا ... داخوش آتا ہے ان لڑکے سپاہی پوشوں کا
... سے پسے ہیں جولی ... نے ... ہیں ہیں

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب	اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں
میر کی ... معلوم لڑکوں کو نہیں	کر ... ادا انہیں سلو ... اچھے
دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے	کام عشاق کا تمام کیا
... خوش ظاہر	فتنہ روزگار ہوتے ہیں
... اہل دول کے لڑکوں سے	میر جی ان سے مل نقیہ ہوئے

میر نے نکات الشعراء میں کئی ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جو ... ہیں۔ مثلاً ... (ص ۱۲۹)، ... (ص ۱۵۷)، ... (ص ...) ... کام عشق کا ... دامن کشاں گذر جانا آسان نہ تھا۔

میر ... زمانہ میں دلی آئے جب کہ واقعی دونوں ہاتھوں سے دل کا سنبھالنا مشکل تھی۔ ہر طرف نفسا نفسی، خود غرضی، ... عالم تھا۔ میر نے یہ مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان کے زخم برداشت کئے۔ ... کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ آج ہے تو کل نہیں، صبح ملی تو شام کا یقین نہیں۔ ... شاعر ... بڑے بڑے امرا اور رؤسا پریشان اور مضمحل تھے۔ بلندی ونکوئی، تاجوری و نوحہ گری ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ اس دور کا رنگ شیشہ گری میں اگر تھا ... کبھی اٹھا تا تھا تو ... اور سانس بھی لیتا تھا تو آہستہ لیکن میر باوجود ناہموار ... زیست کرنے کے جب تک بن پڑا دلی ہی میں قدم جمائے رہے اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ اجڑی ہوئی دلی ان کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔ اور لکھنؤ کا وہ ماحول جو خندہ وقہقہہ سے عبارت تھا ان کو کبھی پسند نہیں آیا: ~

... لکھنؤ میں اقامت ہے تجکو لیک	یاں کے چلن سے لگتا ہوں جوں ہم سفر ہنوز
خرابہ دلی کا ... لکھنؤ سے تھا	وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یہاں

لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ میر بالکل قانع اور متوکل آدمی تھے اور اُن کے لوح دل پر آرزو کا کوئی نقش تھا ہی نہیں۔ دلی کے محسنین کی فہرست کافی طویل ہے:

(۱) امیر الامرا صمصام الدولہ (ذکر میر ص ۶۲) (۲) رعایت خاں

(ذکر میر ص ۷۶) (۳) نواب بہادر (ذکر میر ص ۸۱) (۴) مہا نراین دیوان (ذکر میر ص...)
(۵) راجہ جگل کشور ص ۵۰ (۶) راجہ ناگر مل ص ۸۷ (۷) راے بشن سنگھ ص ۹۳۔
(۸) وجیہ الدین خاں برادر حسام الدولہ ص ۱۲۲۔

اس درمیان میں ایسے واقعات بھی پیش آ گئے ہیں [illegible] رہا [illegible] سے ہو گیا ہے (ذکر میر ص ۸۷) اور میر شرمندہ ہو کر [illegible] آئے [illegible] بادشاہ کے راستے [illegible] لکھنؤ [illegible] سے ملنے گئے [illegible] بیان [illegible]
"ناچار برگشتہ آمدم" [illegible] وار داری بھی کی ہے۔

"از اں روز بعد نماز عشا [illegible] در خانہ [illegible]
[illegible] شب [illegible] در دل [illegible] پوشیدگی
خاطر از نفاست [illegible]" ذکر میر ص ۹۷۔

اپنی دل تنگی اور پریشان حالی کا ذکر کر کے [illegible] لیا ہے۔
(ص ۸۷، ص ۹۱)

لکھنؤ میں بہت ان کی قدر کی گئی۔ [illegible] ماہوار مقرر ہو گئے تھے۔ آزاد کے اس بیان کی تردید کہ آخری عمر میں ان کی تنخواہ بند ہو گئی تھی صاحب گلشن بے خار کے تذکرے سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ یہ اتنی بڑی تنخواہ ہے [illegible] کے باوجود ماگوئی اور مدح گستری کے دلی اور رامپور [illegible] ہو گئی غالب کا ابتدائی زمانہ بڑے عیش میں گزرا تھا میر درویش زادے تھے جنہوں نے فاقوں میں تعلیم شروع سے حاصل کی تھی۔ ان کے لئے یہ تین سو کم [illegible] تھے پھر بھی وہ ساری عمر [illegible] رہے کہ "دست کوتاہ نا سبو نہ گیا" اور [illegible]

تنگیٔ معاش یعنی غم زیست تا بہ کے — مر جائیے کہیں کہ ٹک آرام پائیے

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میر میں "خوۓ گدایانہ" نہیں تھی۔ وہ کافی خوددار اور بانجبت واقع ہوئے تھے۔ اس لئے قصیدہ کے لئے زیادہ موزوں نہیں تھے۔ جو لکھے وہ کم درلیے جنہوں نے اعتبار [illegible] مرتبہ نہیں رکھتے ان میں نہ شکوہ ہے نہ زور نہ مبالغہ آمیز خیالات ہیں [illegible] بہادر [illegible] انداز بیان ہے۔ غرض کا یہ شعر ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

میر نے اگر ہاتھ پھیلایا ہے تو بڑی مجبوری میں اور کسی کے سامنے اپنی غریبی کا دکھڑا رویا ہے تو یہ سمجھ کر کہ یہ صاحب غیور پر بڑا ستم ہو رہا ہے لیکن ایک غیر جانب دار وقائع نگار ان باتوں کو قطعی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ انھوں نے قصیدے بھی لکھے ستائش گری اور مداحی بھی کی تلاش معاش میں صفت جام

[1] گلشن ہند ص ۱۵۳۔

بھی پھرے اور باوصف اہل دہلی کی قدر دانی اور ارباب لکھنؤ کی سرپرستی کے ستارہ وفلک وبخت و روزگار کی شکایت ہی کرتے رہے۔

[illegible] نے باوجود [illegible] سے گزر جانے کے دلی نہیں چھوڑی۔
[illegible] میر نے ایک مثنوی لکھی ہے [illegible] ارادہ کر لیا۔ یہاں محب خان آرزو نے بھی [illegible] میر نے اپنے طنز و تشنیع کا سارا ترکش ختم کر دیا تھا:

"[illegible] درویشی [illegible] از [illegible]
[illegible] توقع [illegible] مخالف [illegible]
[illegible] حقوق سابق رعایتے خوب مند کرد [illegible]
زمانہ خورد وہم آں جا ماند" (ذکر میر ص ۷۵)

[illegible] ہے کہ میر کو لکھنؤ بلانے والے بھی خان آرزو کے ہی [illegible] میر کو اپنے کمال فن کا غیر معمولی احساس تھا۔ ان کی انفرادیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آخر وہ مرض بن گئی زندگی بھر وہ اسی انفرادیت کا جنازہ لئے لئے پھرے اور ان کو زیر آسمان کہیں سکون میسر نہ آیا۔ غم عشق اور غم روزگار دونوں نے مل کر ان کی زندگی کو غارت کر دیا اور سوائے ایک نوائے تلخ کے ان کے پاس کچھ بھی نہ چھوڑا۔

پیشہ گرچہ شغلے در آستیں دارد — به خون زدہ ز برش گر انگبیں دارم

ناکامی اور مایوسی نے ان کی بے دماغی نازک مزاجی، غرور اور تمکنت کو حد سے بڑھا دیا۔ وہ خود بھی اس کے معترف ہیں۔

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی — اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج — اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی
اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو — الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے
تیری چال ٹیڑھی، تیری بات روکھی — تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

ذاتی رنجش اور غرور و نخوت کی وجہ سے میر نے اپنی سوانح عمری میں خان آرزو کو اپنا استاد بھی تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ سعادت امروہوی اور میر جعفر عظیم آبادی اور دیاران شہر کے فیضان کا اعتراف کیا ہے۔
میر حسن اور [illegible] دونوں اس کے معترف ہیں کہ میر خان آرزو کے شاگرد تھے۔
قاسم نے مجموعۂ نغز میں یہاں تک لکھا ہے:

نسبت تلمذ ہم بہ جناب افادۃ انتساب خان مشار الیہ دارد
اما بنا بر نخوتے کہ در سرش جا گرفتہ از یں امر کہ فی الحقیقت
فخرے ست ابا ورزد۔ میاں آرزو۔ از کبر و غرورش چہ نگارم
کہ حدے ندارد واز نخوت و خود سرشیں چہ برنگارم کہ سینۂ قلم

[1] ذکر میر ص ۱۳۹۔

حقائق رقمی نگارد" (مجموعہ نغز ص ۲۳۰)

تذکرہ نکات الشعرا، تذکرہ میر حسن، تذکرہ مخزن نکات، اور تذکرہ قاسم کے بیانات اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ میر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں دیدہ و دانستہ خان آرزو کی شاگردی سے انکار کیا ہے۔ ممکن ہے اب وہ

اپنے آپ کو خان آرزو سے بڑا سمجھتے ہوں اور ان سے نسبت تلمذ کو دون مرتبت خیال کرتے ہوں۔ حالانکہ بعض اہل علم نے خان آرزو کو "امام المتاخرین" کے لقب سے یاد کیا ہے اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ایک شخص اپنے آپ کو علم و ادب میں کامل نہ سمجھتا تھا تاوقتیکہ وہ کسی نہ کسی طرح خان آرزو کے حلقۂ درس میں شریک نہ ہوا ہو۔ میر اور آرزو کی تصانیف کا باہم مقابلہ و موازنہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ میر کے غنچۂ استعداد کی شگفتگی خان آرزو ہی کی رہین منت ہے۔

دلی میں میر کے کمالات کا ہر چہار طرف اعتراف ہوا۔ خود فرماتے ہیں ؎

یہ میر ستم کشتہ، کسو وقت جواں تھا — انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا — منہ تکئے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلی میں نکلتا — ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک — آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا

ذکر میر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر محفل میں بتقریب ملاقات بھی شاعری تھی۔ اور لوگ ان کی متاع سخن کو جان و دل سے خریدنے کو تیار تھے۔ یہ شہرت دلی کی محفلوں، خانقاہوں اور بازاروں سے نکل کر دکن تک پہونچ گئی۔ خود فرماتے ہیں ؎

کچھ ہند ہی میں لوگ نہیں میر جیب چاک — ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام
سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ — ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

اس شہرت کے ساتھ میر کا غرور بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ معاصرین کو ہیچ در پوچ سمجھتے تھے اور ان کے شعر و سخن میں شبہات کا برملا اظہار کرتے تھے ؎

کہاں عاجز سخن، قادر سخن ہوں — ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

اژدر نامہ ان کے خیالات کا آئینہ دار ہے ؎

بری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے — جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر — گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

مخالفین نے ان کا اس سے زیادہ سخت جواب دیا۔ محمد امان نثار نے اژدر کے نکلے چیونٹی کی دھمکی دی اور بقا نے اس طرح فہمائش کی ؎

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر — اور بستی نہیں یہ دلی ہے

لکھنؤ میں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں دونوں نے میر کی ناز برداری کی۔ سب نے ان کو آنکھوں پر بٹھایا اور شاعری کا استاد مانا لیکن میر کی شکایتیں دستور باقی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جور و ستم کا نوحہ ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی:

بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو لیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاع ہنر پھیر کر لے چلو — بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

میر کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ ؎

ریختہ کا ہو کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر — جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

وہ اپنے آپ کو نظیری کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے اور انہیں اس کا شدید احساس تھا کہ ان کی جیسی قدر ہونا چاہئے وہ نہیں ہوئی لیکن واقعہ یہ ہے کہ میر کی زندگی میں جیسی قدر ہوئی اس کی مثالیں اردو شاعری میں کم ہیں۔

میر کی شخصیت صحت مند نہیں تھی۔ ان کے غم میں محسن ضرور ہے لیکن ان کی شخصیت پوری طرح سرسبز ہونے سے قبل کچھ مرجھا سی گئی۔ بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میر ہیں۔ ایک کی غیرت، حمیت، شرافت، فتادگی، پاک نفسی، انصاف پسندی اور دل سوزی کی انتہا نہیں۔ دوسرا بے دماغ، متکبر اور مغرور ہے وہ اپنے آگے کسی کو نہیں سمجھتا۔ وہ امیروں اور رئیسوں سے بھی لڑتا ہے۔ دلی کے کج کلاہ لڑکوں اور عطار کے لونڈوں سے بھی دل بہلاتا ہے۔ مدح بھی لکھتا ہے اور ہجو بھی۔ وہ ذاتی عناد کی بنا پر احسانات سے قطع نظر کر سکتا ہے اور حقائق پر پردہ ڈال سکتا ہے۔

ایسے ہی شاعری میں بھی دو میر ہیں۔ ایک کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے مملو ہے۔ جو شعر ہے وہ انتخاب اور دنیائے شاعری میں لاجواب۔ دوسرے کا کلام رعایات و تکلفات سے گراں بار ہے۔ اس میں حد درجہ گندگی، سوقیت اور ابتذال ہے۔ اسی لئے شاید آزردہ نے لکھا تھا:

"پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند"

لیکن ۲۰۰۰ صفحات کے کلیات کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ پست زیادہ ہے اور بلند کم۔ لیکن جتنا حصہ بھی غایت بلند کا ہے وہ میر کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لئے کافی ہے۔ ناسخ و غالب کا یہ فتویٰ بھی اسی جزو کے متعلق ہے۔ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"۔

نیلام

افسانہ

رام چرن اور درگا پرشاد سرائی کے مشہور قصبہ کے رہنے والے تھے۔ دونوں بھائیوں میں بڑی محبت تھی۔ جنگ عظیم کے زمانے میں بھرتی ہو رہی تھی۔ یہ دونوں بھی فوج میں شریک ہو کر ہندوستان کو جرمنی کے پنجے میں گرفتار ہونے سے بچانے کے لئے یورپ چلے گئے۔ چار سال میں دونوں نے رسالداری کے عہدے تک ترقی پائی اور جنگ ختم ہونے پر وطن واپس آ گئے۔

ان کے باپ گرو چرن گاؤں کے مکھیا تھے اور انھوں نے اپنی زندگی بڑی دور اندیشی اور کفایت شعاری سے کام لے کر کافی اثاثہ جمع کر لیا۔ بیٹوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مکان بھی بنوا دیئے تھے۔ دونوں بیٹے باپ کی زندگی میں ہمیشہ باپ کے ساتھ ہی رہے۔ البتہ باپ کے انتقال پر کچھ عرصہ بعد انھوں نے آپس میں تصفیہ کر لیا کہ گھر کا سارا سامان نیلام کر دیا جائے اور جسے جو چیز پسند ہو نیلام میں بولی بول کر حاصل کرے۔

نیلام شروع ہوا اور ایک کے بعد دوسری چیز چھوٹتی گئی۔ اس طرح ایک سونے کی گھڑی باقی رہ گئی تھی۔ یہ گھڑی گرو چرن کو بہت عزیز تھی اور دور دور کے گاؤوں میں اس کی شہرت تھی۔ نیلام شروع ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ دونوں بھائی بولی بڑھا رہے ہیں۔ وہ خاموش ہو گئے۔

رام چرن بڑا بھائی تھا۔ اسے توقع تھی کہ درگا پرشاد اسے بولتا دیکھ کر خاموش ہو جائیگا۔ ادھر درگا پرشاد کا خیال تھا کہ رام چرن میرے بڑے بھائی ہیں جب انھیں معلوم ہوگا کہ گھڑی مجھے پسند ہے اور میں لینا چاہتا ہوں تو خاموش ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی خاموش نہ ہوا اور دام بڑھتے بڑھتے تیس روپیہ تک پہنچ گئے۔

درگا پرشاد نے سوچا: "بھائی کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔" اس نے اکتیس ۳۱ روپیہ کا اشارہ کیا۔

مسلم ضیائی

رام چرن نے دل میں کہا "درگا پرشاد میری محبت اور مہربانیوں کو بھول گیا ہے اور اسے میرے بڑے پن کا بھی خیال نہیں رہا۔" اس نے بولی بڑھائی۔ درگا پرشاد نے اضافہ کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف گھور گھور کر دیکھتے اور دام بڑھاتے رہے۔ رام چرن نے غصہ میں چالیس کہے تو درگا پرشاد نے پچاس۔

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ نیلام گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف نیلامی کی آواز آ رہی تھی۔ رام چرن نے ذلت محسوس کی اور ستر روپیہ کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔

"اسی روپیہ" درگا پرشاد نے آواز دی۔

"سو روپیہ اور اس کے ساتھ ہی بھائی کی محبت بھی" رام چرن نے آگ بگولہ ہو کر کہا اور نیلام گھر سے باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد جب وہ گھوڑے پر زین کس کر گھر جانے کو تیار تھا، ایک آدمی نے دوڑ کر اس سے کہا: "گھڑی تمہارے نام پر چھوٹ گئی ہے۔ درگا نے بولی نہیں بڑھائی۔"

رام چرن سوچ میں پڑ گیا۔ اس کو اپنے دل میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ اب اسے گھڑی کے بجائے بھائی کا خیال تھا۔ اس کا ایک پاؤں رکاب میں تھا اور ایک زمین پر۔ وہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ ٹھیرے یا چلا جائے۔

اتنے میں نیلام گھر سے بہت سے آدمی نکلے۔ ان میں درگا پرشاد بھی تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ رام چرن کیا سوچ رہا ہے۔

"بھائی صاحب! گھڑی مبارک! لیکن آج سے ہمیشہ کے لئے خدا حافظ۔ آئندہ آپ کو اپنے بھائی سے کسی قسم کی محبت اور اطاعت کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔" درگا پرشاد نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ تم بھی میرے منحوس قدم اپنے دروازے پر کبھی نہ دیکھو گے۔" رام چرن نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے جھلا کر کہا۔

اس روز سے دونوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی اس گھر میں قدم نہیں رکھا جس میں وہ باپ کی زندگی میں مل جل کر رہا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں لیکن نہ تو رام چرن کی شادی میں درگا پرشاد شریک ہوا اور نہ درگا پرشاد کی شادی میں رام چرن۔ درگا پرشاد کی شادی ہونے کے بعد ایک روز صبح کو اس کی گائے مری ہوئی پائی گئی لیکن اس کی موت کا سبب کوئی نہ بتا سکا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس پر دوسری بلائیں نازل ہوتی رہیں لیکن سب سے بڑا صدمہ اسے اس روز ہوا جب ایک رات اس کے بھوسے کا سارا ذخیرہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ تحقیقات ہوئی اور بہت کچھ لیکن پھر بھی معلوم نہ ہو سکا کہ بھوسے میں آگ کیونکر لگی تھی، اتفاقاً یا کسی کی شرارت سے۔ "یہ تو کسی دشمن کا کام ہے"۔ درگا پرشاد نے کہا۔

وہ رات بھر روتا رہا۔ اس دن سے اسے کام کاج سے بالکل نفرت ہو گئی اور وہ نہایت غمگین رہنے لگا۔

آگ لگنے کے دوسرے روز شام کو رام چرن اپنے بھائی کے گھر گیا۔ درگا پرشاد لیٹا ہوا تھا۔ بھائی کو دیکھتے ہی اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے کہا اور بھائی کو غصہ بھری نظروں سے گھورنے لگا۔

رام چرن نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "درگا! میں تمہاری

مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم آجکل پریشانیوں میں گرفتار ہو۔"

"اتنا زیادہ نہیں جتنا تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ نہیں تو مجھے نہیں معلوم کہ اپنا غصہ ضبط بھی کر سکوں گا یا —"

"چلے جاؤ۔ نہیں تو ایشور جانے میں کیا کر بیٹھوں۔"

رام چرن ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا "تم لکڑی چاہتے ہو تو لے سکتے ہو۔"

"چلے جاؤ" اس کے بھائی نے کہا "نہیں تو —"

اور رام چرن کو جانا ہی پڑا۔

دراصل یہ تھا کہ جب رام چرن کو بھائی کی پریشانیوں کا علم ہوا تو برادرانہ محبت نے جوش مارا۔ اس نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ بھائی سے ملوں مگر ہمت نہ ہوئی۔ خودداری نے پاؤں سو سو من کے کر دیئے۔ وہ کئی مرتبہ گھر سے اس خیال سے نکلا بھی کہ کسی طرح جا کر بھائی سے مل لے۔ درگا پرشاد کے مکان کے سامنے پہنچا لیکن الٹے پاؤں واپس آگیا کیونکہ راستہ میں یا تو کوئی ملاقاتی مل جاتا یا درگا پرشاد دروازے پر کھڑا ہوا نظر آتا۔

ایک روز رام چرن مندر گیا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اسی وقت درگا پرشاد بھی آیا۔ رام چرن نے اسے دیکھا۔ وہ بہت لاغر اور نحیف ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ آج اس کے بدن پر وہی کپڑے تھے جنھیں وہ اس زمانے میں پہنتا تھا جب دونوں بھائی ساتھ رہتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ان میں جا بجا پیوند بھی لگے تھے۔ درگا پرشاد نے اس کی جانب نظر نہیں اٹھائی لیکن رام چرن کو اس کے چہرے پر محبت اور نرمی کی جھلک نظر آئی۔ اسے وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ دونوں بچے تھے اور ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اسے یاد آیا کہ درگا کیسا پیارا اور نیک لڑکا تھا۔ اس روز رام چرن نے قسم کھائی کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ بھائی سے ضرور صلح کر لے گا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ بڑا بھائی تھا اس لئے کچھ کہتے اسے [illegible] لگا۔ لیکن راستہ میں کوئی اور شخص آگیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ درگا پرشاد کی بیوی اس کے ساتھ تھی لیکن رام چرن اسے نہ پہچانتا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ گھر ہی پہ جا کر [illegible]

شام ہوئی۔ رام چرن گھر سے نکل کر درگا پرشاد کے دروازے تک پہنچا۔ اندر کوئی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے سنا جیسے کوئی اس کا نام لے کر کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ درگا پرشاد کی بیوی کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "آج تمہارے بھائی مندر میں آئے تھے۔ مجھے یقین ہے اس وقت وہ تمہارے بارے ہی میں سوچ رہے تھے۔"

"نہیں نہیں۔ وہ میرا خیال کیوں کرنے لگے۔" درگا پرشاد نے کہا۔ "میں خوب جانتا ہوں۔ انھیں میرا خیال کیوں ہونے لگا۔ اپنے ہی متعلق سوچ رہے ہونگے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بیوی نے کہا "تم چاہے مانو چاہے نہ مانو مگر مجھے تو یقین ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے متعلق سوچتے رہتے ہو۔"

"کچھ اور باتیں کرو" درگا پرشاد نے کہا۔

ذرا دیر بعد وہ باہر جانے کے لئے اٹھا۔ رام چرن کو درختوں کی آڑ میں پناہ لینی پڑی لیکن درگا پرشاد بھی اسی طرف درختوں کے جھنڈ میں پہنچا۔ اس نے تھوڑی سی سوکھی سوکھی ٹہنیاں جمع کیں۔ اس وقت وہ اپنی پرانی وردی پہنے ہوئے تھا حالانکہ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ اسے کبھی نہ پہنیں گے بلکہ اپنے بچوں کے لئے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں گے۔

درگا پرشاد اس قدر نحیف اور لاغر ہو چکا تھا کہ وردی اس کے جسم پر ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے بانس پر تکیہ کا غلاف۔ درگا پرشاد لکڑی کے ایک ڈھیر کے پاس پہنچا اور بجائے لکڑی اٹھانے کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"اف۔ ہائے رام!" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

رام چرن نے چاہا کہ سامنے آجائے، لیکن درگا پرشاد لڑکھڑاتا اور تھوڑی سی لکڑیاں اٹھائے ہوئے جلدی سے اس کے پاس سے گذر گیا۔

رام چرن تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے سوچا "میں نے ہمت سے کیوں نہ کام لیا اور کیوں نہ سامنے آگیا — لیکن اب جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔" وہ آہستہ آہستہ جھونپڑی کی طرف گیا جس کے چاروں طرف رام پرشاد اور درگا پرشاد کا بھوسہ کا ڈھیر تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسے کوئی چیز نظر نہ آرہی تھی۔ اس لئے اس نے دیا سلائی جلا کر ایک تیلے کی مشعل بنائی اور چھپر میں اس لکڑی کو تلاش کیا جس میں درگا پرشاد اپنا کوٹ لٹکایا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے جیب سے گھڑی نکالی اور اسی جگہ لٹکا کر مشعل ایک طرف پھینک دی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اس لئے وہ ایک نوجوان کی طرح [illegible] لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر واپس گیا۔

صبح کو اس نے سنا کہ درگا پرشاد کے بھوسہ میں آگ لگ گئی اور سارا کا سارا بھوسہ جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ اس روز وہ گھر سے باہر نہیں نکلا اور دن بھر رامائن پڑھتا رہا۔ گھر کے لوگوں نے خیال کیا کہ شاید اس کا دماغ متاثر ہو گیا ہے۔

رات میں وہ باہر نکلا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ بھائی کے کھلیان پہنچا۔ اور ادھر ادھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے گھڑی مل گئی لیکن اب وہ گھڑی نہ تھی بلکہ صرف گلی ہوئی دھات کا ایک ڈلا۔

اس نے یہ ڈلا اٹھا لیا اور بھائی کے گھر گیا تاکہ اسے سب کچھ سمجھا کر صلح کی کوشش کرے لیکن ہوا وہ جو کہا جا چکا ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی نے اسے راکھ کے ڈھیر میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے دیکھا تھا بعض لڑکوں نے درگا پرشاد کے گھر کی طرف شام کے وقت جانے کی تصدیق کی۔ ان کے

ہمسایوں نے بتایا کہ آگ لگنے کے دوسرے روز اس کی حرکات عجیب تھیں۔ چونکہ ہر شخص کو بھائیوں کی دشمنی کا علم تھا اس لئے حکام کو حادثہ کی اطلاع دی گئی اور تحقیقات شروع ہوئی۔ اگرچہ کوئی شخص رام چرن کے خلاف کوئی قطعی ثبوت نہ دے سکا پھر بھی شبہ کی ذرا سی تلک لوگوں کے دلوں میں باقی رہی۔

آگ لگنے پر درگا پرشاد کو رام چرن کا خیال آیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن جب شام کو رام چرن اس کے گھر گیا تو اس نے رام چرن کا اترا ہوا چہرا دیکھا لیکن آگ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس نے دل میں سوچا کہ بھائی اپنے فعل پر شرمندہ ہے۔ لیکن اتنا بڑا نقصان پہنچانے کے بعد معافی کا سوال ہی نہ تھا۔ اس کے بعد اس نے تحقیقات کی تفصیلات سنیں اور اگرچہ بھائی کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا پھر بھی اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ضرور خطاوار ہے۔

پنچایت گھر میں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رام چرن صاف ستھرے کپڑے پہنے تھا اور درگا پرشاد نوسیدہ اور پھٹے ہوئے۔ اسے رام چرن کی آنکھوں سے معلوم ہوا کہ وہ نہیں چاہتا کہ درگا پرشاد اس کے خلاف بیان دے۔ چنانچہ جب اس سے سوال کیا گیا کہ آیا اسے بھائی پر شبہ ہے تو اس نے قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا "نہیں"۔

اس روز سے درگا پرشاد نے کثرت سے تاڑی پینا شروع کر دی۔ رام چرن کی حالت اس سے زیادہ خراب تھی اور اگرچہ وہ پیتا نہ تھا پھر بھی اس کی حالت دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوتا تھا اور بعض اوقات تو لوگ اسے دیکھ کر پہچان بھی نہ سکتے تھے۔

ایک روز شام کو ایک شکستہ حال غریب عورت رام چرن کے مکان پر آئی اور اس سے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ یہ درگا پرشاد کی بیوی تھی۔ رام چرن نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ کیوں آئی ہے۔ اس نے کپڑے پہنے اور ساتھ ہو لیا۔ درگا پرشاد کے مکان پر پہنچا تو ایک مدھم سی روشنی کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوئی نظر آئی۔

رام چرن اندر داخل ہوا تو اسے ایک عجیب قسم کی بو سی معلوم ہوئی۔ سامنے دالان میں ایک ننھا سا بچہ کوئلوں کے ڈھیر سے کھیلتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں منہ اور سارا بدن سیاہ کر لیا تھا۔ بچے نے اس کی طرف دیکھا اور کھلکھلا کر ہنسا۔ یہ درگا پرشاد کا بچہ تھا۔

ایک جھلنگے پر درگا پرشاد پڑا ہوا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ زرد اور نحیف۔ وہ پھٹی ہوئی رضائی میں لپٹا ہوا دیدے پھاڑ پھاڑ کر بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ رام چرن کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ وہ پلنگ کی پٹی سے پیٹھ لگا کر زمین ہی پر بیٹھ گیا۔ اس نے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنا چاہا کہ اسے بخار تو نہیں۔

غزل

مری کوئی تمنا نہیں مرگ و زیست کا امتیاز کیا ہے
مری بقا کے مقابلے میں خضر کی عمر دراز کیا ہے

خیال کی خود فریبیاں ہیں خوشی کہاں کی ملال کیسا
نظر کی فرق آفرینیاں ہیں نشیب کیا ہے فراز کیا ہے

گر آتش عشق مشتعل ہے وہ جانتا ہے جو اہل دل ہے
کبھی ہوا شمع پر روشن کہ لطف سوز و گداز کیا ہے

حجاب صورت میں دلکشی ہے کچھ اور رنگ عشق کی نگاہ ہے
کوئی دل غزنوی سے پوچھے کہ شان حسن ایاز کیا ہے

ادھر سجود و قیام کرنا ادھر خدا سے کلام کرنا
جنہیں ہوا یہ کمال حاصل انہی سے پوچھو نماز کیا ہے

اسد حکیم فرنگ مرنے کے بعد کا حال خاک جانے
جسے ابھی تک خبر نہیں ہے کہ زندگانی کا راز کیا ہے

اسد ملتانی

اس کے بعد اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔

بیمار اس کی جانب ٹکٹکی باندھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ آخر اس نے بیوی سے باہر جانے کے لئے کہا لیکن رام چرن نے اسے اشارہ کیا کہ وہ کمرے ہی میں ٹھہرے۔

اس کے بعد دونوں بھائی باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے اس روز سے جب گھڑی نیلام ہوئی تھی، اپنے اپنے حالات ایک دوسرے کو سنائے۔ رام چرن نے جیب سے گھڑی نکال کر درگا پرشاد کو دکھائی۔ پگھلی ہوئی دھات کا ایک ڈلا۔ درگا پرشاد کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اس وقت معلوم ہوا جھگڑا ہونے کے دن سے اس وقت تک دونوں میں سے ایک کو بھی ذرا دیر کے لئے سکون اور مسرت نہ تھی۔

درگا پرشاد نے زیادہ باتیں نہ کیں کیونکہ اس کے بدن میں قوت بالکل نہ تھی لیکن رام چرن جس وقت تک درگا پرشاد بیمار رہا اس کی تیمارداری کرتا رہا۔

ایک روز صبح اٹھ کر درگا پرشاد نے کہا "میں اب بالکل اچھا ہوں، بھیا! اب ہم لوگ ہمیشہ ساتھ رہیں گے جیسے پہلے رہتے تھے۔ اب ہم کبھی جدا نہ ہوں گے"۔ لیکن اسی روز شام اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی

عسیر اور اس کے موجودہ فرمانروا

محمد کامل بحر العلومی

مملکت عربیہ سعودیہ اور یمن کے درمیان، بحر احمر کے ساحل پر حکومت عسیر واقع ہے۔ عسیر اگرچہ بہت چھوٹی حکومت نہیں ہے پھر بھی یمن سے چھوٹی ہی ہے۔ عسیر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ پہاڑی علاقہ بہت دشوار گذار ہے اور اس کے بلند پہاڑوں کے درمیان سفر کرنا کسی مسافر کے لئے ہوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس کے مغربی جانب قنفذہ سے میدی تک بحر احمر موجزن ہے، مشرق میں یمن کے سر بفلک پہاڑ جبل برارع اور جبل سعد واقع ہیں، جنوبی حدیں سلطنت یمن سے متصل ہیں، اور شمالی حدود مملکت عربیہ سعودیہ سے۔

عسیر کا رقبہ یوں تو بہت خاصا وسیع ہے یعنی پچیس ہزار مربع میل جو لمبائی میں تین سو پچاس میل اور چوڑائی میں ستر میل پھیلا ہوا ہے مگر اتنے وسیع رقبہ کو دیکھتے ہوئے آبادی بہت کم ہے یعنی کم و بیش دس لاکھ۔ مذہبی اعتبار سے یہ آبادی شیعوں میں جعفری اور اسماعیلی، سنیوں میں شافعی اور غیر مسلم فرقوں میں ہندو، پارسی اور یہودیوں پر مشتمل ہے۔ آب و ہوا نے یہاں کے باشندوں کو طاقتور اور مضبوط؛ آزادانہ بدوی زندگی نے نڈر، بے خوف اور بہادر بنا دیا ہے۔

پہاڑی ملک ہونے کے باوجود عسیر میں قابل زراعت زمینیں بھی بہت کافی ہیں جو بیکار پڑی ہیں اور بارش بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ اگر یہاں کے باشندے چاہیں تو زراعت کر کے خوب فائدہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر زیادہ تر ان کا ذریعہ معاش مویشیوں کی پرورش پر منحصر ہے۔ تجارتی حالت بہت اچھی ہے اسلحہ اور غلاموں کی خفیہ تجارت سے سوداگر بھی کافی منافع حاصل کرتے ہیں اور حکومت عسیر بھی۔ میدی یہاں کا سب سے بڑا اور بارونق تجارتی بندرگاہ ہے، اس کی مرکزیت کا سبب یہ ہے کہ یہاں سے درآمد ہونے والے مال پر چنگی بالکل نہیں لی جاتی، اسی لئے حجاز و یمن کے اکثر تاجر اپنا مال "میدی" ہی میں اتارتے ہیں۔ محرم میں مہینہ بھر تک تجارتی کاروبار بالکل بند رہتا ہے۔

عسیر کے اہم ساحلی شہر یا بندرگاہیں قنفذہ اور میدی ہیں۔ اور داخلی شہر عبیا، جیزان، لحیہ، ابوعریش، باجل، ابہا اور صلیف ہیں۔ مشہور قبائل بنی مروان، بنی ہلال، بنی عبس، التحر، المسارحہ، الربیعہ اور الجہرہ ہیں۔ موخر الذکر دونوں قبیلے علی الترتیب وادی الضلاع اور وادی الردوم میں بستے ہیں اور صحیح نحوی عربی بولتے ہیں جو موجودہ زمانہ میں عرب بھر میں کسی دوسری جگہ نہیں بولی جاتی۔ ان دونوں قبیلوں کی زبان معیاری زبان سمجھی جاتی ہے اگرچہ عسیر کے دوسرے خطوں کی زبان بھی تمام عرب ممالک سے بہتر اور فصیح ہوتی ہے۔

اگرچہ لوگوں کو عام طور سے زراعت کی طرف توجہ نہیں ہے تاہم تھوڑا بہت گیہوں پیدا ہو جاتا ہے اور پیداوار کا بسواں حصہ حکومت ٹیکس میں وصول کر لیتی ہے۔ نمک کی کانیں بکثرت ہیں جن میں سب سے بڑی کان صلیف میں ہے۔ دیگر معدنیات میں لوہا، سیسہ، تانبا اور گندھک کی کانیں ہیں اور کسی قدر سیمنٹ اور پٹرول بھی پایا جاتا ہے۔

جیزان بہت بڑی تجارتی منڈی ہے اس کی آبادی صرف چھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اور شہر بھر میں کوئی بڑا بازار نظر نہیں آتا پھر بھی یہاں بڑی تجارتی چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔ جیزان کے بعد دوسری تجارتی منڈی باجل ہے۔ اس شہر کی عجیب ترین خصوصیت عورتوں کی عام آزادی ہے۔ یہاں کی عورتیں یورپ اور امریکہ کی عورتوں کی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیتی ہیں۔ بازار میں آزادی سے خرید و فروخت کرتی ہیں، کھیتوں میں مردوں کے ساتھ کھیتی باڑی کرتی ہیں اور گھروں پر مہمانوں کی میزبانی ان کے فرائض میں شامل ہے۔ ان کا ناک نقشہ دلکش، قد موزوں اور اعضا میں جاذب نظر تناسب ہوتا ہے۔ باجل کے سوا نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ کسی مشرقی شہر میں اتنی آزاد عورتیں نظر نہیں آتیں۔

عسیر کے باشندے چونکہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہیں اس لئے جس طرح ان کی زبان اختلاط سے محفوظ رہی اسی طرح ان کی قدیم خصوصیتیں اور عادات و اطوار بھی برقرار ہیں۔ یہ لوگ عربوں کی روایات قدیمہ یعنی سادگی، صداقت، شجاعت، پابندی عہد، سخاوت اور مہمان نوازی کے حامل ہیں۔

یہاں جا بجا سادات کی بستیاں ہیں جن کی تمام لوگ بیحد عزت کرتے ہیں حتے کہ دوکاندار ان سے قیمت نہیں لیتے۔ سادات اپنی زنبیلیں لے کر بازار جاتے ہیں جو واپسی کے وقت گوشت، ترکاری، پھل، غلہ اور مٹھائی سے بھری ہوتی ہیں۔ دوکاندار سادات کی خدمت میں ضرورت کی ہر چیز اپنی سعادت جان کر بلاقیمت پیش کر دیتے ہیں۔

عسیر کے موجودہ فرمانروا کا نام سید حسن الادریسی ہے۔ یہ مراکش کے قدیم اور مشہور ادریسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو عرصہ دراز تک مراکش پر حکمران رہ چکا ہے۔ یہ لوگ نسباً حسنی سید ہیں۔ سید حسن الادریسی (جن کو عسیر میں دنیوی حکومت کے ساتھ ساتھ دینی پیشوائی کا مرتبہ بھی حاصل ہے، امام ادریسی کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں) کے مورث اعلیٰ احمد بن ادریس جو مشہور صوفی اور عالم دین تھے فاس (مراکش) کے "بلدۂ عرایش" نامی شہر میں ۱۷۵۸ء میں پیدا ہوئے اور وہیں علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو کر شیخ عبدالوہاب تازی کے حلقہ ارادت میں شریک ہوئے اور فیوض لمعانی و

باطنی حاصل کئے تکمیل علوم ظاہری و باطنی کے بعد حج کے لئے مکہ معظمہ گئے جہاں اسی زمانہ میں مغرب اقصیٰ کے شیخ الطریقت سید محمد سنوسی المغربی بھی گئے ہوئے تھے جو سید احمد بن ادریس کے روحانی کمالات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوکر روحانی فیض حاصل کیا۔ یہ تنا اہم واقعہ تھا جس نے سید احمد بن ادریس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ کچھ عرصہ بعد یمن کے مفتی اعظم سید عبدالرحمٰن اہدل زبیدی بھی وارد مکہ معظمہ ہوئے اور سید احمد بن ادریس کے فضل و کمال کا شہرہ سن کر ان کی خدمت میں حاضری دی اور روحانی فیوض و برکات حاصل کئے۔ مفتی صاحب موصوف سید احمد بن ادریس کے باطنی کمالات سے اس درجہ متأثر ہوئے کہ اپنے وطن مالوف یمن میں واپس جاکر ان کے داعی بن گئے اور تبلیغ شروع کردی۔ کچھ زمانہ کے بعد سید احمد بن ادریس بھی یمن گئے اور شہر زبید میں مفتی سید عبدالرحمٰن اہدل کے مکان پر قیام کیا۔ یہاں پہلے ہی سے ان کے فضل و کمال کا شہرہ ہوچکا تھا علماء و مشائخ ان کے گرد و پیش آکر ان سے ظاہری اور باطنی فیوض و برکات حاصل کرنے لگے۔ زبید میں چند دن ٹھیرنے کے بعد تہامہ، حدیدہ اور باجل ہوتے ہوئے صبیا پہونچ کر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس سیاحت سے سید احمد بن ادریس کا روحانی اقتدار مذکورہ بالا تمام مقامات پر قائم ہوگیا اور ہر جگہ کے علماء و مشائخ ان کے داعی بن گئے۔ صبیا میں سکونت اختیار کرنے کے کچھ ہی دن بعد عسیر اور تہامہ کے گوشہ گوشہ میں ان کے علم و فضل اور زہد و اتقا کی دھاک بیٹھ گئی۔ ۷۹ سال کی عمر پاکر ۱۸۳۷ء میں بمقام زبید انتقال کیا۔

یہ دور تہامہ اور عسیر کی طوائف الملوکی کا دور تھا۔ قنفدہ سے مخا تک ابراہیم پاشا (محمد علی پاشا سلطان مصر کے صاحبزادہ) قابض تھے۔ اس علاقہ کے باشندے ابراہیم پاشا کی حکومت سے سخت بیزار تھے جس کی وجہ سے خانہ جنگی کی آگ مشتعل رہتی تھی۔ آخرکار لندن کی موتمر کے فیصلہ کے مطابق ۱۸۴۰ء میں ابراہیم پاشا کو تہامہ اور عسیر سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس زمانہ کے امرائے عرب میں سے شریف محمد بن عون شریف مکہ، شریف حسین بن علی فرمانروائے ابی عریش اور امام یمن ان مقامات کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے خواہشمند تھے۔ ابراہیم پاشا نے اپنے مقبوضات کی عنان حکومت ایک مقررہ سالانہ خراج پر شریف حسین حاکم ابی عریش کے سپرد کردی کیونکہ یہی تینوں امیدواروں میں سب سے زیادہ ہوشمند اور صاحب اثر تھے۔

ترکوں نے ۱۸۴۹ء میں یمن اور عسیر کو اپنے مقبوضات میں شامل کرنے کی کوشش شروع کی اور توفیق پاشا نے حدیدہ میں اپنی فوجیں اتار دیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریف حسین بن علی کو اپنے پایۂ مستقر ابی عریش میں لوٹ جانا پڑا۔ ترکوں نے تہامہ فتح کرکے صنعاء کی طرف پیش قدمی کی مگر اس پر قبضہ نہ کرسکے۔ ادھر تہامہ میں ترکوں کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس موقع پر ادریسیوں نے اس خلفشار کا فائدہ اٹھاکر اپنی روحانی سیادت کو آلۂ کار بناتے ہوئے اپنی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد شروع کردی اور اپنے داعی تمام قبائل میں بھیج کر ان کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے معتقد قبائل جوق در جوق صبیا میں جمع ہوگئے جن کی مدد سے شریف حسین بن علی کو ابی عریش سے نکال باہر کیا اور ان کے مقبوضہ علاقہ پر قبضہ کر بیٹھے۔ ادھر سے فراغت پاکر ترکوں کو بھی نکالنے کی کوشش کی جس کا کوئی اہم نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ان مقامات پر ادریسیوں کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔

عسیر میں ادریسیوں کی باقاعدہ اور منظم حکومت کا سنگ بنیاد سید محمد بن علی الادریسی نے رکھا جو سید احمد بن ادریس کے پڑپوتے تھے۔ سید محمد بن علی ۱۸۷۶ء میں بمقام صبیا پیدا ہوئے اور اعلیٰ تعلیم جامعہ ازہر مصر میں پائی۔ پھر تکمیل تعلیم کے لئے مغرب اقصیٰ جاکر شیخ سنوسی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سوڈان گئے اور وہاں سلسلہ احمدیہ کے شیخ الطریقت "شیخ ہارون الکمال" کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ کچھ دن اپنی سسرال سوڈان میں قیام کرکے عسیر واپس آئے تو دیکھا کہ ملک میں کوئی مرکزی حکومت نہیں ہے بلکہ ہر قبیلہ اپنی جگہ پر آزاد و خودمختار ہے، اگرچہ عسیر کے جنوبی حصہ میں ترکوں کی برائے نام حکومت قائم ہے لیکن اس کا ملک پر کوئی اثر نہیں ہے۔ عربی قبیلوں کے عمال اور عقال ترکوں سے بیحد بیزار ہیں اور قبائل میں ترکوں کے خلاف سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے۔ سید محمد بن علی الادریسی نے موقع غنیمت جان کر یہ فائدہ اٹھایا کہ سرداران قبائل کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرلیا اور ان کی وساطت سے قبیلوں کو اپنے اثر و اقتدار میں لے آئے۔ انہوں نے یہ اصول بنالیا تھا کہ جو قبیلہ بیعت کرتا اس کے کچھ افراد ضمانت کے طور پر اپنے قبضہ میں رکھتے تاکہ وہ عہد شکنی کا خیال بھی دل میں نہ لاسکے۔ غرضکہ بتدریج ان کی سیادت کا دائرہ شمال مشرق کے قبائل میں وسیع ہوتا چلاگیا اور ابہا کے قلعہ میں عسیر کے اکثر و بیشتر قبائل ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ اگرچہ قبائل پوری طرح ان کے زیر اقتدار آچکے تھے لیکن ابھی تک کوئی ایسی صورت نہیں پیدا ہوئی تھی جس کو باقاعدہ حکومت کہا جاسکے۔ ۱۹۱۱ء میں جب طرابلس کے متعلق اٹلی اور ترکی میں لڑائی شروع ہوئی اس وقت ترکوں سے عرب قبائل کی نفرت رنگ لائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عسیر اور تہامہ میں ترکوں کی طاقت بالکل کمزور پڑگئی اور سید محمد بن علی کا اقتدار اس حد تک بڑھ گیا جس کو ایک گونہ بادشاہت

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

زندگی

رام پرتاب بہادر

اپنی پیدائش اور اس سے پہلے کے واقعات سے میں اتنا ہی واقف ہوں جتنا آپ ہوں گے، یعنی بالکل نہیں ہوں۔ بس کچھ سنی سنائی باتیں ہیں، جن کا یقین اس وجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ پیدائش کے موقع پر عام طور سے یہی سب ہوتا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ جس کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے اس کے یہاں بہت خوشی منائی جاتی ہے، سوا ایک برادری کے جس کا ذکر یہاں کرنا ضروری نہیں۔ تو کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ میرے گھر میں بھی خوشی منائی گئی یعنی تھالیاں بجیں، بندوق چھٹی، گانا بجانا ہوا وغیرہ وغیرہ۔ باوجود اس مستقل رونے کے کہ ملک کی آبادی بھیانک شکل سے بڑھ رہی ہے، جب بیٹا ہوتا ہے۔ یعنی جب بیٹی نہیں ہوتی ہے، تو سبھی خوشیاں مناتے ہیں۔ چنانچہ میری پیدائش بھی میرے گھروالوں کے لئے نہایت ہی مبارک خبر تھی۔ یہی نہیں بلکہ اگر گستاخی معاف ہو تو میں یہ بھی کہوں گا کہ میری پیدائش سے میرے گھروالوں کو جتنی خوشی ہوئی اتنی شاید آپ کی پیدائش سے آپ کے گھروالوں کو خوشی نہ ہوئی ہوگی۔ وہ کیوں؟ اس وجہ سے کہ مجھ سے پہلے میرے سات بہنیں پیدا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب میرے والد کو لڑکے کی کوئی امید نہیں رہ گئی تو انھیں مجبوراً دوسری شادی کرنی پڑی لیکن جب دوسری شادی سے بھی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ زندگی اور اپنے دونوں سے بالکل مایوس ہو گئے۔ بیٹا بیٹی میں کیا فرق، اور ویسے سوچئے تو بہت بڑا فرق ہے۔ بہرحال کہنے کا مطلب یہ کہ دونوں خدا کی دین ہے۔ اور ان کی مرضی کوئی کیسے بدل سکتا ہے۔ پھر بھی آرزو منت تو ہو ہی سکتی ہے، وہ مانیں یا نہ مانیں۔ بلکہ کچھ دیوی دیوتا تو ایسے بھی ہیں جن کی ایک حد تک سفارش بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میرے والد نے بھی تیرتھ برت کئے، سادھو مہاتماؤں کے درشن کئے، چرن چھوئے اور جب میں پیدا ہوا تو دسہرے سے ایک دن پہلے چودہ کالے بکروں کی چودہ گردنیں دیوی درگا کے سامنے چبوترے پہ ایک ساتھ گرا دی گئیں۔

میری سواری کے لئے میرے والدین نے جو گاڑی خریدی تھی، جسے آپ اپنی زبان میں "پریم" کہتے ہیں، اس پر جاڑے کے موسم میں شام کے وقت بیٹھا بیٹھا جب میں شکر قند کھاتا تھا تو اپنے والدین کی صرف ایک یاد آتی تھی، یعنی جب میری والدہ کی لاش گھر کے باہر نکالی جا رہی تھی تو میں زمین پہ بیٹھا بھنے ہوئے چنے کھا رہا تھا۔ پتا جی کب مرے، یہ تو معلوم نہیں۔ ماں کا مرنا بھی بھنے ہوئے چنے کھاتے وقت تو معلوم نہیں ہوا تھا لیکن جب میرا چھوٹا بھائی میری گاڑی پہ چڑھنے لگا اور میں نیچے اتر کر زمین پر چلنے لگا تھا تب یہ معلوم ہوا کہ ماتا پتا دونوں مجھے بغیر بتائے ہوئے اس دنیا سے چل بسے تھے۔ غرضیکہ سر منڈے تھے کہ اولے پڑے۔ والدین کی زمینداری پہ دوسرے نے قبضے جما لئے۔ گھر میں جو تھا چور اٹھا لے گئے۔ کایستھ بنک کا سارا روپیہ چونکہ وہاں کے کایستھوں نے ایک ہی دن نکال لیا اس لئے نہ بیچارہ کایستھ بنک رہا اور نہ میرا حصہ۔ تعلیم میری "کریما" سے شروع ہوئی۔ مولوی صاحب، جن کی تعلیم خود یکہ ہانکنے سے شروع ہوئی تھی، جب "مقیماں" مجھے پڑھا رہے تھے اسی وقت بڑے زور کا پلیگ گاؤں میں آیا۔ اس لئے انگریزی پڑھانے کے بہانہ ہم دونوں بھائی پکڑ کر شہر بھیج دیئے گئے۔ ہم لوگوں کے شہر چلے جانے کے بعد مولوی صاحب پھر یکہ ہانکنے لگے اور آج بھی یکہ ہانکتے اور افیون کھاتے ہیں۔

آپ کہیں گے جو زندگی اس طرح شروع ہوئی اس سے زیادہ امید ہی کیا کی جا سکتی ہے۔ لیکن آپ کا ایسا سوچنا غلط ہوگا، اس لئے کہ میری سمجھ میں زندگی کے لئے امید کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ زندگی خود امید ہوتی ہے۔ جب امید نہیں رہ جاتی تو آدمی خودکشی کر لیتا ہے۔ خودکشی کرنے والے کو دنیا پاگل کہتی ہے۔ لیکن میں کوئی پاگل تھوڑے ہی ہو گیا تھا۔ اس لئے چاہے آپ میرا وشواس نہ کریں لیکن پھر بھی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے جینے کا سلسلہ جو اس طرح چل نکلا تھا وہ، میرے والدین کی موت کے باوجود بھی، ویسے ہی بے روک چلتا رہا۔ سمجھ لیجئے بس ایسے ہی جیسے کیلا، بھوا اور بانس کی سنتانیں کیلا بھوا بانس کے بعد بھی چلتی رہتی ہیں۔ بہرحال میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے میری زندگی کا سلسلہ ٹھیک ویسے ہی چلتا رہا جیسے شاید پہلے چلتا۔ اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ پہلے شاید جوتے پہن کر اسکول جاتا تو اب ننگے پیر جاتا تھا۔ کبھی کبھی مٹی کا تیل نہ ہونے سے لالٹین بھی نہ جلتی تھی لیکن میں کوئی راجہ بھوج تھوڑے ہی تھا جو سڑک پہ جا کر میونسپل لیمپ کے نیچے حساب لگاتا۔

پڑھتے رہے، پاس ہوتے رہے، فیل بھی ہوتے رہے۔ پاس ہونے کی خوشی ہوتی، فیل ہونے کا افسوس ہوتا۔ لیکن آج تو کچھ ایسا سوچتا ہوں کہ اگر اور فیل ہوا ہوتا یا ہمیشہ فیل ہوتا رہتا تو آج زندگی کے امتحان میں کم پاس ہونے کا شاید افسوس زیادہ نہ ہوتا۔ بہرحال پڑھتے تھے، لکھتے تھے نہیں بھی پڑھتے لکھتے تھے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کہاوت ہے، "دن بھر بھیک مانگئے۔ تب دیا بھر، نہ مانگئے تب بھی دیا بھر"۔ کچھ اسی قسم کا میرا پڑھنا لکھنا بھی تھا اور تقریباً اسی قسم کی میری زندگی تھی۔ لیکن اصلی زندگی تو وہ تھی جو رات میں چارپائی پہ پڑ جانے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ بستر پہ پڑا ہوں، آنکھیں بند ہیں، لیکن نیند نہیں آتی ہے۔ بہت بڑا میچ ہو رہا ہے، کبھی ہاکی کا ہے کبھی فٹ بال کا۔ میں ہوں کہ گیند لئے آگے

بھاگا جارہا ہوں، تالیاں بج رہی ہیں، ہزاروں لاکھوں تالیاں، مار ادھڑاک سے، گول ہوگیا۔ سیٹی بج گئی۔ کھیل کے میدان کے کنارے کنارے سینکڑوں ٹوپیاں، جوتے، چھاتے اور ڈنڈے اچھلنے لگے۔ کچھ لڑکوں نے دوڑ کر مجھے کندھوں پہ اٹھا لیا۔ دوسری "بلی" ہوتے ہوتے میں سو گیا۔

بہرحال ستاروں سے شرما کر کبھی میں رکا نہیں۔ سورج کو دیکھ کر ڈرا نہیں۔ بادلوں کی گرج سے میں گھبرایا نہیں۔ آسمان کو دیکھ کر میرے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ میں تھا کہ اپنی زندگی کی شاہراہ پہ چلا ہی جاتا تھا۔ میں تھا اور میری زندگی تھی۔ کبھی پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ہزاروں لاکھوں مردوں عورتوں کو اکٹھا کر کے لکچر دیتا تھا۔ کبھی دھیان چند کی طرح ہاکی کھیلتا تھا۔ اور جو آگے بڑھا تو عمر کا یہ بھی تقاضہ تھا جو کہیں کسی سنسان میں اکیلے چپ چاپ بیٹھ کر کسی کے تصور کو پیار کرنے لگا۔ چپکے چپکے خاموش باتیں ہوتیں۔ کبھی شہر سے دور جا کر پارک کے درختوں سے اپنا بھید کہتا، چڑیوں کے گانے سنتا۔ بیٹھے بیٹھے تنکے توڑتا، اور انھیں جوڑتا۔ پھر کسی کے تخیل میں وہاں سے چل دیتا۔ قدم ہمیشہ گھر ہی کی طرف اٹھتے۔ اندھیری سنسان سڑکوں پہ جب ڈر لگتا تو "گایتری منتر" پڑھنے لگتا اور اسی طرح چلتا چلتا گھر چلا آتا۔

پڑھنے کا شوق تو "سیکنڈ ڈویژن" میں دسواں درجہ پاس کرنے پیدا ہوا۔ اور پھر اس "سیکنڈ ڈویژن" سے اتنی محبت پیدا ہوگئی کہ "فرسٹ ڈویژن" کو کبھی بھول کے بھی نہیں سوچا۔ پھر پڑھنا لکھنا کیا ہوگیا کہ سیڑھی کا چڑھنا تھا۔ ایک سیڑھی پہ چڑھ کے دوسری سیڑھی کے لئے قدم آپ سے آپ اٹھ جاتے۔ چنانچہ ان سیڑھیوں کا سلسلہ آج بھی ختم نہ ہوا اور غضب تو یہ ہے کہ آج آپ سے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ دراصل ہوں کس سیڑھی پر۔

غرض بے ڈھنگی زندگی کا سلسلہ جس طرح شروع ہوا تھا اسی بے ڈھنگے طریقے سے چلتا رہا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے وہ سب کچھ ہوا جو دنیا میں ہوتا ہے یعنی شادی ہوئی، اس لئے کہ وہ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ سب ہوا جو شادی ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ بیوی پا کر خوش ہوا۔ بہت خوش ہوا۔ ناخوش بھی ہوا اور بہت ناخوش ہوا۔ اور اگر آپ یہ پوچھیں کہ اب کیسے ہیں تو جواب دوں گا بس یوں ہی ہوں، یعنی نہ خوش ہوں نہ ناخوش ہوں۔ زیادہ کچھ بھی نہیں سکتا اس لئے کہ شاید بیوی سنتی ہوں۔ لیکن اس میں بیوی کا بھی کیا قصور؟ شادی سے خوش رہنے والے کو میں بالکل ایماندار آدمی بھی تو ماننے کو تیار نہیں۔ اور اگر آدمی ایماندار ہے تو پھر اس میں شے لطیف کی کمی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح میں اپنی شیروانی یا قلم سے ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہ سکتا ہوں اسی طرح اپنی بیوی سے بھی ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہ سکتا۔ یہی نہیں بلکہ میری قسمت تو یہ بھی ہے کہ میں خود اپنے سے ہمیشہ خوش یا ناخوش نہیں رہتا یعنی کبھی اپنی شکل آئینہ میں دیکھ کر اتنی تسکین ہوتی ہے کہ بس مسکرا دینا پڑتا ہے۔ کبھی اسی آئینہ میں اپنے کو دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ ناک کو آخر کیوں نہیں ہونا تھا؟ ذرا نہ ادھر نہ اُدھر۔ آپ شاید اس کی وجہ معدہ کی کیفیت بتائیں۔ یہ آپ کی سمجھ کی بات ہے اس لئے میں اس میں ترمیم کرنے والا کون ہوا۔ خیر میں کہہ رہا تھا کہ شادی ہوئی، شادی کے بعد نوکری ملی، اس لئے کہ اس وقت ملتی تھی۔ شادی کے بعد چونکہ بچے ہوتے ہیں اس لئے بچے بھی ہوئے۔ لیکن —— لیکن کا یہ مطلب نہیں کہ بچے بڑے ہوئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر بچے اچھے بھی ہوتے تو کیا کر لیتے۔ آخر میں نے ہی کیا کر لیا جو یہ کچھ کر لیتے۔ پھر میں ان کا ہوں ہی کون جو انھیں اس طرح نا یوں تولوں۔ یہ پڑھیں گے لکھیں گے یا نہیں پڑھیں لکھیں گے۔ بہرحال کسی نہ کسی حالت میں جئیں گے اور جئیں گے بھی اپنے واسطے جس طرح میں اپنے لئے جی رہا ہوں۔ دوسروں کے لئے یہ جئیں بھی کیوں؟ کیا یہ کچھ کر بھی سکیں گے؟ لیکن اگر کر بھی لیں گے تو کیا کر لیں گے؟ جہاں تک کرنے کا سوال ہے، جیسے کچھ میں نے کر لیا اور کچھ یہ کر لیں گے۔ اگر گھر کو آگ لگ نہ گئی گھر کے چراغ سے تو بڑی بات ہوگی۔

خیر چھوڑئیے اس بے مطلب کی بکواس کو آئیے میں حال ہی کی اپنی ایک آپ بیتی سناؤں۔

صبح کا وقت تھا۔ اخبار پڑھ چکنے کے بعد چائے پی۔ پھر سوچا کچھ کام کر لوں۔ کچھ کیا بھی لیکن زیادہ جی نہیں لگا۔ اس لئے ارادہ کیا کہیں گھوم آؤں۔ ٹہلتا ٹہلتا اپنے دوست مستری صاحب کے وہاں پہنچ گیا۔ چونکہ ان دنوں بیوی ان کی میکے گئی ہوئی تھیں اس لئے بے دھڑک اندر چلا گیا۔ آنگن میں ان کا نوکر ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مستری صاحب بھنڈارے میں ہیں۔ سن کر کچھ تعجب ہوا لیکن چونکہ اپنے دوست کی زندگی سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے سوچا چلوں دیکھوں حضرت باورچی خانے میں آخر بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ اندر گیا تو دیکھا مستری صاحب غلّے کی بوریوں اور مٹکوں کے درمیان ایک کونے میں بیٹھے کچھ مصروف سے ہیں۔ دیکھنے سے ایسے لگے جیسے آٹے کی کسی بوری میں گھسے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بدن پر سے آٹا جھاڑنے لگے۔ پوچھا "کہو بھائی، خیریت تو ہے؟" بولے "کچھ نہیں، اتوار کا دن تھا، سوچا دیکھوں غلہ وغیرہ کیا خرچ ہوگیا ہے۔" ایک بوری پہ سیر ترازو رکھے تھے۔ انھیں نیچے رکھ کر اسی بوری پہ میں بیٹھ گیا۔ چونکہ نگاہوں کی چکا چوندھ اب ختم ہو چکی تھی اس لئے اندھیری کوٹھری کی چیزیں صاف صاف نظر آنے لگیں۔ ان کے ہاتھ میں انچ والی بٹری دیکھ کر پوچھا۔ "آخر اس سے کیا کر رہے ہو؟" "ڈالڈا کے دس پونڈ والے ٹن میں بٹری ڈالتے ہوئے بولے۔ "دیکھ رہا ہوں کڑوا تیل کتنا رہ گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کڑوا تیل انچ والی بٹری

سے ناپنے لگے۔ اور میری نظر کوٹھری کی دیواروں پر لٹکی ہوئی چیزوں کی طرف گئی۔ چاروں طرف صرف تھیلیاں لٹک رہی تھیں۔ کسی تھیلی پہ ہلدی، کسی پہ مرچہ، کسی پہ نمک، تو کسی پہ دھنیا، غرض کہ ہر تھیلی پہ کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔ دریافت کرنے پہ معلوم ہوا کہ جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے تھیلی میں سے وہ چیز نکال لی جاتی ہے اور اس کی قیمت جوڑ کر اسی وقت تھیلی میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس طرح جب تھیلی کی چیز ختم ہو جاتی ہے اس وقت تک اس چیز کی پوری قیمت اس تھیلی میں اکٹھا ہو جاتی ہے۔ پھر اسی قیمت سے وہ چیز اسی تعداد میں بلا کسی جھنجھٹ کے بازار سے منگوالی جاتی ہے۔

اس انتظام اور اہتمام کو دیکھ کر میں تو بھونچکا رہ گیا اور اتنا بھونچکا ہوا کہ کچھ دیر بات چیت کر کے پھر الٹے پاؤں گھر ہی واپس لوٹا۔ دن اس طرح خراب ہوا تھا کہ اب کچھ نہ کرتے اور نہ سوچتے بنے۔ بار بار یہی خیال آئے آخر اس آدمی نے بھی زندگی کو کس حوصلہ اور اطمینان سے ناپ لیا ہے۔ گز، فٹ، انچ اور روپیہ، آنہ، پائی سے۔ چنانچہ سارا دن زندگی اور اس کی کامیابی اور ناکامیابی ہی کو سوچتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے کہ آخر یہ دنیا بھی کیا تماشا ہے، اس میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے، کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے۔

دن تھا دھن تیرس کا، یعنی دیوالی سے پہلے شام جس دن ہندو برتن خریدتے ہیں اس خیال سے کہ اگر اس دن برتن خرید لیں گے تو بقیہ سال گھر میں ایسی خوشحالی رہے گی کہ تین سو چونسٹھ دن برتن ہی خریدتے بیتیں گے۔ غرضکہ لکشمی اس طرح گھر میں آجائیں گی تو سال بھر گھر سے باہر نہیں جا سکیں گی۔ حالانکہ میں نے کبھی اس طرح اپنے گھر میں لکشمی کا داخلہ نہیں کرایا تھا لیکن مستری صاحب کی زندگی کو تمام دن سوچتے سوچتے ایسا اثر پڑا کہ شام تک بازار جانے کے لئے میں بھی تیار ہو گیا۔ جب بیوی سے برتن خریدنے کے لئے روپیہ مانگا تو انھیں بھی تعجب ہوا۔

لیکن باہر نکل ہی رہا تھا کہ منّے صاحب باہر کے دروازے سے کچھ گنگناتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ میں نے سوچا لکشمی کو لانے چلے تھے ہاتھ یہ لگے۔ اندر آ کر گاندھی ٹوپی سر سے اتار کر کرسی پر انھوں نے ایک طرف پھینکی، شیروانی اتار کر دوسری طرف۔ پھر میرے سامنے کھڑے ہو کر جیسے مجھے چڑھانے کے لئے زور زور سے گانے لگے ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

چونکہ بو کافی آ رہی تھی اس لئے میں نے سوچا، یار آج دوپہر ہی سے ایک آدھ پیگ چڑھائے ہوئے ہے۔ نوکر کو بلا کر پھر انھوں نے پانچ روپے دیئے اور تاکید کی۔ "ادھا لانا"۔ چونکہ دھن تیرس کو برتن خریدنے کا حوصلہ اس طرح کرکرا ہوا تھا اس لئے میں بھی بیٹھ گیا لیکن اس درمیان میں میری دن بھر کی الجھن ایک مستقل ذہنی ترشی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس لئے میں نے کچھ جھنجھلا کر پوچھا "کہو آج دن دھاڑے کس کی جیب کاٹ لائے کیا؟" منّے صاحب بولے:

"دوست تم نے بھی زندگی کو پہچانا نہیں"۔ پھر گانے لگے۔ ؎

زندگی مذاق ہے — مذاق کو نبھائے جا

میں نے کہا۔ وہ تو ہے۔ لیکن میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تمہاری زندگی ہے کیا جو تم اس طرح لوگوں کے پیسے مارتے پھرتے ہو۔ کل آپ نے مستری بیچارے کا نام بتا کر اس کے دوست سے دس روپیہ مار لئے۔ مجھے کئی بار مصیبت میں ڈال ہی چکے ہو۔ آخر کب تک اس طرح جیئو گے؟ کب تک تم سوچتے ہو، تمہاری اس 'ادبی' زندگی کا بوجھ تمہارے دوست اٹھائے رہیں؟"۔ منّے صاحب بولے: "یار بیٹھنے بھی دو گے یا لکچر ہی جھاڑتے جاؤ گے۔ اگر میرا آنا اچھا نہ لگا ہو تو کہو میں چلا ہی جاؤں؟"۔

یہ کہہ کر وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہل ٹہل کر گانے لگا۔ "کوئی چلا رہا ہے جیئے جا رہا ہوں"۔ اس طرح کچھ دیر گاتا رہا۔ میں بھی چپ رہا اور جب منّے ٹھنڈا پڑا تو میں نے کہا، "بھائی منّے، اگر کچھ دیر اپنی شاعری بند کر کے سنو تو کہوں؟" ایک دم جیسے اچھل پڑا۔ "کہو بھائی ضرور کہو، میں تو چاہتا ہوں کہ تم کچھ کہو۔ لیکن کہنے سے پہلے میری سن لو۔ تم شاید یہی کہو گے نہ کہ میں بھی تمہاری طرح شادی کیوں نہیں کر لیتا اور اپنا گھر کیوں نہیں بسا لیتا۔ پھر میری بیوی مجھے صبح شام ٹماٹر کھانے کو دے اور میں اس وجہ سے ٹماٹر کھاؤں کہ ٹماٹر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمہاری طرح دوسروں کو بے معنی لکچر پلاؤں، بے مطلب کتابیں لکھوں، پیسہ کماؤں اور اس طرح تمہاری رائے میں زندگی کامیاب بناؤں۔ لیکن یار میں اپنے کو اور دوسروں کو اس طرح دھوکا دے کر جینا نہیں چاہتا۔ میں صرف جینا چاہتا ہوں۔ زندگی کو کامیاب بنانا نہیں چاہتا۔ زندگی مجھے بالکل ملیا میٹ ملی تھی اور اسے میں ملیا میٹ ہی چھوڑنا چاہتا ہوں۔ دوست، زندگی کامیاب بنانا کا نام نہیں ہوتی۔ زندگی صرف زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کو گز فٹ انچ سے نہیں ناپا جاتا۔ زندگی تھرمامیٹر ہے اسے ایک سو دو ڈگری بخار ناپ کر اتنا ہی افسوس یا خوشی ہوتی ہے جتنا ایک سو سات ڈگری بخار ناپ کر ہوتا ہے۔ یار، میری بات یاد رکھو۔ اگر تم نے بھول کر بھی زندگی کو کسی پیمانے سے ناپا تو زندگی کے ہاتھوں بری مات کھاؤ گے"۔

اس طرح معلوم نہیں منّے کب تک بکتا رہا اور میں سنتا یا نہیں سنتا رہا۔

اتنا یاد ہے کہ نوکر آ دھمکا۔ منّے آ رہے کر چلا گیا۔ میں نے اسے جانے سے روکا بھی نہیں اس طرح معلوم نہیں کب تک میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ باہر سے کسی نے پکارا۔ میں چونک پڑا۔ جب تک اس آدمی کو میں اندر آنے کو کہتا وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ گیروا بستہ پہنے داڑھی رکھے۔ یہ جھولی مالا لٹکائے پنجابی آدمی کرسی پر میرے بغل میں بیٹھ گیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا بابا جی ہاتھ دیکھتے ہیں۔ میرے دوست مسٹر ... صاحب نے انہیں میرے یہاں بھیجا تھا۔ چنانچہ بغیر زیادہ سوچے سمجھے میں نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ بابا جی میری ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں لے کر غور سے کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ بچہ یہ لائف لائن ہے۔ میں نے کہا "جی"۔ اور یہ ہیڈ کی لائن ہے۔ میں نے کہا "جی"۔ اور یہ ہارٹ لائن ہے"۔ میں نے کہا "جی"۔ "تو بیٹا تیری سب لائنیں اچھی ہیں۔ تجھ کو بڑی اچھی نوکری ملے گی۔ شادی بھی اچھی ہو گی۔ بچے جو ہوں گے بڑے بھاگوان ہوں گے۔ دولت بہت آئے گی اور خرچ بھی ہو گی۔ اور تو ایک مکان بھی بنوائے گا۔ تیرے لڑکوں کی شادیاں اچھی ہوں گی"۔ میں نے پوچھا "میرے مرنے کا خطرہ تو نہیں ہے"۔ بابا جی چونکے، لیکن پھر اپنے کو سنبھال کر بولے "نہیں بچہ، ایسی کوئی بات نہیں"۔ اور پھر وہ معلوم نہیں کیا کیا بکتے رہے۔ میں سوچ رہا تھا یہی تو زندگی ہے۔ اسی کو زندگی کہتے بھی ہیں۔ بابا جی بھی اپنی زندگی کامیاب بنا رہے تھے۔ میں نے اندر سے ایک روپیہ منگایا اور اسے بابا جی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس طرح میری ہتھیلی کی جان چھوٹی۔ بابا جی اٹھ کر چلے گئے۔ میں منّے کی باتیں سوچتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔ زندگی جو ہم سے لیتی ہے وہ دیتی بھی ہے۔ لیکن زندگی کی شراب ہمیشہ ایک ہی پیمانے سے نہیں بکتی۔ پیمانے اکثر بدلتے رہتے ہیں۔ اکثر شراب کی لذت بھی بدلتی رہتی ہے کبھی شراب بھی بدل جاتی ہے اور کبھی ہم خود ہی بدلے رہتے ہیں لیکن اگر زندگی کے ہاتھوں مات نہیں کھانا چاہتے ہو تو زندگی جو کچھ تم سے لیتی ہے اسے کھونا مت سمجھو اور زندگی سے جو تمہیں ملتا ہے اسے پانا مت سمجھو۔ اگر آپ نے بھول کر بھی ایسا کیا تو آپ زندگی کے ہاتھوں بڑے بکیں گے۔ یعنی ٹماٹر ضرور کھاؤ لیکن اس لئے نہیں کہ اس سے تمہاری زندگی بڑھ جائے گی۔ ٹماٹر اس لئے کھاؤ کہ اس کا رنگ تمہیں پسند ہے لیکن اگر تم ٹماٹر اس کے رنگ کی وجہ سے کھاؤ گے تو تمہاری بیوی ٹماٹر صبح شام کھانے کو نہیں لائے گی۔

شاید زندگی مجھے پرکھ رہی ہے اور آج میں روئی دار بند گلے کا کوٹ اور روئی دار تنگ مہری کا پاجامہ اور روئی دار کنٹوپ کی دونوں گھنڈیاں کو گلے کے نیچے کھینچ کر باندھتا ہوں تب بھی وہ دھڑاکا آج بار بار سنائی پڑتا ہے۔ اس دھڑاکے سے ڈر لگتا ہے، میں سہم سہم جاتا ہوں۔

عسیر اور اس کا فرمانروا ـــــ بقیہ صفحہ ۲۱

کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں سید محمد بن علی نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا جس کی بنا پر انگریز عسیر کی بندرگاہوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہو گئے اور سید محمد کو سامان حرب اور مال سے بھی امداد دینے لگے۔ معاہدہ کی تکمیل ہوتے ہی سید محمد بن علی کے چچا زاد بھائی سید مصطفےٰ الادریسی نے ترکوں پر حملہ کر کے ان کا رہا سہا اقتدار بھی ختم کر دیا۔ مشرق میں صعدہ اور شمال میں نعدمہ اور قنفذہ تک اپنی فوجیں بڑھا لے گئے اس طرح عسیر میں بلا شرکت غیرے ادریسیوں کی حکومت مسلم ہو گئی۔

گذشتہ جنگ عظیم میں سید محمد بن علی نے اتحادیوں کو بیش قیمت امداد دی۔ جنگ عظیم سے قبل جنوب میں صرف وادی العین تک ادریسیوں کی حکومت تھی لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد نہ صرف حدیدہ بلکہ لحیہ، صلیف، باجل اور عیال بھی ان کی قلمرو میں شامل ہو گئے۔

۱۹۲۳ء میں بعمر ۴۹ سال سید محمد بن علی کا انتقال ہو گیا اور ان کے صاحبزادے سید علی بن محمد الادریسی ان کے جانشین ہوئے مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے چچا سید حسن الادریسی کے حق میں تخت سلطنت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

حکومت عسیر کی فوج کا ایک مختصر سا دستہ محمد طاہر رضوان کی سرکردگی میں باجل رہتا ہے۔ اسی مختصر فوجی دستہ کو عسیر کی باقاعدہ فوج کا نام دیا جا سکتا ہے، ورنہ عموماً جنگ کے دوران میں سرداران قبائل کی وساطت سے تیس چالیس ہزار مجاہد حکومت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں جن میں کا ہر فرد اپنے لئے سواری، ہتھیار اور کھانے پینے کا سامان فراہم کرنے کا ذمہ دار خود ہوتا ہے، اگر اس سامان میں کوئی کمی پڑے تو اس کو حکومت پورا کر دیتی ہے۔ لڑائی کے زمانہ میں ان سپاہیوں کو حکومت کی طرف سے تنخواہ بھی دی جاتی ہے اور مال غنیمت سے حصہ بھی۔ حکومت عسیر کا رویہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ اور تعلقات خوشگوار ہیں۔

شاید یہ وہی دھڑاکا ہے جو میری پیدائش کے وقت بندوق داغنے سے ہوا تھا۔ خوشی کے موقع پر بندوق کا جھوٹا 'فائر' شاید اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ اس دھڑاکے کو سن کر میں زندگی میں کسی اور آواز سے نہیں ڈروں گا۔ لیکن آج اگر ڈر لگتا ہے تو اسی دھڑاکے سے، یعنی اسی جھوٹے 'فائر' سے جو شاید میری زندگی ہے۔

غزل —— آفاق دہلوی

جس دل میں آرزو بھی نہ تھی بے مدعا ہوا ٭ تو نے کرم کیا بھی تو خونِ وفا ہوا
دل کا جو مدعا تھا نہ پھر بھی ادا ہوا ٭ فرطِ الم سے آنکھ جو رو دی تو کیا ہوا
منت کشِ سفینہ و ساحل نہیں ہوں میں ٭ شکرِ خدا مرا نہ کوئی ناخدا ہوا
کافی یہی ہے برق و نشیمن کا یادگار ٭ اک مشتِ پر پڑا ہے چمن میں جلا ہوا
ہے عقل تو جنوں ہے خدا واسطے کا بیر ٭ جو دل پہ چھا گیا وہ مرا رہنما ہوا
اٹھا جو تھا عطا کیلئے ہاتھ رک گیا ٭ شامل خطا کیسا تھا جو عذرِ خطا ہوا
موسیٰ کے بعد کیا کوئی آتش بجاں نہ تھا ٭ اب تک چراغِ طور پڑا ہے بجھا ہوا
بزمِ تعلقات ادھر ہے ادھر ہوئی ٭ میں غیر سے مگر نہ کبھی آشنا ہوا

آفاق مشکلات میں دیکھی خدا کی شان
گرداب خود ہی میرے لئے ناخدا ہوا

[illegible]

غزل —— مہندر سنگھ کوثر

تباہی خیز ہر موجِ سرابِ زندگانی ہے ٭ ڈبوئے گا کسی آدمی کو یہ پانی ہے
خموشی مقتضائے دل کی محوِ ترجمانی ہے ٭ زبانِ شوق کیا ہے اک بیانِ بے زبانی ہے
ستم ہے قہر ہے آزار ہے ایذا رسانی ہے ٭ بڑی نامہربانی ہے یہ کیا کم مہربانی ہے
بساطِ دہر کو میں اور ہی کچھ سمجھتا ہوں ٭ مری نظروں میں کوئی شے نہ باقی ہے نہ فانی ہے
جو جنتی ہے تو فرصت کے مقرر خاص لمحے ہوں ٭ نہیں کچھ داستاں دنیا کی یہ میری کہانی ہے
عجب رنگینیاں فطرت نے دی ہیں بزمِ ساقی کو ٭ شفق آلودہ ساغر ہے صراحی آسمانی ہے
فلک کے جور قسمت کے ستم گردش زمانے کی ٭ گراں اک منتِ خاکِ انساں آتی زندگانی ہے
یہ حالت کیا ہے دل کی رخ کیا پلٹا ہے آنکھوں نے ٭ نہ شدت درد کی ہے اب نہ اشکوں کی روانی ہے

بنا دیتا ہے کوثر تو چمن بزمِ معانی کو
قیامت کی ترے اشعار میں رنگیں بیانی ہے

[illegible]

ہندوستان کے کمانڈر انچیف نیپال میں

ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر کلاڈ آکنلیک اکتوبر میں پہلی دفعہ نیپال تشریف لے گئے۔ نیپال میں آپکا بڑا شاندار استقبال ہوا۔ راجہ صاحب کی طرف سے آپکو نیپال کا سب سے بڑا فوجی تمغہ عطا ہوا اور نیپالی فوج کا آپکو آنریری جنرل بنایا گیا۔



نیپال کے کمانڈر انچیف جنرل سر پدم شمشیر جنگ بہادر رانا شاہی محل میں تشریف لا رہے ہیں۔

نیپال کے وزیراعظم کے صاحبزادے جنرل سر بہادر شمشیر جنگ بہادر رانا شاہی تقریر جنرل آکنلیک کو پڑھ کر سنا رہے ہیں۔



،کی زمیں دوز ریلیں



میں دوز ریلوں کا جال۔ تصویر کے ابیچ امیں گول کمرہ ٹکٹ گھر ہے۔

دوز ریلوں کا جال تقریباً دوسو بیس میل تک
ا ہے۔ عام طور پر ان ریلوں میں لوگ اس
کرتے ہیں جب انکو لندن میں ایک جگہ
ی جگہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر جانا ہوتا
ریلوں کا سلسلہ نو اسّی سال ہوئے تب شروع
لیکن زیادہ تر ریلیں ۱۹۰۰ء کے بعد کی بنی
ں۔ کہیں تو انکی بیچائی زمیں کی سطح سے
ں فٹ ہے اور کہیں ڈھائی سو فٹ۔ شروع شروع
یلیں زمین کھودکر بنائی گئی تھیں اور پٹریاں
، جانے کے بعد انکی چھتیں پاٹ دی گئی تھیں۔
سرنگیں بنا کر بہت زیادہ گہرائیوں میں بھی یہ
لادی گئیں۔ سرنگوں کی تعمیر انگریز انجینئر
بٹ ہیڈ کا کارنامہ ہے۔ آپکی اس صنائی کا اثر
میں سرنگوں کی کھدائی کے کام پر پڑا۔

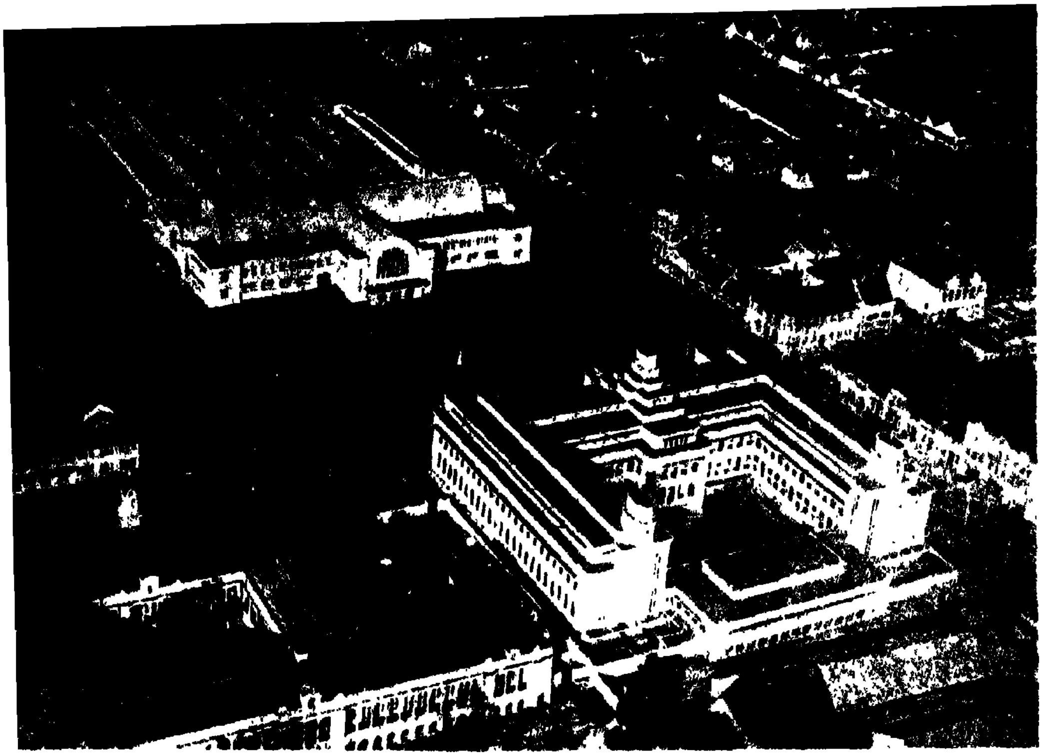
ان ریلوں سے سفر کو زیادہ سے زیادہ آسان اور آرام ده بنانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ٹکٹ مشینوں کے ذریعہ لئے اور بدلے جاتے ہیں۔ ریلوں کے کواڑ بجلی کا بٹن دبا دینے سے بند ہوتے اور کھل جاتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر بجلی کی علامت کے ذریعہ بتایا جاتا ہے کہ گاڑی کہاں جانے والی ہے اور کن کن اسٹیشنوں پر ٹھیریگی۔ سرنگوں کے اندر کی ہوا کو صاف اور تازہ رکھا جاتا ہے۔ یہ ریلیں بجلی کے ذریعہ چلتی ہیں۔

تمام زمیں دوز ریلیں علیحدہ علیحدہ بنی تھیں لیکن اب سب کی سب ایک ہی انجمن کے زیر اہتمام آگئی ہیں جسکا نام ہے "لندن پسنجر ٹرانسپورٹ بورڈ" اسکا کام بہت باقاعدہ اور منظم ہے۔



۔ڈگ ن اسٹیشن۔ گاڑی چلنے ہی والی ہے۔

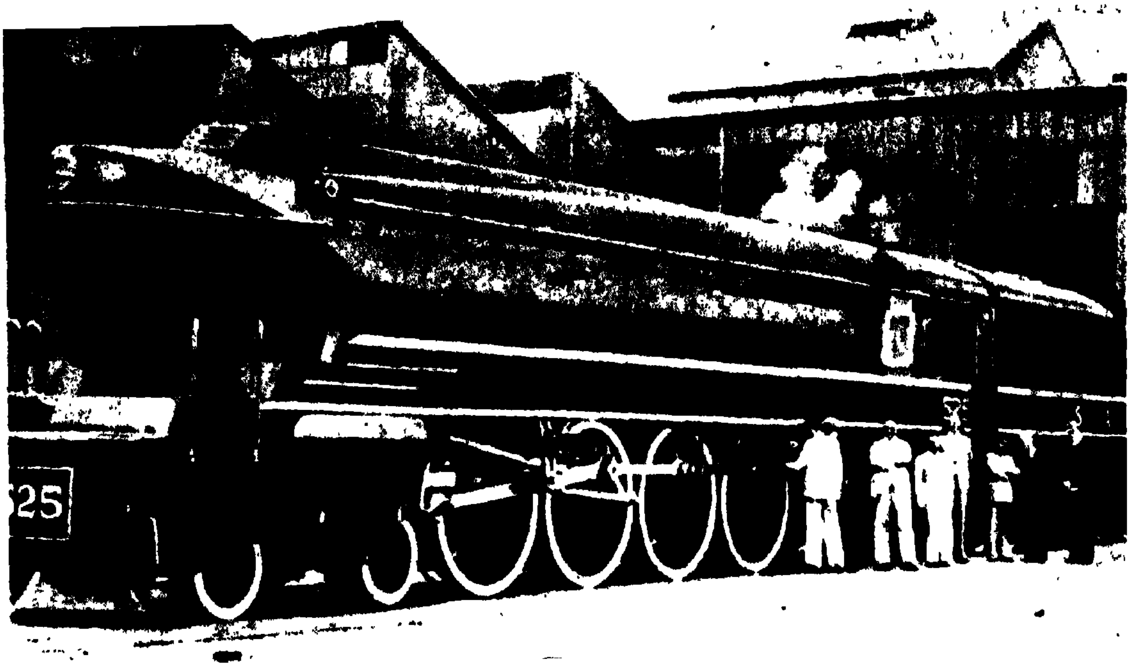
ڈچ مشرقی جزائر الہند



بٹاویہ میں سرکاری دفاتر داہنی طرف جاوا بینک ہے اور بائیں جانب "نیدرلینڈس ٹریڈنگ سوسائٹی" کی ع



سورابایا جاوا کا تجارتی مرکز ہے۔ اس شہر کی عمارتیں جدید ترین وضع کی ہیں۔



ے ممبر ایک نئے انجن کو دیکھ رہے ہیں جسکا وزن ایک سو ستانوے ٹن ہے۔ یہ انجن جنوبی آسٹریلیا کے ایک سرکاری کارخانے میں بنا ہے۔

ہندوستانی صنعتی مشن آسٹریلیا میں

انچاس دن کا ہوائی دورہ

نان کے چھ بڑے ماہرین صنعت وحرفت کچھ عرصہ ہوا
کاری حیثیت سے آسٹریلیا گئے تھے تاکہ ہندوستان اور
یا کے درمیان تجارتی امکانات کا جائزہ لیں۔ اس وفد نے
ا میں انچاس دن تک آسٹریلیا کے شاہی ہوائی بیڑہ
ز میں سفر کیا اور وہاں کی زراعت و حرفت کے اکثر
ں میں جاکر حالات کا مطالعہ کیا۔ یہ لوگ آسٹریلیا کے
ظم' کابینہ کے ممبروں اور ملک کے گورنروں سے بھی ملے۔
مل وحرکت میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔

ان لوگوں نے ہوائی جہاز بنانے اور کپڑا بننے کے کارخانوں' سونے کی کانوں' لوہے فولاد اور پانی کے جہازوں کے کارخانوں کا خاص طور پر معائنہ کیا۔ نئی وضع کے فارموں پر بھی گئے اور ان سے خوب متاثر ہوئے۔

وفد کے اراکین یہ تھے:- سر دتار سنگھ صدر وفد (پنجاب) مسٹر نیول واڈیا (بمبئی) مسٹر رام رتن گپتا (کانپور) مسٹر شانتی پرشاد جین (ڈالمیانگر) مسٹر عبدالواحد آدم جی (کلکتہ) اور مسٹر بی وشواناتھ (میسور)

ممبران مشن وکٹوریہ کے ایک تاکستان (انگور کی بیلوں کا چمن) کے انگور دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ (بائیں جانب) مشن کے صدر سردتار سنگھ ملدورا میں لیمو کے درختوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔







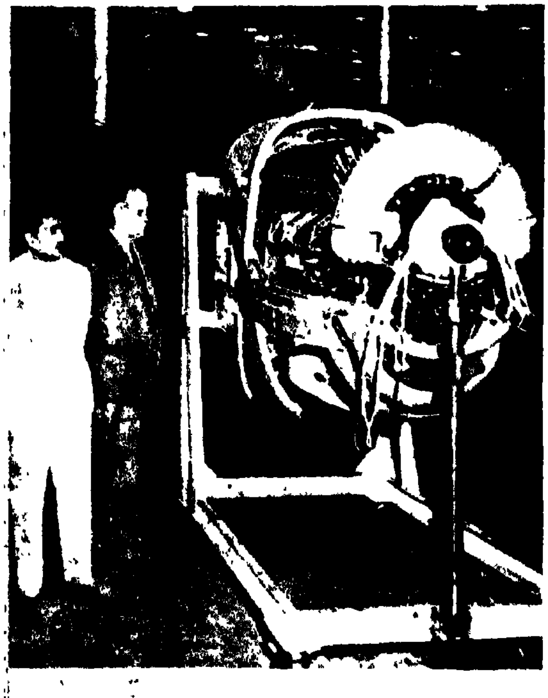
ممبران مشن مغربی آسٹریلیا کے ایک کارخانہ میں بنے ہوئے کل پرزوں کو بغور دیکھ رہے ہیں۔ بائیں جانب مسٹر عبدالواحد آدمجی ہیں اور بیچ میں مسٹر شانتی پرشاد جین ہیں۔



ہوائی جہاز کے دھکیلو پنکھے کے پاس نول واڈیا کھڑے ہیں۔ آپ خود ایک سند یافتہ طیارہ باز ہیں۔



آپ صاحبان کیلونگ میں بنا ہوا اونی کپڑا ملاحظہ کررہے ہیں بائیں سے داہنے کو ۔ مسٹر آر۔ آر۔ سکسینہ' مسٹر بی۔ وشوناتھ' [illegible]



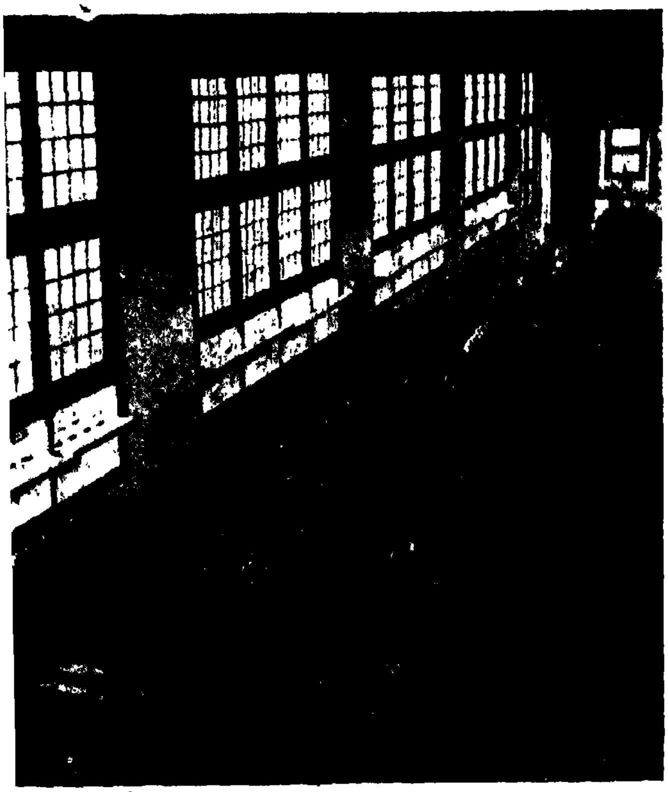
ممبران مشن ویراوے ہوائی جہاز کا انجن دیکھ رہے ہیں۔ یہ پہلا ہوائی جہاز ہے جو پورا کا پورا [illegible]

چین میں ریڈیو کا کارخانہ



جوان چینی کاریگر کارخانوں میں ہتھیار ڈھالتے ہیں جنکی انکے سپاہیوں کو بڑی ضرورت ہے ۔

کوہاین میں ریڈیو بنانے کا سرکاری کارخانہ۔اس میں کام سیکھنے والے چینی کاریگر دو سال تک ٹریننگ حاصل کرتے ہیں ۔ داخلہ کیلئے شرط ہے کہ طلباء کی عمر ۱۴ اور ۱۸ سال کے درمیان ہو۔





جزائر سیلی



کارنوال کے جنوب مغرب میں کوئی تیس میل کے فاصلہ پر بحر اٹلانٹک میں تقریباً دو سو جزیروں کا ایک گچھا ہے۔ ان میں سے اکثر جزیرے کیا ہیں جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی چٹانیں ہیں۔ صرف پانچ جزیرون میں انسانی آبادی پائی جاتی ہے۔ ان میں رنگ برنگ کے سدا بہار پھولوں کی بڑی بہتات ہے اور یہاں صرف پھولوں ہی کی تجارت ہوتی ہے۔ ان جزیروں کے پھول صرف انگلستان ہی نہیں بلکہ شمالی یورپ میں بھی بڑی کثرت سے پہونچتے ہیں۔

ان جزیروں میں اگنے والے، یہ پھول باہر بھیجے جانے کیلئے صندوقچوں میں بند کئے جارہے ہیں

جزائر سیلی میں سب سے بڑا جزیرہ 'سینٹ مری' ہے۔ یہ اس جزیرہ پر ایک طائرانہ نظر ہے۔





پھولوں کی سرزمین جزائر سیلی

برطانیہ کے ارد گرد کے نہایت دلکش جزیروں میں جزائر سیلی بھی ہیں۔ یہ کارنوال کے ساحل سے تیس میل کے فاصلہ پر بحر اٹلانٹک میں واقع ہیں۔ یہاں کی آب وہوا کچھ منطقۂ حارہ کی سی ہے۔ سدا بہار پھولوں اور نرالے بدیسی درختوں اور پودوں کی وجہ سے یہ جزیرے فردوس معلوم ہوتے ہیں۔ "اٹلانٹک گلف اسٹریم" کی وجہ سے باقی برطانیہ کے مقابلہ میں ان جزیروں کو دھوپ کا زیادہ فائدہ ہے۔ یہاں بہار کے ابتدائی زمانہ اور سردیوں میں بے شمار رنگ برنگ پھول کھلتے ہیں۔ زمین کا چپہ چپہ زرد اور مقامی سفید نرگس کے پھولوں سے ڈھکا رہتا ہے اور سمندر اور آسمان کے گہرے نیلے رنگ کے تضاد سے بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔

جزائر سیلی میں تقریباً دو سو جزیرے شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر عجیب وغریب شکلوں کی چٹانیں ہیں جن پر سمندری پھولوں والی گھاس اگی رہتی ہے اور یہاں دریائی بچھڑے اور جنگلی پرندے آتے رہتے ہیں۔ ان جزیروں میں سے آجکل صرف پانچ آباد ہیں۔ سب سے بڑا جزیرہ سینٹ میری ہے۔ یہ بھی تقریباً تین میل لمبا اور ڈیڑھ میل چوڑا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ جزیرے لیونیس کی غرقاب شدہ زمین کے باقی ماندہ حصے ہیں جو کسی زمانہ میں کارنوال کی موجودہ حدود سے بہت آگے تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ دسویں صدی میں کچھ سینٹ بینی ڈکٹ کے پیرو راہب ٹریسکو میں جو دوسرا بڑا جزیرہ ہے، آکر آباد ہو گئے اور ایک خانقاہ بنوائی۔ جب سولھویں صدی میں خانقاہوں کا خاتمہ ہو گیا تو یہ سارے جزیرے بادشاہ کی ملکیت ہو گئے اور انگریز بادشاہوں نے انھیں مختلف خاندانوں کو پٹہ پر دے دیا۔ یہ جزیرے باغبانی کے لئے بھی مشہور ہیں۔ یہاں کے ایک ہزار آٹھ سو باشندوں میں سے اکثر دسمبر اور اپریل کے درمیانی زمانہ میں پہاڑی ڈھلان سے ساحل تک پودوں کی دیکھ بھال کرتے اور ہر ہفتہ [illegible] لاکھ پھول توڑتے ہیں۔

نرگس کی فصل میں جہازوں کے ذریعہ ہفتہ میں کئی کئی مرتبہ بندرگاہ سینٹ میری سے ٹنوں تروتازہ پھول لائے جاتے ہیں۔ یہاں پنزانس کے مقام پر یہ پھولوں کی پیٹیاں ریل گاڑیوں میں جو "فلاور اسپیشل" کہلاتی ہیں لاد دیئے جاتے ہیں۔ یہ گاڑیاں انھیں جلد سے جلد مختلف دور دراز شہروں کے بازاروں میں پہنچا دیتی ہیں۔ اس صنعت کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ سیلی کی آب وہوا شہروں کے لئے نہ صرف انگلستان بلکہ شمالی یورپ کے اضلاع کے مقابلہ میں جلدی پھول پیدا کرنے کے لئے موافق پڑتی ہے۔ کھیتوں کے قریب لمبے لمبے سائبانوں میں مالیوں کی بہو بیٹیاں گلدستے بنا کر پیٹیوں میں بند کرتی ہیں۔ یہ گھنٹہ بھر میں ہزاروں پھولوں کے گلدستے بنا ڈالتی ہیں۔ اس کے باوجود اتفاق ہی سے کبھی کسی پھول کو نقصان پہنچنے پاتا ہے۔ اس کام کے لئے رنگ کے عمدہ ذوق کی ضرورت ہے کیونکہ ایک ہی قسم کے پھولوں کے رنگ میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے۔ اس لئے جو پھول بالکل دوسروں جیسا نہیں ہوتا یا جس کے جلد مرجھا نے کی امید ہوتی ہے اسے نکال دینا پڑتا ہے۔ جزائر سیلی کے رہنے والوں کو صرف پھولوں ہی نے دنیا کی ایک نہایت خوشحال اور صابر قوم بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ صنعت ستر سال سے زیادہ قدیم نہیں ہے اور اس کی ابتدا بھی نہایت دلچسپ طریقہ پر ہوئی۔ [illegible] تک کسی کو پھول اگانے کا خیال نہیں تھا۔ جزیرہ ٹریسکو کے حاکم [illegible] نے اپنے جزیرہ کے کچھ پھول لندن کے بازار میں بھیجے۔ یہ ایک پرانے ٹوپ کی پیٹی میں رکھ کر بھیجے گئے تھے۔ بہار کے پھولوں کو سردیوں کے وسط میں دیکھ کر گاہک حیران رہ گئے اور ان پھولوں کی اتنی قیمت ملی کہ اور زیادہ پھول بھیجنے کے لئے درخواست کی گئی۔ اسی [illegible] سے جزائر پر جن پر کوئی دھیان بھی نہیں دیتا تھا وہاں نئے پودے اگائے گئے اور لوگ سنجیدگی کے ساتھ اس صنعت میں لگ گئے۔ اس وقت سے اب تک اس کام میں کبھی نقصان نہیں ہوا۔

جزیرہ سینٹ میری میں پھولوں کے بڑے بڑے چمن ہونے کے ساتھ ہی ساتھ عجیب وغریب ٹیڑھا میڑھا ساحل بھی ہے جس میں بحر اٹلانٹک میں نکلی ہوئی خوبصورت زمینوں کے درمیان سفید ریت کی بہت سی کھاڑیاں ہیں۔ مغربی ساحل پر "ہیو ٹاؤن" کو جزائر سیلی کا صدر مقام سمجھنا چاہئے کیونکہ اس چھوٹی سی بندرگاہ میں دکانیں، ہوٹل، بنک اور پھول بھیجنے والے بیوپاریوں کے دفتر واقع ہیں۔ اس کے قریب ہی کسی قدر بلندی پر "اسٹار کاسل" نامی قدیم قلعہ ہے۔ یہ ۱۵۹۳ء میں بنا تھا۔ اس زمانہ میں انگلستان کی اسپین سے لڑائی تھی اس لئے اسے تعمیر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسپین والے ان جزیروں کو انگلستان پر حملہ کرنے کے لئے اڈا نہ بنا پائیں۔ انگلستان کی خانہ جنگی کے وقت بادشاہ پرستوں نے یہیں آخری مرتبہ ہتھیار ڈالے تھے۔

(بقیہ صفحہ ۴۱ پر)

ڈبلیو۔ ایچ اوینز

"ہندوستاں ہمارا" کی شانِ نزول

کون ہے جس نے حضرت علامہ اقبال مغفور کی وہ نظم جسکا عنوان ہے "ہندوستان ہمارا" سنی یا پڑھی یا گائی نہ ہو۔ مگر ہے کوئی شخص جو یہ بتائے کہ یہ ترانہ کس طرح کہا گیا۔ حضرت اقبال پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں مگر یہ کسی نے نہ لکھا کہ یہ نظم کیسے عالم وجود میں آئی اور اسکے تشریف لانے سے کیا ہنگامہ بپا ہوا۔ جنھیں اسکا علم تھا وہ قوتِ بیان سے محروم تھے اور جو اسے بتانے کی اہلیت رکھتے تھے ان بیچاروں کو اسکا علم نہ تھا یہ کام میرے لئے ودیعت ہوا اور مجھی کو کرنا پڑا۔ آپ تو اسے دیکھ کر خوش ہوں گے مگر مجھ سے پوچھئے تو میں یہی کہوں گا کہ کاش یہ ترانہ نہ لکھا جاتا۔ اگر حضرت مرحوم کو یہ لکھنا ہی تھا تو اسوقت نہ لکھتے جس وقت لکھا۔ آپ تو آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں مگر اسکی مہربانی سے جو کچھ مجھ پر گذری میں ہی جانتا ہوں۔ سنہ ۱۹۰۴ء کا حادثہ سنہ ۱۹۱۳ء تک میرے لئے سوہانِ روح بنا رہا۔ اب سنئے اس معرکہ کی کیفیت اور میری حالتِ زار پر ہنسئے یا رو دیجئے جو آپ کو پسند ہو۔

ہردیال۔ جی ہاں جو ہندوستان سے جلاوطن ہوئے کچھ عرصہ امریکہ میں رہے اور بعد ازاں برلن میں جا فوت ہوئے، تو یہ ہردیال گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کی تعلیم لے رہے تھے۔ یہ عجیب خصلت کا انسان عجائباتِ قدرت میں شمار ہوتا تھا۔ اگر کسی اور زمانہ میں ہوتا تو کیا تعجب ہے کہ رشی یا منی کا دعویٰ کرتا۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی ایک نظر پڑھ لیتا تو پھر وہ کبھی حافظہ سے باہر نہ جا سکتا۔ ہردیال نہ صرف گورنمنٹ کالج میں بلکہ دوسرے مقابلہ کے کالج فورمن کرسچن کالج کے طلبا میں بھی بڑے ہر دل عزیز تھے اور سب انکا احترام کرتے تھے۔

لاہور میں سنہ ۱۹۰۴ء میں صرف ایک کلب ینگ مینز کرسچن ایسوسی ایشن تھا ہردیال بھی اسکے ممبر تھے طبعاً وطن دوست اور قومیت پرست تھے۔ ایک دن سکرٹری کلب سے کچھ جھڑپ ہو گئی۔ بات نے طول پکڑا اور ہردیال نے اس کلب کو سلام کرنے اور ینگ مینز انڈین ایسوسی ایشن قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور تمام کالجوں کے طلباء ہردیال کی مدد پر آمادہ ہو گئے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب حضرت اقبال مغفور یعنی اسوقت کے صرف شیخ محمد اقبال ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور میں لکچرار تھے اور لازوال شاعری کے ابتدائی منازل طے ہو رہے تھے۔ ہردیال سے آپ کے تعلقات دوستانہ تھے۔ اب ہردیال کے کلب کا افتتاحی جلسہ ہوا تو جناب نے اسکی صدارت قبول کی۔ تین بجے شام یہ طے ہوا اور ۴ بجے یہ جلسہ شروع ہوا۔ ذرا مدت کا لحاظ رکھئے اور پھر تاریخ کا لحاظ رکھئے جب یہ جلسہ شروع ہوا تو آپ نے بجائے خطبہ ارشاد فرمانے کے

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

پڑھنا، سوءِ ادب معاف، گانا شروع کیا۔ حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری ہوئی مگر ہم جو روزانہ بلاناغہ شام کو حاضرِ خدمت ہوا کرتے تھے۔ حیران تھے کہ یہ نظم کب کہی گئی۔ وہ نظم پڑھتے گئے اور میں پنسل سے لکھتا گیا۔ ہاں میں ان دنوں فورمین کرسچین کالج میں پڑھتا تھا اگر یہ قصہ یہیں ختم ہو جاتا تو میری آئندہ کوفت کم ہو جاتی۔ مگر وفورِ عقیدت کہئے یا حماقت کہ میں نے اپنے نیوٹن ہال ہوسٹل میں جا کر اس نظم کو سنوار کر لکھا۔ ان دنوں میں مولوی عبدالحلیم شرر اپنے رسالہ "اتحاد" میں ہندو مسلم اتحاد پر دھنا کہہ رہے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یہ نظم برائے اشاعت بھیج دی امنگ تھی کہ میرا نام بھی کسی رسالہ میں چھپ کر نکلے اس لئے اپنا نام شائع کرنے کی بڑی تاکید کی۔ شرر مرحوم نے نظم تو شائع کر دی مگر میرا نام نہ لکھا۔ بات آئی گئی ہو گئی اور رسالے کا انتظار ہونے لگا۔ میں نے حضرت قبلہ سے ذکر نہ کیا۔ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ جب رسالہ آئیگا تو لے کر جاؤنگا۔ وہ اپنا کلام چھپا ہوا دیکھیں گے تو میری خدمت کی داد دینگے میں رسالے کا انتظار ہی کھینچ رہا تھا کہ ایک دن میں حسبِ معمول آپ کے مکان پر گیا۔ معاف فرمائیگا یعنی چھوٹے چھوٹے کمروں والے سے چوبارہ کو درِ دولت کیسے کہوں جو اب بھی بھاٹی دروازہ کے بازار میں "زندہ" شہادت دینے کو موجود ہے۔ گیا تو محفل پر مُردنی چھائی تھی اور شیخ صاحب غصہ کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ میں نے بندگانِ درگاہ سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو معلوم ہوا کہ جو نظم کلب کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ اسے کسی لڑکے نے رسالہ اتحاد لکھنؤ میں شائع کر دیا۔ اس میں بہت غلطیاں لڑکے کی حماقت کی بدولت وارد ہو گئیں اور ان غلطیوں کو سامنے رکھکر حسن موہانی نے اپنے رسالہ اردوئے معلیٰ میں اہلِ پنجاب کو جی بھر کر جلی کٹی سنائی ہیں۔ اب اس بیچارے لڑکے کو صلواتیں سنائی جا رہی تھیں۔ کوئی مہذب گالی اٹھا نہ رکھی گئی۔ اور مجھے بھی سینہ پر پتھر رکھکر اس دشنام دہی میں شریک ہونا پڑا۔ فرمائیے میرے دل و جگر کی کیا کیفیت ہو گی مگر یہیں خاتمہ بالخیر ہو جاتا تو میں یہ سب کچھ پی جاتا۔ مگر اب شیخ صاحب قبلہ مصر ہوئے کہ اس لڑکے کا کھوج لگایا جائے۔ اس ارادے کی میں نے بڑے زور سے تائید کی اور اسی زور سے اپنے چہرے کے رنگ کو اڑنے سے روکا۔ اسلامیہ کالج لاہور کے ایک قل آموزے نے کہا کہ پتہ لگانا تو ملنے کا نہیں۔ مولانا شرر ہی سے پوچھا جائے کہ یہ نظم انہیں کس نے ارسال کی تھی۔ سب نے اس تجویز کی تائید کی۔ ظاہر میں تو اس تجویز کی تعریف کر رہا تھا مگر باطن میں اس لڑکے کو بد دعائیں دے رہا تھا۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ اور فورمن کرسچن کالجوں کے طلباء ارسٹوکریٹ۔ اسلامیہ کالج کے قل آموز اور ڈی اے وی کالج کے مدر دیسی کہلاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ صاحب نے جھٹ مولانا شرر کو خط لکھ مارا۔ چونکہ ڈاک خانہ میرے ہوسٹل سے قریب تھا اس لئے ڈاک میں ڈالنے کے لئے میرے سپرد ہوا۔

محمد عمر (نور الٰہی)

میرا وارنٹ اور میرے ہی ہاتھوں اسکی تعمیل! سبحان اللہ قدرت کے کھیل! میں بھاٹی دروازے سے چلا اور نیلے گنبد تک پہنچنے تک میں نے کئی ایک فرار کی صورتیں پیدا کیں اور مٹائیں۔ یہ خیال کہ شیخ صاحب کا شفقت نامہ ہی غت ربود کیا جائے آسان تو تھا مگر اس میں آخرکار پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ پھر یہ سوچا کہ اسی لفافہ کی پشت پر لکھ دوں کہ جواب دینے کی ضرورت نہیں یہ تجویز بھی نامعقول معلوم ہوئی۔ ایک لڑکا اپنے گھر سے دور جسکا نہ کوئی مونس نہ غمگسار۔ نہ کوئی رہبر نہ مشیر کار اس کی حیرانی کی کسک کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں اپنے گھروں سے دور بورڈنگوں میں رہنا پڑا ہے۔ پھر طبیعت اس بات پر ٹھہری کہ مولانا ظفر کو لکھا جائے کہ میرا نام نہ بتانے سے منع کیا جائے۔ چنانچہ میں بوسٹل پہنچ گیا خط لکھا اور دونوں خط ایک ساتھ ڈاک کے حوالے کئے۔ مجھے خطوں کی جواب یابی کی توقع بہت ہی کم تھی۔ کہاں کالج کا ایک پروفیسر اور کہاں فسٹ ایر کا ایک فی طالب علم۔ دو چار دن بڑی پریشانی میں بسر ہوئے۔ مولانا تو [illegible] انھیں کر دیں کر دٹ جرأت لعیب کرے۔ مولانا کا خط شیخ صاحب کے نام آیا اور اس میں لکھا تھا کہ لاہور سے کسی نے یہ نظم بھیجی تھی۔ مسودہ بہت تلاش کیا نہ ملا۔ نام یاد نہیں۔ میں تو اس عذاب سے چھوٹا مگر اور بھنس گئے۔

حسرت موہانی کی تعریض نے یو۔پی اور پنجاب کے ادیبوں میں ایک طویل بحث کا دروازہ کھول دیا۔ ادیبوں و معلمین اور مخبرین میں محاذ قائم ہوئے۔ خوب گولہ باری ہوئی [illegible] کے معرکے پڑے۔ آخر چھ سات مہینوں کے بعد فریقین تھک کر چور ہو گئے نہ کوئی جیتا نہ ہارا۔ یہ راز مدتوں سربستہ رہا۔ شیخ صاحب تعلیم کے لئے ولایت چلے گئے۔ واپس آئے اور میں سمجھا کہ یہ نظم والی بات ان کے ذہن سے اتر گئی ہوگی لیکن جب آپ ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں سرینگر تشریف لائے اور مولوی احمد الدین منشی نور الٰہی اور ان کے دو ایک موکل اور راقم الحروف آپ کے پاس ہوس بوٹ میں بیٹھے تھے کہ ایک شکارا (چھوٹی کشتی) ہمارے پاس سے گذرا۔ اس میں دو تین بچے یہی نظم گا رہے تھے۔ اس غیر شعوری استقبال نے ایک کیفیت پیدا کر دی جس کے دوران حضرت علامہ نے بھی حصہ لیا۔ اور بیان کیا کہ کس طرح یہ نظم شائع ہوئی اور کس طرح ایک ادبی طوفان بپا ہوا۔ مگر یہ پتہ نہ لگا کہ یہ نظم کس نے شائع کرائی۔ منشی نور الٰہی نے میری طرف دیکھا میں کچھ کھو سا گیا مگر ظالم نے تاہی دیا کہ یہ سب کارستانی میری تھی۔ سب ہنس پڑے اور حضرت مغفور بھی اس میں شریک غالب ہوئے۔

جی ہاں ہے یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا

نوٹ: مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ آجکل کیلئے مضامین کے سپیدے صاف خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھکر روانہ فرمایا کریں۔ (ادارہ)

عراق کے ہندوستانی

آر۔ ڈی۔ سوزا

سارے عراق میں تین ہزار سے زیادہ ہندوستانی آباد ہیں۔ ان میں سے اکثر یا تو بڑے بڑے شہروں یعنی بغداد اور بصرہ میں رہنے لگے ہیں اور یا کربلا، نجف اور کاظمین کے مقدس شہروں میں بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان ہندوستانیوں میں سے زیادہ تر یہاں پچھلی جنگ عظیم کے بعد آئے۔ اس سے پہلے یہاں ہندوستانی یا تو تجارت کی غرض سے آتے تھے یا زیارت کی۔ جو لوگ زیارت کے لئے آتے تھے ان میں سے کچھ نے عراق کے مقدس شہروں میں دکانیں کر لی تھیں۔

عراق پر فوجی قبضہ اور نئی حکومت کے قیام کے بعد بہت سے ہندوستانی حکومت عراق، تیل کی کمپنیوں اور برطانیہ کی تجارتی کمپنیوں میں ملازم ہو گئے تھے لیکن اب بہت کم ہندوستانی ایسے رہ گئے ہیں جو عراقی حکومت کے ملازم ہیں اور جو ہیں بھی ان میں سے اکثر ریلوے اور آبپاشی کے محکموں میں انجینئر یا سر ویئر ہیں۔

اگرچہ زیادہ تر ہندوستانی بیوپاری ہیں پھر بھی بحیثیت مجموعی یہ لوگ زیادہ خوشحال نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سنہ ۴۲-۱۹۴۰ء کے نفع خوری کے دنوں میں کچھ سوداگروں نے کافی روپیہ جمع کر لیا ہے مگر جو لوگ ملازم پیشہ ہیں انھیں قیمتیں بڑھ جانے سے نقصان پہنچا ہے۔ ایک دو ہندوستانی کمپنیوں نے بصرہ میں خوب دولت کمائی لیکن یہ عراق میں نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے قائم ہیں۔

تاجروں میں زیادہ تر تھوک فروش ہیں جو باہر سے مال منگاتے ہیں۔ یہ کھیل کے سامان سے لے کر پرانے کپڑے تک ہر قسم کی چیزیں بیچتے ہیں کسی زمانہ میں امریکہ اور انگلستان سے پرانے کپڑوں کی درآمد پوری طرح ہندوستانی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی لیکن اب درآمد کرنے والے عراقیوں کی تعداد ہندوستانیوں سے دگنی ہو گئی ہے۔

عراق کے ہندوستانیوں کی سماجی زندگی بہت محدود ہے اس لحاظ سے بغداد کی "انڈین ایسوسی ایشن" کا وجود غنیمت ہے جو سنہ ۱۹۲۳ء میں قائم ہوئی تھی یہ انجمن عراق کے سارے ہندوستانیوں کی نمائندہ ہے اور اس نے عراق میں مقیم ہندوستانی فوجوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا چندہ کچھ نہیں ہے ہر رتبہ کا ہندوستانی اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ اس نے سنہ ۱۹۴۱ء سے ہر پندرھویں روز چائے کی پارٹی دے کر، ہر ہفتہ موسیقی کے جلسے کر کے اور کھیل تماشے سے ہندوستانی سپاہیوں کا دل بہلایا۔ "ٹراونکور ہاؤس" کھلنے سے پہلے ہی ہندوستانی سپاہیوں کا کلب تھا جب تک این۔ اے۔ اے۔ ایف۔ آئی نے کام سنبھالا "ٹراونکور ہاؤس" کا انتظام بھی ایک ایسی کمیٹی کے ہاتھ میں تھا جس کے ممبر انڈین ایسوسی ایشن میں سے چنے جاتے تھے۔ اب بھلائی کا کام ہندوستانی شہریوں کے ہاتھ میں ہے۔

ہندوستانی افسروں اور سپاہیوں کا دل بہلانے کے لئے "انڈین ایسوسی ایشن" ہی نے ان کی خاطر نہیں کی بلکہ بہت سے لوگ اپنے گھروں پر بھی سپاہیوں کو چائے اور کھانا کھلاتے رہے۔

کم آمدنیاں ہونے کے باوجود عراق کے ہندوستانیوں نے لڑائی کے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ چندہ دینے کی کوشش کی۔ ان دنوں اسی ایسوسی ایشن کی کمیٹی ایک بڑی عمارت بنانے کے لئے چندہ جمع کرنے میں مصروف ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ جیسے ہی سامان کی قیمتیں گریں گی عمارت بنوانے کا کام شروع کر دیا جائے گا۔

پچھلے سال تک بصرہ میں ایک ہندوستانی کلب بھی تھا لیکن کرایہ بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے اسے بند کر دینا پڑا۔ اب ایک عمارتی فنڈ کھولا گیا ہے جس میں لوگ دل کھول کر چندہ دے رہے ہیں۔ امید ہے کہ مستقبل قریب میں "بصرہ انڈین کلب" اپنی عمارت خود بنوا لے گا۔

پھولوں کی سرزمین ۔ جزائر سسلی

بقیہ صفحہ ۳۵

جزائر سسلی کے دلکش منظروں میں ٹریسکو کے "ایبے گارڈنس" نامی باغات بھی شامل ہیں۔ ان کے اور سینٹ میری کے درمیان تقریباً دو میل چوڑی آبنائے ہے۔ چٹانی ساحلوں کے ان باغوں میں انگلستان کے بہترین درخت اور پودے پائے جاتے ہیں۔ یہ سب کھلی ہوا میں پرورش پاتے ہیں۔

یہاں دنیا کے بہت سے حصوں کے درختوں کے نمونے موجود ہیں۔ یہاں ہمالیہ کے ادرک، کیلے اور چکوترے اور لبنان کے صنوبر کے شاندار درخت بھی جاتے ہیں۔

ٹریسکو سے آگے جزیرہ سینٹ مارٹن ہے جس میں ایک سو چالیس آدمی رہتے ہیں۔ باقی جزائر سینٹ اگنیز اور بریہر پر آبادی نہیں ہے۔ بریہر کا چٹانی منظر سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ آپ جہاں کہیں جائیے ان جزائر میں پھولوں کی بھرمار ہے۔ چمنوں میں بھی جن کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں اور بحر اٹلانٹک کے چٹانی ساحلوں پر بھی۔ باہر کے جزیروں کی بہت سی چٹانوں پر چلکے گلابی اور نیلے رنگ کے پھول نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان خوبصورت جزیروں کو برطانیہ کے پھولوں کے جزیرے کہنا بجا ہے۔

فریب

نقش ثانی

افسانہ

ناصر

اس واقعہ کو کئی دن اور مہینے گذر گئے۔ صادق حسب معمول اب پھر اسی کھیت کے کنارے کاپی اور پنسل لئے کچھ لکھتا ہوا نظر آتا تھا۔ نازاں بھی روزانہ اپنے کاموں سے فارغ ہوکر اس کے پاس آبیٹھتی اور خاموش اس کے چہرے کو تکا کرتی۔ محمد بخش روز یہ سب کچھ دیکھتا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کا انسان ہے۔ ایک طرف تو اتنی محبت بھی کرتا ہے کہ اپنی ساری کمائی نازاں کو دیدی لیکن ساتھ ہی اپنی کوئی خواہش بھی ظاہر نہیں کرتا۔ آخر اس نے ایک چال سوچ ہی لی۔ اس نے اپنے دوست جگو چودھری کو جا کے تمام ماجرا سنایا اور کہا تم جا کے یہ بات صادق سے میرا حوالہ دیکر کہو کہ میری بھی یہی منشاء ہے۔ جگو چودھری نے مدبرانہ انداز سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن بھائی اگر اسے شادی کرنا ہوتی تو وہ خود ہی نہ کہتا۔ مجھکو تو وہ کچھ پاگل سا نظر آتا ہے۔" محمد بخش نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ پڑھے لکھے لوگ کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ میں زیادہ بے چین اسی لئے ہوں کہ نازاں کو اس سے بے انتہا محبت ہے اور روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اگر صادق نے اس سے شادی نہیں کی تو مجھکو انجام کچھ اچھا نظر نہیں آتا۔ میں اس کی طبیعت سے خوب واقف ہوں۔" — "لیکن بھائی یہ بھی تو سوچو کہ وہ پڑھا لکھا ہے وہ کیسے کسی جاہل لڑکی سے شادی کرنے پر رضامند ہو گا۔" جگو نے فلسفیانہ پیرائے میں کہا۔ "جگو اگر تم کوشش کرو تو شاید بنتا ہو جائے۔ میرے خیال میں چاہتا تو وہ بھی ہے لیکن شرم سے نہیں کہتا۔" محمد بخش نے ایک بیڑی جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ تم کہتے ہو تو جا کے کوشش کرونگا مان جائے جبھی بات ہے" جگو چودھری نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی دن جگو چودھری صادق کو کھیت کے کنارے اکیلے بیٹھا ہوا دیکھ کے پہونچ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے صادق سے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "صادق بھیا ایک بات کہیں؟"... "ضرور کہو" صادق نے اپنی کاپی بند کرتے ہوئے کہا.... جگو چودھری نے چاروں طرف ایک گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "نازاں سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ ایسی حسین لڑکی سارے گاؤں میں نہیں ملے گی۔ ابھی تمہارے آنے سے پہلے گاؤں کے زمیندار آئے وہ نازاں کو دیکھ کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ دوسری شادی کرنے پر تیار ہو گئے۔ لیکن محمد بخش کسی طرح تیار نہیں ہوا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ میں دولت کا بھوکا نہیں کہ جوان لڑکی کو بڈھے کے حوالے کر دوں۔ بہر حال میں تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ نازاں سے بیاہ کر لو بڑا اچھا جوڑا رہے گا۔" صادق نے جگو کے دلائل خاموشی سے سنے اور کہا۔ "تمہارے مشورہ کا شکریہ جگو چودھری مگر میرا ارادہ ابھی شادی کرنے کا نہیں ہے۔" "تمہارا خیال ہے کہ شاید [illegible] ہوسکنے کی کیونکہ وہ پڑھی لکھی نہیں۔ ہاں اس خیال سے تو وہ تمہارے لائق نہیں ہے لیکن....." صادق نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جگو کیسی باتیں کرتے ہو۔ لائق نالائق کا سوال نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں شادی ہی کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟" جگو چودھری نے تعجب انگیز لہجہ میں پوچھا۔

"یونہی" — مختصر سا جواب تھا۔

"کوئی وجہ تو ہوگی" جگو نے تفتیش آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"کہہ تو دیا کہ دل نہیں چاہتا" صادق نے بیزاری سے کہا۔

"بات اصل میں یہ ہے" جگو نے دوسرے پہلو سے شروع کیا "یہ پیغام محمد بخش نے خود کہلوایا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم ان کی بھتیجی سے شادی کر لو وہ کبھی نہ کہتے اگر ایک خاص بات پیدا نہ ہوئی ہوتی"... "کیا بات پیدا ہوگئی ہے" صادق نے جگو کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ جگو چودھری نے آنکھ ملاتے ہوئے کہا: "نازاں کو تم سے محبت ہوگئی ہے اگر تم نے شادی کرنے سے انکار...."

"محبت ہوگئی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا" صادق جیسے کسی خواب سے چونک اٹھا۔ جگو نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں اسکو تم سے شدت سے محبت ہوگئی ہے اور اب اس کی زندگی کے تم ذمہ دار ہو" جگو نے صادق کو خواب غفلت سے جھنجھوڑتے ہوئے آخری جملہ کہا اور اٹھکر چلدیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد صادق پھر ان پریشان خیالوں میں الجھ کر رہ گیا "کیا واقعی اس کے رویہ سے محبت کی جھلک پائی جاتی ہے وہ روز کیوں میرے پاس آکے بیٹھی رہتی ہے۔ وہ کیوں میرے کھانا کھائے بغیر کھانا نہیں کھاتی۔ آخر کیوں اسکو میرا اتنا خیال ہے۔ میرے شہر جاتے وقت اسنے اپنی محنت سے جمع کی ہوئی دولت تک مجھکو دیدی تھی۔ اور وہاں اس روز میری تکلیف کا احساس کرکے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اسکو مجھ سے صرف ہمدردی ہے... لیکن جیسا کہ جگو کہتا ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو بڑی مشکل ہوگئی۔ میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا، میں پاگل ہو چکا ہوں، مجھ سے شادی کرکے کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔ میں اس کی زندگی تباہ نہیں کر سکتا۔ ایک کی زندگی تو تباہ کر چکا ہوں اب دوسری کی نہیں کروں گا۔ میں گاؤں چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔ وہ ضرور تھوڑے دنوں میں مجھکو بھول جائے گی" صادق ان ہی خیالات میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اور اس کو نازاں کی موجودگی کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ نازاں نے جگو چودھری اور صادق کی تمام باتیں سن لی تھیں اور اب وہ اس کے بشرے سے اس کے خیالات کی تہ تک پہونچ سکتی تھی۔ نازاں کو کامل یقین ہو گیا تھا کہ صادق کے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور آخر ہو بھی تو کیسے؟ وہ پڑھا لکھا تہذیب یافتہ

اور ایسا ہنرمند کہ صرف ایک کتاب لکھ کے دس ہزار روپے کما سکتا تھا اور وہ خود ایک غریب لڑکی تھی۔ جاہل، کندۂ ناتراش..... یہ خیالات تھے جو نازاں کے دل کو مجروح کئے ہوئے تھے لیکن پھر بھی وہ اپنی قسمت پر ناز کرتی تھی۔ وہ اسکو اپنی عزت سمجھتی تھی کہ اسکو ایک اتنی بڑی شخصیت کی خدمت کا شرف حاصل تھا۔ صادق کو اگر اس سے محبت نہیں تو کیا تھا۔ وہ کم از کم اس کی خدمت تو کر سکتی تھی۔ اسکو اسی خدمت میں ایک مسرت جاودانی اور ایک روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ لیکن صادق کے ایک غیر متوقع جملے سے اس کے ان مسرت آگیں خیالات کے تار و پود بکھر گئے۔ اس نے نازاں کو اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھ کر کہا: "نازاں کل میں اپنے وطن جا رہا ہوں" نازاں پر گویا برق سی گر پڑی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور ایک نامعلوم خوف کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "وطن جا رہے ہیں آپ! شاید آپ ہم لوگوں سے خفا ہو گئے ہیں؟" صادق نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "نہیں نازاں، تم بہت بھولی ہو۔ بھلا اتنی اچھی لڑکی سے میں خفا ہو سکتا ہوں۔ بات اصل یہ ہے کہ میں آٹھ عرصے سے اپنے عزیزوں سے نہیں ملا ہوں اور وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب میرا جانا ضروری ہے۔ میں پھر بھی آنے کی کوشش کروں گا" لیکن نازاں سمجھ گئی کہ یہ جملے محض تسلی کے لئے کہے گئے ہیں۔ جدائی کا خیال کر کے اس کا دل اندر سے بیٹھنے لگا اور اسے اپنی مسرتوں کی دنیا منہدم ہوتی نظر آئی۔ اس نے بہت ضبط کیا لیکن خودسر آنسو اس کی حسین آنکھوں میں چھلکنے لگے۔

صادق یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کو دلی صدمہ ہوا لیکن اپنے عہد سے مجبور تھا۔ اس نے آگے بڑھ کے نازاں کا چہرہ ہاتھ سے اٹھاتے ہوئے کہا: "نازاں رو رہی ہو؟" — نازاں نے سر جھکائے ہوئے کہا: "میں جانتی ہوں۔ جگو چودھری نے آپ کو خفا کر دیا۔ لیکن میں نے تو آپ سے کچھ نہیں کہا"..... صادق خوف سے کانپ گیا "نہیں نازاں یہ بات نہیں۔ تم کو نہیں معلوم کہ میں کن خیالات کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری حیثیت ایک پاگل سے زیادہ نہیں۔ مجھ سے شادی کر کے دنیا میں کوئی خوش نہیں رہ سکتا....."

نازاں نے اپنی خوبصورت پلکیں جو کہ آنسوؤں کی روانی سے بوجھل ہو رہی تھیں اٹھاتے ہوئے کہا: "لیکن میں نے تو اس کے متعلق آپ سے کچھ نہیں کہا۔ میں جانتی ہوں کہ میں اس لائق نہیں۔ میں تو صرف آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ میرے لئے دنیا کی یہی سب سے بڑی مسرت ہے، اس مسرت کو مجھ سے نہ چھینیئے" اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی اور اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ صادق ایک عجیب کشمکش و پیچ میں ہو کر رہ گیا۔ اس کی عقل اس گتھی کو سلجھا لینے سے قاصر تھی۔ کبھی وہ سوچتا — نازاں کو مجھ سے سچی محبت ہے۔ اگر میں چلا گیا تو اس کے لئے زندگی دوبھر ہو جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی قمر کے ساتھ کئے ہوئے پیمان یاد آتے۔ اس نے قمر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سوائے اس کے کسی دوسری سے شادی نہ کرے گا۔ گو کہ قمر نے اس کو آخری ملاقات کے وقت کہا تھا کہ کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لینا اور مجھے بھول جانے کی کوشش کرنا۔ لیکن نہیں وہ اس دل میں کسی دوسرے کو جگہ نہیں دے سکتا تھا جو کہ قمر کے لئے وقف ہو چکا ہو۔ اس نے سوچا کہ وہ دل مضبوط کر کے گاؤں چھوڑ دیگا۔ تھوڑے دنوں میں نازاں ضرور اس کو بھول جائے گی۔ یہ اسکا آخری جملہ تھا۔ دوسرے روز وہ محمد بخش کو خفا اور نازاں کو روتا ہوا چھوڑ کے اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔

اپنے وطن پہنچ کر اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح قمر سے ملے لیکن کچھ عرصہ تک وہ ناکام رہا۔ قمر کی شادی ایک بڑے رئیس سے ہو چکی تھی۔ صادق نے اپنی واپسی کی خبر کو پوشیدہ رکھا اور روزانہ قمر کی سسرال کے چکر کاٹنے لگا تاکہ کہیں قمر کی جھلک دیکھ جائے۔ اس نے اپنی خیالی دنیا میں قمر کی مختلف قسم کی غمزدہ اور اندوہناک شکلیں بنا رکھی تھیں۔ وہ سوچتا وہ ضرور بہت دبلی ہو گئی

برہن

دکھ ہوتا ہے رو لیتی ہوں

چپکے چپکے آہیں بھر کر — من سے اپنی بپتا کہہ کر
من کلیا کے زخم کلپا کے — دل میں ان کی یاد بسا کے
ناسوروں کو دھو لیتی ہوں
دکھ ہوتا ہے رو لیتی ہوں

ساجن چھوڑ گئے ہیں جب سے — آشا روپ مٹے ہیں تب سے
نینن ساغر امڈ امڈ کے — ایسے بہے ہیں جیسے دھارے
اب تو نین بھی کھو بیٹھی ہوں
دکھ ہوتا ہے رو لیتی ہوں

ساجن آئیں پھر بندھ جائیں — تب شاید آنسو تھم جائیں
ورنہ یہ چنچل آنسو تو!! — رہ رہ من میں آگ لگائیں
آس امید بھی کھو بیٹھی ہوں
دکھ ہوتا ہے رو لیتی ہوں

ریاض بخاری

ہو گی اس کے چہرے سے یاس اور حرماں نصیبی ٹپکتی ہو گی۔ سیر و تفریح سے، سگ دوڑتی
نہ رہا ہو گا جبھی تو کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اب کہ ناخوشگوار انجام ہوا۔ سب کچھ
میری بدولت ہے۔ صادق کی تمام کوششیں رائیگاں ہو گئیں اور وہ قمر سے بسترت
نہ مل سکا۔ آخر اس نے ایک ترکیب نکال ہی لی۔ چند دن شیو نہ کرنے سے اس نے اپنی
داڑھی مونچھیں خاصی بڑھا لیں اور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر نوکری کی تلاش میں
قمر کے یہاں گیا۔ چلتے وقت اس نے اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا تو اپنے آپ کو خود
نہ پہچان پایا۔ اس کو خوش قسمتی کہئے یا اتفاق کہ صادق کو مسٹر یعقوب، قمر کے شوہر
کے یہاں، ویسے کام کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھ لیا گیا۔ چند دنوں تک
تو زنان خانہ میں اس کا پردہ رہا لیکن اس کو انتہائی احمق و سیدھا سادہ پاکر
مسٹر یعقوب نے اس کو زنان خانہ میں بھی کام کرنے کی اجازت دیدی۔ وہ
دن شاید انتہائی خوش قسمتی کا دن تھا جس روز زنان خانہ میں صفائی کے لئے اس کو
اندر بلایا گیا۔ وہ ایک کپڑے سے بڑے کمرہ کی میزوں اور کرسیوں کو صاف
کرتا جاتا، اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر کمرہ میں چاروں طرف دیکھ لیتا تھا۔ دروازے
کے اوپر قمر اور مسٹر یعقوب کا خوبصورت فوٹو لگا ہوا تھا جو کہ شاید شادی کے وقت
کھینچا گیا تھا کیونکہ دونوں دولہا دلہن کے لباس میں تھے۔ صادق فوٹو کے قریب ہو کر
غور سے دیکھنے لگا۔ دونوں کے چہروں پر ایک ہلکا سا تبسم تھا۔ صادق جی ہی جی
نے خیال کیا کہ قمر بظاہر طور پر مطمئن رہتی ہے لیکن اس کا دل روتا ہو گا۔ پیچھے کے
کمرے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور صادق نے فوراً سر جھکا کر دیکھا۔
ایک چھوٹی سی میز کی گرد جھاڑنے لگا۔ چند لمحوں میں کوئی کمرہ میں داخل ہوا۔
اس نے دیکھا۔ قمر ایک قیمتی ساڑی میں ملبوس اپنے شباب کی تمام رعنائیوں کو لئے
اس کے سامنے موجود تھی۔۔۔۔ شاید وہ قمر کے خوبصورت چہرہ سے اپنی نظریں نہ
ہٹاتا اگر اس کو اپنی حیثیت کا فوراً احساس نہ ہو جاتا۔ اس نے سر جھکاتے ہوئے
کہا "سلام بیگم صاحب" قمر سر کے اشارہ سے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے
قریب آئی پھر کچھ دیر اس کے کام کا معائنہ کرنے کے بعد بولی۔ "کیا نام ہے تمہارا"
"دین محمد سرکار" صادق نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "دین محمد تم ہمیں روز کا
کام آج سمجھائے دیتے ہیں۔ بغیر ہمارے کہے سب یاد کر لینا۔ روز صبح کمرہ
کی صفائی کھانا کھلانا اور ہر تیسرے چوتھے روز جوتوں پر پالش" قمر نے اپنے
خاص لہجہ میں کہا۔ صادق نے ایک مرتبہ اور قمر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:
"بہت اچھا سرکار" قمر کے چلے جانے کے بعد صادق کا دماغ مسلسل پریشان کن
خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ قمر کی خیالی تصویر جو کہ اس نے اپنے تصورات کے
عالم میں تیار رکھی تھی قمر کی شکل سے بالکل مختلف تھی۔ قمر اس کو پہلے سے زیادہ
خوبصورت، صحت مند اور خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات سے تنگ
آکر سوچنے لگا "کیا وہ مجھ کو اور میری محبت کو بھول گئی ہے، نہیں یہ ہرگز نہیں

ہو سکتا۔ قمر کبھی بیوفا نہیں ہو سکتی۔ وہ ظاہرہ طور پر اپنے آپ کو خوش رکھتی ہے
تاکہ اس کے دل کا بھید کوئی نہ جان سکے۔ آخر اسکو اپنے شوہر کے ساتھ کسی
نہ کسی طرح زندگی تو گذارنا ہی ہے" صادق کو قمر کے یہاں کام کرتے کئی روز
گذر گئے۔ اس کا جسم اس قسم کی محنت کا عادی نہ تھا اور وہ روز بروز کمزور
ہونے لگا لیکن قمر کی کشش اس کو اتنی ذلت اور تھکاوٹ برداشت کرنے کیلئے
دیئے ہوئے تھی۔ ایک روز شام کو جب وہ جوتے پر پالش کر رہا تھا تو وہ مسٹر
یعقوب کا ایک جملہ سن کر چونک پڑا۔ وہ قمر سے کہہ رہے تھے۔ "قمر آج نشاط میں
بہت عمدہ پکچر لگی ہے" قمر نے پان بناتے ہوئے پوچھا "کونسی؟" "دکھڑا" مسٹر یعقوب
نے قمر کے پاس جاتے ہوئے کہا۔ "دکھڑا" اپنی لکھی ہوئی اسٹوری کا نام سنکر صادق
چونک پڑا۔ بات تو اس کے خیال سے بھی اتر گئی تھی کہ اس کی لکھی ہوئی اسٹوری کی
فلم بھی چلی ہو گی۔ مسٹر یعقوب نے صادق سے کہا۔ "دین محمد ذرا پالش جلدی کر دو
ہم لوگ سینما جا رہے ہیں" پھر قمر سے کہا "اور سے قمر تمہاری سہیلی اختر کو بھی لیتے
چلیں" ۔ "ہاں ہاں" قمر نے کہا اور دونوں تیار ہو کر موٹر میں بیٹھ کے روانہ ہو گئے۔
رات کے نو بجے جب دو لوگ معہ اختر کے پکچر دیکھ کر واپس آئے تو صادق کو قمر کی
حالت دیکھنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید قمر کے بحرِ غم میں
ڈوبی ہوئی ہو گی۔ اس کی آنکھیں بے اختیار آنسو بہا رہی ہوں گی۔ وہ سینما ہال سے بیحد
رنجیدہ واپس آئی ہو گی اور شاید آج رات وہ کھانا بھی نہ کھا سکے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قمر کے
چہرے سے کوئی دلی شکستگی کے آثار عیاں نہیں تھے۔ جب کھانے کی میز پر تینوں بیٹھے
تو خوب ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے۔ مسٹر یعقوب تو کھانا کھا کے فوراً کسی کام
سے باہر چلے گئے لیکن قمر اور اختر میز پر باتیں کرتی رہیں۔

قمر نے مسکرا کر اختر سے کہا: "اختر معلوم ہے اس فلم کی اسٹوری کس کی
لکھی ہوئی ہے" اختر نے پوچھا "کس کی؟" قمر نے مسکراتے ہوئے کہا "صادق صاحب کی
لکھی ہے"۔۔۔ "کون صادق؟" اختر نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ قمر نے
انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا "وہ ہمارے پرستار" صادق اپنا ذکر سنکر چوکنا ہو گیا لیکن
یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ان کی باتیں نہیں سن رہا ہے بے توجہی سے میز پر سے
کھانے کی پلیٹیں اٹھانے لگا۔ اختر نے قمر کے جواب میں کہا "لیکن ان کے متعلق تو
مشہور ہے کہ انہوں نے خودکشی کر لی" ۔ "نہیں جی" قمر نے تیزی سے کہا۔
"اڑائی ہوئی خبر ہے۔ یہ اسٹوری انہیں حضرت کی ہے"۔ اختر نے ہنستے ہوئے کہا
"ہاں اب مجھکو یاد آیا۔ ہیرو، ہیروئن کا کیریکٹر بالکل صادق اور تمہارا جیسا ہے،
بڑی دردانگیز اسٹوری لکھی ہے۔ اس کو تم سے سچی محبت تھی" "ہاں تھی تو" قمر نے
ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔ اختر نے ذرا دھیمے لہجہ میں کہا "اور تم نے اسکو دھوکا
دیا اگر تم چاہتیں تو تمہاری شادی صادق سے ہو سکتی تھی۔ تمہاری مرضی کے خلاف
تمہاری شادی کوئی نہیں کر سکتا تھا" قمر نے ذرا بگڑتے ہوئے کہا "اس میں

دھوکے کی کیا بات ہے۔ میں صادق سے کسی حال میں شادی نہیں کرسکتی تھی۔ ان کو میری دولت سے محبت تھی مجھ سے نہیں۔ اور اگر تھی بھی تو میں ان سے اس حال میں شادی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی ایسی خاص خوبی نہیں تھی کہ میں اتنی بڑی قربانی کرتی .....؟ اختر نے بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن جب تمہارا ان سے شادی کا ارادہ نہیں تھا تو کیوں تم نے محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ اس بیچارے کی تو زندگی برباد ہوگئی۔" قمر نے مسکرا کر کہا "صرف دل بہلانے کے لئے"۔ اختر نے بیزاری سے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا "خوب ..... کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"۔ قمر نے بھی کرسی سے اٹھتے ہوئے ایک قہقہہ کے ساتھ جواب دیا "کیوں یہ نہیں کہو گی کہ اس محبت نے انکو اتنا بڑا سٹوری رائٹر بنا دیا ورنہ وہ اتنے دردناک اور پراثر جذبات کہاں سے لاتے"۔

صادق پر اس گفتگو اور انکشافات نے گویا بجلی گرا دی۔ اس کو اپنے کانوں کی صحت پر یقین نہیں آتا تھا۔ کیا قمر نے اسکو دھوکا دیا۔ کیا جس کے لئے اس نے اپنی زندگی تباہ کر دی اسکو کھلونا سمجھ رکھا تھا۔ صرف دل بہلانے کے لئے۔ اف! کیا غریب کی زندگی کی بس یہی حقیقت ہے۔ اتنی بڑی قیمت ہے۔ کتنا بڑا دھوکا۔ کتنا زبردست فریب۔ غصہ اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے وہ کانپ اٹھا۔ اس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے اور چینی کا بڑا گلاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے فرش پر گر پڑا۔ لیکن اس کو کچھ محسوس نہ ہوا۔ گلاب کے ٹوٹنے کی آواز اسکو کوسوں دور سے آتی سنائی دی۔ وہ آنکھیں پھاڑے قمر کی طرف دیکھتا رہا۔ قمر نے غصہ سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "دیکھ کے کام نہیں کرتے؟ کیا اندھا ہو گیا ہے؟" لیکن صادق بدستور قمر کو دہشت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ جیسے کہ وہ کوئی خوفناک چیز دیکھ رہا ہو۔ قمر اور اختر اس کی اس حالت کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اس پر ساری حقیقت آشکار ہوگئی۔ اس نے اپنے سر سے وہ صافہ تیزی سے کھینچ لیا جو کہ اس کی اصلیت چھپانے میں بہت کچھ مدد دے رہا تھا۔ اس نے قمر کی طرف بڑھتے ہوئے کہنا شروع کیا: "ہاں اب تک اندھا تھا قمر۔ لیکن آج آنکھیں کھلیں۔ آج تمہاری حقیقت اور تمہارا باطن میرے سامنے برہنہ ہے"۔ قمر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے صادق کی طرف دیکھا۔ چشم زدن میں وہ اسکو پہچان گئی اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ "صادق تم! ....." اس کے منہ سے نامکمل جملہ نکلا۔ "ہاں میں۔ وہی جس کے متعلق آپ ابھی گفتگو کر رہی تھیں۔ وہی جس کی زندگی ہی اب دل کے بہلاوے کا کھیل کھلونا کر دی تھی۔ جسکو پہلے بھی ایک کھلونا سمجھ رکھا تھا ..... حقیر مٹی کا پتلا ..... جذبات سے عاری ..... اف! تم اسقدر دھوکے باز ہوگی۔ میرے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ قمر! میں نے تمہاری محبت میں اپنی زندگی تباہ کر دی۔ دین و دنیا سے بے خبر ہوکر ذلیل سے ذلیل کام کرنے پر تیار ہو گیا تاکہ تمہاری قربت حاصل ہو سکے اور تمہارے دل میں میری محبت اتنی ہی وقعت ہے؟ اف قمر تم عورت نہیں لیکن مجھکو تم سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے دل پر کوئی چیز اثر نہیں کرسکتی۔ تمہارا دل پتھر کا ہے ....." صادق نے غصہ کی شدت سے ہانپتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور قمر اختر کو استعجاب اور سراسیمگی کی حالت میں چھوڑ کر تیزی سے مکان کے باہر نکل گیا۔ وہ رات کی تاریکی میں تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غصہ سے اندھی ہو رہی تھیں۔ سرد ہوا کے جھونکے اسکو اپنے الاؤ سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سڑک کی سنسان فضا میں صرف اس کے قدموں کی آواز اس کی دل کی تیز دھڑکن کی ہمنوا تھی۔ یکایک وہ رک گیا۔ نازاں کا خوبصورت اور معصوم چہرہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ نازاں اب تنہا اپنے ساتھ میں نے کسقدر بے رحمی کا سلوک کیا۔ کتنی سچی محبت ہے۔ میری کسقدر خدمت کرتی تھی۔ اس دن روانگی والے دن اسکی آنکھیں رونے سے سوج گئی تھیں۔ پھر اس کو وہ جملے یاد آئے جو کہ نازاں نے اس سے رخصتی کے وقت ایک دن چپکے کہے تھے۔ اف کسقدر بے لوث تھی اس کی محبت۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ضرور گاؤں واپس جائے گا۔ وہ نازاں کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرکے قمر کو بتلا دے گا کہ وہ اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے لیکن کیا وہ اس حیثیت کی حالت میں قمر سے زیادہ تہذیب یافتہ، زیادہ رحم دل اور زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ ضرور تھی۔ اس کی پاک اور بے لوث محبت اس کا واضح ثبوت تھی۔ وہ وفا اور الفت کا زندہ نمونہ۔ شرم و حیا کا مجسمہ اور پیکر وفا تھی۔

صادق اسی روز لاہور سے روانہ ہو گیا اور دوسرے روز وہ تیز تیز قدم بڑھاتا گاؤں کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کے بشاش چہرے سے اس کی دلی مسرت کا پتہ چلتا تھا۔ نازاں سے ملنے کی خوشی نے اسکے تھکاوٹ سے چور بدن میں ایک نئی طاقت پیدا کر دی اور وہ تیز گام چلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اسکو محمد بخش کی جھونپڑی دکھائی دینے لگی۔ جھونپڑی کے سامنے اسکو ایک مجمع دکھائی دیا۔ مجمع دیکھ کے وہ ذرا ٹھٹکا "کہیں نازاں کی شادی تو نہیں ہو رہی ہے۔ ضرور محمد بخش نے میرے چلے آنیکے بعد اس کی شادی کہیں طے کر دی ہوگی۔ لیکن میرے پہنچ جانے سے وہ بھی رک سکتی ہے"۔ یہ سوچکر وہ اور تیز قدم بڑھاتا جھونپڑی کے سامنے پہونچ گیا۔ سارے گاؤں والے اسکو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ خاموش مجمع کیوں اکٹھا ہوا۔ اگر شادی ہوتی تو کم سے کم ڈھولک تو ضرور بج رہی ہوتی۔ یکایک اس کی نظر ایک درخت کے نیچے رکھے ہوئے تابوت پر پڑی۔ تابوت کو دیکھتے ہی اس کا دل دہل گیا۔ اسکا دماغ چکرانے لگا اور دل بیٹھتا ہوا معلوم ہوا۔ ایک نامعلوم خوف سے اسکے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور محمد بخش کو دیکھتے ہی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ محمد بخش خود اس کو دیکھ کر مجمع کو چیرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ محمد بخش کا افسردہ اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ انتہائی غیظ کی وجہ سے اس کا سارا بدن کانپ گیا۔ وہ چیخ کر بولا "شاید اب تم پھر اسکو اپنے حسن سے بہلانے آئے ہو مگر اب تم صرف اس کے موت کے جشن میں شریک ہو سکتے ہو۔

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

ایران میں شکر سازی

نوائے معاصر

شکر سازی کی صنعت ایران کیلئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ گنے کی پیداوار اس ملک میں بہت پرانے زمانہ سے ہوتی آئی ہے اور شکر کے خرچ کے لئے ہمیشہ [illegible] تھی۔ اس کا استعمال ہوتا ہی ہے لیکن پرانے زمانہ میں شکر گنے سے بنائی جاتی تھی، اور زمانہ [illegible] سے چقندر سے بنائی جانے لگی ہے۔

حکومت ایران نے ۱۹۳۲ء میں شکر سازی کے دوسرا کارخانہ [illegible] میں قائم کیا۔ پہلا کارخانہ طہران کے قریب [illegible] ۱۸۹۵ء [illegible] نام [illegible] کے علاوہ [illegible] کارخانے [illegible] مختلف مقامات جیسے مشہد، تبریز، [illegible] شاہ [illegible] اور [illegible] ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان قائم ہوئے۔

ایران کے یہ کارخانے [illegible] کارخانوں کی طرز [illegible] گئے ہیں اور ان میں روزانہ [illegible] سے لیکر ساڑھے [illegible] ٹن تک [illegible] آتے ہیں۔ یہاں سادہ شکر، مصری اور مٹھائی کی گولیاں بنائی جاتی ہیں۔

ایرانی سفید شکر کے عادی ہیں اور جو شکر سفید [illegible] وہ ان کو بالکل پسند نہیں آتی۔ اسی لئے ضروری ہے کہ جو شکر وہاں درآمد کی جائے یا خود وہیں بنائی جائے وہ اول درجہ کی صاف اور سفید ہو۔ ایران شکر سازی کیلئے بہت پرانے زمانے سے مشہور چلا آرہا ہے اور اس کی تائید پرانی تاریخوں سے [illegible] ہے۔ شکر سازی کی [illegible] صنعت [illegible] مگر [illegible] اس زمانہ میں [illegible] سفید [illegible] قند کہتے تھے۔ سنسکرت میں قند کا مترادف لفظ "کانڈ" یا "قانڈ" ہے "قاند" کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ قند کے معنی توڑنے کے ہیں۔ پرانے زمانہ میں گنے کو طبی نقطۂ نظر سے بہت مفید سمجھا جاتا تھا۔ جندی شاپور میں ایک مشہور طبی مدرسہ تھا جس کی بدولت گنے کا استعمال ایران میں عام ہو گیا۔ شکر سازی کی صنعت ایران میں ایک ہزار سال سے بھی [illegible] پرانی ہے۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں اس صنعت کو خاص طور پر ترقی ہوئی۔ [illegible] زمانہ حال میں [illegible] خوزستان [illegible] خلیج فارس کی طرف کے علاقوں میں [illegible] [illegible] ان علاقوں میں [illegible] کارخانے کھولے جائیں۔ [illegible] ان کارخانوں میں اتنی شکر بنے گی جو ایران کی نصف سے زیادہ ضرورت پوری کرنے کیلئے کافی ہوگی۔

مذکورہ بالا علاقوں میں شکر بنانے کے لئے جو چقندر [illegible] جاتا ہے وہ زیادہ تر دیہاتی لوگ [illegible] سطح سمندر سے ایک تا سات ہزار فٹ تک کی بلندی پر اگاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کوہستانی علاقوں میں بارش کم ہوتی ہے اور کاشت [illegible] زیادہ تر آبپاشی پر ہے۔ اس لئے عام طور پر کاشت کاروں کو [illegible] کھودنے [illegible] یہ چقندر [illegible] کے مہینہ میں [illegible] ہو جاتے ہیں۔ [illegible] کا سلسلہ دسمبر تک جاری رہتا ہے۔

صنعت و حرفت کا سرکاری محکمہ جس کی نگرانی میں سب کارخانے چل رہے ہیں چقندر بونے والے کسانوں کو بیج مہیا کرتا ہے۔ کاشت کے زمانہ میں یہ محکمہ کسانوں کی دوسری ضروریات (ٹریکٹر، ہل وغیرہ) بھی پوری کرتا ہے۔ ان سب مشکلات کے باوجود ایران کا چقندر دوسرے شکر ساز ملکوں کے بہترین چقندر کا ہم پلہ ہوتا ہے۔ اس وقت ایران میں ہر سال اتنی شکر پیدا ہوتی ہے کہ وہ ملک کی ایک تہائی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے۔ اگر چقندر کافی مقدار میں ملتا رہے تو ہر سال [illegible] پچاس ہزار ٹن تک شکر بنائی جا سکتی ہے۔ اس وقت جن علاقوں میں چقندر [illegible] پیداوار ہوتی ہے ان کا رقبہ تقریباً ساٹھ ہزار ایکڑ ہے۔ [illegible] ایک ہیکٹر [illegible] چقندر [illegible] کیلوگرام شکر نکلتی تھی مگر اب [illegible] کیلوگرام تک شکر نکلنے لگی ہے (ایک کیلوگرام [illegible] پونڈ) خاص طور پر ۱۹۴۲ء میں اگرچہ ایران عملی طور پر جنگ میں شریک نہیں ہوا لیکن جنگ کے قدرتی اثرات اس ملک پر بھی پڑے۔ [illegible] [illegible] شکر کی قیمت [illegible] بیرونی ملکوں [illegible] ذریعہ دریافت کر سکتے ہیں۔ ایران میں [illegible] شکر [illegible] [illegible] جاپان وغیرہ سے زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایران نے شکر سازی کی صنعت [illegible] عام اقتصادی ترقی [illegible] ایک شاخ [illegible] عام ترقی [illegible] [illegible] صلاحیت [illegible] ذاتی امداد کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کلی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایران ترکیہ کی طرح مشرقی دنیا کی [illegible] کامیاب ہوا۔

فریب

بقیہ صفحہ ۴۲

تم میری [illegible]۔ ہاں تم ہی سے کہہ رہا ہوں۔ تم [illegible] کو اپنے دامِ الفت میں پھانستے [illegible]۔ [illegible] انکو اپنی باتوں [illegible] مرعوب کرتے ہو۔۔۔۔ آخر کیوں؟ جب تم ان کو اتنا [illegible] سمجھتے ہو کہ ان سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے تو کیوں محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو۔ [illegible] سسکتا ہوا چھوڑ کے [illegible] آخر میری نازاں نے [illegible] کیا بگاڑا تھا جو تم نے اس سے [illegible] انتقام لیا؟۔۔۔ [illegible] تہذیب یافتہ سمجھتے ہو تم کو اپنی تعلیم پر ناز ہے اور ہم کو غیر [illegible] سمجھتے ہو لیکن تم تعلیم یافتہ ڈاکوؤں سے ہم ان پڑھ گنوار [illegible] عورت کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ محمد بخش غم و غصہ سے [illegible] ہو رہا تھا [illegible] چیخ چیخ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا کہ عادف [illegible] زمین پر گر پڑے وہ چونک [illegible] کی طرف [illegible] لیکن وہ مر چکا [illegible]۔ [illegible] اس کی [illegible] تابوت پر گڑی ہوئی تھیں اور [illegible] اپنے [illegible] معافی مانگنے [illegible] گیا ہو۔

ڈی ہائیڈریشن

علی ارشاد نقوی

آج سے صدہا سال پیشتر بھی لوگ پھلوں اور ترکاریوں کو خشک کر کے ان کا استعمال کرنا جانتے تھے لیکن ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ چیزیں خشک ہونے کے بعد اسی قدر مفید رہتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر خشک ہونے پر وہ ویسی مفید نہیں رہتیں تو ان میں وہ کونسی ایسی شے ہے جو ضائع ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ پھلوں ترکاریوں کو دھوپ میں سکھا لینے سے وہ زیادہ عرصے تک خراب ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ رفتہ رفتہ سائنسدانوں کی توجہ اس طرف منتقل ہوئی اور انھوں نے اس امر کی دریافت کیلئے تجربے کرنا شروع کئے کہ خشک ہونے پر خشک شدہ شے کی غذائیت پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ڈیپارٹمنٹ آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ نے کھانے کی اشیاء کی رطوبت کو خشک کرنے پر ایک باقاعدہ تحقیقات شروع کی۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد لڑائی چھڑ گئی اور یہ کام پس پشت ڈال دیا گیا۔

ابھی لڑائی کو شروع ہوئے ایک ہی سال گذرا تھا کہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ فوج کے لئے اگر خشک شدہ اشیائے خوردنی مہیا کی جائیں تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی رطوبت کو پھر خشک کرنے کی ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔ یہ کام سنہ ۱۹۴۰ء میں پھر سے شروع ہو گیا۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ایک کامیاب آلہ ترکاریوں کو خشک کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور اس وقت سے ویجیٹیبل ڈی ہائیڈریشن (Vegetable Dehydration) یعنی باقاعدہ ترکاریوں کو خشک کرنے کے طریقے عمل میں آئے۔

یوں تو کسی ترکاری کو خشک کرنا مشکل نہیں لیکن ڈی ہائیڈریشن کا مقصد ہی کچھ اور ہے۔ ڈی ہائیڈریشن میں کئی چیزوں کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ خشک کی ہوئی ترکاری پانی میں ڈالنے پر ایک متعینہ وقت میں اپنی اصلی حالت پر آ جائے۔ دوسرے یہ کہ پکنے پر اس کا ذائقہ ایسا ہی ہو جیسا کہ تازی ترکاری کا ہوتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ اس کی غذائیت میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

ان تینوں شرائط کی تکمیل کے لئے مختلف چیزوں کو ڈی ہائیڈریٹ کرنے کے لئے مختلف طریقوں کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کھانے کی اشیاء کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً ترکاریاں دوئم گوشت و دیگر اشیا۔

ترکاریوں کو خشک کرنے کے لئے ایک باقاعدہ تدبیر پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس میں سب سے پہلی چیز صفائی ہے۔ جڑوں میں پیدا ہونے والی ترکاریاں پہلے خوب اچھی طرح سے دھوئی جاتی ہیں۔ یہ کام ایک محوری گردش کرنے والی مشین سے لیا جاتا ہے۔ جب ترکاری خوب صاف ہو جاتی ہے تو اسے چھیلا پھر تراشا جاتا ہے۔

ترکاریوں کو چھیلنے کے لئے کچھ مشینیں بھی بنائی گئی ہیں جن سے کہ ۴۵ سکنڈ میں ۵ من آلو تک چھیلا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ مشینیں ہر ترکاری کے لئے استعمال نہیں کی جا سکتیں۔ آلو۔ گاجر اور شلجم وغیرہ ان مشینوں سے آسانی کے ساتھ چھیلے جا سکتے ہیں لیکن پیاز اور اس قسم کی دوسری ترکاریوں کے لئے یہ مشینیں موزوں نہیں۔ کیونکہ پیاز اوّل تو اس مشین سے چھلتی ہی نہیں اور اگر چھلتی بھی ہے تو بہت موٹے چھلکے اترتے ہیں۔ اس طرح سے بہت سی پیاز ضائع ہو جاتی ہے۔ اسی سبب سے پیاز زیادہ تر ہاتھ سے چھیلی اور تراشی جاتی ہے۔ اس کے بعد ترکاری کے حسب دلخواہ ٹکڑے کر لئے جاتے ہیں۔ اب یہ ترکاری بلانچنگ[۵۱] کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

بلانچنگ کٹی ہوئی ترکاری کو گرم پانی یا بھاپ میں ابالنے کو کہتے ہیں۔ یہ زیادہ آسانی سے ابلتے ہوئے پانی کے چھوٹے چھوٹے حوضوں میں کی جاتی ہے۔ بھاپ والے بلانچرز[۵۲] کا استعمال بھی اکثر کیا جاتا ہے۔ بلانچنگ کئی وجوہات سے اشد ضروری ہے۔ اولاً اگر بلانچنگ نہ کی جائے تو خشک ہونے پر ترکاری کا رنگ خراب ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بلانچنگ خشک شدہ ترکاری میں کیمیاوی خمیر پیدا ہونے سے روکتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس کے سبب ترکاری کو خشک ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ بعض بعض ترکاریوں مثلاً پیاز اور ٹماٹر وغیرہ میں بلانچنگ کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ پیاز کے رنگ کو محفوظ رکھنے کے لئے کٹے ہوئے پیاز کے ٹکڑوں کو چار یا پانچ منٹ تک ٹھنڈے پانچ فیصدی نمک کے حل شدہ پانی میں رکھتے ہیں۔ آلو کو بلانچ کرنے کے لئے اس کو تقریباً پانچ منٹ ایسے پانی میں ابالتے ہیں جس کی حرارت قریب ۲۰۰ ڈگری فارن ہائٹ ہو۔ گوبھی کو تقریباً ایک منٹ گرم ایک فیصدی سوڈیم بائیکاربونیٹ کے حل میں ابال کر بلانچ کیا جاتا ہے اور مٹر کو گرم پانی سے بلانچ کر لیتے ہیں۔

بلانچ کے بعد ترکاری کو ڈی ہائیڈریٹر[۵۳] میں خشک کیا جاتا ہے۔ ڈی ہائیڈریٹر کئی اقسام کے ہوتے ہیں لیکن جو آج کل بہت عام ہے وہ سرنگ نما[۵۴] ڈی ہائیڈریٹر کہلاتا ہے۔ اس میں لمبی لمبی بنبوں کے

---

۵۱ بلانچنگ (Blanching) اس کے لفظی معنی ہیں سفید کرنا یہاں یہ لفظ اسلئے استعمال کیا جاتا ہے کہ بلانچنگ ترکاری کے رنگ کو خراب نہیں ہونے دیتی

۵۲ بلانچنگ کرنے والے آلے۔

۵۳ خشک کرنے والا آلہ

۵۴ اس کو انگریزی میں (Funnel-type Dehydration) کہتے ہیں

بنی ہوئی سرنگیں ہوتی ہیں جن کے دونوں طرف دروازے لگے رہتے ہیں۔ ان سرنگوں کے اوپر یا نیچے بڑی بڑی بھٹیاں بنی ہوتی ہیں۔ یہ بھٹیاں لوہے کی ان بڑی نلیوں کو جو کہ ان کے اندر سے ہو کر گذرتی ہیں گرم کرتی ہیں۔ جب یہ نلیاں گرم ہو جاتی ہیں تو بڑے بڑے بجلی کے پنکھوں کے ذریعے ان کے اندر کی ہوا کو سرنگ میں داخل کر دیا جاتا ہے جہاں یہ گرم ہوا رطوبت کو خشک کرنے کا کام کرتی ہے۔

ترکاری کو بلانچنگ کے بعد جالی نما کشتیوں میں چن دیا جاتا ہے۔ یہ کشتیاں پہیے دار گاڑیوں پر تلے اوپر بیچ بیچ میں تھوڑی جگہ چھوڑ کر رکھدی جاتی ہیں جب گاڑی بھر جاتی ہے تو سرنگ کے اندر دھکیل دی جاتی ہے۔ ایک ایک سرنگ میں کئی کئی گاڑیاں رکھی جاتی ہیں۔ جب سرنگ میں جگہ نہیں رہتی تو اس کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں اور گرم ہوا تیز [illegible] ترکاری پر سے گذرتی ہوئی اس کی رطوبت کو خشک کر دیتی ہے۔ ہر ایک ترکاری کو خشک کرنے کے لئے ایک خاص درجہ حرارت کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وقت کی پابندی کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ علاوہ آلو کے جو کہ خشک ہونے میں آٹھ گھنٹے تک لے لیتا ہے سب ترکاریاں پانچ سے چھ گھنٹے کے اندر ہی اندر خشک ہو جاتی ہیں۔ آلو کے لئے سرنگ کی ہوا کا درجہ حرارت ۱۵۰ ڈگری فارن ہائیٹ سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس درجہ حرارت کے اوپر خشک شدہ آلو کا رنگ بھورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پیاز، شکر قند اور گوبھی کو خشک کرنے کے لئے موزوں درجہ حرارت ترتیب وار ۱۴۰ ڈگری فارن ہائیٹ، ۱۵۵ ڈگری فارن ہائیٹ اور ۱۴۵ ڈگری فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔ ہوا کے درجہ حرارت کو زیادہ بڑھا دینے سے ترکاری کا رنگ خراب ہونے اور اس کے جل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اگر وقت کی بچت منظور ہو تو ہوا کی رفتار تیز کر دینا زیادہ مناسب ہے۔ بعض بعض ترکاریاں مثلاً گاجر وغیرہ میں درجہ حرارت کا کچھ بڑھا دینا زیادہ نقصان دہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ چیزیں کافی حرارت برداشت کر سکتی ہیں۔

ترکاریوں کو خشک کرنے میں رطوبت کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور ان میں چھ فیصدی سے زیادہ رطوبت باقی نہیں رکھی جاتی کیونکہ رطوبت زیادہ باقی رہ جانے پر خشک شدہ ترکاری جلد ہی خراب ہو جاتی ہے اور اس میں خمیر پیدا ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہر ایک ترکاری کا لحاظ کرتے ہوئے مقررہ مقدار سے کم ہو جانا بھی مضر ہے۔ کیونکہ پانی میں تر کرنے سے سوکھی ہوئی ترکاری کی ساخت ٹھیک نہیں ہوتی اور مزے میں بھی فرق آ جاتا ہے۔

خشک ہونے کے بعد ترکاری میں سے خراب ٹکڑے چن کر الگ کر دئے جاتے ہیں اور اچھے ٹکڑے پیپوں میں بھرنے جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ترکاریوں کی طرح گوشت بھی خشک کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ڈی ہائیڈریٹ کرنے کا طریقہ بھی قریب قریب ویسا ہی ہے جیسا کہ ترکاریوں کا۔ گوشت کو پہلے خوب صاف کیا جاتا ہے اور سب چربی علیحدہ کر دی جاتی ہے۔ چربی کا علیحدہ کر دینا انتہائی ضروری ہے کیونکہ یہ ڈی ہائیڈریشن میں بہت رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ جب چربی کا ذرا سا ٹکڑا بھی باقی نہیں رہتا تو ہڈیاں نکال ڈالی جاتی ہیں اور گوشت مہین مہین کوٹ ڈالا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس لئے کئے جاتے ہیں کہ ڈی ہائیڈریشن میں آسانی رہے۔ بڑے ٹکڑے پوری طرح سے خشک نہیں ہوتے۔

یہ قیمہ کیا ہوا گوشت دو یا تین منٹ کے لئے دس فیصدی نمک کے حل شدہ پانی میں رکھا جاتا ہے۔ اس سے گوشت کافی عرصے تک محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس نمک میں تر کئے ہوئے گوشت کو کشتیوں پر لگا کر ڈی ہائیڈریٹر میں خشک کر لیا جاتا ہے۔ خشک ہونے میں گوشت تقریباً نو گھنٹے لیتا ہے۔ خشک کیا ہوا گوشت بھورا چھوٹے چھوٹے مٹر کے دانوں کی شکل کا ہوتا ہے اگر اسکو چٹکی سے مسل دیا جائے تو یہ سفوف کے مانند ہو جاتا ہے۔ خشک شدہ گوشت کو اگر کچھ دیر پانی میں پڑا رہنے دیا جائے اور اس کے بعد پکایا جائے تو اس کا مزا بالکل تازے گوشت کا سا ہوتا ہے۔

انڈے کو بھی ڈی ہائیڈریٹ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے خشک کرنے کی کوئی زیادہ کارگر ترکیب ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ پھر بھی کچھ کامیاب تجربے اسکو خشک کرنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ ان کے لحاظ سے انڈے کو خشک کرنے کے لئے پہلے اس کی زردی کو خوب پھینٹا جاتا ہے۔ پھر اسکو مہین مہین ریزوں کی شکل میں شیشوں پر چھڑک کر خشک کیا جا سکتا ہے۔

خشک شدہ چیز کے بند کرنے کا مسئلہ بھی قابل غور ہے کیونکہ خشک ہونے کے بعد ہر چیز میں رطوبت کو جذب کرنے کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ فضائی رطوبت کو جذب کر لیتی ہے۔ اس واسطے ڈی ہائیڈریٹ کی ہوئی چیز کو یا تو ایسے پیپوں میں بند کیا جائے جس میں ہوا کا دخل نہ ہو یا ایسے پیپوں میں جن میں کہ کاربن ڈائی آکسائڈ یا نائٹروجن بھری ہو۔

باوجود ان تمام تمام دقتوں کے جو کہ ڈی ہائیڈریشن میں پیش آتی ہیں یہ ایک بہت ہی کارآمد چیز ثابت ہوئی ہے اور وہ سہولتیں اور آسانیاں جو ہمیں ڈی ہائیڈریشن سے پہنچی ہیں ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم ان تمام دقتوں کو نظرانداز کر دیں جو کہ دوران ڈی ہائیڈریشن میں ہم کو پیش آتی ہیں۔ اس لڑائی کے زمانے میں جبکہ ریل میں جگہ کی سخت دقت تھی ہم کئی کئی من ترکاری چند چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا سکتے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ کئی مہینے تک یہ ترکاری خراب نہیں ہو سکتی۔ علاوہ اس کے پکانے پر مزا بالکل وہی جو کہ تازی ترکاری کا ہوتا ہے۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

بہار میں اردو ناول نگاری

اختر اورینوی

آجکل کی کسی گذشتہ اشاعت میں میرا ایک طویل مضمون "بولیوں کا سنگم" شائع ہوا تھا، میں نے اس کے ذریعہ یہ عرض کیا تھا کہ اردو زبان و ادب اپنی تخلیق و ترویج و ترقی کے لحاظ سے ہندوستان گیر رہے ہیں۔ گلستان اردو ساحل سندھ پر لہلہایا۔ آدی، نربدا و تاپتی کے کنارے اس نے اپنی بہار دکھائی، گوداوری، کرشنا اور کاویری کے چمنوں میں اپنا رخ حسین دکھایا۔ گنگ و جمن کے تیر میں اس پر جوبن آیا اور ستلج و برہم پترا کی گودوں میں بھی یہ پھولا پھلا۔ غرض یہ عروس نوبہار سارے دیس کی آغوش میں پل کر سب کی آنکھوں کی پتلی بنی، سب کے دلوں میں اتری۔ اور اب تو ایک عالم کے دل میں گھر کر کے جہانگیر و جہاندار ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی نور جہانی کے اپنے پرائے سب ہی قائل ہوتے جا رہے ہیں۔

میں آج کی صحبت میں داستان اردو کا ایک ورق پیش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ ورق خود داستاں بہ کنار ہے۔ میں دریا کو کوزے میں بند کر کے حاضر خدمت کرتا ہوں۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ ۶۰ سال کے اندر کی بات ہے۔ اردو کے دو سرچشمے ہیں۔ فارسی اور عربی ادب کی روایات اور بھاشا اور سنسکرت کی روایتیں۔ موجودہ معنوں میں اردو کے دونوں مصدروں میں ناول کی خبریں نہیں ملتیں۔ یوں تو نہایت ہی بالیدہ و طویل داستانوں کی روایات عربی، فارسی ادب میں پائی جاتی ہیں۔ اور سنسکرت و بھاشا میں بھی ضمنیاتی رنگ کی طویل داستانیں ملتی ہیں۔ الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ، پرانک کتھائیں، مشرقی رزمیہ داستانیں مثلاً رامائن، مہابھارت، شاہنامۂ فردوسی اور ہماری قدیم مثنویاں یہ سب ناول کی پیش رو تو کہی جا سکتی ہیں لیکن ناول نہیں کہی جا سکتیں۔ ان سبھوں میں میرا خیال ہے کہ الف لیلہ اپنی سیرت نگاری، تنوع، وسعت، رنگارنگی اور وسیع البنیادی کے سبب سے زیادہ ناول کے قریب ہے۔ دراصل اردو ناول کی پیدائش ایک تیسرے مصدر سے ہوئی ہے۔ مغربی ادب اردو کے لئے نئی روایات لایا ہے۔ اردو زبان کے دو ہی اہم مصدر تھے۔ اب اردو ادب کے تین مصادر ہو گئے۔ سنسکرت اور بھاشا کا ادب، عربی و فارسی ادب اور انگریزی و دیگر یورپی ادب۔ ہمارے یہاں ناول نگاری کی ابتدا انگریزی تہذیب کے اثرات کے ماتحت ہوئی ہے۔

مغرب میں ناول ایک نہایت ہی ترقی یافتہ فن بن چکا ہے۔ اس کی خاص تکنیک ہوتی ہے۔ اس کی تعمیر و تشکیل کے مقررہ قواعد ہیں اور اس کی ہیئت و قماش کے متعدد اصول و ضوابط۔ ناول کے بنیادی و تنظیمی ضابطے میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ "ڈیزائن" میں تنوع اور جدت ہو سکتی ہے۔ میری ناچیز رائے میں اردو ناول نگاری ہنوز فنکارانہ بلوغت و پختگی حاصل نہیں کر سکی۔ لہٰذا اس کے ابتدائی دور میں تکنیک کا کمال ڈھونڈنا عبث ہوگا۔ تاہم دور اولین میں بھی اتنا تو صاف نظر آتا ہے کہ نئے افسانوی شعور کے زیر اثر داستان سرائی شروع ہوئی۔ نئی تراش خراش اور نئے رنگ روپ پیش کئے گئے۔ ہمارے اردو قصوں میں ایک نئے ضابطے، نئے قرینے اور سلیقے کا واضح اظہار نظر آتا ہے۔

دور اولین کی ناول نگاری کے سلسلے میں دہلی اور لکھنؤ کا نام تو لیا جاتا ہے لیکن عظیم آباد کو ارباب تاریخ ادب فراموش کر گئے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ بے اعتنائی یا نارسائی۔ ایک ان کی بے وسعتی دل کی حرف گیر ہے اور دوسری وسعت نظر کی۔ ان کی بے اعتنائی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ اردو کی کل ہند اصلیت و اہمیت کو نہ سمجھے۔ اور ان کی نارسائی اس امر کا پردہ فاش کرتی ہے کہ وہ اپنے گہوارے کو سارا جہان سمجھ بیٹھے۔ اور ہوا یہ کہ اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہ گئی۔ اب تک کی تحقیقات سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اردو ناول نگاری کی شروعات نذیر احمد دہلوی نے کی۔ ان کی ابتدائی کتابوں سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے تو "توبۃ النصوح" اور "ابن الوقت" اردو کی پہلی ناولیں کہی جا سکتی ہیں۔ یہ دونوں ناولیں اواخر انیسویں صدی عیسوی کی پیداوار ہیں۔ ان کے بعد اردو میں ناول نگاری کا سلسلہ پیدا ہوا اور اچھی بری بہتیری ناولیں لکھی گئیں۔ دلی نے دور اولین میں دو ممتاز و مشہور ناول نگار پیدا کئے۔ نذیر احمد اور راشد الخیری۔ لکھنؤ نے بھی اس عہد میں دو معروف ناول نگار پیش کئے۔ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر۔ اسی زمانہ میں عظیم آباد نے چار ناول نگاروں کو جنم دیا۔ جن میں ایک خاتون تھیں۔ یہ خاتون غالباً سب سے پہلی ناول نگار ہیں۔ یعنی بیگم مولوی یحییٰ علی صاحب (خدیجۃ الکبریٰ)۔ آپ نے "اصلاح النساء" ایک سماجی اصلاحی ناول لکھی۔ ان خاتون محترمہ کے علاوہ شاد عظیم آبادی کی ناول "صورۃ الخیال" تین حصوں میں شائع ہوئی۔ سید علی سجاد عظیم آبادی نے دو حصوں میں "دلِ نمانہ" ناول پیش کی۔ اور سید افضل الدین عظیم آبادی نے ایک طویل ناول "فسانۂ خورشیدی" کے نام سے لکھی۔ یہ چاروں ناولیں کئی کئی بار چھپیں اور ان کی خوب دھوم مچی مگر حیرت ہے کہ سکسینہ نے بھی ان کا تذکرہ تک نہ کیا۔ حامد حسن قادری کی "داستان تاریخ اردو" میں بھی ان ناولوں کا نام نظر نہیں آتا۔ محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری اور دوسرے جدید ناقدین فن نے ترچھی نظروں سے بھی اس طرف نہ دیکھا۔ پروفیسر احسن مارہروی مرحوم اس دربار سے تعلق دیرینہ کے باوجود عہد قدیم میں حضرت عماد و سجاد پھلواروی کے

نثری نمونہ ہائے تحریر اور عہد جدید میں شاد و تجاد عظیم آبادی کی غزلوں سے نثری نمونے اپنی کتاب "تاریخ نثر اردو" میں شامل کرنا بھول ہی گئے خود بہاری تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے بہار کی ادبی کاوشوں اور نثری کارناموں کی پیشکش نثری اور نظموں کا حق ادا نہ کیا صفیر بلگرامی، بسمل، خضر اور نواب امداد امام اثر عظیم آبادی نے بھی اپنی کتابوں میں بہار کی ادبی تاریخ پر اور بار روشنی نہیں ڈالی۔ نصیر حسین خیال عظیم آبادی نے ..... اردو کے قصے کے بعد اپنے ہمعصروں کا خیال آیا تو انھوں نے ..... عظیم آبادی کی ..... ناول کے متعلق کچھ لکھا۔ مگر وہ کبھی شائع نہ ہوا ..... اکتوبر نومبر ..... اس کا ..... مقالہ کی اشاعت کا ..... حق تو یہ ہے کہ بہار کی ..... ادب کی تاریخ ..... موضوع ہے اس ..... اسباب لکھنے کی ضرورت ہے جو بہار کی ..... تاریخ ..... قدیم ترین تاریخ سے انکا تعلق ہے اور اس کے ..... دلی کے ویرانے سے جا بسے ہیں پھر یہ دبستان دلی و دبستان لکھنؤ کے ساتھ متوازی چلتی ہوئی شاد عظیم آباد پر آکر ختم ہوتی ہے ..... عصر حاضر ..... بہار ..... ادیبوں کا ذکر کرتی ہے ..... عظیم آبادی صاحب "کل نظر" سے ہوتی ..... آغاز ..... بہار کی ادبی ..... انبار کی جا رہی ہے ..... ہوگی۔

(۱) شاد عظیم آبادی

شاد کی شخصیت عجیب و غریب تھی ..... بطل جلیل ایک نابغہ عظیم تھا۔ شاعری میں وہ صرف ..... عظیم آبادی اور راسخ و جوشش عظیم آبادی کا خلف رشید ہی نہیں تھا بلکہ مرثیہ نگاری میں اس نے لکھنؤ کے فن کی خوش ..... بھی کی۔ بقول نفیس لکھنوی کا قول ہے کہ شاد عظیم آبادی انیس کے پایہ کے مرثیہ نگار تھے۔ افسوس کہ اب تک شاد کے مراثی شائع نہیں ہوئے۔ ورنہ اہل ادب دیکھتے کہ شاد نے انیس کی روایات فن میں کیسے کیسے نادر اضافے کئے ہیں۔ شاد نے مرثیوں کے متن ..... لکھے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں چھ چھ سات سات مرثیے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی نواسہ نہراد فاطمی بیرہ شاد کے پاس موجود ہیں۔ نہراد فاطمی ایم۔ اے اردو کلاس میں جب میرے شاگرد تھے تو میں نے ان مرثیوں کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دلائی مگر "تیاگ" کا مادہ بہاریوں کے مزاج میں کچھ ایسا پایا جاتا ہے کہ لا مان۔ شاد کے مرثیے ایک علیحدہ مضمون ہے۔ جو مختصر ہو تو مقالہ ورنہ ایک کتاب۔ "انیس المتغزلین اور امام مرثیہ نگار شاد عظیم آبادی" ناول نگاری کی اقلیم کا بھی تاجدار ہے۔ شاد ایک اعلیٰ شاعر اور بلند مرثیہ نگار تھا۔ ناول کے علاوہ بھی شاد نے نثر میں کئی کتابیں تحریر کیں، مثلاً حیات فریاد اور "صورت حال" (۱۸۹۰ء)

فی الحال ان کی ناول نگاری سے بحث ہے۔ اہل طرز کی حیثیت سے شاد کو روشناس کرانا علاوہ ..... کا متقاضی ہے۔

شاد نے "صورت الخیال" تین حصوں میں لکھی۔ یہ ایک عبرت انگیز اثر خیز داستان ہے کسی صاحب عفت و عصمت کا بیان ہے۔ جو ملتی ہے تین جلدوں پر پہلی جلد الموسوم بہ "صورت الخیال" مصنفہ جناب مولوی سید علی محمد شاد ..... مطبع ..... صادق ..... عظیم آباد میں چھاپی گئی ۱۸۷۶ء۔ ناظرین نے ملاحظہ فرمایا کہ اس کی اشاعت ابھی سن ..... سال میں ہوئی ہے جبکہ "توبۃ النصوح" "ابن الوقت" ..... لکھی گئیں۔ ..... میں نہ کسی طلسم کے باندھنے اور توڑنے کا ..... ہے ..... دیو و پری کا ڈھکوسلہ ہے۔ نہ کسی ایسے انوکھے مقام و انوکھی باتوں کا بیان ہے ..... زمین میں ملے نہ آسمان پر۔ حتی الوسع اس خیالی ..... میں فطری حالات ..... کی گئی ہے (دیباچہ از مصنف) اس ناول ..... میں ایک عفت مآب خاتون موسوم بہ ولایتی ہے۔ جو ماں باپ شوہر کی سب ..... کے ..... عصمت ..... کرتی ہے۔ وہ شوہر کے افعال ذمیمہ ..... کہ ..... نہیں جانتی ..... جب کسی عورت ..... اندر ..... گرفتار ہوتا ہے ..... جشن ..... بن جاتا ہے تو وہ اس کے ساتھ ہے۔ "غلاق ..... کا دانا ..... ہے ..... اخلاق کی ..... اور ..... ذاتی ..... یہ ناول ..... واردات، تجربات، ..... اور ..... آزمائش کی دلچسپ داستان ہے پرنسپل صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ اس ناول کے متعلق ڈائرکٹر صاحب بہادر پبلک انسٹرکشن سررشتہ تعلیم گورنمنٹ بنگال کو بتاریخ ۱۲ فروری ۱۸۹۱ء لکھتے ہیں۔

"..... یہ رپورٹ ..... ایک ہندوستانی ناول کے جو ملقب بہ صورۃ الخیال تصنیف سید علی محمد متوطن عظیم آباد ہے میں آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مجھے اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ جس قدر ناولیں ہندوستانی زبان میں پڑھی ہیں، ان میں یہ ناول سب سے بہتر ہے۔ ...... قصے کی سرگذشت کی تحریر میں مبالغہ یا امورات غیر متحمل الوقوع کو دخل نہیں ہے اور بیان سوانحات کے بعد دیگرے اس طرح مسلسل ہے کہ توجہ پڑھنے والے کی ابتدا سے انتہا تک برابر قائم و مصروف رہتی ہے ..... ہر شخص جس کا بیان اس قصے میں کیے ہیں وغیرہ ہے یعنی آقا، بی بی، نوکر، انگریز یا ایم ..... اپنی خاص وضع کی ہندوستانی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ ...... ہماری رائے میں یہ ناول اپنے ماقبل کے تصانیف مرآۃ العروس و بنات النعش سے باعتبار حیثیت ادب و انشا کے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ ...."

مندرجہ بالا حوالے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "صورۃ الخیال" بلحاظ "توبۃ النصوح" اور "ابن الوقت" سے پہلے کی ناول ہے کیونکہ اس عبارت میں ان کا تذکرہ

(۲) خدیجۃ الکبریٰ بیگم مولوی یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی

بہار کی دوسری ناول نگار ہستی ایک خاتون محترم کی ہے۔ انھوں نے ایک اعلیٰ اصلاحی ناول "اصلاح النساء" نہایت شستہ، بامحاورہ، سادہ گھریلو زبان میں تصنیف کی۔ یہ ناول بھی اسی عہد کی تخلیق ہے۔ اندرونی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب "مرآۃ العروس" کے بعد لکھی گئی۔ "اللہ مولوی نذیر احمد صاحب کو عاقبت میں اچھا بڑا انعام دے! ان کی کتاب کے پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جہاں تک ان کو معلوم تھا انھوں نے لکھا۔ اور اب جو ہم جانتے ہیں اس کو انشاء اللہ تعالےٰ لکھیں گے۔ جب اس کتاب کو لڑکیاں پڑھیں گی تو مجھے خدا سے امید ہے کہ انشاء اللہ سب "اصغری" ہو جائیں گی۔ شاید سو میں ایک اپنی بدقسمتی سے "اکبری" رہ جائے تو رہ جائے۔ میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہوگی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہوگا۔ اور سمجھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھ دیکھی بات لکھی ہے۔۔" کردار، واقعات اور فضا سب اپنے اندر مقامی رنگ رکھتے ہیں۔ بسم اللہ اور اشرف النساء اہم ترین سیرتیں ہیں۔ اجزاء (پلاٹ) کے اعتبار سے یہ صورت حال سے کم تر درجہ کی چیز ہے۔

(۳) سید افضل الدین عظیم آبادی

بہار کے تیسرے ناول نگار سید افضل الدین صاحب عظیم آبادی گذرے ہیں۔ آپ نے "فسانۂ خورشیدی" کے نام سے ایک ضخیم ناول لکھی۔ اس کی ہیروئین ظاہر ہے کہ خورشید بیگم ہیں۔ پہلے اڈیشن کا سال اشاعت ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۶ء ہے۔ آہ عظیم آبادی نے تاریخ کہی ہے "سعادت کی کیمیا یا خوب" (۱۳۱۳ھ)۔ یہ کتاب مطبع شمسی واقع گورہٹہ پٹنہ سیٹی میں چھپی۔ طبع دیباچہ میں خود مصنف لکھتے ہیں:-

چاہتے ہو بقائے نام اگر	تم بھی ناول کرو کوئی تسطیر
پر ہے یہ شرط خوب یاد رہے	ہو زوائد سے دور وہ تحریر
ہو نہ کچھ سحر اور فسوں کا بیاں	دیو اور جن کی جس سے ہو تسخیر
ہو نہ اس خواب کا کبھی اظہار	ٹھیک جس کی نہ ہو سکے تعبیر
ہو نہ اس حسن و عشق کی توصیف	جن کو سمجھیں خیال کی تصویر

(۴) سید علی سجاد صاحب سجاد عظیم آبادی

چوتھے فن کار سید علی سجاد صاحب ہیں۔ آپ پریزیڈنٹ اردو لائبریری سوسائٹی عظیم آباد اور مترجم محکمہ تعمیرات سرکار نظام تھے۔ آپ کا ناول "محل خانہ" "مفید عام پریس آگرہ" سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ علی سجاد کا وہی درجہ ہے جو مرزا رسوا مصنف امراؤ جان و شریف زادہ و ذات شریف کا دبستان لکھنؤ میں ہے۔ اس حیثیت سے دتی کے دبستان میں مرزا محمد سعید مصنف "یاسمین" و "خواب ہستی" کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ "محل خانہ" ناول دو حصوں میں شائع ہوئی۔ دونوں حصے خاصے ضخیم ہیں۔

"یہ ایک ادبی تخیل اور اخلاقی ناول یا رسم و رواج کی سچی تاریخ ہے جس میں شادی غمی و ولادت کی رسمیں بیگمات لکھنؤ کے عادات و اطوار۔ ان کی نشست برخاست۔ ان کی تہذیب۔ اخلاق۔ رنگ روپ۔ خانہ داری اور ملاقات کے طریقے۔ آپس کا شوق۔ جوش محبت۔ ان کی بے تکلفیاں۔ لڑائی جھگڑے۔ ان کے مذاق لطیفے۔ شستہ روزمرے۔ گلے شکوے۔ پند و نصیحت کی داستانیں۔ ساس بہوؤں کی بدمزاجیاں۔ بداخلاقیاں۔ آپس کی رنجشیں۔ ان کے برے نتائج۔ اصلاح کی صورتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ خاص محلات لکھنؤ کی شیریں زبان اور اعلیٰ درجہ کے فصیح محاورات میں عجیب دلکش عنوان سے لکھی گئی ہے۔"

میں نے محض سرسری طور پر برائے تعارف بہار کے ممتاز ناول نگاروں کو دنیائے اردو کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان پر سیر حاصل نقد و تبصرہ کے لئے پوری ایک کتاب چاہئے:

ڈی ہائیڈریشن

بقیہ صفحہ ۴۳

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لڑائی کے ختم ہوتے ہی ڈی ہائیڈریشن کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی وجہ اس طرف ذوق پیدا نہ ہونا ہے۔ اب بھی یہ ایجاد بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ کہا جائے گا کہ ہندوستان میں اسقدر ترکاری پیدا ہوتی ہے کہ لوگ تازی سبزی سے سال بھر گذارہ کر سکتے ہیں اس لئے کیوں یہ مصیبت مول لی جاتے۔ کیا اس کا جواب یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر ہندوستان میں سبزی زیادہ پیدا ہوتی ہے تو ہم غیر ملکوں سے جہاں ترکاری کی پیداوار کم ہے خشک شدہ ترکاری کی تجارت کریں۔ اس طرح سے ہم اپنے ملک کی ایک صنعت میں اضافہ کرنے کے علاوہ ہزاروں بیکار لوگوں کو کام سے لگا سکتے ہیں۔ علاوہ اسکے خشک شدہ گوشت، انڈا اور دودھ وغیرہ کی مانگ ہمارے ملک ہی میں بہت کافی ہے۔ اگر ترکاری نہیں تو گوشت اور دودھ وغیرہ کو ڈی ہائیڈریٹ کر کے بہت کچھ فائدہ اٹھایا اور پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہ تمام باتیں ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم ڈی ہائیڈریشن پر خاص توجہ دیں اور اس کو ہندوستان کی صنعتوں میں داخل کر دیں۔

نوٹ: مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ آجکل کیلئے مضامین کے مسودے صاف خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھکر روانہ فرمایا کریں (ادارہ)

برطانیہ اور امریکہ کا مالی معاملہ

راج نرائن گپتا

ستیش :- ہاں بھائی مدن صاحب! آپ تو ایک لائق ماہر اقتصادیات ہیں۔ کیا آپ مجھ جیسے غیر ماہر شخص کو بتا سکتے ہیں کہ وہ گفتگو جو واشنگٹن میں ہو رہی تھی آخر کس سلسلے میں تھی؟

مدن :- غالباً آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ جاپان کی لڑائی ختم ہونے تک ادھار پٹہ کی شرط پر لئے گئے سامان جنگ، خوراک اور مشینیں، اور شہری ضروریات کی چیزیں برطانیہ کو فراہم کرتا رہا تھا تاکہ برطانیہ دشمن کے خلاف کامیاب جنگ کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ یہ امداد یکایک ۲۱ اگست ۱۹۴۵ء کو روک دی گئی۔ اس امداد کے رکتے ہی امریکہ اور برطانیہ کے مابین گفتگو شروع ہو گئی۔

ستیش :- لیکن آپ یہ بتائیں کہ اس ادھار پٹہ کی امداد کی بنیاد کیا تھی؟ کیا یہ تمام سامان بلاقیمت فراہم کیا جاتا تھا؟ اگر نہیں تو دراصل کیا صورت تھی؟

مدن :- ادھار پٹہ کی امداد کا دار و مدار کسی تجارتی قسم کا نہیں تھا۔ آنجہانی صدر روزویلٹ نے یہ طریقہ نکالا تھا کہ فاشیت کی بڑھتی ہوئی غارتگری کو روکا جا سکے۔ تاکہ ساری دنیا میں جمہوری قومیں برقرار رہ سکیں۔ ادھار پٹہ کا قانون امریکہ میں مارچ ۱۹۴۱ء میں منظور ہوا تھا اور اس کی رو سے صدر امریکہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ مدافعت کی چیزیں جس ملک کو چاہیں بھیجیں بشرطیکہ اس کی مدافعت ریاست ہائے متحدہ کی مدافعت کے مترادف قرار پا سکے۔ اس امداد کا معاوضہ نقد یا جنس کی صورت میں ہوتا تھا جس سے براہ راست یا بالواسطہ امریکہ کو فائدہ حاصل ہو سکے اور جو صدر امریکہ کے نزدیک زیادہ مناسب ہو۔ اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک لحاظ سے بلاقیمت عطیہ تھا جو ان ملکوں کو دیا گیا جو فاشیت کے استیصال کے لئے متحد و مشترک تھے۔ امریکہ کو بالواسطہ فائدہ پہنچا کہ اسے اپنی ہی سرزمین پر لڑائی لڑنے کی ضرورت نہیں پڑی ورنہ دوسرے جمہوریت پسند ملکوں کی تباہی کے بعد اس کے لئے ایسا ہونا لازمی تھا۔ اور اسطرح اپنا دامن بچائے رکھ کر اسے موقع ملا اور اس نے اپنی صنعتی پیداوار کو اتنی ترقی دے لی کہ اس میدان کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

ستیش :- اچھا اب یہ بتائیے کہ اس ادھار پٹہ کی رو سے کتنی رقم کا سامان برطانیہ کو پہنچایا گیا اور پھر جنگ کے ختم ہونے ہی اس کی روک تھام کیوں کر لی گئی؟

مدن :- امریکہ نے تمام اتحادیوں کو ادھار پٹہ کی جو امداد پہنچائی اسکی کل رقم کا اندازہ تقریباً بیالیس ارب ڈالر یعنی سو ارب روپیوں کے لگ بھگ کیا جاتا ہے۔ یہ رقم اتنی ہے کہ ہندوستان کے کل چالیس کروڑ آدمیوں کی پانچ سال کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ اس امداد میں برطانیہ کا حصہ سب سے زیادہ رہا۔ یعنی جس قدر پندرہ ارب ڈالر کا سامان اسے دیا گیا۔ یہ امداد اگست میں روک لی گئی کیونکہ امریکی کانگریس کے قانون کے مطابق اس کا سلسلہ محض دوران جنگ تک جاری رہ سکتا تھا۔

ستیش :- اچھا اگر امداد بند کر دی گئی تھی تو برطانیہ کے عام لوگوں کو کیوں دھکا سا لگا؟

مدن :- یہ اسلئے کہ زمانہ جنگ نے برطانیہ کا وہ تمام اقتصادی نظام جو لڑائی سے پہلے قائم تھا، درہم برہم کر ڈالا تھا۔ لڑائی کے دوران میں کسی بھی اتحادی ملک کو سوائے سوویٹ یونین کے جنگ کی تباہ کاریوں سے اتنا شدید نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ برطانیہ کو اٹھانا پڑا۔ برطانیہ کے مرد عورت فوج، خدمات کے کسی نہ کسی سلسلے میں دنیا کے ہر حصے میں پہنچے ہوئے تھے۔ ان کا معیار زندگی تکلیف دہ حد تک گر گیا تھا۔ عیش و آرام کو وہ بھول چکے تھے۔ ملک کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ سامان جنگ کو بہت بڑے پیمانہ پر تیار کرنے کے باعث ایک حد تک اسلحہ خانہ بن گیا۔ کچھ شدید بمباری کے باعث بھی حالت خراب رہی۔ ہزاروں مکان مسمار ہو گئے، شہر کے شہر تباہ ہو گئے، اور لاکھوں باشندوں کو بے گھر ہو جانا پڑا۔ برطانیہ کی اقتصادی صورت حالات بھی یکسر بدل گئی۔ برطانیہ کی اقتصادی زندگی کا انحصار غیر ملکی تجارت پر تھا جو جنگ سے پہلے کے معیار کے مقابلے میں بقدر ربع تھائی رہ گئی۔ اس کے تجارتی جہاز تباہ ہو گئے۔ اس کی درآمد میں اضافہ ہوتا رہا اور چونکہ اسی مقدار میں سامان باہر ملکوں میں نہیں بھیجا جا سکتا تھا اس لئے ملک بری طرح مقروض ہو گیا۔ چنانچہ جنگ ختم ہونے کے وقت اس کے قرضے کا اندازہ بقدر ساڑھے تین ارب پونڈ تھا۔ لہٰذا ادھار پٹہ کے سامان کی فراہمی بند ہو جانے سے اہل برطانیہ کو شدید دھکا لگا۔ اسلئے نہیں کہ صورت غیر متوقع تھی بلکہ اس لئے کہ خاص ایسے موقع پر پیدا ہوئی جبکہ انگلستان کی مالی حالت بہت خراب تھی اور امریکہ نے برطانیہ کی اعانت کے لئے کوئی دوسری امدادی تجویز پیش نہیں کی تھی۔

ستیش :- تو کیا واشنگٹن میں ہونے والی گفتگو کا مطلب امریکہ سے نئی مالی امداد لینے کے سلسلے میں تھا؟ اگر یہ سچ ہے تو برطانیہ والوں نے کتنی رقم چاہی تھی؟

مدن :- برطانوی مالی وفد جس کے صدر لارڈ ہیلی فیکس اور معاون لارڈ کینس تھے برطانیہ سے طویل مدت کا قرضہ لینے کے لئے گفتگو کرتا رہا۔ برطانیہ آج کل لڑائی کے ہاتھوں بگڑی ہوئی اقتصادی خستہ حالی کو سنوارنے اور بحال کرنے کی دشواریوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اسے لیبر حکومت کے ان خاکوں کو جو جنگی

صنعتوں کو قومی رنگ دینے اور معاشرتی تحفظات کے منصوبوں سے متعلق ہیں دائرۂ عمل میں لانے کے لئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان تمام کاموں کیلئے برطانیہ کو مالی اعانت درکار ہے۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ انگلستان کو اپنی اقتصادی الجھنیں سے ہموار کرنے کے لئے کم سے کم چار ارب ڈالر درکار ہونگے لہذا یہ کثیر رقم زیادہ سے زیادہ نفع بخش شرائط پر امریکہ سے بطور قرض لینے کیلئے واشنگٹن میں گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

ستیش:- لیکن انگلستان کے لئے اس رقم کی منظوری دینے میں ریاست ہائے متحدہ کو آخر کیا اعتراض تھا؟

مدن:- امریکہ نے برطانیہ کو قرضہ دینے کے سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان امور زیر بحث یہ تھے کہ قرضے کی رقم کس قدر ہو۔ سود کس شرح سے لیا جائے۔ ادائیگی کتنے عرصے میں ہو اور انگلستان کو اتنی کثیر رقم بطور قرض دے کر امریکہ بالواسطہ منافع کس حد تک حاصل کرے۔

ستیش:- لیکن مجھے بتائیے کہ برطانیہ کا مطالبہ کیا تھا؟

مدن:- برطانیہ بڑی کشادہ دلی کے ساتھ امریکہ سے قرضہ اس طرح لینا چاہتا تھا کہ سود معاف ہو اور آسان قسطوں میں رقم واپس کی جائے۔ برطانیہ نے زور دیا کہ امریکہ سے قرضہ لینے میں صرف اسی کے خود غرضانہ مفاد زیر بحث نہیں ہیں بلکہ اس کے اقتصادی نظام کی بحالی خود امریکہ کے لئے اور ساری دنیا کی تجارت کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ کیونکہ اگر برطانیہ خوش حال ہو جائے تو امریکی تجارت کو بھی اپنا میدان زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ لڑائی سے پہلے امریکہ کے مال کی سب سے زیادہ کھپت برطانیہ میں ہوتی تھی۔ لڑائی کے دوران میں امریکہ کی پیداوار کی صلاحیت ترقی کر کے آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے اور اس لئے اسے ضرورت ہے کہ وہ بعد جنگ کی دنیا میں اپنے کاروبار کے لئے مناسب منڈیاں تیار کر لے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ یورپ اور ایشیا کی تباہ شدہ اقتصادی حالت بحال نہ ہو جائے۔ اس زمرے میں برطانیہ بھی شامل ہے جسے غیر ملکی تجارت کے سلسلے میں سب سے زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔

ستیش:- اور امریکہ کے لئے کیا صورت تھی؟

مدن:- امریکہ نے اس مطالبہ کو قبول کر لیا لیکن ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ اگر اتنی رقم بلا سود برطانیہ کو دیدی گئی تو پھر اتنے ذرائع باقی نہیں رہینگے کہ دوسرے ملکوں کی بھاری ضرورتوں کو یکساں طور پر پورا کیا جا سکے۔ اسلئے وہ برطانیہ کو مطلوبہ رقم سے کسی قدر کم قرضہ دینے کے لئے بالکل تیار تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس قرضے کے بالعوض وہ چاہتا تھا کہ برطانیہ پچھلی بقایا رقموں کو چکتا کر دے اور عالمگیر تجارت کو فروغ دینے کے سلسلے میں موافق صورتیں پیدا کر دے۔

ستیش:- تب دونوں فریقوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی نوعیت کیا ہے؟

مدن:- امریکہ نے برطانیہ کو چار ارب چالیس کروڑ ڈالر بطور قرض دینے منظور کر لئے ان میں سے تین ارب پچھتر کروڑ ڈالر آئندہ تجارتی مقاصد کے لئے ہونگے اور پینسٹھ کروڑ ڈالر ادھار پٹے کے اس سامان کا آخری حساب بیباق کرنے کے لئے جو اس وقت برطانیہ میں موجود ہے۔ قرضے کی واپسی دو فیصدی شرح سود پر پچاس سال کی مدت میں ہوگی اور اس کا آغاز ۳۱ دسمبر ۱۹۵۱ء سے ہوگا۔ اگر مالی تنگدستیوں کے کسی مخصوص سال میں جب برطانیہ کے مبادلے کے محفوظ سرمائے پوری طرح کفالت نہ کر سکتے ہوں، سود کی رقم معاف کر دی جائیگی لیکن اصل رقم کی واپسی بہرحال لازمی ہوگی۔

ستیش:- کیا آپ کے خیال میں قرضے کی شرائط قابل اطمینان ہیں؟

مدن:- قرضے کی شرائط قابل اطمینان ہیں اس لحاظ سے کہ ان سے ان نظریوں کے مابین باعزت مفاہمت کا پتہ چلتا ہے جو گفتگو کرنے والے دونوں فریقوں نے باہمی طور پر مرتب کئے تھے۔ برطانیہ زیادہ قرضہ لینا چاہتا تھا اور امریکہ کچھ کم

کلامِ ظریف

(دلّی کی ٹکسالی زبان میں)

یہ باجے یہ گاجے یہ میلے یہ ٹھیلے — یہ بس جیتے جی کے ہیں سارے جھمیلے
وہ مسکین صورت نظر بھولی بھالی — مگر بات ایسی کہ بس چٹکی لیے لے
یقیناً وہ انسان بارِ زمیں ہے — پھلی پھوڑ کر جو نہ دے دکھ نہ جھیلے
وہ بت آج بے طرح گرم شم بنا ہے — نہ کچھ منہ سے بولے نہ کچھ سر سے کھیلے
خدا جانتا ہے محبت میں تیری — سدا دکھ ہی جھیلے ہیں پاپڑ ہی بیلے
گرہ دو گرہ کی لنگوٹی میں ہم بھی — رہے مست و بیخود سدا بھاگ کھیلے
تمہاری تلون مزاجی کے صدقے — مجھے شہد ہو، گا ہے کڑوے کریلے
پریم اور محبت کی پونجی بچا کر — تری زلفِ مشکیں سے ہم خوب کھیلے
کرے تجھ سے الفت تو سودائی ہو لے — جو دل تجھکو دے وہ بلا مول لے لے

ظریف آپ کا رنگ ہے سب سے چوکھا
ظرافت میں ہیں آپ اکبر کے چیلے

ظریف دہلوی

دینے کے لئے تیار تھا۔ دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ ہوا اور انجام کار چار ارب چالیس کروڑ ڈالر قرضے ہوگئے۔ اس معاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں فریقوں نے [illegible] فیاضی اور رواداری سے کام لیا۔ امریکہ نے ادھار پٹہ کے سلسلے میں برطانیہ کے ذمہ پندرہ ارب ڈالر [illegible] دینے کے لیے رضامند [illegible] برطانیہ [illegible] ملکوں کی آسانی [illegible] سے پونڈ [illegible] منسوخ کرنا پسند کر لیا۔

[illegible] اس معاہدے کا منظور [illegible] مستفید ہوگا [illegible] آخر الذکر رعایت کا نتیجہ [illegible] امریکہ کی تجارت کو فروغ حاصل ہو جائے گا۔

سٹینیش:- آپ نے فرمایا کہ برطانیہ نے اپنی [illegible] تجارت کو فروغ دینے کے لئے زیادہ قرضہ مانگا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا برطانیہ دوسرے ملکوں سے تجارت کئے بغیر واقعی گزارا نہیں کر سکتا؟

مدن:- بے شک برطانیہ برآمد کے بغیر اپنی اقتصادی حالت کو سنوار نہیں سکتا۔ یہی چیز اس کی اقتصادی زندگی کے لئے روح رواں ہے۔ انگلستان کی آبادی ساڑھے چار کروڑ سے زیادہ ہے اور اس کی سرزمین پر صرف [illegible] افراد کے لئے خوراک پیدا ہو سکتی ہے۔ ملک میں صرف ایک خام شے ہے یعنی کوئلہ۔ لہذا برطانیہ کو نصف اشیائے خوراک مثلاً گوشت، پنیر، گندم، پھل، چائے، قہوہ، کوکو وغیرہ اور بہت سی خام اشیاء مثلاً روئی، اون، چمڑا، کچا لوہا، تانبا، نکل اور تیل باہر سے لینے پڑتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کے عوض برطانیہ اپنی بیرونی تجارت کو ترقی دیکر رقم ادا کرتی ہے۔ لڑائی سے پہلے وہ اپنی درآمدی تجارت کی تقریباً چالیس فیصدی رقم اس سود کی صورت میں ادا کرتا تھا جو دوسرے ملکوں میں لگائے ہوئے سرمائے سے ملتا تھا اور کچھ ان بہت سی خدمات کی صورت میں جیسے جہازوں اور بینکوں کے کاروبار وغیرہ۔ لڑائی کے دوران میں بہت سے ذرائع قربان ہوگئے۔ نتیجہ یہ کہ آئندہ انگلستان کو اپنی تیار شدہ چیزوں کی برآمدی تجارت پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔

سٹینیش:- لیکن اس کی وجہ کیا ہے کہ دوسرے تمام ملکوں کے مقابلے میں صرف امریکہ ہی برطانیہ کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اسقدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ بین الاقوامی تجارت میں اس کا حریف ہو جائے

مدن:- ہاں یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر دونوں ملکوں کے مفاد ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن اگر آپ گہری نظر ڈال کر جائزہ لیں تو آپ خود محسوس کر لینگے کہ صرف امریکہ اور برطانیہ ہی اپنی برآمدی تجارت کو ترقی دینے کے کوشاں نہیں بلکہ دنیا کی ہر صنعتی قوم اس کوشش میں سرگرداں رہتی ہے اور اس ضمن میں دو بیا زیادہ ملکوں کی خواہشات کا کسی طرح بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ غیر ملکی تجارت ہمیشہ ان دو ملکوں کے درمیان ترقی پا سکتی ہے جو صنعتی اعتبار سے بہت بڑھے ہوئے ہوں۔ پست اقوام جنکی قوت خرید کم ہو کامیاب تجارت سے کبھی فیض نہیں اٹھا سکتیں۔ اسی طرح وہ دوسرے اعلیٰ صنعتی ملکوں کا مال بھی درآمد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ امریکہ اپنے لوگوں کو بار روزگار رکھنے کے لئے صرف اسی طرح اپنی تجارت کو فروغ دے سکتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی قوت خرید پر حاوی ہو جائے۔ لہذا برطانیہ کو امداد دینے میں خود امریکہ کا مفاد مضمر ہے۔

سٹینیش:- لیکن کیا وجہ ہے کہ صرف امریکہ ہی نے اس بار کو اٹھانا منظور کیا؟ دوسرے تمام ملکوں کی طرح اس کا بھی اس لڑائی کے جیتنے میں نمایاں حصہ تھا خصوصاً گو یہ بار [illegible] فراہم کرنے میں ذخیرۂ جنگ بن گیا تھا۔

مدن:- اسی پہلو کو سمجھنے میں آپ نے غلطی کی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کے سوا دنیا کی وہ تمام قومیں جو محوری فتنے کو شکست دینے کے لئے ملی ہوئی تھیں جسمانی اور مالی اعتبار سے نہایت ہولناک جنگ کی ظلمتوں سے ابھری تھیں۔ امریکہ کی اقتصادی حالت نہ صرف یہ کہ ان خوفناک تباہ کاریوں سے بچی رہی بلکہ برعکس طور پر اسے کافی تقویت پہنچ گئی۔ اس کی پیداواری صلاحیت کئی گنی زیادہ ہو گئی اور عام لوگوں کا معیار زندگی بھی بڑھ گیا۔ اسلئے یہ بالکل قرین انصاف تھا کہ ایسی صورت میں جبکہ دوسرے ملکوں نے خون پسینہ ایک کر کے محوری طاقتوں کو شکست دی تھی، امریکہ بھی اس ایثار و قربانی میں مناسب حصہ لینے کے لئے تیار ہو جائے اور اس کی صورت یہی تھی کہ وہ اپنے اتحادیوں کو اقتصادی بحالی کا موقع دے۔

سٹینیش:- یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اب ایک سوال اور ہے۔ آپ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ امریکہ ترجیحی محصولوں اور رکی ہوئی باقی رقموں کو موقوف کر دینا چاہتا ہے میں ان باتوں کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ ان کو موقوف کر دینے کے لئے کیوں مصر تھا؟

مدن:- ترجیحی محصولات کا مطلب یہ ہے کہ ایک ملک کے مال پر کم محصول لگایا جائے اور دوسرے کے مال پر نسبتاً زیادہ۔ تنزل کے زمانے میں برطانیہ نے اپنے مقبوضہ ملکوں کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ اختیار کیا۔ رکی ہوئی باقی رقوم کا طریقہ بھی اسی مقصد کے ماتحت تھا۔ تنزل کے اثرات کو کم کرنے میں ان طریقوں نے ایک حد تک انگلستان کو فائدہ پہنچایا لیکن جب ان پر عمل کرنے کے لئے اور ملکوں نے بھی ٹھان لی تو انہوں نے ساری دنیا میں مالی انتشار پھیلا دیا جو جنگ چھڑنے سے پہلے رونما ہوا۔ عالمگیر تجارت میں زبردست کمی کا پیدا ہو جانا بھی اس سبب سے کہا جا سکتا ہے۔ بعد جنگ کے زمانے میں امریکہ ساری دنیا میں تجارتی ترقی کا خواہاں ہے۔ اس بنا پر اس نے ترجیحی محصولوں اور رکی ہوئی

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

جاوا

شنکر دیال

مشرقِ بعید میں سیر کرنے والوں کو سوائے جاوا کے اور کسی جزیرے میں اتنی دلکشی نظر نہیں آتی۔ سیاحوں نے جو کچھ اس کی تعریف میں کہا ہے وہ بجا ہے۔ یہاں کے باشندے خوش مزاج و خوش باش ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ خوش منظر و خوشنما ہیں۔ جانوروں اور مختلف قسم کی نباتات کی بڑی بہتات ہے اور اس کی گذشتہ تاریخ نے اس کو اور بھی جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔

ڈچ مشرقی جزائر الہند کل پانچ جزیرے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم جاوا ہی ہے۔ اس کی صورت مستطیل نما سی ہے۔ لمبائی چھ سو بائیس میل اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی ایک سو اکیس میل ہے۔ اس جزیرہ میں ایک کوہستانی سلسلہ ریڑھ کی ہڈی کی طرح پھیلا پڑا ہے۔ اس میں متعدد پہاڑ آتش فشاں بھی ہیں۔ ہندوؤں کے زمانہ میں یہ پہاڑ مردہ نہیں تھے اس لئے ہنود ان پر اکثر بھینٹ چڑھاتے رہتے تھے۔ اب لوگوں کے نظریے بہت بدل گئے ہیں اور وہ پہاڑوں سے خائف نہیں رہے ہیں۔ جنوب کا علاقہ پہاڑی ہے اور شمال کا نشیبی۔ اسی حصۂ ملک میں زیادہ تر دریا پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ منطقۂ حارہ کے نیچے واقع ہے لیکن یہاں کی آب و ہوا زیادہ گرم نہیں ہے۔ پہاڑوں اور سمندروں کی وجہ سے آب و ہوا میں اعتدال پیدا ہو گیا ہے۔

بارش کی کثرت اور آتش فشاں پہاڑوں کی راکھ کی وجہ سے جاوا کی زمین بہت ہی زرخیز ہو گئی ہے۔ جزیرہ کا تقریباً نصف حصہ زیر کاشت ہے باقی میں پہاڑ اور جنگلات ہیں۔ جنگ سے پہلے انڈونیشیا کے کسان چھوٹے چھوٹے کھیت جوتتے تھے اور کل پیداوار اندرون ملک ہی میں کھپ جاتی تھی۔ جن چیزوں کی برآمد ہوتی تھی وہ بڑے بڑے کارخانوں کی تیار شدہ ہوتی تھیں۔ کارخانے یورپی تاجروں کے تھے اور مزدور دیسی لوگ ہوتے تھے۔ اراضی کے زیادہ حصہ میں چاول کی کاشت ہوتی تھی۔ چاول اور مچھلی ہی یہاں کے باشندوں کی بنیادی غذا ہے۔ شکر برآمد کے مال میں سب سے زیادہ مشہور تھی۔ کونین بھی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ سنکونا کے بیج سب سے پہلے یہاں جنوبی امریکہ سے لائے گئے تھے۔ اس کا پودا مغربی جاوا میں پانچ ہزار فٹ کی اونچائی پر بویا گیا اور اب تک دنیا کی کل پیداوار کی نوّے فی صدی کونین یہیں پیدا ہوتی ہے۔ ان دو چیزوں کے علاوہ ربڑ، سیاہ مرچ، قہوہ، بانس اور کھوپرے کی بھی برآمد ہوتی تھی۔ معدنیات یہاں زیادہ نہیں ہیں۔ کوئلہ اور تیل یہاں ضرور پایا جاتا ہے۔ انہی دونوں قیمتی چیزوں سے انگریز اور ڈچ جنگ سے پہلے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

جاوا کی آبادی اس کے رقبہ کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ جاوا کا رقبہ تمام جزائر الہند کے رقبہ کا ۱/۱۵ ہے لیکن یہ سات کروڑ میں سے تقریباً چار کروڑ اسی لاکھ آدمیوں کا پیٹ پالتا ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت ہم پر اس وقت زیادہ اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے جب ہم اس کا مقابلہ کسی ہندوستانی صوبہ مثلاً پنجاب سے کریں۔ جاوا رقبہ میں پنجاب سے نصف ہے لیکن آبادی پنجاب سے دگنی ہے۔ اس امر سے کہ جاوا کے آدمی پنجاب کے مقابلہ میں زیادہ بہتر حالت میں رہ سکتے ہیں بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جاوی اور ڈچ کسان اپنے کام میں کس قدر ہوشیار ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں ڈچ حکومت نے اس کثرتِ آبادی کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس طرح کہ ڈچ مشرقی جزائر الہند کے جن حصوں میں آبادی کم تھی وہاں نوآبادیات قائم کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تجویز کافی کامیاب ہو رہی تھی کہ جاپان کے حملہ نے گڑبڑ ڈال دی۔

انڈونیشیا کی کل آبادی چار کروڑ ہے۔ اس میں سے اکثر مسلمان ہیں۔ ان کی طرزِ معاشرت زیادہ تر قدیم اور رسمی ہی ہے گو مغربی اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں کے آدمی خوش مزاج، شائستہ اور مستعد ہوتے ہیں۔ عورتیں تہمد کی طرح کا لباس پہنتی ہیں اور پردہ نہیں کرتیں۔ ناچنے کی بڑی ماہر ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں دو لاکھ تیس ہزار یورپین رہتے ہیں جن میں سے اکثر ڈچ ہیں اور چھ لاکھ چینی ہیں۔ جاپان کے قبضہ کر لینے سے پہلے یورپی اقوام کے افراد زیادہ تر کارخانہ جات کے مالک اور منیجر ہوتے تھے یا سرکاری عہدہ دار، سائنسدان، انجینئر اور ڈاکٹر۔ یہ لوگ زیادہ تر بڑے بڑے شہروں مثلاً بٹاویہ، سورابایا اور بیدونگ میں رہتے تھے۔ یہاں کی اقتصادی زندگی کے ہر شعبہ میں چینیوں کا بڑا دخل تھا۔ انڈونیشیا والے، یورپین لوگ اور چینی علیحدہ علیحدہ زندگی بسر کرتے تھے اور آپس میں بہت کم میل جول رکھتے تھے۔

جاوا کی تاریخ پر اس کی جغرافیائی حالت کا بڑا اثر پڑا ہے۔ چونکہ یہ جزیرہ ہمسائے کے جزیروں کے راستہ میں پڑتا ہے اور دو سمندروں کی درمیانی شاہراہ کا ایک جزو ہے اس لئے عرصہ تک یہ گمنام نہیں رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے یہاں ہندو تاجر آئے پہلی صدی عیسوی میں یہ لوگ یہاں کی قدرتی دولت سے کھنچ کر اور ہمسائے کے جزیروں سے پہلے اس کو اپنے سلطنے کا اڈہ بنانے کی خاطر یہاں آباد ہو گئے۔ یہ چھوٹی چھوٹی جگہیں نوآبادیاں بنیں اور نوآبادیات سے سلطنتیں تقریباً ایک ہزار سال تک باہر کے آدمی اس جزیرہ میں بڑی کثرت

سے آتے رہے۔ ہندو مت، فنون، ادب اور طرز تعمیر نے اس جزیرہ میں پوری طرح جڑ پکڑ لی تھی۔ چودھویں صدی میں جاوا کو مجاپہت خاندان کے زمانہ میں انتہائی عروج حاصل ہوا۔ ان وقت جاوا کے ہندو حکمرانوں کے زیر نگیں وہ تمام علاقہ تھا جس کو آج ڈچ مشرقی جزائر الہند کہتے ہیں۔ اس زمانہ کے جاوی سمندر میں بے دریغ سفر کرتے، جہاز بناتے، نو آبادیاں قائم کرتے اور پورے مجمع الجزائر کی تجارت پر حاوی تھے۔ یہ لوگ بڑے ہوشیار کاریگر اور عمدہ معمار تھے اور پلاستر کا بڑھیا کام جانتے تھے۔ اس زمانہ کے ان کے کارناموں سے کچھ آج تک بھی باقی ہیں۔ فن تعمیر، موسیقی، نقاشی، رقاصی، ادب اور کھیل تماشوں کو اس زمانہ میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس ہندو خاندان کے زوال کے بعد پندرھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں نے یہاں اپنے پاؤں جمانا شروع کئے۔

ڈچ لوگ جاوا میں پہلی دفعہ ۱۵۹۵ء میں داخل ہوئے۔ تین سال بعد ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی ظہور میں آئی۔ ان لوگوں کا مقصد یہاں آباد ہونے سے یہ تھا کہ تجارت کی جائے۔ تجارت کے لئے امن لازمی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے واسطے ان کی اکثر مقامی حکمرانوں سے ٹکر ہوتی رہی۔ اس قسم کی ہر ٹکر کا نتیجہ یہی نکلتا رہا کہ ڈچ مقبوضات بڑھتے رہے یہاں تک کہ پورے جزیرہ پر انہی کا دور دورہ ہوگیا۔

جاوا میں قومی بیداری کی تحریک بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ مغربی تعلیم نے بعض اونچی جاتی کے آدمیوں میں نئے نئے خیالات پھونکے جن کا پرچار اخبارات وغیرہ کے ذریعہ کیا گیا۔ اقتصادی دنیا میں چینیوں اور یورپین لوگوں کے ساتھ مقابلہ بازی نے اور ہندوستان کی قومی بیداری کی تحریک نے بھی جاوا کے لوگوں میں قومیت کی روح پھونکی بلکہ اس جذبہ کو تیز تر کردیا۔ یہ تحریک اس لئے اور زیادہ پھولی پھلی کہ انڈونیشیا والوں میں ذات پات کی تفریق نہیں ہے۔ یہ سب لوگ ایک ہی ثقافتی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں اور سب کا مذہب ایک ہی ہے۔ اس تحریک کو بہت سے ڈچ لوگوں سے بھی تقویت پہنچی۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں ایک مجلس عوام کی بنیاد ڈالی۔ حکومت کو عوام پسندی کی بنیادوں پر کھڑا کرنے کے واسطے ۱۹۲۲ء میں جاوا کے دستور اساسی میں تبدیلی کی گئی ۱۹۴۱ء میں ملکہ ولہلمینا نے وعدہ کیا کہ لڑائی کے اختتام پر وہ ایک امپیریل کانفرنس منعقد کریں گی جس میں طے کیا جاتا کہ جاوی لوگوں کو سیاسی اختیارات کس طرح پر دیئے جائیں۔

۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے جاوا پر قبضہ کرلیا اور جلد ہی واضح ہوگیا کہ جاپانی اگرچہ اس بات کے لئے تیار تھے کہ برما اور جزائر فلپائن کو نو برائے نام کچھ آزادی دے دیں لیکن جاوا پر وہ مستبدانہ طور پر اپنی حکومت رکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر سوئیکارنو اور ڈاکٹر ہتا ۱۹۴۳ء کے اختتام پر اپنے مطالبات لے کر جاپان گئے لیکن ان کو یقین دلایا گیا کہ جاپان کو ان کے ساتھ ہمدردی ضرور ہے لیکن آزادی کے سوال پر بعد از جنگ غور کیا جائے گا۔ ۱۹۴۴ء کے آخری حصہ میں جاپان نے جاوا کو مکمل آزادی دینے کا باقاعدہ وعدہ کرلیا۔ کیونکہ اس وقت تک جاپان کو اندازہ ہوچکا تھا کہ اسے بے ہتھیار ہوئے ملک لازمی طور پر چھوڑنا ہی پڑیں گے اور بعد لڑائی ختم ہوجانے کے بعد آزاد جاوا اتحادیوں کے لئے ایک پیچیدہ مسئلہ بن جائے گا۔ جب بھی جاپان کے اعلان میں دیر ہوئی اور جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے دو دن بعد سوئیکارنو اور ڈاکٹر ہتا یہ اعلان کرسکے کہ انڈونیشیا ایک آزاد جمہوریت ہے۔

جنگ کے زمانہ میں فوجی کارروائی جنرل میک آرتھر کے ذمہ تھی۔ جب جاپان نے ہتھیار ڈالے تو یہ کمان اگست میں لورڈ کمپی ایشیائی کمان کو دے دی گئی اگرچہ لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کو اس پر اعتراض بھی ہوا۔ اگر برطانوی فوجیں جاوا میں اگست ہی کے مہینہ میں داخل ہوگئی ہوتیں تو جاپانیوں سے ہتھیار ڈلوا لینے کا کام مقابلتہً آسان رہتا لیکن ان کو ستمبر تک انتظار کرنا پڑا کیونکہ اسی تاریخ کو جاپان نے پورے طور پر شرائط اطاعت پر دستخط کئے۔ اس ایک مہینہ میں جاپانیوں کو شرارت کرنے کا اور بھی موقع مل گیا۔ انھوں نے انڈونیشیا کے تشدد پسندوں کو بھڑکا دیا۔ ان کو ہتھیاروں سے مسلح کیا اور فوجی تعلیم سکھائی۔

جب برطانوی فوج جاوا میں اتری تو صورت حال امید افزا تھی لیکن جلد ہی خرابیاں پیدا ہوچلیں۔ ڈچ حکومت اصل حالات کا اندازہ نہ کرسکی۔ اس کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ ملک میں قومی تحریک کس حد تک بڑھ چکی ہے۔ اسی لئے اس نے انڈونیشیا کے لیڈروں سے بات کی گفتگو کرنے سے انکار کردیا بلکہ ان کو غدار اور وطن فروش گردانا گیا اور ایسی ایسی تجاویز بنائی گئیں جو کسی قدر مبہم تھیں۔ اسی دوران میں ایک نئی انڈونیشیائی کابینہ بنی۔ اس کے اراکین وہ لوگ تھے جنہوں نے جاپانیوں کی مخالفت میں زیادہ حصہ لیا تھا۔ قوم پرستوں کے رویہ میں خشونت پیدا ہوچکی تھی۔ اعتدال پسندوں کی کچھ نہ سنی گئی اور تشدد پسندوں کا بول بالا ہوگیا۔ انہی بدلے ہوئے حالات نے برطانوی افواج کے کام کو مشکل تر بنا دیا۔

ڈچ حکومت کا کہنا ہے کہ ان کی حکومت جاوا میں دستوری اور قانونی ہے اس نے جزیرۂ جاوا کی دستوری حیثیت میں تغیر اس کی نفی

کے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف انڈونیشیا والوں کو ڈچ حکومت کی صورت اور شکل ہی منظور نہیں۔ برطانیہ کے ذمہ یہ کام آ پڑا ہے کہ وہ ایسی صورتِ حال پیدا کرے جس میں دونوں فریق اس طرح کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں کہ مطمئن بھی ہو جائیں اور تشدد کا قدم بھی بیچ میں نہ آئے۔ اس کے علاوہ ایک کام یہ بھی اقوامِ متحدہ کی طرف سے انکے سر آ پڑا ہے کہ وہ اتحادی جنگی قیدیوں کو رہا کرائے اور جاپانیوں سے ہتھیار ڈلوائے۔ برطانوی فوج جلد از جلد امن قائم کرنا یوں بھی چاہتی ہے کہ تشدد پسندوں کی کارروائیوں نے ملک کی اقتصادیات کو بالکل برباد کر دیا ہے اور سامانِ خورد و نوش کی بڑی قلت ہو گئی ہے۔ اگر جلد ہی امن و امان قائم نہ ہو گیا تو قحط کا اندیشہ ہے۔

ایسے غیظ انگیز حالات میں رہتے ہوئے برطانوی اور ہندوستانی افواج کا رویہ اور طرزِ عمل قابلِ داد ہے۔ شہریار کی کابینہ اتحادیوں کے ارادوں اور نظریوں کی قدر کر رہی ہے اور ان کی دقتوں کا اندازہ کرتے ہوئے امن و امان کے قیام کے سلسلے میں ان کے ساتھ تعاون بھی برت رہی ہے۔ کچھ اور حالات بھی امید افزا ہیں وہ یہ کہ ڈچ حکومت اس مسئلہ پر بہتر طریقہ پر غور کر رہی ہے۔ اس کی رواداری کے ساتھ ساتھ انڈونیشیائی لیڈر بھی ڈچ حکومت کے ساتھ مفاہمت کی گفتگو کرنے پر راضی نظر آ رہی ہے۔ جاوا میں اتحادیوں کا فریضہ بلا تشکر سا ہے۔ اتحادی اس مسئلہ کے حل ہو جانے پر سب سے زیادہ خوش ہوں گے۔

برطانیہ اور امریکہ کا مالی معاہدہ — بقیہ صفحہ ۱۵

بقایا رقموں کو موقوف کرنے کا مطالبہ کیا۔

سنتیش:- لیکن کیا برطانیہ اس تجویز پر راضی ہو گیا؟

مدن:- یہ برطانیہ قرضے کی شرائط کے نفاذ کے ایک سال بعد سے اپنی تمام رکی ہوئی بقایا رقموں کو موقوف کرنے کے لئے راضی ہو گیا ہے۔ دوسری شرطیں اور رکاوٹوں کے سلسلے میں برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ اس لحاظ سے متفق ہے کہ تمام قوموں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں ان موضوعات پر بحث ہو اور پھر دیکھا جائے کہ بین الاقوامی تجارتی تنظیم قائم کرنے میں کس قدر امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

سنتیش:- اچھا اب یہ بتائیے کہ اس معاہدے سے ہندوستان کو کس طرح فائدہ پہنچیگا؟

مدن:- ہندوستان کو برطانیہ اور امریکہ کے مالی معاہدے سے فائدہ پہنچیگا کیونکہ اس طرح امریکہ کو ڈالر جمع کرنے کا انتظام ترک کر دینا پڑیگا۔ پھر اس صورت میں ہندوستان پوری آزادی کے ساتھ امریکہ سے ہر قسم کا ساز و سامان اور مال اپنے ملک کی دوسری اشیاء کے بالعوض منگا سکیگا۔ اس طرح ہندوستان اپنے بعد جنگ کے تعمیری منصوبوں کو دائرۂ عمل میں لانے کے لائق ہو جائے گا۔

قلعۂ رائسین اور اس کے کتبات

مائل نقوی

قلعہ رائسین کا شمار ہندوستان کے اُن چند مشہور و معروف قلعوں میں ہوتا ہے جو صدیوں سے آگے کرشمۂ روزگار ... قلعہ گزینوں کی سکونت اور ترقی کا مرکز رہ چکے ہیں۔ اگرچہ آج جدید طرز کی سائنٹفک ایجادات نے اگرچہ ان کی ضرورت کو بیکار ثابت کر دیا ہے۔ مگر ان کی تاریخی عظمت میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے پایا۔ ریاست قدیم کی یہ خاموش یادگاریں عہد بعہد کی تبدیلیوں اور انقلابات زمانہ کے دلچسپ نقشے پیش کرتی ہیں، جن کی تصویر کشی سے بہترین مؤرخ کا قلم اور شاعر کی فکر قاصر ہے۔

یہ قلعہ بھوپال سے جنوب مشرق میں ... ریاست بھوپال کے ... جی آئی پی ریلوے ... بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ... اور سیاحوں کی آسانی کے لئے بھوپال سے رائسین تک ... باقاعدہ موٹر سروس کا بھی انتظام ہے۔

رائسین کا قلعہ قدیم طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسے ... کی ایک ایسی پہاڑی پر بنایا گیا ہے جو سطح سمندر سے ... فٹ بلند ہے۔ اپنی جائے وقوع کی وجہ سے اسے مشرقی مالوہ کی تاریخ میں ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی سے قبل اس قلعہ کا ذکر تاریخ ... پر نہیں پایا جاتا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس سے صدہا سال پہلے سے اس علاقہ کی سیاست میں قلعہ کا خاص ... چلا آتا ہے۔ ... اس کا ذکر نہ آنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ مشرقی مالوہ کی اس عہد تک کی تاریخ پر تاریکی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ اول تو اس عہد کی بابت معلومات ہی بہت کم ہیں اور جو کچھ دستیاب ہوئے ہیں واقعات معلوم بھی ہیں وہ بھی شکوک سے خالی نہیں ہیں۔

ان مجبوریوں کے باعث بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ اس زمانہ کی تاریخ کا محض ایک سا خاکہ ذہن میں لانے کی غرض سے صرف ان خاندانوں کے ناموں پر اکتفا کیا جائے جو وقتاً فوقتاً یہاں حکمران رہے ہیں۔ ان خاندانوں میں موریا، سنگا، آندھرا، ... گپتا، ... ہرش، پرمار۔ اور ... خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ہن خاندان کی تاریکی ... کے بعد سے جو ... میں ہوئی ... تک یعنی اس وقت تک جب کہ سلطان محمود غزنوی کا پنجاب پر تسلط ہوا ہندوستان ... زیر تحت ابتری پھیلی رہی۔ اس تمام زمانہ میں کوئی ایسی مرکزی طاقت نہیں تھی جس کا اقتدار عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہو بلکہ بجائے اس کے ملک میں بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر جنگ رہتی تھیں۔ کوئی نظام ایسا نہ تھا جس سے اندرون ملک میں نظم و امن قائم رہتا یا کسی حملہ کا پوری طرح مقابلہ کیا جاتا۔ ان حالات میں مشرقی مالوہ میں ایک خود مختار ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے بانی پرمار خاندان کے نامبردار تھے۔ ان راجاؤں کے ماتحت یہ ریاست رفتہ رفتہ وسط ہند کی سب سے طاقتور حکومت بن گئی۔

اس بات کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں کہ یہ قلعہ اسی جگہ عرصہ دراز سے واقع تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اگرچہ بوجہ اپنی جائے وقوع کے اس نواح میں اسے خاص اہمیت بھی حاصل تھی، اس کے علاوہ مشرقی مالوہ کی قدیم راجدھانی ... کے بالکل ہی قریب واقع تھا۔ تاہم پرمار راجاؤں کی حکومت سے پہلے یعنی آٹھویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی تک قائم رہی رائسین کی بابت کوئی مواد فراہم نہیں ہوتا۔

قلعہ کی وجہ تسمیہ کی بابت بھی سخت اختلافات ہیں۔ پرمار عہد کے بعض دستاویزات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ سمت ... بکرمی کے قریب مالوہ میں کوئی جگہ "راجہ سین" نامی تھی۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ شاید رائسین کا ابتدائی نام یہی رہا ہو۔ اس بارے میں مقامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم کے ایک راجہ "رائے سنگھ" نامی نے اس قلعہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ کثرت استعمال سے "رائے سنگھ" ... "رائے سین" ہو گیا۔ یہ روایت زیادہ قرین قیاس اس لئے بھی ہے کہ تزک بابری میں اسے راجہ رائے سنگھ کے نام سے موسوم کیا ہے۔[۱]

قلعہ کی قدامت کے متعلق جو روایتیں اس نواح میں مشہور ہیں ان میں ... نام قابل ... ہوئے ہیں تاہم ان ... پیدائش مسیح سے دو تین صدی قبل اس کا وجود ثابت

۱۔ "تاریخ ہند جلد چہارم مؤلفہ ... و تزک بابری"

کیا جاتا ہے۔ ان روایات کی صحت معرضِ بحث میں لائی جا سکتی ہے لیکن ایک تحریری قوی ثبوت قدامت کی بابت موجود ہے۔ دریچہ قلعہ کے شمالی دروازہ کا ایک عجیب پتھر ہے۔ اس پتھر پر ایک شکار کا منظر کندہ کرکے دکھایا گیا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اس منظر کو پہلے سُرخ قسم کے رنگ سے بنایا گیا تھا اس کے بعد نوک دار آلے سے خطوط کو کندہ کیا گیا۔ رنگ کی بابت تحقیقات کرنے سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس کی نوعیت اُسی قسم کے سُرخ رنگ کی ہے جو ایک ہزار سال آدھم خیموں پر پالش کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

آج سے کچھ عرصہ پیشتر تک شکاریوں، اُن کی سواریوں اور شکار کی تصویروں میں سُرخ رنگ جھلکتا نظر آتا تھا مگر اس کے باشندوں کی خوش عقیدگی نے تصاویر کے نقوش کو چونے سے لیپ کر بھر دیا ہے تاہم جہاں سے چونہ جھڑ گیا ہے سُرخی اب بھی نظر آجاتی ہے

ان تصاویر کی بابت اس وقت تک کسی عہدِ خاص کا تعین نہیں کیا جا سکا ہے تاہم ان کی طرز و وضع کے اعتبار سے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان تصویروں سے ملتی جلتی ہیں جو سلسلہ کیمور (وسط ہند) کے غاروں کی دیواروں پر کندہ ہیں۔ یا جو ریاست رائے گڈھ (ممالک متوسط) میں دریائے مانڈ کے مشرقی جانب موضع سنگھن پور کے قریب ایک پہاڑی سلسلہ میں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن باوجود ان باتوں کے بھی قلعہ رائے سین کی تصاویر کی قدامت ناقابل انکار ہے۔

یہ تصویریں کس عہد میں کندہ کی گئیں ہیں کتنے عرصہ تک ان کا ابتدائی خاکہ محض سرخ رنگت میں قائم رہا؟ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب صحت و یقین کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح میں رائسین کے قریبی مقامات سانچی۔ ستاری۔ آندھیر۔ ست دھارا۔ پپلیا۔ بھوجپور اور بھوجپور جو رائسین سے کسی قدر دور ہے، بدھ مت انتہائی عروج پر تھا۔ حال ہی میں قلعہ کے اندر کچھ کھدائی کا کام جاری کیا گیا تھا۔ اس ذیل میں منجملہ دوسرے آثار کے کچھ سنگین استوپ برآمد ہوئے۔ ان کی برآمدگی سے یہ گمان کیا جانے لگا ہے کہ رائسین کے حکمرانوں نے بھی بدھ مت اختیار کر لیا تھا۔ بعض استوپ ایسے بھی ہیں جن میں کتبے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریریں بہت کچھ مٹ گئی ہیں۔ تاہم تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی تعمیر چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں ہوئی ہے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ گپت راجاؤں کے عہد میں رائسین میں بدھ مت کا زور دورہ رہا ہوگا۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی بدھ مت ہندو مت میں جذب ہو گیا ہوگا

مسلمان اس علاقہ میں تیرھویں صدی کے آغاز میں آئے۔ ۱۲۳۱ء میں سلطان شمس الدین التمش گوالیار کے حاکم راجہ دیپال کو شکست دے کر مالوہ کی طرف بڑھا۔ اور قلعہ بھیلسہ کو تسخیر کرکے اس نے اجین کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد مالوہ پھر خود مختار ہو گیا۔ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) نے مالوہ پر دوبارہ حملہ کیا اور راجہ مہالک دیو اور اس کے پردھان کوکہ نامی کو شکست دے کر اس صوبہ کو سلطنت دہلی میں شامل کر لیا اور عین الملک کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا۔

لیکن تاریخ فرشتہ کو اس سے اختلاف ہے۔ اس کی رو سے مالوہ کو سب سے پہلے غیاث الدین بلبن نے ۱۲۶۵ء میں فتح کیا۔ اس وقت سے سلطان ناصر الدین محمود ثانی کے عہد حکومت تک مالوہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ ۱۳۹۸ء میں جب تیمور نے ہندوستان پر چڑھائی کی اور حکومت دہلی کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور خاں صوبہ دار مالوہ نے اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔ دلاور خاں کے بعد اس کا بیٹا ہوشنگ شاہ ۱۴۰۵ء میں تخت پر بیٹھا ۱۴۳۵ء میں ہوشنگ شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ہی سلطان محمود خلجی نے مالوہ پر قبضہ جما لیا۔ یہی عہد ہے جب کہ قلعہ رائسین کا نام پہلی مرتبہ تاریخ کے صفحات پر آتا ہے۔ غیاث الدین خلجی اسی محمود خلجی کا بیٹا تھا جس نے ۱۴۶۹ء سے لے کر

دیوانے — ضیا فتح آبادی

شبِ تاریک میں اُمیدِ سحر کے ہمراہ
جانبِ منزلِ مقصود بڑھے جاتے ہیں
آندھیاں جیسے چلیں جیسے بگڑے اُٹھیں
سرِ کہسار حوادث پہ چڑھے جاتے ہیں
جانبِ منزلِ مقصود بڑھے جاتے ہیں

یہ اندھیرا یہ غضبناک گھٹاؤں کا ہجوم
یہ تموج یہ تلاطم - یہ تھپیڑ و گرداب
یہ اُمنڈتے ہوئے طوفان اُبلتے ہوئے جھاگ
ان کی نظروں میں تو یہ سب ہیں مگر نقشِ بر آب
سرِ کہسار حوادث پہ چڑھے جاتے ہیں

اُفقِ چرخ سے یہ چھین کے لائینگے سحر
ڈگمگا جائیں گے اِک آن میں راہوں کے قدم
ہاتھ میں مشعلِ خورشید لیئے لوٹیں گے
اور جلا دیں گے اسی آگ سے ایوانِ ستم
جانبِ منزلِ مقصود بڑھے جاتے ہیں
سرِ کہسار حوادث پہ چڑھے جاتے ہیں

سنہ ۱۵۳۱ء تک مالوہ پر حکومت کی۔ اس کے عہد میں قلعہ رائسین کے اندر متعدد عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ان سب میں آتیبا کا مندر اور ناصر الملک کی مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان عمارتوں پر شیلیں کتبے بھی نصب کیے گئے تھے۔

قلعہ کے اندر جو عمارتیں دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں بادل محل، چار مندر، دو مسجدیں اور چند پختہ تالاب ہیں۔ ان میں ناصر الملک کی مسجد، ایک مندر، بارہ دری اور بادل محل کی حالت بہت اچھی ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے ان کی مرمت بھی کرا دی ہے۔ یہ سلسلہ عمارات ... بارہ دری ... اس کا مغربی دروازہ بھی اچھی حالت میں ہے ... نسب ہے ... اس پر کوئی تحریر نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ... عمارتیں ہیں لیکن ... انھیں کوئی خاص حیثیت حاصل نہیں ہے ... جو ایک ... بنایا گیا ہے ... ایک ... خانہ اور تین چھوٹے چھوٹے ... ہیں۔ ان ... فاصلہ پر ایک عمارت نقار خانہ کے نام سے ہے۔

قلعہ کے ... ہیں۔ دو جنوبی ایک شمالی ... بھی ٹھیک ہے۔ ان پر ... تحریریں ... ہیں جن سے قلعہ کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ زیادہ تر عمارتیں ایسی ہیں جن پر ... بنے ہوئے ہیں۔ یہ گنبد اونچی کرسی دے کر تعمیر کیے گئے ہیں۔ دریچوں اور ... پر ... کنگرے بھی ہیں۔ ان سے عمارت کی شان اور دلآویزی میں ... اضافہ ہو گیا ہے۔ عمارتوں کی محرابوں میں ایک خاص بات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہر محراب کو متعدد چھوٹی چھوٹی محرابوں پر منقسم کیا گیا ہے یعنی چھوٹی محرابیں بڑی محرابوں کو سہارا دیے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم عمارتوں میں محرابوں کی یہ طرز تو اکثر دیکھنے میں آتی ہے لیکن فن تعمیر کا جو دلکش نمونہ ... محرابوں میں پیش کیا گیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

تمام عمارتوں کی دیواروں پر پہلے موٹا پلاسٹر کیا گیا ہے پھر اس پلاستر کے اوپر سفید چکنا ... نقش و نگاری کی گئی ہے۔ بارہ دری کے بعض گوشوں میں بیل بوٹوں کے نشانات اب بھی نمایاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قلعہ عرصہ دراز تک اپنی اصلی قدیم حالت پر قائم رہا۔ اس کے بعد شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہونے لگے جس ... جو حصہ قابل مرمت ہوتا تھا اس کی مرمت کرا دی جاتی تھی۔ گری ہوئی عمارتوں کی جگہ پر جدید عمارتیں تعمیر کرائی گئیں۔ قدیم عمارتوں میں ترمیم و اصلاح بھی کی جاتی تھی۔ اسی ذیل میں قلعہ کے چاروں طرف ایک جدید ... فصیل تعمیر کی گئی۔ اس میں برج اور مورچے بنائے گئے۔ مزید پائداری کے لئے پشتے بنائے گئے، گوگھٹ کی دیواریں نکالی گئیں۔ قلعہ کے گرد کھائی کھود دی گئی۔

اس وقت قلعہ کی مختلف عمارتوں پر حسب ذیل چھ کتبے ہیں۔

(۱) ... مندر کی دیوار پر سنسکرت میں۔

(۲) مسجد ناصر الملک کی درمیانی محراب پر فارسی میں۔

(۳و۴و۵) یہ تین کتبے دروازوں کے ... پر ہیں۔ ان کی زبان مقامی ہے۔ جو ہندی سے ملتی جلتی ہے۔

(۶) فارسی کتبہ جو ... دروازہ پر ہے۔

مندر کے دروازے پر کتبہ کا جو پتھر نصب ہے اس کا طول ۱۳ ¾ ... اور عرض ... انچ ہے۔ اس میں گیارہ سطریں ہیں اور اس کی زبان بگڑی ہوئی سنسکرت کا ایک نمونہ ہے۔ تحریر کا بہت بڑا حصہ بارو باراں کے شدید جھونکوں کی نذر ہو چکا ہے۔ بڑی کوشش کے بعد کہیں کہیں سے کچھ نشانات پڑھے جا سکتے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ سنہ تاریخ اور دن کی جگہ ... نمایاں ہے۔ اصل عبارت یہ ہے۔

"بکرمی سمت ۱۵۴۷ ساکھ سک ۱۴۱۲ ماگھ بدی تیرہیں ادی ونا یوس لکھتہ۔"

یہ سنہ اور تاریخ ۔یوم شنبہ ۲۳ جنوری ۱۴۹۱ء کے مطابق ہے۔

دوسری سطر میں صرف یہ الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں "دتا محمود ا ساہی"۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے کے جو الفاظ مٹ گئے ہیں وہ ملا کر شاید غیاث الدین محمد شاہ بادشاہ مالوہ کا نام ہوگا۔ تیسری سطر میں صرف "مالوہ دیش" پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جو نقوش ہیں وہ صاف طور سے سمجھ میں نہیں آتے نہایت دقت ریزی کے بعد "گرائے مبا ودا" لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چوتھی سطر کا زیادہ حصہ صاف ہے۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے اور صاف پڑھا جاتا ہے۔ "ملکا، ترکسا نا، مالا۔ ملوکا سلطانی"۔ یہی الفاظ نویں، دسویں اور گیارھویں سطروں میں دہرائے گئے ہیں۔ پانچویں سطر کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں۔

"دامزنا با باتاما"

اس کتبے کی جو عبارت کہیں کہیں سے باقی رہ گئی ہے اور جسے ناظرین سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں وہ ایک دوسرے سے اس قدر غیر متعلق، بے ربط اور مبہم ہے کہ اس سے اصل مطلب یا مندر کی بابت کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا مبصرین نے اس کا مطلب نکالنے، عبارت کا جوڑ بٹھانے اور ناموں کی تحقیق میں بہت کچھ کوشش صرف کی ہے اور جو نتیجہ نکالا گیا ہے اس کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صحت سے بہت زیادہ قریب ہے۔ (باقی آئندہ)

نقد و نظر

چودھری سلطان کے ڈرامے | مصنف جناب چودھری سلطان۔ ناشر: مکتبہ سیاسیہ، اردو بازار دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۲۴ صفحات۔ مجلد قیمت تین روپے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نشر گاہ دہلی کا دیہاتی پروگرام ... گاؤں والے تو ... بھی ... بیٹھ کر سنتے ہیں بلکہ انگریزی پروگرام کے وقت جن گھروں میں عموماً ریڈیو بند کر دیا جاتا ہے وہاں دیہاتی پروگرام شروع ہونے پر بھی اس کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا ... گھنٹہ گزرنے کے بعد ... چودھری کی ... ہوتی ہے ... بھی چاہتا ہے کہ ... ہمارا رہنما تو اچھا ہوتا۔ اس مقبولیت و کامیابی کا سہرا ... کے تحت چودھری سلطان صاحب ہیں جو دیہاتی پروگرام لکھتے ... سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اس سلسلے کے ... ڈراموں کو شائع کیا گیا ہے جو ... تاریخی ہیں ... ان سے ... ذخیرہ کی ... کہا جا سکتا ہے ... متعلق ہیں۔ پانچ ڈرامے شاہان مغلیہ ... جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد زریں کی یاد دلاتے ہیں تو ایک ایران کی مشہور رزمیہ داستان ... پیش کرتا ہے۔ باقی تین مزاحیہ ہیں۔ ... اصل دیہاتی طرز گفتگو کو برقرار رکھا ہے ورنہ اور سب عام فہم سیدھی سادی زبان میں لکھے ہیں۔ ان کا مطالعہ دیہاتی پروگرام سننے کی طرح ہر خاص و عام کے لئے باعث دلچسپی ہو سکتا ہے ... تنقید کو زیادہ وسیع نہیں ...

زرد پتے | مصنف: جناب ابراہیم جلیس ... ناشر ... ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۷۶ صفحات مجلد قیمت سوا دو روپے۔ ... ترقی پسند مضمون کی پیروی کرنے والے ... کے افسانہ نگاروں کی طرح ابراہیم جلیس صاحب نے بھی ... اپنے افسانوں میں اس ملک کی سماجی زندگی کے ان تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو عبارت ہیں مرد و عورت کے باہمی تعلقات ... کی تصویریں کھینچی ہیں جو مرد کی نفس پرستیوں اور عورت کی مجبوریوں یا مالداروں ... اور مزدوروں کی بے چارگیوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ چنانچہ موضوع کے لحاظ سے ان میں کوئی جدت نہیں مگر طرز بیان اور حسن ... قابل تحسین ہے ... فسانوں کے مطالعے کی سفارش کی جا سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں نازک ... موضوعوں پر بھی عریانی یا رکاکت پیدا ہونے نہیں پاتی کہیں کہیں انسانی فطرت کا صحیح مطالعہ ... گئی ہے اور بعض افسانے فنی اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں قاضی عبدالغفار صاحب نے خود ہی اعتراف کر لیا ہے کہ میں بہت ہی ادنیٰ درجہ کا نقاد ہوں ورنہ یہ کہنا پڑتا کہ اس مجموعے کو حقیقت نگاری کی پہلی کوشش بتا کر انہوں نے اپنے قلیل المطالعہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

دام خیال | مصنف جناب ضیاء الاسلام بی۔ اے ... ناشر: ساقی بک ڈپو ... روڈ، الہ آباد۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ... صفحے، علاوہ چار تصاویر، مجلد قیمت سوا دو روپے۔ اس مجموعۂ کلام میں شاعری کے نئے اور پرانے دونوں اسلوب موجود ہیں یعنی کچھ غزلیں اور نظمیں عروض و بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور کچھ ان سے بے نیاز رہ کر۔ اول الذکر قسم پر ... اس درجہ چھائی ہوئی ہے کہ کہیں بھی کوئی نئی بات نظر نہیں آتی بلکہ بہت سی جگہ پرانے شعراء کے کلام سے اس طرح استفادہ کیا گیا ہے کہ چشم پوشی سے کام لینے والے بعض لوگ اسے محض توارد کہیں گے اور بعض ... سرقہ۔ مثلاً اس شعر کی بابت جو "نذر محبت" کے زیر عنوان درج ہے کیا کہا جائیگا ؎

ترے عشق میں زندگانی لٹا دی ۔۔۔ تری یاد میں نوجوانی لٹا دی

جبکہ حضرت بہزاد لکھنوی کی اس مشہور غزل کا جو گراموفون اور ریڈیو کے ذریعہ سارے ہندوستان میں لاکھوں بار گونج چکی ہے، مندرجہ ذیل مطلع اپنے نقش اول ہونے کا دعویدار ہے ؎

ترے عشق میں زندگانی لٹا دی ۔۔۔ عجب کھیل کھیلا جوانی لٹا دی

پھر قابل غور بات یہ ہے کہ بہزاد کا شعر اتنا بلند ہے کہ اس سے مقابلہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ... کاوش سے ایسی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ دوسری قسم کے کلام میں بعض جگہ ابہام اس درجہ زیادہ ہے کہ کوشش کے باوجود کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا مثلاً "برف باری کے زمانے میں احساس کے گالے ہر سو خون بن بن کے اڑ جاتے ہیں" ایک ایسا معمہ ہے جسے شاید ہی کوئی حل کر سکے۔ کتاب کی قیمت ضخامت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے اور خصوصاً جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ ... زیادہ جگہ گھیرنے کے لئے ایسی دریا دلی سے کام لیا گیا ہے کہ بعض صفحات پر صرف ایک شعر ہے اور بعض پر دو۔

ف۔ ح

روپ سنگار | مصنف ڈاکٹر اعظم کریوی۔ ناشر: کتب خانہ دارالبلاغ محمد نگر میو روڈ، لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ... صفحات۔ مجلد دو روپے۔

چودہ افسانوں کے اس دلکش مجموعے میں ہماری معاشرت کے سچے مرقعے ... کی جھلک دکھاتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانے صداقت سے اسقدر قریب ہوتے ہیں کہ انہیں صحیح معنوں میں پریم چند کا ہم پلہ کہا جاتا ہے۔ اور یہی نہیں، ان کے ہاں بیان کی رنگینی ایک علیحدہ چیز ہے جو پریم چند کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ اس مجموعے کا مقابلہ اگر موصوف کے پچھلے مجموعوں سے کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ انہوں نے آج سے پچیس سال پہلے جو روش اپنے لئے اختیار کی تھی، وہ بدستور قائم ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے افسانے ایک مقصد کے ماتحت لکھے ہیں۔ انہوں نے دوسروں کے پیدا کئے ہوئے سیلاب کے ساتھ کبھی بہہ جانا گوارا نہیں کیا۔ یہ مستقل مزاجی قابل ستائش ہے۔ اس مجموعے میں "روپ سنگار" ایک تاریخی افسانہ ہے جسکی

نقد و نظر

چودھری سلطان کے ڈرامے مصنف جناب چودھری سلطان صاحب۔ ناشر مکتبہ سیاسیہ۔ اردو بازار۔ دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۴ صفحات۔ مجلد قیمت تین روپے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دہلی ریڈیو اسٹیشن کا دیہاتی پروگرام ... درجہ دلچسپ ہے۔ گاؤں والے تو گاؤں والے شہر کے لوگ بھی ... سے سن کر ... لیتے ہیں۔ ... کانوں پر انگریزی پروگرام کے وقت جن گھروں میں عموماً ریڈیو بند کر دیا جاتا ہے وہاں دیہاتی پروگرام شروع ہونے پر بھی اس کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تا وقتیکہ ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد بار ... چوپال کی نشست ختم نہیں ہو جاتی ... جی چاہتا ہے ابھی یہ اور جاری رہتا تو اچھا ہوتا۔ اس مقبولیت و کامیابی پر خراج تحسین کے مستحق چودھری سلطان صاحب ہیں جو دیہاتی پروگرام لکھتے اور سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اس سلسلے کے ایک درجن ڈراموں کو شائع کیا گیا ہے جو زیادہ تر تاریخی ہیں۔ ان میں سے پہلے تین ڈرامے جنہیں ایک ہی زنجیر کی تین کڑیاں کہا جا سکتا ہے ... اور ... سے متعلق ہیں۔ پانچ ڈرامے شاہان مغلیہ ... بابر ہمایوں اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد زریں کی یاد دلاتے ہیں تو ایک ایران کی مشہور داستان ... رستم و سہراب کی ... پیش کرتا ہے۔ باقی تین مزاحیہ ہیں۔ میلے کی سیر ... پڑھائی ... میں حتی ... دیہاتی طرز گفتگو کو برقرار رکھا ہے ورنہ اور سب عام فہم سیدھی سادی زبان میں لکھے ہیں۔ ان کا مطالعہ دیہاتی پروگرام سننے کی طرح ہر خاص و عام کے لئے باعث دلچسپی ہو سکتا ہے۔ ... کتابت طباعت ... زیادہ توجہ ... ہے۔

زرد پتے مصنف: جناب ابراہیم جلیس۔ ... ناشر ... حیدرآباد دکن۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۷۵ صفحات۔ مجلد قیمت ... روپے۔ ... مضامین کی ... افسانہ ... کی طرح ابراہیم جلیس صاحب نے بھی ... ان افسانوں میں اس ملک کی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ... مرد و عورت کے باہمی تعلقات ... کی تصویر کشی میں جو مرد کی نفس پرستیوں اور عورت کی مجبوریوں یا ... مزدوروں ... کی آئینہ دار ہوتی ہے ... کوئی جدت نہیں مگر طرز بیان اور حسن ... قابل تحسین ہے اور اسی بنا پر ان افسانوں کے مطالعے کی سفارش کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں نازک ترین موقعوں پر بھی عریانی یا رکاکت پیدا ہونے نہیں پائی۔ کہیں کہیں انسانی فطرت کا صحیح مطالعہ کرنے میں کسر رہ گئی ہے اور بعض افسانے فنی اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں مولوی عبدالحق صاحب نے خود ہی اعتراف کر لیا ہے کہ میں بہت ہی ادنیٰ درجہ کا نقاد ہوں ورنہ یہ کہنا پڑتا کہ اس مجموعے کو حقیقت نگاری کی پہلی کوشش بتا کر انہوں نے اپنے ... ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

دام خیال مصنف جناب ضیاء الاسلام ... ناشر ... روڈ۔ الہ آباد۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کے ... صفحات علاوہ چار تصاویر۔ مجلد قیمت دو روپے۔ اس مجموعہ کلام میں شاعری کے نئے اور پرانے دونوں اسلوب موجود ہیں یعنی کچھ غزلیں اور نظمیں عروض و بحر اور ردیف و قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور کچھ ان سے بے نیاز ہو کر۔ ... الذکر قسم پر ... کی اس دور ... چھائی ہوئی ہے ... انہیں بھی کوئی نئی بات نظر نہیں آتی بلکہ بہت سی جگہ پرانے شعرا کے کلام سے استفادہ کیا گیا ہے جسے چشم پوشی سے کام لینے والے بعض لوگ اسے محض توارد کہیں گے اور بعض ... سرقہ۔ مثلاً اس شعر کی بابت جو "نذر محبت" کے زیر عنوان درج ہے کیا کہا جائے گا ۔

ترے عشق میں زندگانی لٹا دی — تری یاد میں نوجوانی لٹا دی

جبکہ حضرت بہزاد لکھنوی کی اس مشہور غزل کا جو گراموفون اور ریڈیو کے ذریعہ سارے ہندوستان میں لاکھوں بار گائی جا چکی ہے، مندرجہ ذیل مطلع اپنے نقش اول ہونے کا دعویدار ہے ۔

ترے عشق میں زندگانی لٹا دی — عجب کھیل کھیلا جوانی لٹا دی

پھر قابل غور بات یہ ہے کہ بہزاد کا شعر اتنا بلند ہے کہ اس سے مقابلہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ... کی کاوش سے ایسی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ دوسری قسم کے کلام میں بعض جگہ ابہام اس درجہ زیادہ ہے کہ کوشش کے باوجود کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا مثلاً "برف باری کے زمانے میں احساس کے گھونسلے ہر سو ... جن جن کے اڑ جاتے ہیں" ایک ایسا معمہ ہے جسے شاید ہی کوئی حل کر سکے۔ کتاب کی قیمت ضخامت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے اور خصوصاً جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ زیادہ جگہ گھیرنے کے لئے ایسی دریا دلی سے کام لیا گیا ہے کہ بعض صفحات پر صرف ایک شعر ہے اور بعض پر دو۔

ف۔ ح

روپ سنگار مصنف ڈاکٹر اعظم کریوی۔ ناشر مکتبہ ... دار الابلاغ محمد نگر میور روڈ۔ لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۶ صفحات۔ مجلد ... روپے

چودہ افسانوں کے اس دلکش مجموعے میں ہماری معاشرت کے سچے مرقعے ... جھلک دکھاتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانے صداقت سے اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ انہیں صحیح معنوں میں پریم چند کا ہم پلہ کہا جاتا ہے۔ اور یہی نہیں ان کے ہاں بیان کی رنگینی ایک علیحدہ چیز ہے جو پریم چند کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ اس مجموعے کا مقابلہ اگر موصوف کے پچھلے مجموعوں سے کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ انہوں نے آج سے پچیس سال پہلے جو روش اپنے لئے اختیار کی تھی، وہ بدستور قائم ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے افسانے ایک مقصد کے ماتحت لکھے ہیں۔ انہوں نے دوسروں کے پیدا کئے ہوئے سیلاب کے ساتھ بھی بہہ جانا گوارا نہیں کیا۔ یہ مستقل مزاجی قابل ستائش ہے۔ اس مجموعے میں "روپ سنگار" ایک تاریخی افسانہ ہے جس کی

مناسبت سے کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ جاگیرلی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ [illegible] کا [illegible] ایک [illegible] حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عورتوں کی آزادی اور مردوں کے [illegible] بدوش چلنے بلکہ ان سے آگے بڑھ جانے کی کوشش پر ایک لطیف طنز ہے۔ [illegible] میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ مرد گھروں میں رہ کر گرہستی کے کام انجام دیا کریں گے اور عورتیں باہر جاکر دوسرے تمام فرائض پورے کیا کریں گی۔ معکوس حالت کو بہت ہی لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس کا آخری [illegible] مگر [illegible] ہے۔

باغبانی نمبر ایڈیٹر چودھری رحمت خاں ناز [illegible] ناشر [illegible] اینڈ کمپنی [illegible] روڈ لاہور۔ [illegible] کے [illegible] صفحات۔ بلا جلد قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ سات سال سے فن زراعت و باغبانی سے متعلق [illegible] ماہانہ رسالہ [illegible] لاہور سے جاری ہے۔ زیر نظر پرچہ اس کی اشاعت خاص ہے جسے کتابی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں ستر پھلوں اور ان کی مختلف قسموں کے [illegible] چڑھانے اور رکھنے کے مفصل حالات الگ الگ درج ہیں۔ صرف [illegible] نہیں [illegible] میں لکھی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضامین کی بنیاد [illegible] کوشش سے کام لیا گیا ہے۔ ہر پھل کے ساتھ اس کی کھاد تیار کرنے، اس کی [illegible] موسمی اثرات اور بیماریوں سے بچانے کے طریقے بیان کرنے کے علاوہ ان اجزا کو مجموعی حیثیت سے عام درختوں کی نشوونما اور ان کی کاشت [illegible] کیا گیا ہے۔ ایک نظام [illegible] سے متعلق بھی شامل ہے۔ پھلوں کی [illegible] کی تحقیق [illegible] ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اردو میں ان کے مروجہ نام کس زبان سے لئے گئے ہیں اور [illegible] دوسری زبانوں میں کن ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جنات کی دنیا مصنف: جناب مقبول احمد سیوہاروی ناشر دکن اردو اکیڈیمی۔ ادارۂ فرقیہ۔ بیرون کالی کمان۔ حیدرآباد دکن۔ [illegible] کے ۱۱۲ صفحات۔ بلا جلد قیمت سوا روپیہ۔ اس کتاب میں جنوں کے [illegible] درج ہیں جو یقیناً بہت دلچسپ ہیں۔ خصوصاً ابوالسجات قدرتی کا سفر منزل [illegible] تک پہنچنے کی ترکیبیں دشوار گذار راستے کے ہولناک حالات اور محیر العقول واقعات [illegible] جاذب توجہ ہیں کہ انہیں ایک ہی نشست میں پڑھ لینے کو دل چاہتا ہے۔ [illegible] میں شک نہیں کہ عقل انسانی ترقی پاکر جنوں اور پریوں کے حالات کو صحیح سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے اسلئے کہانی کی یہ قسم اب بعد از وقت ہے مگر تحریر کا اسلوب اگر دلنشیں ہو تو یہ کاوش اب بھی خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مقبول صاحب کے انداز بیان میں شگفتگی ہے۔ اس لئے ان انہونی باتوں کو بھی پڑھنے کے لئے طبیعت کھنچ جاتی ہے۔ کتاب کا سرورق بالکل غیر موزوں ہے۔ اسے دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ آئندہ اشاعت کے وقت اس امر کا خیال رکھا جائے تو [illegible] ہے۔

نوٹ:- تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنی ضروری ہیں ورنہ کتب پر ان کاموں میں اظہار خیال نہ ہو سکے گا — (ادارہ)

کنول

کنول نے قدرت معبود کے آئینہ دار — تو بھی ہے دنیا میں اک حسن نظر کی یادگار
کس قدر دلکش مناسبت ہے مناسبت [illegible] — تو کھلی پانی کی [illegible] پہ [illegible] بہار

چھو لیا [illegible] تو نے منظر [illegible]
چاند گویا [illegible] کی آغوش میں

دہر کے [illegible] [illegible] — تیری صورت [illegible] آپ ہی اپنا جواب
تو کھلا [illegible] کی آئین [illegible] — دیکھتا ہے [illegible] کے منہ پر تیرا آفتاب

تیری ہر [illegible] فطرت ہو گیا
ہے سراپا [illegible] معبود کی گویا نشاں

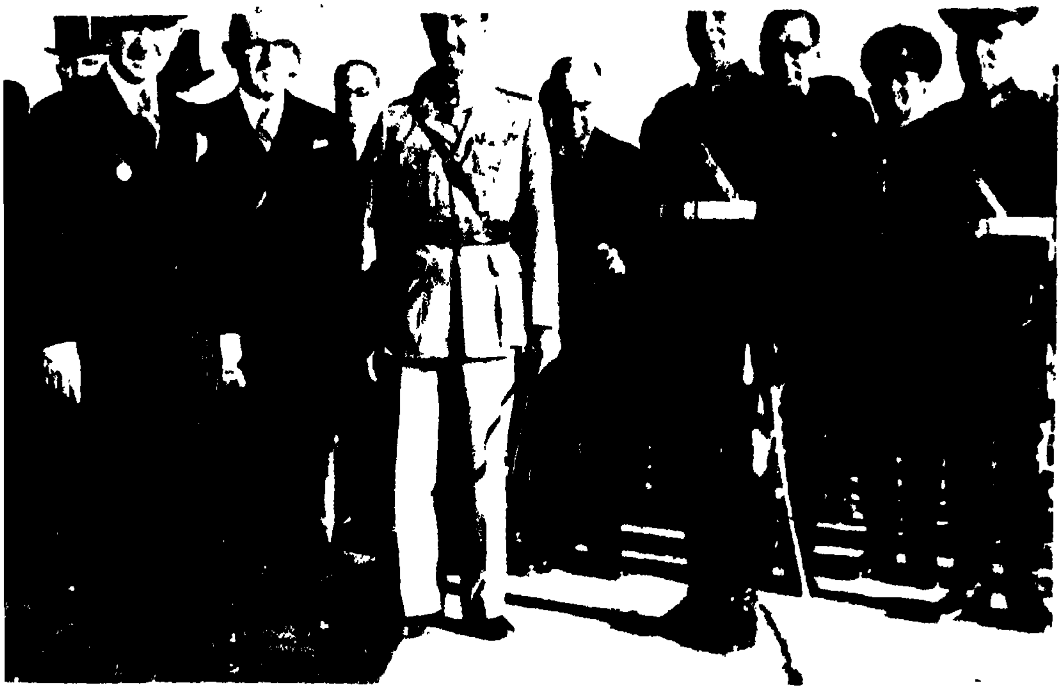
ہاں مگر اتنا بتا جلوہ میں تیرے [illegible] ہے — کشتی عمر رواں کا کچھ کوئی ساحل بھی ہے
زندگی کی راہ میں تیری کوئی منزل بھی ہے — تیرے آئینہ کا زمانے میں کوئی حاصل بھی ہے

[illegible] جلوہ دکھانے کیلئے
[illegible] لب پر مسکرانے کیلئے

سکندر مہدی

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

1. گاتی ہوئی راہیں (نظم) .... علامہ سیماب اکبر آبادی ......
2. پطرس کی مزاح نگاری .... پروفیسر کنہیا لال کپور ......
3. روضۂ استاد الدولہ .... مولانا نور احمد فریدی
4. ایرانی ریل کی مختصر تاریخ .... ڈاکٹر جمشید منعم
5. بہادر (مصری افسانہ) .... جناب صلاح الدین قریشی ......
6. سائنسی ترقیوں کے مسائل ...... محترمہ زہرا رسل ......
7. اردو کلچر .... پروفیسر حامد اللہ افسر ......
8. مرزا غالب کی شاعری میں ہندوستانی جھلک ...... پروفیسر پرمانند شرما ......
9. پکار (افسانہ) .... محترمہ شکیلہ اختر ......
10. علامہ اقبال کے متضاد نظریئے .... جناب مکیش اکبر آبادی
11. آگ کا سمندر (افسانہ) .... جناب کوثر چاند پوری
12. برطانیہ کے نئے مکانات .... جناب نارمن جورڈن موس ......
13. یہ سٹرائک (افسانہ) .... آغا آفتاب قزلباش ......



ہی میں عراق
جنٹ عبدالالٰہ
سے ملاقات کیلئے
تشریف لے گئے
۔ یہ دونوں
ں اسی موقعہ
پہنچی گئی تھیں۔
ملاقات کی تاریخی
ے قابل لحاظ ہے۔

انقرہ کے فضائی مرکز سے بغداد روانہ ہوتے وقت عراق کے ریجنٹ صدر ترکی عصمت انونو
وزیر اعظم شکر سراج اوغلو کو " خدا حافظ " کہہ رہے ہیں۔

عراق اور ترکی

ق کے ریجنٹ انقرہ کے زراعتی ادارۂ عالیہ کے ایک باغ میں عبدالالٰہ ترکی کے ہمراہ گامزن ہیں۔



آجکل





پطرس

پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) جو آجکل آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل ہیں اردو اور انگریزی کے ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں ۔ آپکے مزاحیہ مضامین بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ ان مضامین کا ایک مجموعہ ٫ مضامین پطرس ، کے نام سے شائع ہوچکا ہے ۔ آپکے متعلق پروفیسر کنہیا لعل کپور کا لکھا ہوا مقالہ اس شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں ۔

ماہ بنام ۵۴



آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۴ نمبر ۱۷ | یکم فروری ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی، بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران: راجیندر ناتھ شیدا، ایم اے — فضل حق قریشی، دہلوی — مشیر احمد، ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

ماسکو کانفرنس کے فیصلے

دنیا بھر کے پیچیدہ معاملات کو سلجھانے اور نظامِ نو قائم کرنے کے سلسلے میں تین بڑے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس ماسکو میں ہو رہی تھی گیارہ دن کے بعد بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ مختلف فیصلوں کے سلسلے میں مرتب کیا ہوا پانچ ہزار الفاظ کا اعلان نامہ جو آٹھ حصوں میں منقسم ہے بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے نشر کیا گیا۔ یہ اعلان نامہ کافی بصیرت افروز ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ کوریا میں دوبارہ آزاد حکومت قائم کی جائیگی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ایک روسی امریکی مشترکہ کمیشن بنانے کی تجویز ہے تاکہ وہ عبوری طور پر کوریائی حکومت قائم کرنے میں مدد دے۔ یہی کمیشن کوریا کے باشندوں کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی ترقی کے سلسلے میں بھی اعانت کرے گی۔ تینوں وزرائے خارجہ نے ایک بار پھر اس حکمت عملی پر مُہر تصدیق ثبت کی کہ چین کے بین الاقوامی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔ انھوں نے یہ ضرور تسلیم کیا کہ قومی حکومت کے ماتحت جمہوریت چین کو ہر قسم کے تعاون کی ضرورت ہے۔ مسٹر مولوٹوف اور مسٹر برنز کے مابین کئی موقعوں پر ان غیر ملکی دستوں کا مسئلہ زیر بحث رہا جو چین میں مقیم ہیں۔ وہ اس امر پر متفق رہے کہ اپنی ذمہ داریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جسقدر جلد اور آسانی کے ساتھ ممکن العمل ہو سکے روسی اور امریکی دستے سرزمین چین سے ہٹالئے جائیں۔ اس اعلان نامے کا آخری حصہ "ایٹمک انرجی کنٹرول کمیشن" سے متعلق ہے۔ اسمیں کہا گیا ہے کہ روس، برطانیہ اور امریکہ اس امر پر متفق ہیں کہ تحفظاتی کونسل کے دوسرے اراکین یعنی فرانس، چین اور کینیڈا کو بھی متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں مدعو کر لیا جائے تاکہ کمیشن قائم کرنے کی قرارداد ان کی موجودگی میں مرتب ہو سکے۔ جاپانی نظم و نسق کے سلسلے میں فار ایسٹرن کمیشن قائم کرنے پر تینوں وزرائے خارجہ کے متفق الرائے ہو جانیکا مطلب ارباب سیاست میں یہ لیا جا رہا ہے کہ جنرل میک آرتھر کے دائرۂ اختیارات میں کمی ہو جائیگی۔ ایک عام رائے یہ بھی ہے کہ فار ایسٹرن کمیشن کا رکن بننے کے سلسلے میں جو مراعات فرانس، بعض ممالک، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہندوستان اور جزائر فلپائن کو دی گئی ہیں وہ ان مراعات کی موجودگی میں ماند پڑ جاتی ہیں جو بلقان کے سلسلے میں برطانیہ اور امریکہ نے روس کو عطا کر دی ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سب فیصلے نپے تُلے ہونے کے باوجود بعض لحاظ سے روس کو بمقابلۂ برطانیہ یا امریکہ سب سے زیادہ فائدہ پہنچ گیا ہے۔ مثلاً بلقانی مراعات کے علاوہ انگریزوں، اور امریکیوں کی حسب ضرورت حیثیت تسلیم کرنے کے سلسلے میں حکومتِ بلغاریہ کو مشورہ کی پوری ذمہ داری روس کے سپرد کر دینی بھی ایک ایسی رعایت ہے جو خود برطانیہ اور امریکہ نے عطا کی ہے۔ گویا ان فیصلوں سے اکابرینِ ثلاثہ نے دوسری قوموں کے سامنے نظیر پیش کر دی ہے کہ باہمی فیصلے اور مفاہمت کے لئے شرائط اس طرح طے کی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اسی اعلان نامے کے آئینے میں اس نسبت اعتماد کی جھلک نظر آرہی ہے جو تینوں بڑی قوتوں کے درمیان پیدا ہو گیا ہے۔ ماسکو کانفرنس نے کم سے کم اس جمود و تعطل کو توڑ دیا جو مذاکراتِ لندن کے بعد فضائے امن پر طاری ہو چلا تھا۔

چین میں امریکی سرگرمیاں

یہ فیصلہ ہو چکنے کے باوجود کہ سرزمین چین سے امریکی دستے وغیرہ بہت جلد ہٹا لئے جائیں گے، امریکی طرزِ عمل سے ثابت ہو رہا ہے کہ اس نے چین کے اندرونی معاملات خصوصاً وہاں کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ یہانتک کہ بعض ارباب سیاست اس غیر ملکی حکمت عملی پر اظہار تعجب کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حسب ذیل چار امور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:—

(۱) متحدہ اقوام کی "انجمنِ رفاہِ مشترک" نے چین کی فلاح و بہبود کے لئے بڑی دریا دلی کے ساتھ جو روپیہ صرف کیا، اسکا ستر فیصدی حصہ امریکی سرمائے سے متعلق ہے۔ انجمن کے پیش نظر صرف کرنے سے فوری رفاہِ عامہ ہی مدنظر نہیں ہے بلکہ دستِ تعاون ایسے کاموں کی طرف بھی بڑھا دیا گیا ہے جو مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ریلوں کی تعمیرِ نو، ساحلی جہاز رانی اور سیلاب زدگان کے لئے آئندہ تعمیری کام۔

(۲) چین میں امریکی فوج کا قیام ایک غیر معینہ مدت کے لئے بڑھا دیا گیا ہے

(۳) امریکی حکومت بحری جہاز فراہم کرنے کے علاوہ حمل و نقل کی دوسری

سہولتیں بھی دیگی تاکہ چینی دستے آسانی سے منچوریا پہنچ سکیں۔

(۴) ہرچند کہ جنرل مارشل نے امریکی سفیر کی حیثیت سے ابھی سرکاری کام نہیں سنبھالا ہے تاہم طرزِ عمل سے ثابت ہو رہا ہے کہ ان کے قیام چین کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ چین کی سیاسی گتھیوں کو سلجھائیں اور وہاں کی خانہ جنگی کو ختم کردیں۔

چینی کمیونسٹ اور تجاویزِ صلح

جنرل چیانگ کائی شیک نے کومنتانگ سے تین نکات پر مشتمل جو تجاویزِ صلح چین کی مرکزی حکومت کی جانب سے چین کی کمیونسٹ پارٹی کے پاس بھیجی تھیں منظور کرلی گئی ہیں۔ ان سرکاری تجاویز میں بیان کیا گیا تھا کہ جنرل جارج مارشل کو جو حال ہی میں امریکی سفیر کی حیثیت سے چین بھیجے گئے ہیں، مرکزی حکومت اور کمیونسٹوں کے مابین صلح کرانے، خانہ جنگی روکنے اور ریلوں کا نظام دوبارہ قائم کرانے کے سلسلے میں "امن خواہ چین" تصور کیا جائے۔ یہ پہلے ہی بیان کردیا گیا تھا کہ اگر کمیونسٹوں نے سرکاری تجاویز قبول کرلیں تو مرکزی حکومت جنرل مارشل سے قیام صلح کے لئے استدعا کریگی۔ کمیونسٹ پارٹی نے حسب ذیل الفاظ میں تجاویز کا جواب دیا ہے:۔

(۱) کمیونسٹ پارٹی کومنتانگ والی تجاویز کو عمومی طور پر قبول کرتی ہے۔

(۲) خانہ جنگی ملک بھر میں اور خصوصاً جہول میں روک دینی چاہیئے۔

(۳) حمل و رسائل کی بحالی میں بری، بحری اور فضائی تینوں ذرائع شامل ہونگے آزادی دلائے ہوئے علاقوں میں ڈاک اور تار کے سلسلوں سے پابندیاں ہٹالی جائینگی۔

(۴) تحقیقاتی جماعتوں میں ملک بھر کے تمام حلقوں سے غیر جانبدار اشخاص شامل ہونگے۔ نیز "پیپلز کنسلٹیٹو" کونسل کے اراکین بھی شریک ہونگے۔

کمیونسٹ جماعت کے جواب میں جنرل مارشل کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ناپسندیدہ انجمنوں کا استیصال

جاپان میں جنرل میک آرتھر نے پچھلے مہینے ایک ہدایت نامہ جاری کیا جس کی رو سے حکومت جاپان کے اعلیٰ مراتب سے ایسے اشخاص اور انجمنوں کو خارج اور بے دخل کردیا گیا ہے جنھوں نے اپنے ظلم و ستم اور تباہکارانہ حرکتوں سے امن عالم کو زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ اس ہدایت نامے کا مقصد یہ ہے کہ حکومت جاپان اور سیاسی جماعتیں عسکریانہ اور جاگیردارانہ اثرات سے پاک ہوجائیں اور دوسرے سرکاری اہلکاروں کے دل و دماغ سے وہ خوف دور ہوجائے جو خفیہ اور دہشت پسند جماعتوں نے پھیلا رکھا تھا۔ اس حکم کے بموجب ۲۰۰ ناجائز انجمنیں خلافِ قانون قرار پاگئی ہیں۔ ان میں "بلیک ڈریگن سوسائٹی" اور "گریٹر ایسٹ ایشیا سوسائٹی" بھی شامل ہیں۔

سرزمین عرب اور تیل کے ذخیرے

سطح کے اعتبار سے عرب کی سرزمین کتنی ہی بنجر اور غیر شاداب ہو بھی اپنے سینے میں تیل کے بے پناہ ذخیرے چھپائے ہوئے ہے۔ چنانچہ خوش فہم اور رجائیت پسند لوگ ساحلی علاقوں کے روغنی میدانوں میں جگہ جگہ برمے لگا کر زمین کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگا رہے ہیں۔ انھیں قوی امید ہے کہ اس بنجر زمین کی گہرائیوں میں بے پناہ تیل کا ذخیرہ موجود ہے۔ اگر ان کا قیاس صحیح نکلا تو وہ حصۂ ارض دنیا کے سب سے بڑے تیل کے میدانوں میں سے ایک ہوگا۔ کافی عرصے سے الظہران کے علاقے میں تیل صاف کرنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ موجود ہے جہاں روزانہ تین ہزار پیپے تیار ہوتے ہیں۔ پھر ایک اور کارخانہ اسی علاقے کے قریب بننا شروع ہوا جس کا کچھ حصہ مکمل ہوچکا اور کچھ باقی ہے۔ فی الحال وہاں ۲۰ ہزار پیپے روزانہ نکل کر صاف ہوجاتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ کارخانہ پوری طرح مکمل ہوجانے پر ۵۰ ہزار پیپے تیار کرسکیگا۔ مغربی ساحل پر چونکہ یہ کاروبار امریکی کمپنیوں کے پاس ہے اس لئے الظہران بالکل امریکہ کا ایک ترقی یافتہ شہر معلوم ہوتا ہے اور وہیں کے باشندے زیادہ تعداد میں مقیم ہیں۔ چنانچہ گذشتہ دو سال میں ان کی آبادی بہت کافی ہوگئی ہے۔ الظہران سے تیل باہر بھیجنے کے اس وقت دو طریقے ہیں اول۔ پائپ لائن کے ذریعے جو اس شہر سے براہ راست بحرین تک پڑی ہوئی ہے اور روزانہ چالیس ہزار پیپے تیل منتقل کرسکتی ہے۔ تاہم تیل کی عربی امریکی کمپنی اس کوشش میں ہے کہ پمپ کی قوتوں میں اضافہ کرکے رفتار اتنی بڑھادی جائے کہ روزانہ تریسٹھ ہزار پیپے تیل منتقل ہوسکے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ راس طنورا سے بحری جہازوں کے ذریعہ لے جایا جائے۔ اس طرح تقریباً چھ ٹینکر ہر ماہ لے جائے جاتے ہیں۔ اب دو نئی پائپ لائنیں ڈالنے کے خاکے مرتب ہو رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک افواہ پھیلی ہے کہ فلسطین والے معاملے کی بنا پر یا امریکیوں کے ساتھ کچھ بدمزگی ہوجانے کے باعث شاہ ابن سعود تیل کی مراعات منسوخ کرنے کے درپے ہیں۔ اس افواہ میں کسقدر اصلیت کے امکانات اسطرح پیدا ہوئے ہیں کہ حال ہی میں کچھ امریکی افسران الظہران سے جدہ گئے اور سعودی عرب کے حکام سے مل کر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔

عربی کو آسان بنانے کے لئے انعام

عربی زبان کی شاہی مصری اکیڈمی نے تیرہ ہزار روپے کا ایک انعام کا اعلان کیا ہے۔ یہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو عربی کو آسان تر بنانے کے لئے کوئی بہترین خاکہ پیش کرے۔ مقابلے میں شامل ہونے کے لئے آخری تاریخ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۶ء ہے۔ بہت سے علماء اس سلسلے میں مختلف تجاویز پہلے ہی پیش کرچکے ہیں جو اکیڈمی کے پاس محفوظ ہیں۔ یہ مفید کام اب تک اس خیال سے معرض التوا میں رہا کہ خاتمۂ جنگ کے بعد یورپ اور مشرق بعید کے مستشرقین بھی آسانی کے ساتھ اس مقابلے میں حصہ لے سکیں۔

ایک لاکھ پچاسی ہزار ڈاکٹر

ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ حفظانِ صحت کے سلسلے میں دس سال کا ایک معقول لائحۂ عمل مرتب کیا گیا ہے جس پر تقریباً دس ارب روپے صرف ہونگے۔ یہ لائحۂ عمل آل انڈیا ہیلتھ سروے اینڈ ڈویلپمنٹ کمیٹی نے بنایا ہے۔ اس کمیٹی کے صدر سر جوزف بھور ہیں۔ کمیٹی کی انتہائی کوشش ہوگی کہ ہر دو ہزار باشندوں کے لئے ایک ڈاکٹر موجود ہو تاکہ صحتِ عامہ کا معیار بلند ہو جائے۔ ۱۹۷۱ء تک جب اس تجویز کے آئندہ نتائج اپنے عروج پر پہنچینگے، ہندوستان میں ایک لاکھ پچاسی ہزار ڈاکٹر ہونگے جبکہ ان کی موجودہ تعداد صرف ساڑھے سینتالیس ہزار ہے۔ گویا اس وقت ہندوستان میں ہر چھ ہزار آٹھ سو باشندوں کے لئے محض ایک ڈاکٹر ہے جبکہ انگلستان میں اوسطاً ایک ہزار کے لئے ایک ڈاکٹر ہے۔ اس صحی نظام کے سلسلے میں دیہاتوں کو اصل مرکز بنایا جائے گا۔ اس کی عملی صورت یہ رہیگی کہ ایسے دیہاتوں کا ایک گروہ بن جائے جنکی آبادی تعداد میں ہزار ہو۔ ایسے ہر گروہ کا انچارج ایک مستند ڈاکٹر ہوگا اور ایک ڈاکٹرنی، جنکی تربیت ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ اس ڈاکٹر کی نگرانی میں چونتیس اشخاص کا پورا عملہ اور ایک شفاخانہ ہوگا جس میں فوری علاج کی غرض سے داخل ہونے والے مریضوں کے لئے پانچ پلنگ رہینگے۔ ایسے ہر تین ابتدائی مرکزوں کے ایک گروہ کے لئے ایک اسپتال ہوگا جس میں تیس پلنگ ہونگے۔ اس اسپتال میں دو ڈاکٹر، صحتِ عامہ کی دیکھ بھال کرنے والی دو نرسیں چار قابلہ اور چار مستند دائیاں ہونگی تاکہ دیہاتیوں کے گھروں پر جا جاکر طبی خدمات پیش کی جاسکیں۔ اسی طرح یہ دائرہ وسیع ہوتے رہینگے یہاں تک کہ ان سب کو ایک زنجیر کی مختلف کڑیوں کی طرح صوبے کے ایک اعلیٰ نظام کے ماتحت آجانا پڑے گا۔ ہر صوبہ کا محکمۂ حفظانِ صحت جو اصول و قواعد منضبط کرے گا۔ انپر بتدریج تمام ماتحت مرکزوں کو عمل کرنا ہوگا۔ اسی طرح ماتحت مرکزوں کی دشواریوں اور شکایتوں پر صوبے کا محکمۂ حفظانِ صحت غور کیا کرے گا متعدی یا وبائی بیماریوں کے پھیل جانے کی صورت میں فوری روک تھام کی مناسب ہدایات جاری کرتے ہوئے انہیں دوا کرنے کی تجویز پیش کرے گا۔

سامانِ آسائش کی تیاری کے منصوبے

لڑائی ختم ہونیکے بعد سے تعمیرِ نو کے سلسلے میں جو منصوبے ہندوستانی کارخانوں وغیرہ کے لئے مرتب ہو رہے ہیں ان میں اشیائے ضرورت کے ساتھ ساتھ آرام و آسائش کی چیزوں کا بھی برابر لحاظ رکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ بمبئی کے ایک بہت بڑے تاجر اور سرمایہ دار شیخ علی احمد جو کہ آجکل لندن میں ہیں برطانوی کارخانہ داروں سے بجلی والوں ریڈیو فریجیڈیر اور ہوائی جہازوں کے سلسلے میں گفت و شنید کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان آکر ہنت نئے کام شروع کرکے فوج سے برطرف ہونے والے ہزاروں سپاہیوں کے لئے وسیلۂ روزگار پیدا کر سکینگے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مزدور پیشہ جماعت کے لئے بھی اچھے مکانات کی فراہمی ممکن ہوسکے گی اور ان کے لئے بھی آرام و آسائش کا سامان مل سکے گا۔ مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ وہ ہندوستانی منڈیوں کے لئے سب قسم کا سامان کافی مقدار میں خرید رہے ہیں اور اگرچہ اسکے حمل و نقل کا انتظام ابھی نہیں ہوسکا ہے تاہم انہیں یقین ہے کہ مستقبل قریب میں ضرور ہو جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ ان چیزوں کے لئے جو لندن میں انہیں مل سکینگی انہیں امریکہ بھی جانا پڑے گا مگر برطانوی تاجروں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ وہی ان کے تمام مطالبات پورے کر دینگے۔

تپ دق کا تیر بہدف علاج

سویڈن کے مشہور سائنسدان پروفیسر گنیس ڈیوڈ نے امید دلائی ہے کہ میں تپ دق کا تیر بہدف علاج معلوم کرنیکے سلسلے میں دنیا کا پہلا شخص ہونگا۔ پروفیسر موصوف اسٹاک ہالم کے شہری اسپتالوں کے مرکزی جراثیمی معمل کے ناظم اعلیٰ ہیں اور اپنے نئے تجربات میں کئی سال سے منہمک ہیں۔ اس سلسلے میں دو اور مشہور سائنسدان بھی ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہے ہیں۔ انہوں نے انجکشن کے ذریعہ چوہوں کے جسم میں دوا پہنچا کر تجربات کی تکمیل کر لی ہے۔ وہ چوہے جن کو ارادتاً دق کے مرض میں مبتلا کیا گیا تھا، اس طریقے سے بالکل تندرست ہوگئے۔ اب انسانی جسموں پر تجربہ ہونا باقی ہے۔ پروفیسر کی عمر اسوقت چھپن سال ہے۔

انتقالِ پُر ملال

نہایت درجہ افسوس کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ امام الفن نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل یکشنبہ ۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو حیدرآباد میں انتقال فرما گئے۔ آپ اردو کے بڑے جلیل القدر اور استاد مسلم الثبوت شاعر تھے۔ ۱۲۸۳ھ میں بمقام مانکپور (اودھ) پیدا ہوئے اور علوم متداولہ سے فارغ ہو کر مشق سخن شروع کی۔ بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مینائی کا شرف تلمذ حاصل کیا اور آپ ہی کی صحبت میں حیدرآباد تشریف لے گئے۔ نواب میر محبوب علیخاں بہادر نے آپ کی شاگردی اختیار کی اور داغ مرحوم کی جگہ عنایت فرما کر "جلیل القدر" کا خطاب عطا کیا۔ پھر اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر نظام دکن نے بھی اپنی استادی کا شرف بخشا۔ آپ نے چھ دیوان یادگار چھوڑے ہیں جنکے نام یہ ہیں: تاج سخن، جان سخن، روح سخن، سرتاج سخن، معراج سخن اور گل صدبرگ۔ دواوین میں غزلیات، رباعیات، قطعات، سلام، قصائد، نعت مثنوی غرض تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ رسالہ آجکل بھی آپکے فیضانِ خصوصی سے اکثر بہرہ ور ہوتا رہتا تھا کسی آئندہ اشاعت میں جلد ہی ایک مبسوط مقالہ آپکی سوانح اور شاعری پر شائع ہوگا۔ دعا ہے کہ خدائے کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو توفیقِ صبرِ جمیل۔

گاتی ہوئی راہیں

سیماب اکبر آبادی

کچھ قدم چل کر نئے اک موڑ پر جاتی ہوئی
رینگتی، چلتی، مچلتی اور لہراتی ہوئی
گھومتی، مڑتی، بدلتی اور بل کھاتی ہوئی
مختلف سازوں اور آوازوں کو اپناتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

غارتِ گلشن کہیں، فصلِ خزاں کی گیرودار
غنچہ و گل مُردہ مُردہ، اور فسردہ برگ و بار
اور کہیں صحنِ چمن میں جلوہ گر صبحِ بہار
پھول اور کلیاں کھلاتی، رنگ برساتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

کاروانِ ابر، بالائے فضا مصروفِ سیر
باغ کے کُنجوں میں جھولوں کی صدا مصروفِ سیر
اور نم آلود سڑکوں پہ ہوا مصروفِ سیر
ناچتی، گاتی، سنکتی، اور سنکاتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

مسجدوں میں ہے اذاں، اور مندروں میں آرتی
میکشی خمخانے میں، غم خانے میں نالہ کشی
بزم میں شعر آفرینی، رزم میں شور افگنی
رات اندھیرے، اور اُجالے صبح پھیلاتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

ہیں کہیں مزدور اپنے جھونپڑوں میں سرگراں
اہلِ دولت ہیں کہیں محلوں میں اپنے شادماں
گونج نالوں کی کہیں، نغمے کہیں تسکینِ جاں
مختلف رنگوں میں، اک دنیا نظر آتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

دور ۔۔۔۔ اُدھر میدان میں کچھ قوتیں گرمِ ستیز
قاتل و سفاک کچھ آلے برق پاش و شعلہ ریز
جنگ کے سازوں سے نغمے موت کے ہیجان خیز
زندگی سے زندگی آپس میں ٹکراتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

اک طرف کویل، پپیہے کی رسیلی بولیاں
اک طرف کچھ ساریاں، اور ان میں رنگین چولیاں
اک طرف پگڈنڈیوں پر کچھ دوشیزہ ٹولیاں
گنگناتی، مسکراتی اور شرماتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی گونجتی گاتی ہوئی

چلتے پھرتے نوجواں، بے جانے بوجھے بے قرار
اٹھتی جھکتی شوق کی نظریں، شرارت در کنار
الٹے سیدھے پینتروں سے عرضِ تمکین و وقار
اور اک نیچی نظر، ان سب کو ٹھکراتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

محوِ گردش ہیں زمیں والے زمیں کے ساتھ ساتھ
راہ بھی گرمِ سفر ہے، رہ گزیں کے ساتھ ساتھ
چل رہی ہے فکرِ شاعر بھی، انہیں کے ساتھ ساتھ
زندگی کے راستوں پر، غور فرماتی ہوئی
اُف یہ راہیں زندگی کی، گونجتی گاتی ہوئی

پطرس کی مزاح نگاری

کنہیا لال کپور

گالز وردی کے متعلق ایک نقاد نے کہا تھا: "انگریزی ادب میں وہ واحد ادیب ہے جو انگریزی زبان میں کامیاب فرانسیسی ناول لکھتا ہے۔" پطرس کے متعلق کہا جا سکتا ہے "جدید اردو ادب میں وہ پہلا ادیب ہے جس نے اردو زبان میں انگریزی مزاحیہ مضامین لکھے"۔ اس تنقید سے میری یہ مراد نہیں کہ پطرس کے مضامین یا اسلوب بیان پر انگریزیت غالب ہے۔ بلکہ ان کے مضامین میں وہی آمد، وہی بے ساختگی اور لطافت ہے جو انگریزی انشائے لطیف کا طرۂ امتیاز ہے۔ جدید انگریزی مزاحیہ نگاروں کی طرح پطرس عمداً غیر شاعرانہ موضوعات پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ مثلاً "سویرے اٹھنا" "کتے" "پرانی بائیسکل"۔ ایسے موضوعات پر لکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سنگلاخ زمین میں اچھی غزل کہنا۔ انیسویں صدی میں اگر کوئی شخص "کتے" کے موضوع پر مضمون لکھنا چاہے وہ کتے، کتے ہی کیوں نہ ہوتے جتنا کہ سگِ لیلےٰ!) تو اس کا استقبال قہقہہ استہزا سے کیا جاتا۔۔۔ "کتے۔ اجی صاحب۔ یہ بھی کوئی مضمون ہوا"۔ اسے پطرس کا اعجاز سمجھئے۔ کہ اس نے ان "موضوعات ممنوعہ" پر قلم اٹھایا۔ اور اپنے حسن بیان سے انہیں "ادبی ہریجنوں" کی امت سے نکال کر "ادبی براہمنوں" کی صف میں لا کھڑا کیا۔ چنانچہ آج اگر ملا رموزی "زکام"، کرشن چندر "ردی" اور امتیاز حسین "غسل خانے" پر مضامین لکھتے ہیں تو ادبی لحاظ سے وہ پطرس کو اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں۔

پطرس کا مزاح، مزاح برائے مزاح ہے۔ مزاح برائے زندگی نہیں۔ ان کے مزاح میں طنز یا اصلاح کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ سماج سے نالاں ہیں نہ مذہب سے بیزار۔ انہیں خدا سے شکایت ہے نہ پیغمبر سے شکوہ۔ وہ نظامِ دل بدلنا چاہتے ہیں نہ نظامِ دہر۔ اگر "ہوسٹل"۔ "بائیسکل" جیسے الفاظ "مضامین پطرس" سے نکال دیئے جائیں تو یہ پتہ چلانا مشکل ہو جائے گا کہ یہ مضامین کونسی صدی میں لکھے گئے۔ پطرس کا مزاح "خالص مزاح" ہے۔ عام مزاحیہ نگاروں کی طرح وہ کسی کی پگڑی نہیں اچھالتے، کسی پر چوٹ کر کے اپنا لوہا نہیں منواتے، کسی شخص کے ہاتھ میں آئینہ تھما کر خود قہقہے نہیں لگاتے۔ ان کی نظر زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ اور وہ انہیں اس خوبی سے بے نقاب کرتے ہیں کہ قاری داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہمارے ادب میں اس قسم کے مزاح کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔ چنانچہ جس صنف کو ہم عموماً مزاح کے نام سے پکارتے ہیں اس کی چند صورتیں یہ ہیں

(۱) پانچ فیصدی مزاح۔ پچانوے فیصدی پھکڑ بازی۔

(۲) دس فیصدی مزاح۔ نوے فیصدی ہجو۔

(۳) بیس فیصدی مزاح۔ اسی فیصدی سماجی اصلاح۔

(۴) صفر فیصدی مزاح۔ سو فیصدی بکواس۔

تمام مزاح کی بنیاد تضاد پر قائم ہے "جیسا ہے اور جیسا ہونا چاہیئے" ان دو حالتوں میں جو تضاد ہے۔ اسے مزاح کی جان کہا جا سکتا ہے۔ پطرس کا مزاح عموماً تضاد پر مبنی ہوتا ہے لیکن یہ تضاد وہ خود پیدا کرتے ہیں مثلاً جب کسی سنجیدہ یا فرسودہ چیز کی پیروڈی (Parody) کرتے ہیں۔ "اردو کی آخری کتاب" اور "لاہور کا جغرافیہ" اس قسم کے تضاد کی بہترین مثالیں ہیں۔ "اردو کی آخری کتاب" میں اصل اور پیروڈی میں جو تضاد پیدا کیا گیا ہے۔ وہ نہایت مضحک کیفیات کا حامل ہے۔ چند فقرے ملاحظہ فرمایئے۔

"ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔۔۔۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے)

"دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے" میں لکھتے ہیں:

"بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے۔ دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر تاکہ کپڑوں والے کبھی پکڑ نہ سکیں۔"

"لاہور کا جغرافیہ"، "اردو کی آخری کتاب" سے زیادہ سنجیدہ اور کامیاب پیروڈی ہے۔

"مضامین پطرس" میں یہ مضمون انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واحد مضمون ہے جس میں پطرس نے طنز کو مزاح میں سمویا ہے اس میں دلچسپ چوٹیں ہیں اور لطیف اشارے۔ مثال کے طور پر

(۱) اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر خاص خاص موقعوں پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر دی جاتی ہیں۔" ۔۔۔۔۔۔۔۔

(۲) وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی کے حملہ آور

ہیں کے رشتے دار ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ موخرالذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں ید طولےٰ رکھتے ہیں،، ....

(۴) لاہور کی سب سے مشہور پیداواریہاں کے طلبا ہیں جو کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں"

پیروڈی لکھنے میں پطرس مشاق ہیں۔ اس صنف میں واقعی ان کا کوئی رقیب نہیں۔

پطرس کردار اور واقعہ دونوں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ انہوں نے کوئی مزاحیہ کردار پیدا نہیں کیا۔ کم ازکم انہوں نے دو زندہ جاوید کردار اردو ادب کو دیئے ہیں۔ "کتے" اور "طالب علم"!

"زندہ دل طالب علم" ان کا محبوب کردار ہے۔ وہ طالب علم جس کی شوخی اور رندی کی کالجوں اور ہوسٹلوں میں دھوم ہوتی ہے۔ جو معلمین اور والدین کے لئے چاہے "بارِ خاطر" ہو لیکن احباب کے زمرہ میں "یارِ شاطر" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کردار کی نفسیات کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ "ہوسٹل میں پڑنا"۔ "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی"۔ "میبل اور میں" میں یہ کردار ہر بار نیا سوانگ بھر کر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس انداز سے آتا ہے کہ ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش — ہر امتحان میں فیل ہونا۔ کتابوں کی بجائے سینما یا تھیٹر سے رجوع کرنا۔ والدین کو سبز باغ دکھانا اور ایک خاص قسم کی وضعداری کو آن سے قائم رکھنا۔ اس قماش کے طالب علم کا شیوہ ہی نہیں ایمان ہے۔ عمر خیام اور ڈان جوآن Don Juan کا دلچسپ مرکب۔ فنونِ لطیفہ کا شائق۔ پطرس کا طالب علم خوش باش۔ لاابالی اور رند قسم کا انسان ہے۔ جسے کوئی فکر ہے تو فکرِ امروز۔ کوئی غم ہے تو غمِ جاناں۔ "ہوسٹل میں پڑنا" میں پطرس نے اس طالب علم کی نفسیات کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے اور بعض مقامات پر اس کی بیچارگی کو اس طرح ابھارا ہے کہ وہ کسی المیہ کہانی کا ہیرو نظر آتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:" یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی سیر کو بھی چلے جاتے تھے ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیئے۔ وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی"

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" میں سوز و ساز کی ہم آہنگی سے پطرس نے ایک نہایت دلکش نغمہ کی تخلیق کی ہے۔ مضمون کا پہلا حصہ سراسر مزاح ہے۔ تو آخری حصہ سراسر حسرت۔ مطلع انشا کا ہے تو مقطع میر کا۔ اگر پطرس نے نثر میں کبھی شاعری کی ہو تو وہ اس مضمون کے آخری حصے میں ..... "جب دل مرحوم ایک جہان آرزو تھا۔ تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے۔

کہ ہمارا "فرقِ ناز محوِ بالشِ کم خواب ہو"۔ اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو:

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی طرح تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت "سالونی صورت توری من کو بھائی" کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے"!

"کتے" پطرس کا شاہکار ہے۔ اگر وہ یہ مضمون لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتے (جیسا کہ انہوں نے قریب قریب توڑ ہی دیا ہے!) تو اس واحد مضمون کی بدولت اردو ادب میں زندہ رہتے۔

پطرس نے اس موضوع پر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ کوئی موضوع غیر مزاحیہ نہیں۔ دوسرے الفاظ میں نغمے اور نالے کی طرح مزاح بھی "پابندِ نے" نہیں۔ "کتے" میں پطرس واقعی بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ کتوں کی غوغا آرائی کو غزل سرا شعرا سے نسبت دے کر انہوں نے "مضحک نقل" (Burlesque) کی معراج کو اگر چھوا نہیں۔ تو چھونے کی کامیاب کوشش ضرور کی ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے۔

"کل ہی کی بات ہے۔ کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے۔ اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے

لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔

کردار کے علاوہ پطرس مضحکہ خیز واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ "مرید پور کا پیر"، "مرحوم کی یاد میں"، "پنسل اور میں" میں مضحکہ خیز کردار موجود ضرور ہیں۔ لیکن مزاح کا سرچشمہ دراصل واقعات ہی ہیں۔ ان تینوں مضامین (یا مزاحیہ افسانوں) میں پی جی۔ ووڈ ہاؤس (Wodehouse) لی کاک اور جیروم کے اندازِ نگارش کی جھلک ہے۔ "مرید پور کے پیر" کا مرکزی خیال وہی ہے جو پی۔ جی۔ ووڈ ہاؤس کے اکثر افسانوں کا ہوتا ہے یعنی سہ ما چہ درخیالیم و فلک چہ درخیال۔ اس مضمون کا ابتدائی حصہ لیڈروں اور ان کے سامعین پر لطیف طنز ہے۔ مضمون کا ہیرو ان نام نہاد قومی راہنماؤں کی نمائندگی کرتا ہے جو عامیانہ اشعار اور جذبات سے سامعین کو محظوظ فرما کر ان پر وجد کی کیفیت طاری کرتے ہیں جو اپنی تقریر کا آغاز چند فرسودہ اشعار سے کرتے ہیں۔ بعدازاں ایک آدھ عام فہم قصے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تقریر کے دوران میں حاضرین کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ تعریفی کلمات سن کر ایک دو منٹ کے لئے رک جاتے ہیں۔ اور تقریر کی تان چند "عام پسند" پند و نصائح پر توڑتے ہیں۔ مرید پور کا پیر اسی قماش کا لیڈر ہے۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ عین موقع پر قسمت اس کی یاوری نہیں کرتی۔ اور وہ بوکھلا کر واہی تباہی بکنے لگتا ہے۔ اس کی گھبراہٹ۔ اس کی تقریر کے بے ربط جملے۔ اس کی صورتِ حالات سے عہدہ برآ ہونے کی ناکام کوششیں۔ سامعین کا ردِعمل۔ اس کی بڑھتی ہوئی بوکھلاہٹ۔ اور آخر میں جلسہ گاہ سے فرار مضمون نگار نے اس لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کہ ہنسی ضبط کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ مقرر کے ذہن میں مختلف خیالات کچھ اس طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ اس کے جملوں سے نہایت مضحکہ خیز نتائج برآمد ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں انکی زندگیاں لوگوں کے لئے شاہ راہ ہیں اور ان کی حکومتیں چاردانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے"

"حضرات۔ تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ تم دو بیل ہو!"

"مرحوم کی یاد میں" میں افسانویت کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ دراصل یہ مضمون بھی "مرید پور کے پیر" کی طرح مزاحیہ افسانہ ہے شگفتہ نگاری کے اعتبار سے یہ مضمون پطرس کے تمام مضامین پر فوقیت رکھتا ہے۔ متین ظرافت اور قابلِ رشک سلاست کے امتزاج سے پطرس نے اس مضمون میں ایک عجیب فضا پیدا کی ہے۔ یہ مضمون مزاح کی اس تعریف پر پورا اترتا ہے جس میں کہا گیا ہے۔ "طنز اغیار پر ہنستی ہے اور مزاح اپنے آپ پر۔" اس مضمون کی ہیروئن پرانی بائیسکل ہے جسے پطرس نے اپنے زورِ بیان سے جیتے جاگتے کردار کی شخصیت عطا کر دی ہے۔ کہنے کو تو یہ بائیسکل ہے لیکن دراصل "حرکت کرتی ہوئی لعنت یا مصیبت" ہے۔ جسے مضمون کے ہیرو نے چالیس روپے میں مرزا سے خریدا ہے۔ اس مضمون میں پطرس کا مزاح اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ .... پطرس یقیناً صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ ان کی ڈگر پر چلنے کی کئی مزاحیہ نگاروں نے کوشش کی لیکن ہر ایک کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان کے اسلوبِ بیان میں شیرینی، گھلاوٹ اور بے ساختگی ہے۔ ان کے واحد نقرے دوسروں کے پورے مضامین پر بھاری ہیں۔ بحیثیتِ مزاح نگار وہ غایت درجہ نفاست پسند ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک قسم کا "ذہنی بورژوا پن" ہے۔ جو انہیں کبھی ابتذال کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔ ان کے مزاح کا نصف سے زیادہ لطف ان کی زبان میں ہے۔ 'مضامین پطرس' کا دیباچہ اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی دیباچہ کے متعلق رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں: یہ "دیباچہ نہیں۔ غزل ہے"۔ پطرس کو ان تمام حربوں سے نفرت ہے۔ جن کے استعمال سے عام مزاحیہ نگار مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً رعایتِ لفظی۔ ہزل گوئی۔ ظریفانہ تصرف۔ سوقیانہ نوک جھونک۔ پھکڑ اور مغلظات۔ ان کے اندازِ بیان میں 'آورد' کا شائبہ تک نہیں۔ ان کے لہجے میں بے تکلفی اور طرزِ تحریر میں شگفتگی اور برجستگی ہے۔ پطرس سے اگر کسی شخص کو کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو یہ کہ انہوں نے بہت کم کیوں لکھا۔ یا انہوں نے لکھنا یکلخت کیوں ترک کر دیا ....

آج بارہویں بار 'مضامین پطرس' پڑھنے کے بعد مجھے خیال آتا ہے کاش کوئی شخص (رشید احمد صدیقی یا نیاز فتحپوری) انہیں یہ یقین دلائے۔ کہ "گیسوئے مزاح ابھی منت پذیرِ شانہ ہے"۔ اور پطرس کا جانشین پطرس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور وہ پھر لکھنا شروع کر دیں!

ہدیۂ تبریک

سالِ نو کے خطابات و اعزازات کی جو فہرست حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس میں حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کا نامِ نامی بھی موجود ہے۔ خواجہ صاحب کے عظیم ادبی احسانات اور تبحرِ علمی کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ حکومتِ ہند نے آپ کو شمس العلما کا خطاب عطا کر کے خواجہ صاحب قبلہ ہی کی نہیں بلکہ خود اس خطاب کی بھی عزت افزائی کی ہے۔ خواجہ صاحب کے فیضانِ عمیم سے ادارۂ "آجکل" بھی اکثر مستفیض ہوتا رہتا ہے۔ اس موقع پر ہم انتہائی خلوص کیساتھ حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں اظہارِ مسرت اور ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ (محمد یعقوب دوانتی)

اردو کلچر

حامد اللہ افسر

کلچر کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں ہے، تہذیب، شائستگی تمدن، عادات وخصائل کا حسن، طبیعت کی وہ صلاحیت جس سے وہ پاکیزہ اور لطیف اور خوشنما اور فرحت انگیز اور نظر فریب چیزوں کی طرف کھنچتی ہے، یہ سب چیزیں کلچر کے مفہوم میں آجاتی ہیں، یہ اصل میں جرمن زبان کا لفظ ہے، ان کے یہاں غالباً شجاعت اور نسلی برتری کا مفہوم بھی اس میں داخل ہے، بہر طور ہماری زبان میں یہ لفظ انگریزی زبان سے آیا ہے اور انگریزی میں اس کا مفہوم وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کیا، لفظ خوش آواز خولصبورت اور مختصر ہے اور ہماری زبان میں آسانی سے گھل مل جائے گا، ابھی تو اس کا استعمال اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود ہے اور انہیں بھی اس کے استعمال کی ضرورت گاہے ماہے ہی پڑتی ہے لیکن اس کے امکانات ہیں کہ یہ لفظ تعلیم کی وسعت کے ساتھ ساتھ عوام تک پہونچ جائے اور دوسرے سینکڑوں انگریزی لفظوں کی طرح ہماری زبان کا جزو بن جائے۔

دنیا کی تمام زبانوں پر ان زبانوں کے بولنے والوں کی تہذیب وشائستگی اور عادات وخصائل اور طبعی رجحان کا اثر پڑتا ہے، اسی طرح ہر زبان کی خصوصیات کا اثر اپنے بولنے والوں کی طرز زندگی اور تمدن اور تہذیب پر پڑتا ہے۔ زبان جیسے جیسے وسیع ہوتی جاتی ہے اور ترقی کرتی جاتی ہے اور مختلف علوم کی سرمایہ دار اور بلند رتبہ ادبی ذخیروں کی خزانہ دار ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس کے بولنے والوں پر اس کا اثر شدید اور مستحکم ہوتا جاتا ہے اور اس اثر میں ایک قسم کی یکرنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں میں کچھ چیزیں ایسی نمودار ہونے لگتی ہیں جو قریب قریب سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

غرض یہ سلسلہ ایک دائرہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ زبان کے بولنے والوں کی خصوصیات کا اثر زبان پر پڑتا ہے اور زبان کی خصوصیات کا اثر اس کے بولنے والوں پر پڑتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ کہیں ایک اثر زیادہ شدید ہوتا ہے اور کہیں دوسرا۔ ہندوستان میں ۲۲۴ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ گو یہ سب ایک نوعیت اور ایک سی اہمیت کی زبانیں نہیں ہیں۔ اکثر تو ان میں سے محض بولیاں ہیں جو محدود حلقوں میں صرف گفتگو کے کام میں آتی ہیں۔ تحریر کے کام میں نہیں آتیں، ایسی بولیاں وہیں قائم رہ سکتی ہیں جہاں تعلیم کا رواج نہیں ہوتا، جیسے جیسے تعلیم کا رواج ہوتا جائے گا ان کا وجود مٹتا جائے گا۔ یا ان میں سے جو بولیاں ترقی کی اہلیت اور تحریری زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں گی وہ باقاعدہ زبان کی صورت اختیار کر لیں گی۔

ہندوستان کی زیادہ وسیع اور ترقی یافتہ زبانوں میں اردو کا پہلا نمبر ہے، یہ شمالی ہند کے قریب قریب تمام حصوں میں رائج ہے اور وسطی اور جنوبی ہند میں بھی برابر پھیلتی جاتی ہے۔

ہندوستان کے جن باشندوں کی مادری زبان اردو ہے ان میں چند عجیب وغریب خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کو میں اردو کلچر سے تعبیر کرتا ہوں، وہ ایک ایسی تہذیب کے سرمایہ دار ہیں جن پر شرقیت غالب ہے۔ ان میں ایک قسم کی شائستگی اور سلیقہ مندی پائی جاتی ہے جو ان کو اور تمام غیر اردو داں لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے ان کا ذوق بہت ستھرا ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت آرٹ کی طرف زیادہ رجوع ہوتی ہے وہ ہر چیز میں حسن ڈھونڈھتے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقوں میں صفائی اور خوش آہنگی ہوتی ہے۔ خوراک میں وہ اچھی پکی ہوئی اور صفائی سے تیار کی ہوئی چیزیں پسند کرتے ہیں۔ ان کا لباس گو یکساں نہیں ہے لیکن صاف، باطریقہ، خوشنما اور سنجیدہ ضرور ہے۔ قدرتی نظاروں سے ان کو ذوق ہوتا ہے۔ میلوں ٹھیلوں سے انہیں دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ بہت ملنسار اور خلق دوست ہوتے ہیں اور احباب کے مجمع میں وقت گذارنا زیادہ پسند کرتے ہیں، ان کے لب ولہجہ میں ایک قسم کی نرمی اور لوچ ہوتا ہے اور قریب قریب ہر محبت میں سر دالعزیز ہوتے ہیں، رواداری وسعت نظر اور بلند خیالی ان میں دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے، وہ عام طور پر تجارت اور صنعت وحرفت کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ ان کو ریاضی سے لگاؤ نہیں ہوتا معاشی تفکیوں سے ان کی طبیعت الجھتی ہے۔ انہیں ایسے کھیلوں سے ذوق ہوتا ہے

جو گھر کے اندر بیٹھ کر کھیلے جا سکیں۔

یہ تمام باتیں "اردو کلچر" میں داخل ہیں اور قریب قریب تمام اردو بولنے اور اردو لکھنے والوں میں پائی جاتی ہیں۔ خواہ وہ کسی صوبہ کے باشندے اور کسی مذہب کے ماننے والے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا وجود ایسے لوگوں میں زیادہ نمایاں ہے جو تعلیم یافتہ ہیں۔ لیکن عوام کے اس غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی جس کی زبان اردو ہے یہ چیزیں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں کہیں فلاکت اور تہیدستی یا اور دوسرے موانع ان میں سے بعض یا اکثر اوصاف کو ابھرنے نہ دیں لیکن ذوق اور طبعی خصوصیات پھر بھی جھلکتی ہوئی نظر آئیں گی۔ غرض جس کی زبان اردو ہے اس میں اردو کلچر کے اثرات نمایاں طور پر موجود ہوں گے۔

بعض اردو شاعروں کا وحشت زدہ چہرہ لئے اور مجنوں کا سا لباس زیب تن کئے ہوئے مشاعروں میں پہنچنا اردو کلچر کے مفقود ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا، اس لئے کہ یہ چیزیں بعض دوسرے خارجی اسباب نے پیدا کی ہیں ممکن ہے کوئی شدید وقتی جذبہ ان پر طاری ہو یا ممکن ہے دنیوی مصائب نے انہیں سودائی بنا دیا ہو، سودائی پر کلچر کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔ کلچر تو صاحب ہوش و گوش کا سرمایہ ہوتا ہے، یا مثلاً آجکل کے مشاعروں میں ہمارے بعض شعراء نے ایک خاص وضع اختیار کی ہے۔ پیر میں ایک پشاوری چپل ہوتا ہے سر پر کلاہ تتار، ہاتھ میں ایک بڑا سا چمڑے کا بیگ، سر پر پٹھوں سے ذرا بڑے بڑے بال "باقاعدہ" بکھرے ہوئے، یہ سب شوق امتیاز کی کارفرمائیاں ہیں۔ لیکن ان امتیازی چیزوں کے علاوہ ان کے باقی لباس پر اردو کلچر ہی مسلط ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کی کوشش کے باوجود بھی وہ اس سے نہیں بچ سکتے۔

میرا دعوے ہے کہ اردو کلچر قطعاً ایک جداگانہ کلچر ہے۔ آپ ذرا ہمارے ملک کی آبادی کے چند ایسے بڑے طبقوں پر نظر ڈالئے جن کی زبان اردو ہے تو آپ پر میرے دعوے کی صداقت واضح ہو جائے گی۔ مثلاً کایستھ فرقے کے لوگوں کی زبان اردو ہے بلکہ اصل میں وہی اس زبان کے بانی مبانی ہیں اور اس طبقہ کے افراد میں بڑے بڑے اردو کے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے، یا مثلاً کشمیری پنڈت ہیں ان کی مادری زبان بھی اردو ہے اور انہوں نے بھی اردو زبان کو چوٹی کے ادیب اور شاعر دیئے یا مثلاً تمام ملک کے متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کی مادری زبان بھی اردو ہے اور ان میں بھی اردو کے ممتاز ادیب اور شاعر پیدا ہوئے۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ جو خصوصیات میں نے اردو کلچر کی اوپر بیان کی ہیں وہ ان سب طبقوں کے افراد میں موجود ہیں یا نہیں۔ آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان سب طبقوں کے افراد میں کم و بیش یہ سب خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ صوبہ سرحد یا پنجاب کے وہ باشندے جو ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں اردو بولی جاتی ہے اپنے صوبہ کے دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہو جاتے ہیں، ان کی گفتگو میں ایک قسم کی نرمی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقے میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب اردو کلچر کی برکت ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ اودھ کے پوربی اضلاع میں ایک گاؤں ہے وہاں کے زمیندار صاحب کے چار لڑکے ہیں۔ چھوٹے لڑکے کو اردو ادب سے ذوق ہے۔ زمیندار صاحب کے تین صاحبزادے بڑے اجڈ، اکھڑ، بے ڈھنگے اور سخت مزاج ہیں، لیکن چھوٹا لڑکا بہت مہذب، سلیقہ مند اور خوش اخلاق ہے اور اس سے گفتگو کر کے جی خوش ہوتا ہے۔ یہ بھی اردو کلچر کا جادو ہے، آپ خود اپنے ارد گرد نظر ڈالئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اردو کلچر کس طرح ان لوگوں کی قلب ماہیت کر دیتا ہے جو ایسے علاقوں سے آکر آباد ہوئے ہیں جہاں اردو کلچر سایہ فگن نہیں ہے، اور کس طرح وہ دیکھتے ہی دیکھتے بدلتے چلے جاتے ہیں

اردو کلچر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بڑی کشش ہے۔ اس کی طرف خواہ مخواہ طبیعت کھنچتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کو ہمارے ملک میں دن دونی اور رات چوگنی وسعت حاصل ہوتی جاتی ہے۔ آپ کسی مجمع میں کسی صحبت میں دیکھ لیجئے، جو شخص اردو کلچر سے زیادہ مستفیض ہوا ہے وہی مرکز توجہ ہوگا اور قریب قریب ہر شخص اسی کی طرف رجوع نظر آئے گا۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اس کلچر کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش

غزل

(از حامد اللہ افسر)

بزم میں تیری کوئی بیخود کوئی مدہوش ہے
اے نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

سامنے بت ہیں تو رسوائی کا کس کو ہوش ہے
یا الٰہی تو گنہگاروں کا پردہ پوش ہے

بزم میں ان مدبھری آنکھوں کو گردش دے مگر
اس کا اندازہ تو کر لے کس کو کتنا ہوش ہے

حشر پر تم نے اٹھا رکھا ہے دل کا فیصلہ
دل کو دیکھو دل ابھی سے حشر در آغوش ہے

جرأت دیدار کیسی تاب نظارہ کہاں؟
آرزوئے دید تمہید وداع ہوش ہے

ہم کہاں ہیں؟ ہم کہاں تھے؟ ہم کو اس کی کیا خبر
تم نے پردے کو اٹھایا تھا بس اتنا ہوش ہے

یہ نظر کی جنبشیں یہ چال اٹھلائی ہوئی
کچھ تمہیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے

یہ تپش، یہ اضطرابی، یہ تڑپ، یہ بے کلی
دل ہے افسر میرا یا اک محشر خاموش ہے

کریں اور اتحاد و اتفاق کا یہ ایک قدرتی ذریعہ جو ہمارے پاس موجود ہے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یاد رکھئے کہ جو موانست کلچر کے ذریعہ وجود میں آتی ہے وہ بہت مستحکم اور دیرپا ہوتی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹا نہیں سکتی۔ ایک کلچر رکھنے والے قدرتی طور پر ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں۔ یہ اتحاد روحانی اور ابدی اور حقیقی اتحاد ہوتا ہے اور کوئی خارجی افتراق خواہ وہ سیاسی ہو یا اقتصادی اس میں رخنے نہیں ڈال سکتا۔

اب وقت آگیا ہے کہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہم ہندوستان بھر میں ہر جگہ اردو کلچر ادارے قائم کردیں تاکہ وہ ایک منظم صورت اختیار کرے اور اردو کلچر کی تحریک کو بہت انہماک اور توجہ کے ساتھ ملک بھر میں پھیلادیں ؎

بہادر

افسانہ

صلاح الدین قریشی

شعبان آفندی تیس سال تک سعد اللہ بک کے ہاں ملازم رہا۔ آخر جب بڑھاپے نے اسے کسی مصرف کا نہ رکھا تو اس نے نوکری چھوڑ دی۔ پھر بھی اسے یقین تھا کہ اپنے پرانے آقا کی آمدنی میں شریک ہو کر ہی کسی طرح زندگی گزر سکتی ہے۔ اسی خیال سے وہ روزانہ مقررہ وقت پر حاضری ضرور دیتا تھا۔ حالانکہ کوئی کام اس کے سپرد نہ تھا۔ گھر کے ملازموں میں اس کے تعلقات صرف قم سید دربان سے تھے۔ اگر موسم خراب ہوتا تو وہ دربان کی کوٹھری میں ورنہ اسکے ساتھ دروازے کے پاس ہی نظر آتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ٹانگیں پھیلائے منہ کھولے بیٹھا ہوتا تھا اور پنکھے سے مکھیاں ہلاتا جاتا تھا۔ اکثر وہ بیٹھا بیٹھا سو جاتا تھا اور پہلو تک نہ بدلتا تھا۔ اگر وہ جاگتا ہوتا تو دربان نیکی اور پرہیزگاری کے فوائد یا مرنے کے بعد مسلمانوں کو ملنے والی نعمتوں کا روکھا پھیکا ذکر کرتا رہتا تھا اور اس گفتگو میں کبھی کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوتی تھی۔

باتیں کرتے کرتے ایک دن یکایک دربان کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ وہ بڑے زور شور سے ایک قصہ سنانے لگا جو اس نے مسجد میں کسی شخص سے سنا تھا۔ یہ قصہ ایک مکان کے متعلق تھا جہاں حال ہی میں آسیب کا اثر ہو گیا تھا اور گھر والے ڈر کے مارے مکان چھوڑ بھاگے تھے۔ جب دربان نے قصہ ختم کیا تو پوچھنے لگا:۔

کیوں بھئی! کبھی تم نے بھی جن بھوت اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں؟

شعبان جواب سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ کسی گہری سوچ میں پڑا رہا۔ آخر اس نے جواب دیا:۔

ہاں! ہاں! کیوں نہیں۔ اکثر میں نے جن بھوتوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور اب بھی کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔

دربان کانپ اٹھا۔ اسکی آنکھوں میں چنگاریاں سی جھلکنے لگیں اور کانپتے ہوئے ہاتھ آپس میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ اس نے ذرا بلند آواز میں کہا:۔

لیکن اس سے پہلے تو کبھی تم نے اس چیز کا ذکر نہیں کیا۔

شعبان آفندی ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی جگہ پر پھیل گیا اور ذرا گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا:۔

ایسی باتوں کا ذکر کر کے میں تمہیں خواہ مخواہ کیوں ڈراتا اور ویسے بھی تم جانتے ہو یہ راز کی باتیں ہیں۔

دربان تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر کہنے لگا:۔

اچھا تو کیا رات کو نظر آتے ہیں یہ جن بھوت؟

ہاں! مجھے تو کبھی دن میں نظر آتے نہیں۔

کبھی تم نے باتیں بھی کی ہیں ان سے؟

ہاں! ہاں! کیوں نہیں۔

ارے! ڈر نہیں لگتا تمہیں ان سے؟

بالکل نہیں!

واقعی بڑے جی دار ہو تم!

شعبان آفندی ذرا کرخت آواز میں کھانسنے لگا اور دیر تک اسی طرح کھانستا رہا۔ دربان ذرا اس کے قریب آ گیا اور کہنے لگا:۔

بھئی تمہیں خدا کی قسم! کیا اپنا کوئی واقعہ نہیں سناؤ گے ہمیں؟

یہ ایک ٹیڑھا سوال تھا جسکا شعبان کو سان و گمان بھی نہ تھا۔ وہ پھر کسی گہرے خیال میں ڈوب گیا تاکہ اپنے دوست کو اس قسم کا کوئی واقعہ سنا سکے۔ سوچتے سوچتے بجلی کی طرح ایک خیال اس کے دماغ میں کوندا اس نے اسی وقت ایک قصہ گھڑ کے سنانا شروع کر دیا جو دربان کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ وہ دیر تک بڑے ذوق و شوق سے سنتا رہا۔ اسے جب موقع ملا اپنے کئی جاننے والوں کو بھی یہ عجیب و غریب قصہ سناتا رہا۔

اس دن سے شعبان آفندی کے متعلق مشہور ہو گیا کہ وہ جن بھوتوں کو دیکھتا اور بالکل نہیں ڈرتا۔ اس قسم کے کئی عجیب و غریب واقعات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

وہ بھی ہمیشہ لوگوں کو جن بھوتوں کے من گھڑت قصے بڑے اہتمام سے سناتا تھا اور سنانے سے پہلے انھیں بڑی احتیاط سے تیار کرتا تھا۔ جیسے کوئی پروفیسر پہلے ہی اپنا لکچر تیار کر کے لاتا ہے۔ سعد اللہ بک کے گھر کے پاس اس کی نشستگاہ کافی مشہور ہو گئی تھی اور ادھر ادھر سے لوگ خاص طور پہ اس کے پاس آتے تھے۔

شعبان آفندی برابر لوگوں کو اس قسم کے واقعات سناتا رہتا اور کبھی نہ تھکتا۔ اصل میں اسے اس سلسلے میں اپنی بوڑھی خادمہ آم خلیل سے بہت مدد ملتی تھی۔ اسے جن بھوتوں کے ان گنت قصے یاد تھے۔ اس کے علاوہ خود شعبان کی مشق بھی بڑھ گئی تھی اور آہستہ آہستہ اس کے خیال کا دائرہ بھی بہت وسیع ہو گیا تھا جن چیزوں میں پہلے اسکا دماغ کام نہیں کرتا تھا ان میں اب خوب مہارت ہو گئی تھی۔

ایک دن اتفاق سے آم خلیل کا پاؤں سیڑھیوں پر سے پھسل گیا اور وہ

سر کے بل گر پڑی گرتے ہی وہ مرگئی اور اس طرح شعبان آفندی کے گھر کی دیکھ بھال کرنے والی اور تنہائی میں اسکا دل بہلانے والی رخصت ہوگئی۔ اب گھر میں صرف عبداللہ کم کے کوئی نہ بچا جو صرف دن میں ہی کام کاج کرتا تھا اور رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

ام خلیل کے مرنے کے ایک دن بعد شعبان آفندی اپنے ٹھکانے کی طرف چلا۔ حسب معمول لوگ اسکے قصے سننے کے لئے جمع ہو گئے جب انہیں بوڑھی خادمہ کی اچانک موت کا حال معلوم ہوا سب نے اظہار افسوس کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ گھر کو چلے لیکن عمر رسیدہ دربان نے پر معنی نظروں سے اسکی طرف دیکھنا شروع کیا۔ شعبان نے اسکا مطلب پوچھا تو دربان جلدی سے اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا۔

آج تم نے کوئی قصہ نہیں سنایا؟

شعبان آفندی اپنی سفید گھنی مونچھوں کو بل دینے لگا پھر شکستہ آواز میں کہنے لگا:۔

ہاں ہاں!!... کل.....
کل رات اسکی روح مجھے نظر آئی تھی۔

دربان کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی:۔

ہائیں! کیا ام خلیل کی روح؟

ہاں! اسی کی روح!

ارے! اتنی جلدی؟

اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

اب وہ مجبور تھا کہ دربان کو تفصیلاً بتلائے کہ کس طرح اس کی روح نظر آئی اور ام خلیل کی موت کے متعلق اسے کیا بتایا؟ اور مرنے کے بعد کس طرح اسکی روح فرشتوں کے پروں پر آسمان کی طرف بلند ہوتی گئی..... یہ خود اپنی جگہ پر ایک نیا اور عجیب قصہ تھا جسے دربان نے بڑے رشک کے ساتھ سنا۔ خود شعبان آفندی نے بھی محسوس کیا کہ واقعی یہ ایک عجیب و غریب قصہ ہے اور لوگوں میں بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا جائے گا۔

شعبان آفندی نے اپنے پڑوسیوں سے کسی نوکرانی کا انتظام کرنے کے لئے کہہ رکھا تھا تاکہ کسی طرح ام خلیل کی کمی پوری ہوسکے۔ جب وہ گھر میں آیا تو وہاں دس گیارہ سال کی ایک لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی بھولی بھالی صورت کی اور سہمی ہوئی تھی اسکا جی خوش ہوگیا۔ لڑکی کو نصیحتیں کیں اور متعلقہ فرائض اسے سمجھائے۔ اس کے بعد ام خلیل کا ذکر چھڑ گیا۔ شعبان نے اس کے اخلاق اور خوبیوں کو بڑی حاشیہ آرائی کے ساتھ بیان کیا دوران گفتگو میں اس کی دردناک موت کا ذکر بھی آگیا۔ شعبان نے اس ناگہانی حادثے پر اظہار افسوس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کی تجہیز و تکفین کا کتنا اہتمام کیا گیا تھا اور اس پر اس کو کتنا خرچ کرنا پڑا تھا۔ ہوتے ہوتے اس کی روح کا ذکر بھی آگیا جو گذشتہ رات کو اسے نظر آئی تھی۔ اس قصے کو اس نے پوری تفصیل سے بیان کیا اور خوب حاشیہ آرائی کی۔ قصہ کے دوران میں وہ باقاعدہ ایکٹنگ کرتا رہا اور قصہ ختم کرنے پر رومال سے پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا بستر پر گر پڑا۔ اس وقت اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں، بال پریشان تھے اور رخساروں پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا اور ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئی۔ شعبان آفندی تاڑ گیا اور مسکرا دیا۔ وہ اس کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس کے دل سے ڈر نکل جائے اسطرح تھوڑی دیر میں اسکی جان میں جان آئی اور ذرا دل بیٹھا۔ شعبان اٹھا اور اس کے ساتھ کھانے پینے کی تیاری کرنے لگا۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو لڑکی کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ کھانے کے دوران میں وہ اس کو کام کاج کے متعلق ہدایات دیتا رہا اور اس گھر میں کام کرنے کے فائدے سمجھاتا رہا۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ اسے بڑی اچھی تنخواہ ملیگی اور یہی نہیں بلکہ شادی کے موقع پر اسے خاص طور پر بہت معقول رقم دی جائے گی۔

کھانا کھانے اور باتیں ختم کرنے کے بعد اس نے ایک دو سگرٹ پئے اور اس کے بعد دو تین پیالیاں قہوے کی چڑھا ڈالیں۔

جب سونے کا وقت آگیا تو اس نے لڑکی کا بستر کمرے میں اسی جگہ بچھا دیا، جہاں ام خلیل سویا کرتی تھی۔ اس کے بعد اس نے چراغ گل کیا اور ایک لمبی انگڑائی لیکر

"کون دوارے آیا"

یہ کون دوارے آیا۔ یہ کون دوارے آیا

نین بھر آئے بچھڑے سجن کو دیکھے من بھر آیا
سندر مکھڑا جیسے دیپک من مندر چمکایا

من مندر کے دیئے جلے اور من مورا سکھ پایا
ڈوبتی نیا لگی کنارے آج کھویا آیا

پھول کنول نیناں مسکاتے جوبن جگ پہ چھایا
کلی کلی مسکاد ستی ہے اور پلٹی جگ کی کایا

بادل لہرائے امبر پر بجلی کا من بل کھایا
دکھ نے دم توڑا ہچکی لی برہا من کلپایا

سکھ آنند پیا کے درشن رنگ خوشی کا چھایا
آج گگن پر چاند پونم کا پریم سندیسہ لایا

دو ہردے مل کر دھڑکتے ہیں اور جیون مسکایا
پریم نے لی انگڑائی من میں پریت نے گیت سنایا

یہ کون دوارے آیا یہ کون دوارے آیا

اقبال معروف

سونے کے لئے بستر پر دراز ہوگیا وہ دیر تک پڑا بے چین رہا اور کروٹوں پر کروٹیں لیکر سونے کی بیکار کوشش کرنے لگا لیکن نیند کا نام نہ تھا۔ آخر وہ پڑے پڑے بڑبڑانے لگا:-

اس قہوے پر خدا کی لعنت ..... آئندہ کبھی اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤنگا

وہ چڑ چڑے پن کے ساتھ بستر پر لوٹنے لگا۔ لیکن ساری کوششیں بے سود تھیں۔ وہ گھبراکر اٹھ بیٹھا اور اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے دل میں چراغ روشن کرنے کا خیال آیا۔ وہ دیا سلائی کی ڈبیہ ٹٹولنے لگا لیکن اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ فوراً اسکا دم گھٹنے لگا۔ سامنے ہی وہ جگہ تھی جہاں ام خلیل نے گر کر جان دی تھی اس خیال سے وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا اور گھبراہٹ میں دیا سلائی کے لئے پھر اندھیرے میں ہاتھ چلانے لگا لیکن اس مرتبہ بھی اس کی محنت ضائع گئی۔ اب اسکا حلق خشک ہونے لگا اور پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے بوکھلا کر ام خلیل کو آواز دی کہ اس کے لئے پانی لائے۔ اسی وقت اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ مجبوراً اس نے لڑکی کو جگانے کا تہیہ کرلیا۔ لیکن اسکا نام یاد نہیں رہا۔ اس نے سوچا کہ لڑکی ہی کہہ کر آواز دے لیکن جب اس نے پھر بار بار لجلجاتے ہوئے ام خلیل ہی کو پکا[را] اور آوازیں کمرے کی دیواروں سے ٹکرائیں تو اسکی وحشت اور بھی بڑھ گئی ...

پسینہ اسکی پیشانی سے بہہ نکلا اور وہ سوچنے لگا کہ اب سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ لڑکی کو خود اس کے بستر پر جاکر جگایا جائے۔ ڈرتے ڈرتے وہ بستر سے اٹھا اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں آگے بڑھا اس نے اپنی چڑھی ہوئی آنکھوں کو اچھی طرح بند کرلیا تھا..... تھوڑی دیر تک وہ کمرے میں اپنے ہی بستر کے گرد چکر لگاتا رہا۔ آخر وہ ٹھہر گیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا:-

اس کا بستر ہی نہیں معلوم ہوتا..... کہیں وہ دوسرے کمرے میں تو نہیں جا سوئی؟

پھر وہ بالکل گم سم کھڑا رہا، اسوقت اسے اپنے ہی خوفزدہ دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی ..... وہ پھر بڑبڑایا۔

اس کے سانس کی آواز بھی تو نہیں آرہی!.. .....

یہ سوچتے ہی وہ پھر کانپ اٹھا اور اپنی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھا۔ اب کے وہ اپنے بستر سے ٹکرایا اور سمجھا کہ یہ لڑکی کا بستر ہے وہ جھک کر ٹٹولنے لگا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہتا جارہا تھا:-

ارے! یہ تو غائب ہے،...... اسکا تو پتہ بھی نہیں... بھاگ گئی مردود! اور مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔

جلدی سے وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہوگیا، ایک ہیبتناک چیخ اسکے حلق سے بلند ہوئی اور گھر کی خاموش فضا میں سنائی دی۔ اس کے بعد پے در پے کئی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں۔ وہ لوگوں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ اسی لمحے ایک اور کانپتی ہوئی تیز آواز ماحول پر چھاگئی۔ کوئی چیخ رہا تھا:-

بھوت!..... بھوت!!..... ام خلیل کا بھوت!!!

شعبان نے تاریکی میں نظریں جماتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا کہ آواز کس گوشے سے آرہی ہے سامنے ہی اسے ام خلیل کا سایہ نظر آیا، وہ گھسٹتی ہوئی اسی طرف چلی آرہی تھی..... اسوقت واقعی اسی کی صورت آنکھوں میں گھوم رہی تھی، دبلا پتلا جسم سفید دوپٹا لپٹا ہوا اور بھاری بھاری چال... دیکھتے دیکھتے وہ زمین پر گر پڑا اور کمرہ میں اس کی دہشت زدہ چیخیں پھیل کر رہ گئیں۔

اسیوقت کچھ پڑوسی اسکے کمرہ میں آپہنچے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ ان کے ہاتھوں میں چراغ اور موٹے موٹے ڈنڈے چمک رہے تھے۔

❖

صبح ہوتے یہ واقعہ گھر گھر مشہور ہوگیا۔ لڑکی نے لوگوں کو بتایا کہ ام خلیل کا بھوت دراز قد اور سر سے پاؤں تک سیاہ لبادہ میں لپٹا ہوا ہے اور سرخ آنکھوں سے آگ کے شعلے لپٹیں مارتے نظر آتے ہیں۔

شعبان بیچارے کا عجیب حال تھا۔ پہلے تو وہ خاموش رہا۔ لیکن لوگوں نے اسے مجبور کیا تو اس سے نہ رہا گیا۔ آخر وہ پھٹ پڑا اور زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کردئے۔ اس نے یہ مشہور کردیا کہ رات کو ام خلیل کے ساتھ اور بہت سے بھوتوں نے اس پر حملہ بولدیا تھا۔ چنانچہ بڑے زور شور کی لڑائی ہوئی اور اسے مجبوراً بڑی سختی اور بے رحمی کیساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔

❖

اس دن شعبان آفندی گھر آیا تو اپنے ملازم عبدالدائم کو دروازے پر انتظار کرتے پایا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی کی ماں اس کے بعد آئی تھی اور اس کو اپنے ساتھ لے گئی ہے چونکہ وہ اپنی لڑکی کو کسی ایسے مکان میں چھوڑنا نہیں چاہتی جہاں آسیب کا اثر ہو...

شعبان نے اپنے ملازم کو تیز تیز نظروں سے دیکھا اور بے سوچے سمجھے کہنے لگا:-

تو آج رات کو میرے پاس کون رہیگا؟

فقرہ ختم کرتے کرتے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور بات بناتے ہوئے کہنے لگا:-

بھیا تم تو جانتے ہو میرا بڑھاپا ہے ایک دفعہ بستر میں لیٹ جانے کے بعد اٹھا نہیں جاتا اسی لئے مجھے ضرورت رہتی ہے کہ کوئی ٹہل کے لئے میرے پاس رہے......

اگر آپ چاہیں تو رات کو میں رہ جایا کروں گا۔

خدا تمہارا بھلا کرے بیٹا! میں تمہاری تنخواہ بھی بڑھا دوں گا۔

وہ آگے بڑھا اور اس کی پیٹھ ٹھونکنے لگا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد شعبان قریب کے شراب خانہ میں گیا اور رات گئے تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں اس نے خلاف عادت نبیذ کے دو تین پیالے پیئے

تاکہ رات کو نیند بھر کر سو سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جھومتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوا۔
عبدالدائم دروازے پر ہی اسکا انتظار کر رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور موم بتی جلا کر روشنی کرتا ہوا اسے سونے کے کمرے کی طرف لیکر چلا۔

شعبان نے کپڑے بدلے۔ پھر گھبرائی ہوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ ملازم نے پہلے سے ایک گوشے میں بستر کر لیا ہے۔ اس نے ماچس اپنی جیب میں ڈال کر چراغ کو سرہانے رکھ لیا اور بجھا کر آرام سے سو گیا۔ ملازم کا دم اس گھپ اندھیرے میں گھٹنے لگا اور اس نے بستر پر بے چینی سے کروٹیں لینی شروع کر دیں۔ ہر طرف خاموشی تھی اور اس منظر سے اسے بری طرح وحشت ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ باتیں ہی کر کے کچھ جی بہلائے۔ اس خیال سے پہلے تو وہ کھنکارا اور پھر دیر تک اونچی آواز میں کھانستا رہا لیکن شعبان بڑی گہری نیند سو رہا تھا اس پر کوئی اثر نہ ہو سکا۔ اس وقت عبدالدائم کو اچانک خیال آیا کہ جس جگہ وہ بستر بچھائے لیٹا ہے وہیں ام خلیل بھی سویا کرتی تھی۔ عرصے سے وہ یہیں سوتی چلی آ رہی تھی۔ اس لئے سارے کمرے میں اسکے سانس اور جسم کی بو بسی ہوئی ہے۔ یہ سوچتے ہی اسکا سانس بے ترتیبی سے چلنے لگا اور اس نے سر پر لحاف کھینچ لیا۔ دیر تک اسکا یہی حال رہا۔ اس کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ دم گھٹ رہا ہے تو فوراً اس نے لحاف منہ پر سے ہٹا دیا۔ اسوقت ایک عجیب سی آواز اسکے کانوں میں آئی۔ پھر ایسا معلوم ہوا کوئی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ ڈر کے مارے وہ شعبان کو آوازیں دینے لگا لیکن کسی نے جواب نہیں دیا!.... ہمت کر کے وہ پھر ایک دو دفعہ پکارا لیکن خراٹوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دی۔

گھبرا کر وہ بستر سے اٹھا اور شعبان کے قریب آ کر اسکو جھنجوڑ ڈالا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چیخنے لگا:—

عبدالدائم! ارے عبدالدائم!!

میں یہ رہا، آپ کے پاس ہی تو ہوں۔

ارے! کیا ہوا کمبخت!

"تحفہ"

تیری خدمت میں اے جاں کونسا تحفہ بھیجوں
نقد جاں پیش کروں عرض تمنا بھیجوں

شوقِ دیدار میں بے خواب نگاہوں کا خمار
گفتگو کو لب لرزاں کا تقاضا بھیجوں

شامِ فرقت میں دلِ مضطر و محزوں کی تڑپ
سوز و سازِ شبِ غم گریہ و نالہ بھیجوں

یادِ ایامِ گذشتہ میں بہے جو آنسو
سلکِ الفت میں پرو کر تجھے مالا بھیجوں

آہ سوزاں کی تپش خارِ محبت کی خلش
ان کو بھیجوں یا فقط انکا تقاضا بھیجوں

جز متاعِ غمِ الفت نہیں کچھ بھی باقی
تو ہی بتلا دے تری نذر کو میں کیا بھیجوں

بسملؔ جالندھری

پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے چراغ روشن کیا۔ جب ذرا تاریکی دور ہوئی تو ملازم نے اطمینان کا سانس لیا اور شعبان کے بستر کے کنارے ہی پر ذرا ٹک گیا۔ شعبان نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے گھورتے ہوئے پھر وہی سوال دہرایا لیکن ملازم اب بھی خاموش رہا۔

آخر اس نے زور سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا:—

ابے! میں تجھ سے ہی تو پوچھ رہا ہوں، تو آخر میری نیند خراب کرنے کیوں آیا تھا؟ بتاتا کیوں نہیں؟

ملازم بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا:—

میں چراغ لینے آیا تھا جناب!

چراغ لینے آیا تھا؟ یہاں اور کوئی چراغ نہیں ملا تجھے؟

جی نہیں!

آخر اس وقت چراغ کی کیا مصیبت پڑی تھی تجھے؟

پیاس کے مارے میری جان نکلی جا رہی ہے۔

تیری پانی کی ٹھلیا کیا ہوئی آخر؟

ادھر باورچی خانے میں رکھی ہے۔

اچھا تو میرا چراغ لے کر تو وہاں جانا چاہتا تھا اور میں یہاں اندھیرے میں ہی پڑا سسکتا رہتا؟ کیوں بے؟

تو کچھ دیر تھوڑی لگتی۔ میں تو ابھی آ جاتا۔

شعبان نے غضب آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ ابھی تک بستر ہی پر ٹکا ہوا تھا۔ اس نے آخر قسم کھا لی کہ آج ہی صبح کو اسے ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا جائیگا.... پھر وہ کہنے لگا:—

چراغ کی اب بھی ضرورت ہے کیا؟

جی ہاں! مارے پیاس کے میرا دم نکل رہا ہے!

خیر اللہ مالک ہے! لے جا چراغ! لیکن ذرا جلدی ہی آ جانا....

ملازم چراغ لے کر لپکا اور شعبان نے ایک ایک کر کے دیا سلائیاں جلانی شروع کر دیں۔ ساتھ ہی وہ آیۃ الکرسی پڑھتا اور توبہ استغفار کرتا جا رہا تھا۔ عبدالدائم بیچارہ باورچی خانہ میں تو کیا جاتا۔ سیدھا قریب کے کمرے میں جا گھسا۔ تھوڑی دیر وہاں گزار کر وہ لوٹ آیا اور کہنے لگا:—

عجیب معاملہ ہے صاحب! باورچی خانے میں سے میری ٹھلیا ہی نذارد ہے یہیں کہیں ہوگی میرے خیال میں۔

یہ کہہ کر وہ گھڑونچی کی طرف لپکا اور جلدی جلدی پانی پینے لگا شعبان بیٹھا اسے گھورتا رہا اسوقت دل ہی دل میں کہہ رہا تھا:

یہ کمبخت ذرا بھی تو میرا لحاظ نہیں کرتا۔ میرے بستر پر بے تکلف آ بیٹھتا ہے اور حد یہ ہے کہ میرے ہی مٹکے میں سے پانی پی رہا ہے..... وہ تو خود مختار سمجھتا ہے اپنے کو...... خیر کوئی ڈر نہیں ہے ذرا صبح ہو جانے دو!

وہ ابھی پوری طرح سونے بھی نہیں پایا کہ ملازم کی آوازوں نے اسے پھر جگا دیا پہلے تو وہ چپ سادھے پڑا رہا، لیکن ملازم برابر چلاتا رہا۔ آخر شعبان نے تکیے سے سر اٹھایا اور چراغ جلاتے ہوئے گرجنے لگا:

کیا آج مجھے اطمینان سے نہیں سونے دیگا تو؟

صاحب! مجھے مجبوراً جگانا پڑا ہے آپ کو۔

آخر کیوں؟ بتا! بتاتا کیوں نہیں؟ کیا گونگا ہے تو؟ ملازم پھر اسی طرح بستر کے قریب آ گیا اور شعبان کے پہلو میں آ بیٹھا۔ شعبان غصے سے تلملا اٹھا اور دل ہی دل میں کہنے لگا:-

کمبخت مانتا ہی نہیں۔ اس طرح بستر پر میرے پاس بیٹھتے ہوئے وہ ذرا نہیں جھجکتا ہے۔

عبدالدائم نے جھک کر شعبان کے کان میں کہا:-

مجھے ڈر لگ رہا ہے!

شعبان کو ایک پھریری سی آئی، ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور مری ہوئی آواز میں پوچھنے لگا:-

ڈر لگ رہا ہے، آخر کس سے؟

جناب! کچھ آوازیں سنائی دی ہیں مجھے؟

کیسی آوازیں؟...... ارے! بتا تو سہی۔

بھوت کی آوازیں، ام خلیل کا بھوت ہے شاید!

یہ کیسے؟ کیا کہہ رہا ہے تو؟

میں نے اپنی آنکھوں سے ام خلیل کے بھوت کو سیڑھیوں پر ناچتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کے بعد دونوں لحاف میں گھس گئے۔

عبدالدائم نے چپکے سے کہا:-

آپ کو آواز نہیں آ رہی کیا؟ وہ دیکھئے کوئی ناچ رہا ہے گھنگروؤں کی آواز بھی آ رہی ہے۔

ہائیں! گھنگروؤں کی آواز؟

شعبان نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ واقعی کچھ آوازیں آ رہی تھیں وہ بڑبڑانے لگا:-

واقعی عجیب بات ہے یہ تو؟ سچ مچ کوئی ناچ تو رہا ہے۔

اسی وقت کھڑکی سے ہوا کا جھونکا آیا اور چراغ گل ہو گیا پھر کیا تھا شعبان اور اسکا ملازم دونوں چیخنے چلانے لگے اور گزشتہ رات کی طرح پڑوسی پھر بوکھلائے ہوئے مدد کے لئے دوڑے۔

دوسرے دن شعبان آفندی نے عبدالدائم کو نکال باہر کیا اور اس کی بجائے دوسرا ملازم تجویز کیا جسکے متعلق اسکا خیال تھا کہ نہایت دلیر ہے..... لیکن یہ بیچارہ بھی چند دن سے زیادہ نہ ٹکا۔

رفتہ رفتہ لوگ شعبان کے نام سے کچھ ڈرنے لگے..... جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے اسکی ملازمت منظور نہ کی۔ آخر اسے یہ گھر چھوڑنا پڑا اور دور کسی محلے میں مکان کرائے پر لے لیا۔ لیکن بھوت نے اس نئے مکان میں منتقل ہونے پر بھی اسکا پیچھا نہیں چھوڑا اور بھیانک ناچ اور ڈراؤنے گیتوں سے اسکی نیند حرام کر دی!

یہاں بھی پڑوسی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے اور اس غریب کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ مجبوراً وہ ایک دوسرے مکان میں چلا آیا، لیکن بھوت اس کی جان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ ہر طرف گھنگروؤں کی تال پر ناچتا، بیلاؤں کی طرح اچھلتا کودتا، یا زمین کو ہلاتا ہوا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چھلانگیں مارتا نظر آتا تھا۔ اکثر وہ دیکھتے دیکھتے ایک خوفناک بلے کا قالب بدل لیتا تھا۔ اور سارے گھر میں اسکی ہیبتناک چیخ پکار سے کھلبلی مچ جاتی تھی۔

اب یہ حال ہو گیا کہ شعبان بیچارہ جب کسی دوسرے محلے میں منتقل ہونا چاہتا تھا تو پہلے ہی لوگوں کو خبر ہو جاتی تھی۔ سارے محلے والے سڑک پر جمع ہو جاتے تھے اور دیر تک دور کھڑے اسکا انتظار کرتے رہتے تھے۔

جب وہ کسی قہوہ خانے میں جاتا تھا تو کوئی اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتا تھا بلکہ ہر شخص اس کے قریب سے ہٹ کر دور جا بیٹھتا تھا اور قہوہ خانے کا ملازم آواز لگاتا سنائی دیتا تھا:-

ایک پیالی قہوہ، ام خلیل کے بھوت کے لئے.....

لوگوں کی گردنیں یکایک بلند ہو جاتی تھیں۔ پھر وہ آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیتے تھے اور مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ ہر طرف پھیل جاتی تھی۔

ایک مرتبہ شعبان گھر لوٹا — یہ ایک نہایت گندا کمرہ تھا ہوا اور روشنی کا نام نہ تھا اور مکاندار نے بڑی منت سماجت کے بعد کافی کرائے پر دیا تھا۔ یہ کمرہ ایک طرف تو گھر کی انگنائی میں کھلتا تھا اور دوسری طرف گلی میں۔

جب وہ کمرے میں گھسا تو مارے تھکن کے ایسا نڈھال ہو رہا تھا کہ بستر تک بھی نہ پہنچ سکا۔ جلدی سے اس نے اپنے کپڑے ایک طرف پھوس کے ڈھیر پر پھینک دئے اور نیند میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ بڑھتے بڑھتے اچانک

اتنی گھٹی گھٹی بند ہوگئی اور دہشت زدہ ہو کر اس نے بخار کی طرح ڈکرانا شروع کیا۔ وہ اس وقت بری طرح چیخ رہا تھا۔ یہ شور و غل سنکر مکان کے دوسرے رہنے والے گھبرا گئے اور خوفزدہ ہو کر کھڑکیوں سے جھانکنے لگے۔ بعض لوگ ڈر کر پناہ لینے ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ سارے محلے پر دہشت چھاگئی اور شعبان برابر شور و غل مچاتا رہا۔ . . . لیکن کوئی اس کی مدد کے لئے نہ آیا۔

چیختے چیختے اس کی آواز بیٹھ گئی اور پھر آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی یہانتک کہ رات کی تاریکی میں گم ہو گئی اور پھر چاروں طرف ایک خوفناک تاریکی چھاگئی۔

دو دن گذر گئے کسی نے شعبان آفندی کو اپنے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا۔

لوگوں کی حیرت اور دہشت برابر بڑھتی گئی۔ مکاندار سے مل کر سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ آیا اور کمرے کے قریب ان کے ساتھ کھڑا دیر تک اس سلسلے میں متفکر رہا۔

ایک شخص جی کڑا کر کے آگے بڑھا اور کواڑ کی جھری میں سے جھانکنے لگا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ایک دوسرے شخص نے کمرے میں گھسنا چاہا لیکن اندر نہ جا سکا۔ آخر مکاندار لوگوں کی طرف مڑا اور چپکے سے پوچھنے لگا:۔

کیا آپ لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اب تک اسی کمرے میں ہے؟

جی ہاں! بالکل یقین ہے۔

تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہیں ہے اور اندر سے کواڑ بند کر رکھے ہیں۔

لوگ ڈرتے ڈرتے پھر کچھ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آخر سب کی رائے یہ ہوئی کہ پولیس کو اطلاع دی جائے۔

پولیس انسپکٹر چند سپاہیوں کے ساتھ آیا اور کمرے کے سامنے سب کو قطار میں کھڑا کر دیا۔ پہلے اس نے ذرا مونچھوں کو تاؤ دیا اور اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیکر دروازہ کی طرف بڑھا۔ وہ زور زور سے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا اور پھر کواڑوں کو جھنجھوڑتے ہوئے چلانا شروع کیا۔

دروازہ کھولو! . . . . ہم کہہ رہے ہیں دروازہ کھولو!! ورنہ یاد رکھو ہم زبردستی اندر آجائیں گے۔ بھوت ووت کا ہمیں بالکل ڈر نہیں ہے۔

پلٹ کر اس نے دوسرے سپاہیوں پر نظر ڈالی ان سب کی پتلیاں جلدی جلدی پھر رہی تھیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

مجبوراً دروازہ توڑا گیا اور وہ سپاہیوں کے ساتھ اندر گھس گیا۔ تھوڑی دیر میں سب باہر نکل آئے اور انسپکٹر نے لوگوں کو بتایا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔

لوگوں کو اب بھی یقین نہیں آیا اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ انسپکٹر نے ان کی کچھ پروا نہ کی اور قفل لگا کر مع اپنے سپاہیوں کے چل دیا۔

مکاندار دیر تک کھڑا گردن جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک بڑھئی کو ساتھ لیکر آیا اور اس سے کواڑوں پر کیلیں ٹھونکنے کو کہا۔ بڑھئی کیلیں جڑنے لگا اور لوگ اس کے گرد کھڑے پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں سے اسکی طرف تکتے رہے۔

اس دن سے کسی نے شعبان آفندی کا سایہ تک نہ دیکھا اگرچہ اتنک برابر اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں. . . . .

جب کوئی سعد اللہ بک کے مکان کے قریب سے گذرتا تو عمر آیۃ دربان کو دروازے پر بالکل اسی مقام پر بیٹھے دیکھتا جہاں کبھی اسکا دوست شعبان آفندی بیٹھا کرتا تھا اسکے ہاتھ میں شعبان کا پنکھا ہوتا تھا اور وہ اسے آہستہ آہستہ جھلتا رہتا تھا۔

جب اس کے پرانے دوست کے متعلق کوئی پوچھتا تو وہ سامنے افق پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑانے لگتا۔

وہ بڑا بہادر آدمی تھا! واقعی بڑا بہادر!!

اور اس سے زیادہ اسکی زبان سے کچھ نہیں نکلنے پاتا تھا۔ (محمود تیمور)

مضراب

نشۂ زہد نہ کیف مئے ناب اچھا ہے
ایک معصوم سا پندارِ شباب اچھا ہے
نہ یقین ہو تو انہی نرگسِ مخمور سے پوچھ
عشق جتنا بھی ہو سرشار و خراب اچھا ہے
سازِ ناہید ظلک ہو کہ دلِ بشکستہ
دردِ مضراب ہو جس کی وہ رباب اچھا ہے
کچھ بھی ہو حسرتِ نظارہ، کہ تمکینِ جمال
حسن ہر رنگ میں مانوسِ حجاب اچھا ہے
ربطِ خاطر اسے کہتے ہیں کہ اب تک نہ کھلا
لطف اچھا ہے تمہارا کہ عتاب اچھا ہے
میکشوں کو ابھی احساس ہے مدہوشی کا
ابھی طاری رہے افسونِ شراب اچھا ہے
ماورا عالمِ اسباب سے ہے عالمِ عشق
سب سوالوں کا یہی ایک جواب اچھا ہے
زندگی حرفِ غلط ہے رخِ محبوب روشؔ!
ورنہ یوں مشغلۂ علم و کتاب اچھا ہے

روشؔ صدیقی

علامہ اقبال کے متضاد نظریئے

ہندوستان کے مایۂ ناز مفکر اور بہترین شاعر علامہ اقبالؒ کو رومیؒ و عطارؒ کے سلسلے کا ایک وحدۃ الوجودی شاعر سمجھتا رہا ہوں اور اپنے بعض مقالات میں اسکی صراحت بھی کر چکا ہوں بعض ناقدین کی رائے اس کے خلاف تھی لیکن میں نے ان کی رائے کو اہمیت نہ دی اس وجہ سے کہ مجھے اپنی نظر پر اعتماد تھا اور نیز اس وجہ سے کہ اکثر ناقد مصنف اور اس کے مسلک کو پیش کرنے کی جگہ اپنے آپ کو اور اپنے مسلک کو پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

میری رائے کی بنیاد تمام تر علامہ کے اشعار پر تھی۔ ان کے مضامین نثر نہ کبھی شائع ہوئے تھے اور نہ میں نے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ اہل دکن اور خصوصاً اہل پنجاب کا ہم پر یہ بڑا احسان ہے کہ ان کی کوششوں سے علامہ تقریباً پورے طور سے ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ علامہ کی غیر معمولی محبت نے مجھے مجبور کیا کہ میں انکی بقیہ مصنفات کا مطالعہ کروں۔ اس سکوں دشمن مفکر کے مطالعے نے جہاں میرے دل کو سکون بخشا وہاں ایک تلخ و خلش بھی پیدا کردی۔ وہ اس وجہ سے کہ میں نے محسوس کیا کہ علامہ اپنے نظریات کے متعلق خود ایک رائے نہیں رکھتے اور ان کا کلام متضاد نظریوں کا مجموعہ ہے۔ یہ میرا احساس ہے اور تضاد کا احساس اگر کوتاہ نظری ہو سکتا ہے تو اس احساس کا چھپانا یقیناً کتمانِ حقیقت ہے۔

اس واقعہ کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ بعض متقدمین کے کلام میں بھی تضاد پایا گیا ہے لیکن ان کے اور علامہ کے زمان و مکان میں بہت فرق ہے۔ علامہ کی تصانیف ان کی حیات میں بار بار شائع ہوئیں۔ اس لئے بہت آسانی سے ان میں حک و اضافہ ہو سکتا تھا۔ بخلاف متقدمین کے جن کے زمانے میں آج کی سہل ترین چیز بھی مشکل ترین تھی۔

ابھی ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے علامہ کو بہت قریب سے دیکھا اور بہت زیادہ سمجھا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ حضرات ایک شفیق و محترم بزرگ کی طرح میری اور دوسروں کی رہنمائی فرمائیں گے۔

میں نے علامہ کے کلام میں دو قسم کا تضاد محسوس کیا۔ صریحی اور غیر صریحی۔ صریحی سے میری مراد اس تضاد سے ہے کہ ایک جگہ وہ یقین کے ساتھ ایک نظریہ بالکلیہ پیش کرتے ہیں اور دوسری جگہ اسی یقین کے ساتھ اسکے خلاف دوسرا نظریہ پیش کرتے ہیں اور اپنے پہلے نظریئے کی تردید بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ آپ اس مقالے میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

غیر صریحی سے میرا مقصد یہ ہے کہ مثلاً وہ ایک ہی خیال کے ایک بزرگ کے مداح ہیں اور دوسرے کے مخالف۔ اسطرح ہم وجہ مخالفت سمجھنے سے معذور رہتے ہیں۔ وہ رومیؒ و عطارؒ کے مرید ہیں اور شیخ اکبر ابن عربیؒ کے مخالف۔ اور وجہ مخالفت شیخ اکبرؒ کا ہمہ اوست ہے۔ حالانکہ رومی و عطار اس مسئلے کے زبردست مبلغ ہیں۔ اس جگہ یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مولانا رومؒ صدرالدین قونویؒ کے اور حضرت قونویؒ شیخ اکبرؒ کے شاگرد ہیں۔ اسی طرح کبھی علامہ دو مخالف صفوں کے ساتھ یکساں اعتقاد و محبت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ جیسے حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی اور بایزید بسطامی رضی اللہ عنہما اور ان کا مخالف علامہ ابن تیمیہ۔ اسی طرح ان کی نظر میں امام ابوحنیفہؒ اور عبدالوہاب نجدی دونوں صحیح اسلام کے نمائندے ہیں۔ یا وہ ایک جگہ چشتیہ سلسلے میں قنوطیت اور سکون کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ایسے محقق سے کوئی ثبوت تو کیا طلب کر سکتا ہے۔ البتہ یہ معلوم کر کے تعجب ضرور ہوتا ہے کہ وہ خود ولایت جاتے آتے حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے آستانۂ اقدس پر عقیدتمندانہ سر نیاز خم کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس مقالے میں اس قسم کے غیر صریحی تضاد کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

ہمہ اوست یا وحدۃ الوجود

ہمہ اوست تصوف کا بنیادی مسئلہ ہے اسلامی تصوف کی بنیاد قرآن و حدیث کی روشنی میں نظرِ باطن اور کشف و شہود پر ہے کسی مسئلے میں ہر صاحب کشف و شہود کا متفق ہونا اس مسئلے کی صداقت کا بہترین ثبوت ہے۔ وحدۃ الوجود پر ساری دنیا کے اہلِ کشف یقین خواہ وہ کسی مذہب یا گروہ سے تعلق رکھتے ہوں متفق ہیں حتیٰ کہ مجدد صاحب بھی جو وحدۃ الشہود کے نظریئے کے موجد ہیں اس کے معترف ہیں کہ ان کے مشائخ کا مذہب وحدۃ الوجود ہی ہے اور کشف و شہود کی راہ سے ایسا ہی منکشف ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اس کو وحدۃ الشہود کہتے ہیں یعنی ایک وجود کا مشاہدہ ہونا۔ اگرچہ سارے اہلِ باطن وحدۃ الوجود پر ایمان رکھتے ہیں مگر حضرت ابن عربیؒ، جنید و شبلی، عطار و رومی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین مشاہیر وجودی سمجھے جاتے ہیں اور ان بزرگوں کے اقوال کی کوئی مولویانہ تاویل بن نہیں پڑتی۔ یہ سب حضرات علامہ اقبال کے ممدوحین میں ہیں حتیٰ کہ ابن عربیؒ بھی۔

اہلِ ظاہر جنھیں نظرِ کشفی عطا نہیں ہوئی اور اس لئے وہ نظرِ کشفی کو ضروری بھی نہیں سمجھتے اور ان کے خیال میں وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا بھی تلبیس ابلیس کا کوئی باب ہے۔ اس مسئلے کے منکر ہیں۔ اہل عقل فلسفہ کا ایک موقر گروہ اپنے علم نظری سے اسے

میکش۔ اکبرآبادی

صحیح سمجھتا ہے۔ اس گروہ میں اہل مذہب بھی ہیں اور منکرین مذہب بھی۔ اہل ظاہر کا پہلا گروہ جن میں غالب حصہ اہل مذہب کا ہے مسلمانوں میں علمائے ظاہریہ اور ان کے مقلدین کا ہے۔ اور چونکہ یہ مسئلہ عقلی اعتبار سے اتنا مضبوط ہے کہ اہل ظاہر سے اس کا جواب بن نہیں پڑتا اس لئے اس موقع پر بھی وہ اپنا آخری حربہ کا فرگری استعمال کرتے ہیں اور دلیل عقل کو استعمال میں لانے کے باوجود دلیل و عقل کو ہیچ کا تیہ بتاتے ہیں (ملل و نحل علامہ ابن حزم ظاہری) اس گروہ کے قائدین میں ابن جوزی ابن تیمیہ ابن قیم وغیرہ ہیں جن میں سے علامہ ابن تیمیہ علامہ کے ممدوح ہیں۔

اہل ظاہر میں ایک معتدل طبقہ بھی ہے یہ تصوف کو شریعت ہی کی ایک اعلیٰ تعبیر سمجھتا ہے لیکن وحدۃ الوجود کسی طرح ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس مسئلے میں یہ اپنا پیشوا حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو سمجھتے ہیں۔

حضرت شیخ احمد سرہندی وحدۃ الوجود کو بالکل غلط نہیں مانتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ صوفیہ پر ایک حال ایسا آتا ہے جہاں غیر اللہ انکی نظر سے معدوم ہو جاتا ہے جس طرح تارے طلوع آفتاب کے وقت یہ وحدۃ الوجود کی ایسی تاویل تھی جو اہل ظاہر کو صوفیہ کے کچھ قریب لے آئی لیکن یہ مسئلہ ایسا نہ تھا کہ اہل نظر مجدد صاحب کی ہمنوائی یا تقلید پر اکتفا کر لیتے۔ چنانچہ مجددی حضرات میں سے جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ان کو نظریہ شہود کی تاویلیں کرنی پڑیں اس سلسلے میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش یا تاویل حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی کی ہے۔ ان کوششوں کی برکت سے یا نظر کشفی کے طفیل آج کتنے ہی مجددی وحدۃ الوجود کو اسی طرح مانتے ہیں جس طرح مجدد صاحب کے پیر حضرت خواجہ باقی اللہؒ اور ان کے اشیاخ قائل تھے۔ وہ لوگ معترضین کو یہی جواب دیتے ہیں کہ اگر حضرت خواجہ باقی باللہ اور تمام صوفیہ کا وحدۃ الوجود حال، مقام، یا مغالطۂ کشفی ہو سکتا ہے تو مجدد صاحب کا انکار بھی حال یا مغالطۂ کشفی ہو سکتا ہے۔

غزل

اخگر رحیم آبادی

کیا کہیں کیا سُن گئے، کیا کہہ گئے ۔ لب ہلے دو چار آنسو بہہ گئے
اُن کی پیشانی پہ شکنیں پڑ گئیں ۔ یونہی ہم جانے ہم کیا کہہ گئے
کہہ سکے کچھ بھی نہ عرضِ شوق پر ۔ ضبط میں تیور بدل کر رہ گئے
عشق میں جور و ستم سے کیا گریز ۔ جو پڑی اُفتادِ دل پر سہہ گئے
ناتواں تھے کیا پہنچتے عرش تک ۔ نالے گُم ہو کر فضا میں رہ گئے
وقتِ رخصت نوکِ مژگاں پر بدم ۔ کچھ ستارے جھلملا کر رہ گئے
ہیں وہی اب کامیابِ زندگی ۔ موت کے دھارے میں جو بھی بہہ گئے
عزم والے بڑھ کے اُس پار تھے! ۔ سوچنے والے اِدھر ہی رہ گئے
کارواں پہنچا ہی منزل کے قریب! ۔ ہم جہاں پر تھے وہیں پر رہ گئے
لاکھ ہستی نے جھنجوڑا نیند سے ! ۔ ہم بس اک کروٹ بدل کر رہ گئے

شرم سے اُٹھتی نہیں اب اُنکی آنکھ
کیا خموش آنکھوں سے اخگر کہہ گئے

علامہ اقبالؒ حضرات عطارؒ رومیؒ اور ابن تیمیہ کی طرح حضرت مجدد صاحب کے خاص معتقدین میں ہیں لیکن ہمیں تعجب یہ ہے کہ علامہ اقبال حضرت ابن عربیؒ کے مقابلے پر مجدد صاحب کو نہیں لاتے بلکہ ابن تیمیہ کو لاتے ہیں جن کے خیال میں تمام تر تصوف مردود ہے خواہ وہ ابن عربیؒ کا ہو یا مجدد صاحب کا اب آپ وحدۃ الوجود کی مخالفت خود علامہ کی زبان سے سنئیے۔

"شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدۃ الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے۔ اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔۔۔۔ اس مسئلے نے عوام تک پہنچکر تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔۔۔۔ علمائے قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور شعرا میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر سیلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔"

(دیباچہ اسرار خودی)

علامہ کے خیال میں "حقیقت کوئی یک رنگ چیز نہیں بلکہ ایک مختلف الالوان مرکب ہے۔"

ملفوظات ص (جامع محمود نظامی)

بلکہ "ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں یہ فلسفے کا مسئلہ ہے۔ وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔"

(ملفوظات ص)

علامہ کے کلام میں اور بھی کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ وحدۃ الوجود کی مخالفت ملتی ہے اور ہم یقین کر سکتے ہیں کہ واقعی وہ وحدۃ الوجود کے خلاف ہیں۔ ان کی رائے میں اسلام کو ایسی بلند خیالی یا حسین و جمیل نکتہ آفرینی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہمیں ایسا یقین کرنا نہیں چاہئیے۔ کیونکہ علامہ کی رائے میں نہ صرف یہ کہ وحدۃ الوجود حق ہے بلکہ اسلام کا مذہب وحدۃ الوجود کے علاوہ کچھ نہیں۔ فرماتے ہیں:

"مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔" مضامین اقبال صفحہ

حضرت ابن عربیؒ کا قول ہے۔ الاعیان ما شمت رائحۃ الوجود ۔۔۔

طرح علامہ بھی کائنات کو عدمِ محض مانتے ہیں اور صوفیہ کی طرح الآن کما کان کے قائل ہیں یعنی خدا کے سوا نہ کچھ تھا اور نہ اب ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے حلقۂ ارادت میں تخلیق کا مسئلہ چھڑ گیا۔ ان کا ایک مرید کہنے لگا کہ ایک زمانہ تھا جب سوائے خدا کے کچھ نہ تھا محض اسی کی ذات تھی۔ یہ سن کر حضرت بایزید نے فرمایا کہ اب کیا ہے اب بھی وہی ہے۔ دراصل مادی عالم کوئی ایسا ہیولیٰ نہیں ہے جو شروع سے خدا کی ذات کے ساتھ موجود ہو۔ اس کی ماہیت ایک عمل کی سی ہے جس کو فکر باہم دگر منفرد اشیا کی ایک کثرت میں تقسیم کر دیتی ہے۔" (نیرنگِ خیال اقبال نمبر صفحہ ۲۰۰)

وحدۃ الوجود کے معنی ہیں وجود کا ایک ہونا۔ وجود کی بحث خالص علمی اور فلسفیانہ ہے اسلئے ملّا ٹائپ کے لوگ اس کے فہم سے اور عوام غلط فہمی سے قاصر و محفوظ رہتے ہیں۔ یہ کارنامہ حضرت ابن عربیؒ کا ہے کہ انھوں نے ظاہر پرستوں پر رحم کھا کے اس مسئلے کو خالص فلسفیانہ رنگ دیدیا اور اس طرح عوام غلط فہمی سے بچ گئے اور اس کے ساتھ اربابِ معرفت کو کوئی نقصان بھی نہ پہنچا۔ مگر بقول علامہ کے "ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچکر تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔" (دیباچہ اسرارِ خودی)

اب آپ ملاحظہ فرمایئے کہ علامہ نے کس طرح اس مسئلے میں دل کو آماجگاہ بنا کر عوام تک پہنچایا ہے۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری ۔۔۔ نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند ۔۔۔ بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ (ضربِ کلیم)

گفت آدم؟ گفتم از اسرار اوست ۔۔۔ گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست (جاوید نامہ)

وحدۃ الوجود کو صحیح مانتے ہوئے بھی بعض لوگ تاویل کر لیتے ہیں کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الموجود میں فرق ہے۔ علامہ اس تاویل کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ موجود بھی سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے۔

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب ۔۔۔ بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش ۔۔۔ ز لا موجود الا اللہ دریاب
(ارمغانِ حجاز)

صوفیہ ساری کائنات کو وجود واحد سمجھتے ہوئے بھی "گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی" کے قائل ہیں لیکن علامہ بعض وقت اس فرق کو بھی توڑ دیتے ہیں۔

عبدہ و رسولہ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است ۔۔۔ خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہمِ تو بالاتر است ۔۔۔ زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا ۔۔۔ اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں ۔۔۔ عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبدہٗ دیگر عبدہٗ چیزے دگر ۔۔۔ ما سراپا انتظار او منتظر

عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست ۔۔۔ ما ہمہ رنگیم و او بے رنگ و بوست
کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست ۔۔۔ عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ ۔۔۔ فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت ۔۔۔ تا نہ بینی از مقامِ مارمیت (جاوید نامہ)

مذکورہ اقتباسات سے نتائج ذیل مترتب ہوتے ہیں:۔

(۱) وحدۃ الوجود غلط ہے۔ اسلام کو اس بحث سے کوئی سروکار نہیں۔ اس مسئلے نے تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔

(۲) اسلام کی رو سے وحدۃ الوجود حق ہے۔ سوائے خدا کے کوئی موجود نہیں ہے۔

لیکن اس کے علاوہ ہمیں ایک اور خیال بھی علامہ کے یہاں ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وحدۃ الوجود سے قوموں کی ترقی تنزل کا کوئی تعلق نہیں بلکہ بقول حضرت مولانا رومؒ

ہر چہ گیرد علتے علت شود ۔۔۔ ہرچہ گیرد کاملے ملت شود

علامہ فرماتے ہیں:۔

خودگیری و خودداری و گلبانگِ انا الحق ۔۔۔ آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اسکے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اسکا ہمہ اوست ۔۔۔ خود مردہ و خود مرقد و خود مرگِ مفاجات
(ارمغانِ حجاز)

(باقی آئندہ)

روضۂ اعتماد الدولہ

نور احمد فریدی

یہ روضہ ملکہ نورجہاں کے والد کا مدفن ہے جو آدمی آگرہ آئے اُسے یہاں ضرور پہنچنا چاہیئے۔ یہ عمارت خوبصورتی اور نفاست میں تاج محل سے دوسرے نمبر پر ہے۔ ورحقیقت کاشی کاری اور گل کاری کا ایک بہترین مرقع ہے۔ آگرہ کے بازاروں میں ٹانگے والے خودبخود زائرین سے پوچھتے ہیں "اعتماد الدولہ چلو گے؟" وہ ابھی داموں پر تصفیہ کرکے ٹانگہ ہی کر لینا چاہیئے۔ یہاں پہنچنے کے لئے دریائے جمنا کا پل عبور کرنا پڑتا ہے۔ پل سے تاج اور قلعہ اکبر آباد کا منظر نہایت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ جمنا کی سیماب خرامی پر شکوہ قلعے کے شاہی محلات، تاج کی مرمریں عمارت، ایک رومانی کیفیت کے حامل نظر آتے ہیں اور مغل بادشاہوں کے جمال و جلال کا منظر بیک نگاہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جمنا کو عبور کرنے کے بعد اس کے مشرقی کنارے پر مغلیہ طرز کی ایک رفیع الشان عمارت نظر آتی ہے۔ یہی مقبرہ اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے

اعتماد الدولہ ملکہ نورجہاں کے والد بزرگوار مرزا غیاث کا خطاب ہے جو اسے شہنشاہ نورالدین جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے موقعہ پر عطا فرمایا تھا مرزا غیاث بیگ خواجہ محمد شریف طہرانی وزیر ایران کا فرزند تھا۔ انقلاب عالم نے والد کی وفات کے بعد ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ ان دنوں ہندوستان کے تخت پر شہنشاہ جلال الدین اکبر رونق افروز تھے۔ اور بادشاہ کی علم دوستی و شرفا پروری کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ادھر سے کچھ شعاع اُمید نظر آئی۔ اپنے بال بچوں اور بی بی کو ساتھ لے ایک قافلہ کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا۔ بدقسمتی سے رستہ میں قزاق آ پڑے اور قافلہ لُٹ گیا۔ نہایت ہی زبون حالی کے ساتھ خارزار جنگلوں کو طے کرتا ہوا قندھار تک آ پہنچا۔ اسی بے سروسامانی کے عالم میں بی بی کو وضع حمل ہوا، اور نورجہاں بیگم پیدا ہوئی حسن اتفاق سے ملک مسعود سالار قافلہ سے تعارف ہو گیا۔ اور اُس نے مرزا کی افسوسناک حالت سے اثر اندوز ہو کر ضرورت سے زیادہ امداد کی جس سے دونوں کے درمیان ایک ارتباط پیدا ہوا۔ ہندوستان پہنچے پر اپنے دوست کو فتح پور سیکری میں شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا جہاں مرزا فوراً ملازمین شاہی میں داخل کر لیا گیا۔

مرزا عالم اور مہذب تھا۔ وہ جادو اثر خطوط نویس اور جادو بیان مقرر تھا۔ تمام عمر وہ کام میں محنت اور شفقت کے لئے مشہور رہا۔ اور آہستہ آہستہ وہ اشاد و مرتبہ میں ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۵۹۵ء میں وہ سہ ہزاری کے منصب سے کابل کی دیوانی پر مامور ہوا۔

اس کی قندھار والی بچی جس کا نام مہرالنساء رکھا گیا تھا۔ اس اثنا میں وہ جوان ہو چکی تھی۔ مرزا نے سترہ برس کی عمر میں اس کی شادی ایک ایرانی جاں باز علی قلی استجلو سے کر دی۔ ۱۵۹۹ء میں وہ شہزادہ سلیم کے شاف میں داخل کیا گیا۔ جو اس وقت میواڑ کی مہم پر متعین تھا۔ ایک موقعہ پر علی قلی نے نہایت بہادری سے ایک شیر کو قتل کر ڈالا۔ جس پر شہزادہ نے خوش ہو کر اسے شیر افگن کا خطاب دیا۔ تھوڑے دنوں تک بغاوت میں سلیم کے ساتھ رہا۔ مگر پھر اسے چھوڑ کر اکبر کے پاس چلا گیا جب سلیم جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا تو اس نے دریا دلی سے کام لے کر شیر افگن کی نہ صرف وہ حرکت معاف کر دی بلکہ بنگال میں ایک عہدہ اور جاگیر بھی عطا کی۔

بنگال اس وقت فتنہ و فساد اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شیر افگن پر بھی کسی سازش کی شرکت کا شبہ ہوا۔ قطب الدین خاں کو جو راجہ مان سنگھ کے بعد اگست ۱۶۰۶ء میں بنگالہ کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ اس بات کا مختار بنایا گیا کہ وہ شیر افگن کو دربار شاہی میں داخل کرے۔ اور اگر وہ نافرمانی کرے تو اسے کیفر کردار کو پہنچایا جائے۔ مارچ ۱۶۰۷ء میں قطب الدین شیر افگن کی طرف روانہ ہوا اور ۳۰۔ مارچ کو ملاقات کے وقت آپس میں مقابل ہو کر مارا گیا۔

شیر افگن کی بیوہ مہرالنساء اور اس کی بیٹی لاڈلی بیگم آگرہ بھیج دیئے گئے جہاں اعتماد الدولہ اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھا۔ مہرالنساء تھوڑے دنوں کے بعد سلطانہ سلیمہ بیگم زوجہ اکبر کی بیوی کی خواص مقرر ہوئی۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے اس کو مینا بازار میں دیکھا۔ اس کی دلفریب شکل و صورت اُسے بھا گئی۔ اپنی والدہ سلطانہ سلیمہ بیگم کی وساطت سے اُسے شادی کا پیغام دیا۔ جسے اُس نے قبول کیا۔ اور آخر مئی ۱۶۱۱ء میں بادشاہ نے اسے نورجہاں بیگم کا خطاب دے کر اپنے محل میں داخل کر لیا۔

مرزا غیاث بیگ جس کی قسمت کو لڑکی کی پیدائش نے چمکا دیا تھا اب انتہائی عروج پر جا پہنچا۔ یعنی بادشاہ نے نورجہاں سے شادی پر اسے منصب ششش ہزاری اور وکالت کل کے عہدے پر سرفراز کیا۔ ۹ شوال ۱۰۳۰ھ کو اس کی بیوی نے انتقال کیا۔ چونکہ اعتماد الدولہ کو اس سے زیادہ محبت تھی، اس صدمہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور تین ماہ بیس یوم بعد خود بھی عالم جاودانی کو کوچ کر گیا۔ جہانگیر نے ان دونوں کی وفات کا حال جس دردمندی سے بیان کیا ہے وہ اس کا ہی حصہ ہے۔ لکھتا ہے:-

"۲۹۔ شوال کو والدہ نورجہاں بیگم رحمت الٰہی کے جوار میں جا

ترجمہ از تاریخ جہانگیر مصنفہ مؤلفہ پروفیسر بینی پرشاد صاحب ایم۔ اے الہ آباد یونیورسٹی۔

[1] تزک جہانگیری۔

جاننگی خاندانِ عفت کی اس کد بانو کے صفاتِ حمیدہ کے متعلق ہم کیا لکھیں۔ بلا مبالغہ پاک طینت۔ دانائی اور ان تمام خوبیوں میں جو عورتوں کا زیور ہیں۔ مادرِ دہر نے اس کی نظیر پیدا نہ کی۔ ہم اس کی ماں کو اپنی حقیقی والدہ سے کم تر نہ جانتے تھے۔ اعتماد الدولہ کو جو اس سے نسبت، تعلق اور رابطۂ محبت تھا۔ یقیناً ربیا کسی شوہر کو اپنی بیوی سے نہیں ہوتا۔ اس سے قیاس کر لینا چاہئیے کہ اس پر غم زدہ پر کیا گذری ہوگی۔ اور نور جہاں بیگم کو ایسی والدہ سے جو نسبت ہے اس کے متعلق ہم کیا تحریر کریں۔ اس سے آصف خاں جیسے فرزند نے نہایت خردمندی اور دانائی کے باوجود صبر کا دامن چاک کرکے اہلِ تعلق کے لباس سے علیحدگی اختیار کرلی اور مجروح خاطر باپ کو ایسے گرامی فرزند کی ایسی حالت کا مشاہدہ کرکے جو شدید غم اور درد لاحق ہوا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا ہر چند اُسے نصیحت کی گئی کوئی اثر نہ ہوا جس دن ہم ماتم پرسی کے لئے گئے اس کی شورشِ مزاج اور آزردگی خاطر کی ابتدا تھی۔ اس لئے ہم نے از روئے شفقت و مرحمت چند نصیحت آمیز حرف فرما کر اصرار نہ کیا اور اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیا تا کہ آشوب کم ہو جائے۔ پھر چند روز کے بعد اس کے جراحتِ دل کا مرہم التفات سے علاج کرکے اُسے اہلِ تعلق کے لباس میں لایا جائے گا۔

اعتماد الدولہ اگرچہ ہماری رضا جوئی اور خاطر داری کے لئے بظاہر ضبط سے کام لے رہا اور حوصلہ کر رہا ہے۔ مگر جس قدر اُسے مرحومہ سے الفت تھی وہ اُسے صبر کیسے کرنے دے؟

اعتماد الدولہ کا انتقال

جس دن سے اُس کی بیوی رحمتِ ایزدی سے ملحق ہوئی اعتماد الدولہ کو اپنی خبر نہ رہی دن بدن گھٹتا ہی گیا۔ اگرچہ بظاہر سلطنت کی مہموں اور امورِ دیوانی کی سرانجام دہی میں محنت سے کام کرتا رہا۔ مگر باطن میں اس کی جدائی کی آگ میں جلتا رہا حتیٰ کہ تین ماہ اور بیس دن کے بعد گذر گیا۔

چونکہ ہم کو کوہستان کانگڑہ کی سیر کی مدت سے خواہش تھی اس لئے اُردوئے کلاں (بڑے لشکر) کو سیتا محل کے پاس چھوڑ کر ہم اپنے مخصوص بندوں اور اہلِ خدمت کے ساتھ قلعہ مذکور کی طرف متوجہ ہوئے۔ چونکہ اعتماد الدولہ بیمار تھا اس لئے اُسے فوج ہی میں چھوڑ دیا۔ اور صادق خاں میر بخشی کو مشار الیہ کی محافظت احوال اور لشکر کی نگہبانی کے لئے مقرر کیا گیا۔ دوسرے دن اطلاع پہنچی کہ اعتماد الدولہ کا حال متغیر ہو گیا ہے اور اس کے چہرے کی حالت سے علامت یاس ظاہر ہے۔ نور جہاں بیگم کے اضطراب اور اس التفات کی نسبت سے جو ہمیں اُس سے تھی، ہم تاب نہ لا کر لشکر میں واپس آگئے۔ دن کے آخری حصے میں اُسے دیکھنے کے لئے گئے۔ سکرات کا وقت تھا۔ کبھی وہ بیہوش ہو جاتا اور کبھی باہوش۔ نور جہاں نے ہماری طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ آپ انہیں پہچانتے ہیں۔ اور اعتماد الدولہ نے ایسی حالت میں انوری کا یہ بیت پڑھ دیا۔ ؎

آنکہ نابینائے ادر زاد گر حاضر شود
در جبیں آرائش عالم بہ بیند مہترے

ہم دو گھڑی اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ جب وہ ہوش میں ہوتا۔ بات آگاہی اور فہمیدگی سے کرتا۔ القصہ صفر ۱۰۳۱ھ کی سترہویں رات تین گھڑی گذرنے پر وہ رحمتِ جاوید سے پیوستہ ہو گیا۔ ہم کیا کہیں کہ اس وحشت افزا واقعہ سے ہم پر کیا گذری۔ وہ وزیر عاقل بھی تھا اور دانا ...

"وطن سے دُور"

لیجا رہا ہے آج جنوں پھر چمن سے دُور
نیرنگیٔ بہار، گُل و یاسمن سے دُور

آباد ہے تصورِ رنگیں سے بزمِ دل
میں انجمن میں رہ کے بھی ہوں انجمن سے دُور

کیا جانے لطفِ صحبتِ احباب وہ غریب
قسمت میں جس کی لکھا ہو رہنا وطن سے دُور

فرقت میں اس طرح ہوں اسیرِ غم و بلا
بلبل ستم رسیدہ ہو جیسے چمن سے دُور

اک کشتیٔ شکستہ ہوں گردابِ زیست میں
اک موجِ بیقرار ہوں گنگ و جمن سے دُور

قطرے نہیں ہیں دامنِ الفت پر اشک کے
ٹوٹے ہوئے ستارے ہیں چرخِ کہن سے دُور

تیرِ نگاہِ ناز چلائے گا دل پہ کون
میں ہوتا جاتا ہوں بُتِ نادک فگن سے دُور

نزدیک ہوتا جاتا ہوں جتنا کہ موت سے
اتنا ہی ہوتا جاتا ہوں گور و کفن سے دُور

توفیقؔ لے چلی ہے مجھے گردشِ جہاں
بزمِ طرب سے محفلِ شعر و سخن سے دُور

توفیق نندرولوی

مہربان مصاحب بھی سے

از شمارِ دو چشم یک تن کم   در حسابِ خرد ہزاراں بیش

باوجودیکہ اس کے کندھے پر ایک عظیم الشان سلطنت کا بوجھ تھا۔ یہ خاص آدمی کا کام ہے کہ ایسی حالت میں ہر ایک کو راضی رکھ سکے۔ اعتماد الدولہ کے پاس جو کوئی بھی غرضِ مطلب کے لئے گیا۔ آزردہ نہ لوٹا۔ وہ ہماری بھی دولت خواہی اور مراعات کرتا اور حاجت مندوں کو بھی خوش اور امیدوار رکھتا۔ الحق یہ اسی کا مخصوص شیوہ تھا۔

ہم دوسرے دن تعزیت کے لئے اس کے فرزندوں اور خواتین کے پاس گئے۔۔۔۔ اور اس کے فرزندوں اور قوم کے اکتالیس اشخاص اور بارہ متعلقین کو خود یا عنایت کرکے لباس ماتم سے نکالا اور اس سے اگلے دن اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے کوچ کرکے قلعہ کانگڑہ دیکھنے چلے گئے۔

ملکۂ نورجہاں نے اپنے والد بزرگوار کی لاش کو آگرہ سے پہنچا کر اپنی والدہ ماجدہ عظمت النساء بیگم کے پہلو میں دفن کرا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے والدین کا مقبرہ سونے اور چاندی سے بنوائے لیکن امراء اور ارکین نے منع کیا اور عرض کی کہ طوائف الملوکی کے زمانہ میں ایسی قیمتی چیز محفوظ اور قائم نہیں رہ سکیگی۔ اور جب بھی موقعہ ملے گا حملہ آور اسے تاخت و تاراج کردیں گے چنانچہ ملکہ اس ارادہ سے باز آئی اور ہزار ہا کاریگروں کی سات سال کی متواتر مشقت و جانکاہی کے بعد یہ عجیب و غریب مقبرہ مکمل کرایا۔ اور لاکھوں روپیہ اس کی خوبصورتی اور نفاست کو بےمثل دکھانے پر صرف کر ڈالے۔ یہ کام کچھ اس نیک نیتی سے کیا گیا ہے کہ صدیوں کے گزر جانے کے باوجود عمارت میں کہنگی اور شکستگی کے آثار تک نہیں ملتے۔ مغلوں کے عام رواج کے مطابق یہ نادرۂ روزگار مقبرہ بھی دریا کے کنارے واقع ہے۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے باغ سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے صدر دروازہ آتا ہے۔ اسی قد و قامت کے دو اور بھی عظیم الشان دروازے شمال اور جنوب کی طرف بنے ہوئے ہیں۔ مگر وہ بند رہتے ہیں صرف اسی دروازے سے آمد و رفت ہوتی ہے۔ روضہ کی عمارت ایک سنگِ سرخ کے چبوترہ پر واقع ہے۔ اس کی پچاس گز مربع کی مرمریں کرسی جس کا ارتفاع تین فٹ آٹھ انچ ہوتا ہے نہایت خوبصورت ہے۔ اور اس پر مختلف قسم کے رنگین پتھروں سے پچہ کاری اور منبت کاری کی گئی ہے۔ مقبرے کے ہر ضلع میں تین تین دروازے ہیں جن میں سے درمیانی تو کھلا رہتا ہے اور باقی دو سفید پتھر کی جالیوں سے بند ہیں۔ عمارت کے اندر چاروں طرف چار کمرے ہیں۔ اور گوشوں پر ایک مربع حجرہ ہے۔ کل عمارت میں جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے صرف تین فٹ آٹھ انچ سنگ مرمر ہے اور اوپر چونے کا کام ہے۔ مگر یہ کام اس قدر نفاست اور خوبصورتی سے کیا گیا ہے کہ سنگ مرمر کو بھی مات کرتا ہے۔ مختلف رنگوں کی دیدہ زیب گلکاری عجیب دلکش اور دبستاں معلوم ہوتی ہے۔ تمام چھت پر طلائی لاجوردی اور نفیس کام تھا۔ مگر اب وہ حالت نہیں ہے۔ غرض بے حد خوبصورت ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چھت کے نیچے بائیس فٹ تین انچ مربع چبوترہ ہے۔ جس کے وسط میں سنگ زرد کے دو نہایت چمکدار اور بے نظیر تعویذ بنے ہوئے ہیں۔ ایک میں ملکہ نورجہاں کا نامدار والد اور دوسرے میں عفت مآب عظمت النساء بیگم والدہ نورجہاں ابدی نیند سو رہی ہے۔ یہ میاں بیوی بھی اپنے زمانہ کے لیلیٰ مجنوں تھے۔ مرزا غیاث، عظمت النساء بیگم۔ شاہ سلیم اور نورجہاں اور شاہجہان اور ملکہ ممتاز محل تینوں جوڑیاں عشق و محبت کے بےمثال شاہکار ہیں۔ اور خوبیٔ اتفاق ملاحظہ ہو۔ نورجہاں، مرزا غیاث کی بیٹی اور ارجمند بانو بیگم پوتی ہے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جمنا کے غربی کنارے پر تاج عکس ریز ہے تو مشرقی کنارے پر اعتماد الدولہ واقع ہے۔ جس طرح ان کی سمتیں مختلف ہیں اسی طرح ان کے نام بھی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ تاج میں بھی "میاں بیوی" پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں اور اعتماد الدولہ میں بھی۔ لیکن "تاج" بیوی کے نام پر مشہور ہے اور اعتماد الدولہ "میاں" کے نام پر حالانکہ دونوں مقابر میں بیویاں پہلے دفن ہوئیں۔ اور شوہر بعد

لہ کس قدر عبرت اور حیرت کا مقام ہے کہ سلطانہ نورجہاں بیگم جو عہد جہانگیری میں سیاہ و سفید کی مالکہ ہو۔ والدین کے مزاروں پر سونے اور چاندی کا مقبرہ بنانے پر آمادہ ہو جانے اور اپنے شوہر کے مرقد پر ایک رفیع المرتبت مقبرہ تیار کرے خود بیچاری اس مقبرہ کو ترستی چلی جائے اور جس کے محلات میں آٹھوں پہر عطر بیزی ہوتی ہو اب وہاں سیلاب کے شرانگی بو ہو۔

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ کے دل لگا   اس بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر ایوان   آرام کے اسباب وہ عیش کے ساماں
جو کچھ تھا کبھی دہر کا یہ کچھ بھی نہیں ہے   ٹوٹے ہوئے پھر کے ٹکڑے ریزہ ریزہ ہیں

لہ مغل بادشاہوں کو اپنے عروج کے زمانہ میں جبکہ انہوں نے لاہور، دہلی اور آگرہ وغیرہ میں کروڑہا روپیہ صرف کرکے عالیشان عمارتیں بنوائیں اور ان کی چھتوں، محرابوں اور کنگروں کو لاکھوں روپیہ کے زر و جواہرات سے مزین کیا۔ یہ وہم بھی نہیں ہوا کہ ہماری اولاد میں کمزور بادشاہ پیدا ہوں گے جو ان کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ اور غرض و آز کے ناقدر شناس بندے ان نادر اشیاء کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگائیں گے۔ اگر ان کو زوال کا اندیشہ ہوتا تو شاید وہ خالص زر و جواہر کی بجائے عمارتوں میں الیبی گلکاری سے کام لیتے جو مسجد وزیر خاں لاہور، چوبرجی، گلابی باغ وغیرہ میں موجود ہے۔ جس کو کوئی شخص مٹا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ (اخبار تعلیم، لاہور)

فراق کے صدمات برداشت کرنے کے بعد اُن کے پہلو میں جا لیٹے

اعتماد الدولہ کے گوشوں میں جو حجرے بنے ہوئے ہیں ان میں مرزا غیاث کے خاندان کے باقی افراد کی قبریں ہیں جن میں سے ممتاز محل کی بڑی بہن "ملکہ بانو" تاریخ میں بہت شہرت رکھتی ہے۔ یہ عفت مآب خاتون ابوالحسن آصف جاہ خانخاناں سپہ سالار صاحبقران ثانی کی بڑی صاحبزادی تھی۔ جب سنِ شباب کو پہنچی تو خاندیس کے گورنر سید عبداللہ سیف خاں سے بیاہی گئی۔ جب جہانگیر عالمِ انحطاط کو پہنچے۔ تو ملکہ نورجہاں اپنے داماد شہریار کے لئے بادشاہت کی کوشش کرنے لگی۔ اور آصف خاں وزیرِ اعظم اپنے داماد شاہجہاں کے طرفدار تھے۔ سوء اتفاق سے "ملکہ بانو" کا شوہر سیف خاں بھی نورجہاں کا حامی و مددگار تھا۔ اس سلسلہ میں "ملکہ بانو" کو سخت مصائب و ابتلا کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف والدین اور ہمشیرہ کی حمایت پیش نظر تھی اور دوسری جانب شوہر کی رضا مندی مطلوب، حالات کتنے نازک کیوں نہ رہے ملکہ بانو نے اپنے شوہر کا دامن نہ چھوڑا اور جب بھی موقعہ ملا۔ والد بزرگوار سے بھی شوہر کی تعریف کرتی رہیں۔ مسلمان خواتین کو چاہیئے کہ وہ یہاں آکر محض عمارت کی فنی نادرہ کاری پر ہی اپنی تمام توجہات نہ صرف کردیں۔ بلکہ اس کے اندر جو پاکیزہ روحیں خوابیدہ ہیں ان کے حالات سے سبق حاصل کرنے کی بھی کوشش کریں اور دیکھیں کہ ملکہ بانو کی سیرت میں ان کے لئے کس قدر قابل تقلید امور موجود ہیں۔ آج مسلمانوں کی بہو بیٹیاں معمولی سی باتوں پہ خاوندوں سے لڑ جھگڑ کر چلی آتی ہیں۔ لیکن "ملکہ بانو" نے ہر حالت اور ہر صورت میں خاوند کی دلجوئی کو مقدم سمجھا اور اپنے تدبر سے والدین میں اور شوہر میں تصادم نہ ہونے دیا۔ بلکہ جب شاہجہاں نے برسرِ اقتدار ہو کر سیف خاں کو نظر بند کیا تو اسی عصمت مآب نے اپنی بہن کے توسط سے نہ صرف جاگیر بحال کرائی۔ بلکہ خلعت چار ہزاری کا منصب۔ علم اور نقارہ بھی دلوادیا۔ ۲۸۔ صفر ۱۰۵۰ھ کو اس کا خاوند انتقال کرگیا اور ۲۸۔ جمادی الاول ۱۰۵۰ھ یعنی تین ماہ بعد اس نے بمقام لاہور دارِ دنیا سے دارِ آخرت کو سفر کیا۔ اور اعتماد الدولہ کے ایک کونہ میں دفن ہوئی۔ یہاں آکر زائرین کو ملکہ بانو کی یاد ضرور تازہ کرنی چاہیئے اور اس کی زندگی کی عبارت سے خاوند کی وفاداری۔ عزبا پروری اور خدا ترسی کے اسباق کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ نیز جو جھگڑالو خسر ادنیٰ معاملات پر اپنے دامادوں سے الجھ پڑتے ہیں۔ انہیں یہ دیکھ کر شرم آنی چاہیئے کہ آصف خاں جیسے خسر نے وزیرِ اعظم اور قلمروِ ہند کے سیاہ و سفید کے مالک ہونے کے باوجود اپنے داماد سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ ورنہ اگر وہ چاہتا تو اس کے لئے جینا دوبھر کردیتا۔

مقبرہ کی بالائی منزل

مقبرہ کی چھت پر چڑھنے کے واسطے جنوبی کمرہ میں آمنے سامنے دو زینے بنے ہوئے ہیں جن کی سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر جا سکتے ہیں۔ یہاں سنگ مرمر کا خوبصورت فرش بنا ہوا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف مرمریں جالیدار کٹہرا اور چاروں کونوں پر ایک ایک بلند مرمریں مینار ہے۔ درمیان میں ایک چھتری سی بنی ہے۔ اس کا چبوترہ مربع شکل کا ہے۔ جس پر خوبصورت پچہ کاری کی گئی ہے۔ وسط میں دو تعویذ ہیں۔ مشرقی جانب کے تعویذ پہ تختی اور غربی تعویذ پر قلمدان بنا ہوا ہے۔ جس سے اس خاندان کے علم و ادب کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ہر ضلع میں تین تین باریک مرمریں جالیاں بنی ہوئی ہیں۔ چھتری کے نیچے کا فرش نہایت ہی خوبصورت اور قابل دید ہے۔ عمارت کے تمام در و دیوار پر نایاب پتھروں سے پچہ کاری کی گئی ہے۔ الغرض یہ اپنی طرز کا لاجواب مقبرہ ہے۔ اور اگر تاج معرضِ وجود میں نہ آتا تو آگرہ میں یہ پہلے درجے کی عمارت شمار ہوتی۔ کسی شاعر نے مقبرہ اعتماد الدولہ کی تعریف میں کیا خوب لکھا ہے

عجب روضۂ مثلِ خلدِ بریں　　کہ خاتم بود باغ او چوں نگیں
ہمہ سنگ مرمر بہ نقش و نگار　　مصفا منور چو روئے نگار

زہ چیں احجار گلگوں نہ رنگ
بہ زنگ آمدہ نقش چین و فرنگ

کسی سے خطاب

تم سے امید نہیں تھی ایسی

میری امید کی نیّا تم تھیں　　میری کشتی کی کھیوّیا تم تھیں
تم سے امید نہیں تھی ایسی

میں تمہیں اپنا سمجھتا تھا کبھی　　حاصلِ عشق سمجھتا تھا کبھی
تم سے امید نہیں تھی ایسی

میں تمہیں پیار بھی کرتا تھا کبھی　　پریم میں بھول بھی کرتا تھا کبھی
تم سے امید نہیں تھی ایسی

میں نے آنکھوں پہ بٹھایا تھا تمہیں　　میں نے نور ستہ دکھایا تھا تمہیں
تم سے امید نہیں تھی ایسی

میری خاموش محبت کا صلہ ہی یہ کیا　　میری امید محبت کا صلہ ہی یہ کیا
تم سے امید نہیں تھی ایسی

مظفر حسین ساز

اثریات میں رومانیت

[جن لوگوں نے اثریات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی ہے وہ اس علم کو محض "گلی ہوئی ہڈیوں اور ٹوٹے پھوٹے پتھروں" کا گورکھ دھندا سمجھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پروفیسر وی۔ گارڈن چائلڈ نے اس مقالہ میں بتایا ہے یہ علم ماہرین میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ نامعلوم ترین زمانہ سے لیکر موجودہ دور تک جسکو عہدِ جوہری کہا جانا چاہئیے تہذیب انسانی کے ارتقا کا ایک مربوط سلسلہ قائم کر دے۔ پروفیسر گارڈن اڈنبرا یونیورسٹی میں تقریباً بیس سال تک قبل تاریخ کے اثریات کے شعبہ کے صدر رہے ہیں]

جب سے میں آسٹریلیا سے آیا ہوں جسکو اب پچیس سال ہو گئے ہیں میں ہندستان کے اور انگلستان کے خاص طور پر اثریات کے مطالعہ میں منہمک ہوں۔ بظاہر اس کام کا تعلق آسٹریلیا سے کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقت میں اس کام میں اور میرے ملک آسٹریلیا میں اتنا بُعد نہیں ہے جتنا ظاہر میں نظر آتا ہے۔ بہت زیادہ عرصہ کی بات نہیں ہے کہ اس وقت انگلستان کا مہذب ترین باشندہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا آسٹریلیائی حبشی ہے اسکی زندگی اور رہنے سہنے کا طریقہ وہی تھا جیسا کہ بعض حبشیوں کا ہے یعنی جو چیز ہاتھ لگی وہی کھالی۔ نہ اس کو کسی دھات کا علم تھا نہ وہ کاشت جانتا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پتھر کے زمانہ میں انگلستان اور یورپ کے اکثر ممالک کے لوگ کیسے رہتے سہتے تھے ہم کو آسٹریلیا کے قدیم اور اصلی باشندوں کے رہن سہن کا پتہ لگانا اور مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

آسٹریلیا کے موجودہ سفید باشندوں کی زندگی پر جنکو قدیم تہذیب ورثہ میں ملی ہے اثریات کا اثر ایک اور طرح بھی پڑتا ہے۔ زمانۂ قدیم کے اثریات نے قدیم تاریخ میں ایسا ہی انقلاب برپا کر دیا ہے جیسا دوربین نے علم نجوم اور خوردبین نے نباتات میں۔ اس نے مورخین کے نظریات کے دائرہ میں ننانوے گنی وسعت پیدا کر دی ہے۔ سب سے پرانی تحریرات (مصر اور عراق کی) پانچ ہزار سال پرانے زمانے کا پتہ دیتی ہیں لیکن اثریات کے نمونوں کی گیرائی پانچ لاکھ سال ہے۔

انسانی ارتقا

لیکن یہ اثریاتی نمونے ہیں کیا چیز؟ مجھکو اسکا اعتراف ہے کہ یہ ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں اور پتھری ہیں۔ مگر یہ ہڈیاں ہمارے اجداد اور پیش روؤں ہی کی ہیں۔ وہ کون تھے؟ — عجیب و غریب نیم انسانی مخلوقات، جاوا کے مشہور عام بن مانس ایسے نیم حیوان اور نیم انسان جنکا پتہ گزشتہ بارہ سال میں پیکنگ کے قریب لگا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنا کہ نیم انسانی (حیوانی) ارتقا کے اس ابتدائی درجہ سے بڑھ کر موجودہ درجہ پر کس طرح پہونچے اور سائنسدانوں کی زبان میں "باشعور انسان" کس طرح بنے ایک ایسا موضوع ہے جسکا تعلق اصل بحث سے بہت قریبی ہے۔ کیونکہ ہر انسانی نسل کا انسان — آسٹریلیائی حبشی اور یورپی اقوام کا ہر فرد — اسی نوعِ انسانی سے تعلق رکھتا ہے جسکو سائنسدان لطیفہ "باشعور انسان" سے موسوم کرتا ہے۔

ٹوٹے پھوٹے پتھر۔ یہ سنگریزے وہ اوزار ہیں جو عہدِ عتیق میں ہمارے موجودہ زمانہ کے جانوروں اور بجلی سے چلنے والی مشینوں کی جگہ استعمال ہوتے تھے۔ پتھر کے یہ اوزار ان اوزاروں سے زیادہ بھدے اور بدنما ہیں جو نسانیا میں اب تک پائے جاتے ہیں لیکن پتھر کے یہی بدصورت ٹکڑے ہماری موجودہ صنعتی ترقی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں جس نے اس بیسویں صدی میں جوہری بم بنا کر دم لیا ہے۔ ماہرین اثریات کے اسی قسم کے مواد سے انسانی ارتقا کا نقشہ ٹھیک ٹھیک کھینچتا ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ترقی کے مختلف مدارج کا مطالعہ کریں اور صحیح نتائج اخذ کریں۔

ماہرین اثریات کو اس کا بھی احساس ہے کہ جن اوزاروں کا وہ بغور مطالعہ کرتے ہیں وہ سماجی پیداوار ہیں۔ ان کی تشکیل آپس کے اتحاد سے ظہور میں آئی اور انکا استعمال بھی مل جل کر ہوا جس کسی نے بھی موجد نے کوئی نئی چیز بنائی۔ بڑی یا چھوٹی۔ اس کی سمجھ اور ذہانت وہی ہوتی تھی جو اپنے معاشرہ سے حاصل کرتا تھا اور اس کی وہی ایجاد مفید سمجھی جاتی ہے جو کسی سوسائٹی کیلئے قابل استعمال ہو۔ اسی وجہ سے ماہر اثریات مجبوراً ہر زمانہ کی سماجی حالت اور تنظیم کا مطالعہ کرتا ہے۔ ہر زمانہ کے اوزار اپنے وقت کے سماجی ڈھانچہ کو پورے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ تو گویا اثریات کا مطالعہ نہ صرف اوزاروں اور ہتھیاروں کی ترقی کا کھوج لگاتا ہے بلکہ سوسائٹی کے ارتقا کا بھی۔ اثریات کی مدد سے مورخ کو موقع ملتا ہے کہ وہ عام رجحانات اور میلانات کا پتہ لگائے اور اس سمت کی طرف اشارہ کرے جدھر سوسائٹی کو ترقی کرنے کیلئے گامزن ہونا چاہئے۔

عوام کے فائدہ کی باتیں

میں اس قسم کی باتیں سیدھی سیدھی زبان میں کئی کتابچوں میں لکھ چکا ہوں کیونکہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اثریات کے ماہروں کو چاہئے کہ ان باتوں سے عوام کو بھی مطلع کریں۔

گورڈن چائلڈ

پچیس سال پہلے تک اثریاتی مواد اتنا اور ایسا تھا کہ ہم اسکو ایک مسلسل طریقہ پر بیان کر سکتے تھے اور تخیل کے زور سے اپنے بیان میں دلچسپی بھی پیدا کر سکتے تھے لیکن اب قیاس آرائی کی گنجائش نہیں رہی ہے کیونکہ بہت سے مسئلے طے ہو چکے ہیں اور بہت سی تحقیق و تنازعہ فیہ امور پر ماہرین اثریات کا اتفاق رائے ہو چکا ہے۔ اب یہاں ماہرین کا فرض ہے کہ وہ ان متفقہ فیصلوں کی اشاعت کریں۔ لیکن اب بھی بہت سی چیزیں پردۂ شہود پر پورے طور پر نہیں آئی ہیں۔ مزید انکشافات کی ضرورت اور انتظار ہے۔ یہ کام بہت دلچسپ ہے۔ ایک سو سال سے جو تحقیقات ہو رہی ہیں ان سے

جو نتائج ہم پہنچے ہیں انکا مطالعہ کرنے کیلئے میں نے تمام یورپ کا دورہ کیا اور وہاں کے عجائب خانوں کا معائنہ کیا ہے۔ عجائب خانے تمام دن کھلے نہیں رہتے اسلئے قہوہ خانوں میں بیٹھکر غیر ملکیوں سے گپ شپ کرنیکا بھی موقع مل سکتا ہے مجھکو اس سلسلہ میں مصر، عراق اور ہندوستان تک جانا پڑا کیونکہ یہی وہ ممالک ہیں جہاں سے مشرقی تہذیب یورپ اور انگلستان تک اپنی شعاعیں پھیلاتی رہی ہے۔ اس زمانہ میں یورپ کے باشندے ناخواندہ، جاہل اور وحشی تھے۔ تاریخی عہد سے پہلے کے یورپ کو سمجھنے کیواسطے ضروری ہے کہ ہم اس مشرقی تہذیب کے پس منظر کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔

گزشتہ سال جون کے مہینہ میں مجھکو اور دوسرے بیس برطانوی سائنسدانوں کو روس کی طرف سے دعوت دی گئی روس میں "اثریات" سائنس ہی میں داخل ہے۔ وہاں مجھکو نہ صرف اس بات کا موقع ملا کہ میں نے روس، یوکرین اور جارجیا کے سائنسدانوں کا کام دیکھا بلکہ یہ بھی دیکھا کہ انہوں نے دوسرے شعبہ جات میں پچھلے دس سال کے دوران میں کیا کیا ترقی کی۔ مجھکو دس سال بعد ماسکو جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

کھدائی بذات خود بڑی دلچسپ چیز ہے۔ مجھکو توت انخ آمن کی سونے چاندی سے بھری ہوئی قبر کو کھودنے کا تجربہ نہیں ہے میں نے زیادہ تر اسکاچستان کی کھدائیاں دیکھی ہیں۔ میں اسکاچستانی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں۔ اسکاچستان قبل تاریخ کے آثار باقیہ سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن اکثر اسکاچستانیوں میں اتنا سلیقہ نہیں ہے کہ وہ ان باقیات سے سائنٹفک طریقہ پر کام لے کر اہم نتائج اخذ کریں۔ اسلئے میں نے یہ سعادت حاصل کی اور اس دولت کو اسکاچستانی ماہرین کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس زمانہ میں مصری اور بابلی دولت تہذیب و تمدن سے مالا مال تھے اس سے بھی بہت عرصہ بعد تک اسکاچستانی لوگ جاہل اور وحشی ہی رہے۔ اسلئے نظاروں کی تلاش ہوئی جواہرات کی ڈبیوں اور دیدہ زیب دھات کی بنی ہوئی اشیا حاصل کرنے کے بجائے کئی کئی مہینوں تک سخت محنت کرنیکے بعد میرے ہاتھ جو چیزیں لگتی ہیں وہ یا تو ہاتھ کے بنے ہوئے بھدی وضع کے مٹی کے برتن ہوتے ہیں یا زنگ آلود لوہے کے ٹکڑے یا کوئلہ کی بنی ہوئی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں۔ ارگائل کے ایک دورافتادہ قلعہ پر چھ ہفتے تک سر کھپانے کے بعد میرا مال غنیمت مشتمل تھا ایک چقماق اور زنگ آلود کلہاڑی، ایک ٹوٹے ہوئے پیتل کے کانٹے (بروچ) اور ایک سنگ سیل پر۔ مگر میں بالکل مطمئن تھا کیونکہ قلعہ کی عمر کی تعین کے سلسلہ میں جو دعوے کیا تھا اسکو صحیح ثابت کرنے کیلئے صرف یہی چیزیں درکار تھیں

اسکاچستانی شیش محل

یہ شیش محل عجیب و غریب قسم کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کے پتھر بہت تیز آنچ سے تپائے اور چمکائے گئے تھے۔ اس طرح کے محل اسکاچستان میں تقریباً ساٹھ ہیں۔ ان میں سے چھ پہلے ہی دریافت ہو چکے تھے۔ ان کے متعلق چھان بین کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محل اہل روما کے اسکاچستان پہونچنے سے بہت پہلے تعمیر ہوئے تھے۔ ان کے بنانے والے اغلب کلٹی قوم کے افراد تھے۔ ساتویں محل کی کھدائی خاص تجربات حاصل کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ چنانچہ کھدائی کے بعد وہی نتیجہ نکلا جسکا قیاس کیا گیا تھا اور یہ بھی دریافت ہو گیا کہ ان کی دیواریں کس طرح بنائی گئی تھیں۔

مجھکو کوئلہ کی ایک کان کے مالک کی مالی امداد بھی حاصل تھی اور اعلیٰ درجہ کا سائنٹفک اور ٹیکنیکل مشورہ بھی۔ سنہ ۱۷۶۰ء سے ماہرین ارضیات اور تاریخ عہد عتیق میں دلچسپی رکھنے والے مورخین کو اس معاملہ میں بڑا تجسس تھا کہ پتھروں کو پگھلانے یا تپانے کیواسطے گرمی کس چیز سے اور کس طرح پیدا کی گئی ہوگی۔ بعض کا خیال آتش فشانی عمل کی طرف گیا تھا لیکن اکثر کی رائے میں یہ آگ انسان کی خود کی پیدا کی ہوئی تھی۔ لیکن ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ تپش انسان کی ارادۃً پیدا کی ہوئی نہ تھی بلکہ کسی اتفاقی حادثہ یا کسی دشمن کی حرکت کا نتیجہ تھی جیسے پتھر اور لکڑی کی ایک دیوار کے جلنے کا ذکر جو اس سے پہلے کیا ہے۔ ہم نے اسکا ثبوت اس طرح بہم پہونچایا کہ اسی طرح کی ایک دیوار بنائی اور اس میں آگ لگا کر شیشے کی ایک چمک پیدا کر لی۔

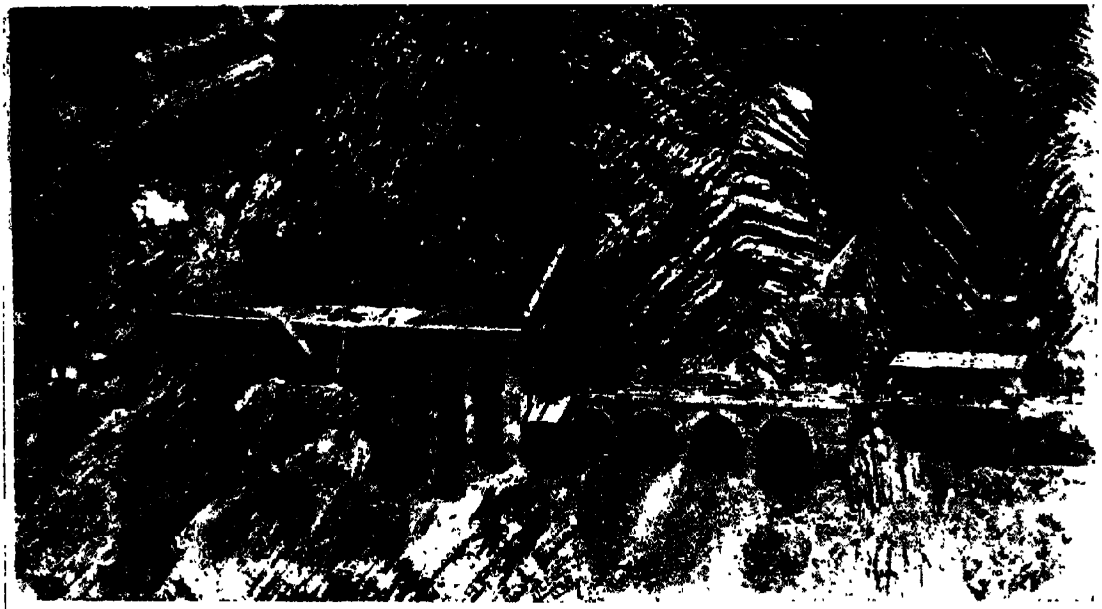
ایک دفعہ فی الواقع میں نے ایک بہت ہی اہم انکشاف کیا۔ پتھر کے زمانہ کے ایک مکان میں مجھکو داخل ہونے کا موقع ملا۔ مکان بالکل اسی حالت میں تھا جیسا اس میں رہنے والوں نے اسکو اب سے تین ہزار سال پہلے چھوڑا ہوگا۔ یہ مکان بحر اٹلانٹک کے ساحل پر اورکنی میں واقع ہے۔ اس مکان کی چھت کسی خوفناک طوفان سے اڑ گئی تھی اور ریت کے ٹیلے آ جمے تھے۔ اس مکان میں رہنے والے بالکل بے بس تھے انکے اوزار صرف ہڈی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے بیلچے یا کرچھے تھے۔ بیچارے آدمی ریت کے ان ٹیلوں پر قابو نہ پا سکے اور ناچار ان کو وہ مکان چھوڑنا ہی پڑا۔ ریت گھر کے اندر بھرتا گیا۔ جب ہم نے وہ گھر ریت سے صاف کیا تو ہم نے اس میں ہر چیز بالکل اسی حالت میں پائی جس حالت میں ان لوگوں نے عالم سراسیمگی میں چھوڑی ہوگی۔

ان چیزوں کو دیکھکر ہماری آنکھوں کے سامنے پتھر کے زمانہ کے اسکاچستان کے طرز معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر کھنچ گئی۔ لیکن انکے رہن سہن کا طریقہ بیابانیوں کا سا نہ تھا۔ کھانے کے ٹکڑے، جانوروں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں اور گھونگے کے خول سارے گھر میں بکھرے پڑے تھے۔ ہمیں ایک بچھڑے کا سر بھی پڑا ملا۔ گھر میں آرام کا تمام سامان موجود تھا۔ یہ یاد رہے کہ اورکنی میں درخت نہ ہوتے تھے اور نہ اب ہوتے ہیں۔ اسلئے لکڑی کی جگہ پتھر سے کام لیا گیا تھا۔ گھر کے بیچ میں ایک آتشدان کے اندر آگ کے جلانے جلنے کے نشانات باقی تھے۔ دونوں طرف پلنگ موجود تھے اور بستر کو سہارا دینے کیلئے پتھر کی سلیاں موجود تھیں جبکہ بستر امتداد زمانہ سے ضائع ہو چکا تھا۔ مختلف چیزیں رکھنے کیلئے دیواروں میں الماریاں تھیں اور دوسری دیوار سے لگی ہوئی ایک بہت ہی جدید وضع کی سنگھار میز تھی جسکے تختے اور کھمبے پتھر کے تھے۔ فرش کے نیچے نیچے نالی بنی تھی جو ایک مرکزی چہ بچہ میں جا کر گرتی تھی۔

اس کھدائی نے مجھکو اسکاچستان کے بہترین مناظر میں پہونچا دیا۔ اسکاچستان اور شمالی آئرستان واقعی بہت حسین ہیں۔ جلد جلد بدلنے ہوئے قدرتی مناظر، لمبے لمبے سردیوں کے دن، تیز ہوا کے جھکڑ جس میں پیمانہ ہاتھ سے چھٹا جاتا تھا، سردی سے ٹھٹھری ہوئی انگلیاں پنسل نہ تھام سکتی تھیں اور بارش سے نوٹ بک بھیگی جاتی تھی ۔۔ یہ سب باتیں اس وقت یاد آ کر عجیب لطف پیدا کر رہی ہیں۔

(لندن کالنگ سے ماخوذ)

ایرانی ریلوے لائن



اسی ایک تصویر کے دیکھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایران میں ریلوے لائن کھولنے اور اسکی پٹری کیواسطے راستہ بنانے میں کتنی مشکلیں پیش آئی ہونگی۔



پہاڑیوں کو کاٹ کر اور سخت پتھروں کو توڑ کر سطح کو ہموار بنایا جا رہا ہے۔



← ایسے موقعوں پر پل بنانا نہایت ضروری تھا۔

چینی ورزشیں

کچھ عرصہ سے چین میں طرح طرح کے کھیل کودوں اور ورزشوں کا بہت چرچا ہوتا جا رہا ہے۔ نئے کھیلوں کے علاوہ ملک کے پرانے کھیل اور قدیم ورزشیں مثلاً کشتی اور مکا بازی بھی دوبارہ زندہ ہو رہی ہیں۔ نئے کھیلوں میں "باسکٹ بال" بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ چینیوں کی ورزشیں اور ان کے کھیل کود بہت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں لیکن جسم کو خوب مضبوط اور طاقتور بناتے ہیں۔



مکے بازی کی ایک قسم۔ یہ ورزش رگ پٹھوں کو بہت مضبوط بنا دیتی ہے۔

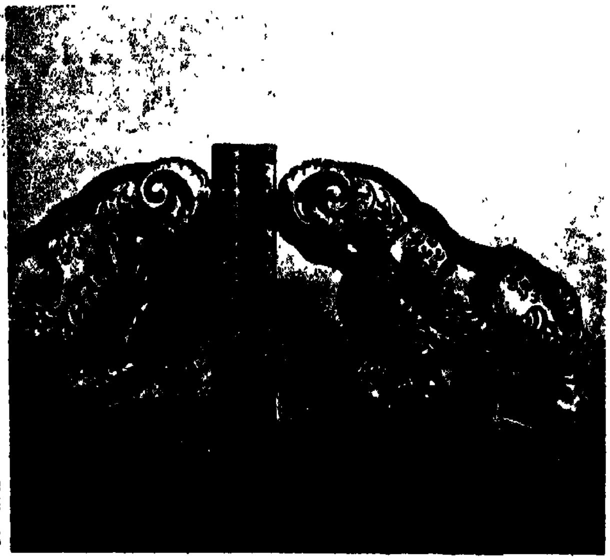




دو جوان کشتی لڑ رہے ہیں۔ اس کشتی میں ہاتھ پاؤں توڑنے [illegible]

ایک اور قسم [illegible] مکا بازی [illegible]

روسی فنکاری کے چند نمونے



لکڑی میں کھدے ہوئے بھیڑ کے بچے (ورنسکوف



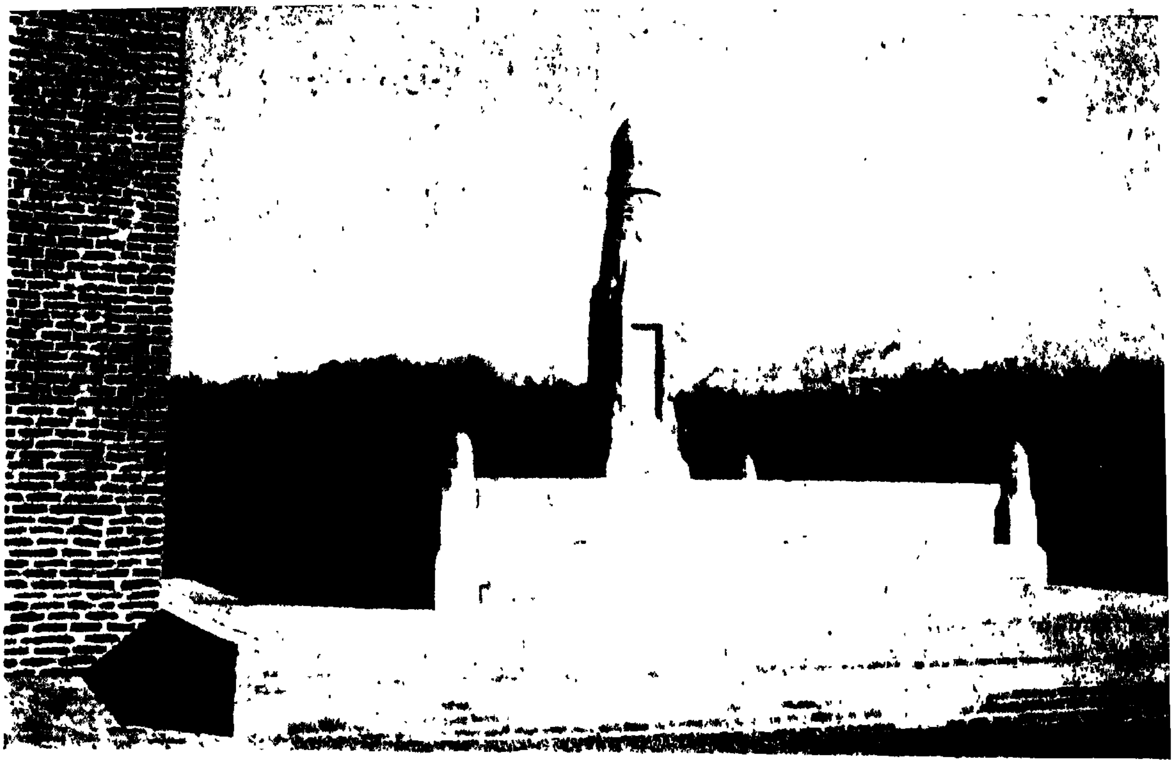
«ملاقات» اسٹولوف کا کارنامہ

روس کے مشہور بت سازوں میں ایوان اسٹولف بھی ہے۔ محنتی صناع ہے اور اپنے فن کے ہر شعبہ میں بڑا کمال ہے۔ اسکے شاگرد بھی بہت ہیں۔

اسکی فنکاری کی ابتداء اسکے لڑکپن ہی میں ہوگئی شروع شروع میں یہ لکڑی کا کام کرتا رہا۔ پھر پتھر کے بنانا شروع کردیے۔ ماسکو کی نمائش میں جب اسکی کے نمونے دیکھے گئے تو اسکی بڑی تعریف ہوئی۔ شاگرد زیادہ تر دیہاتی لڑکے اور لڑکیاں تھیں لیکن بہت سے آدمی بڑے ہوشیار فنکار نکلے۔







خیام کا مقبرہ۔ اسکی سادگی قابل غور ہے۔

عمر خیام

فارسی کا مشہور شاعر،



عمر خیام کی شہرت زیادہ تر بہ حیثیت شاعر کے ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ خود اسکے زمانہ میں لوگ اسے ایک باکمال ماہر علم نجوم، ریاضی داں اور حکیم سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے جس سوانح نگار نے اسکا تذکرہ کیا ہے وہ نظامی عروضی سمرقندی ہے۔ مگر «چہار مقالہ» میں خیام کا ذکر محض ایک حکیم کے طور پر ہوا ہے۔

اصناف شاعری میں خیام نے صرف رباعی کی زمین کو اپنی طبع رواں کی جولانگاہ بنایا۔
ایک ... زیادہ تر اسکی رباعیات



ای رفته بچوگان قضا همچوں گو چپ میخور و راست میرو و هیچ مگو
کانکس که ترا فگنده اندر تگ و پو او داند و او داند و او داند و او

نیشاپوری

منجم اور ریاضی دان

یہ ترجمہ انگریزی کے مشہور شاعر فٹز جیرالڈ کا کیا ہوا ہے۔

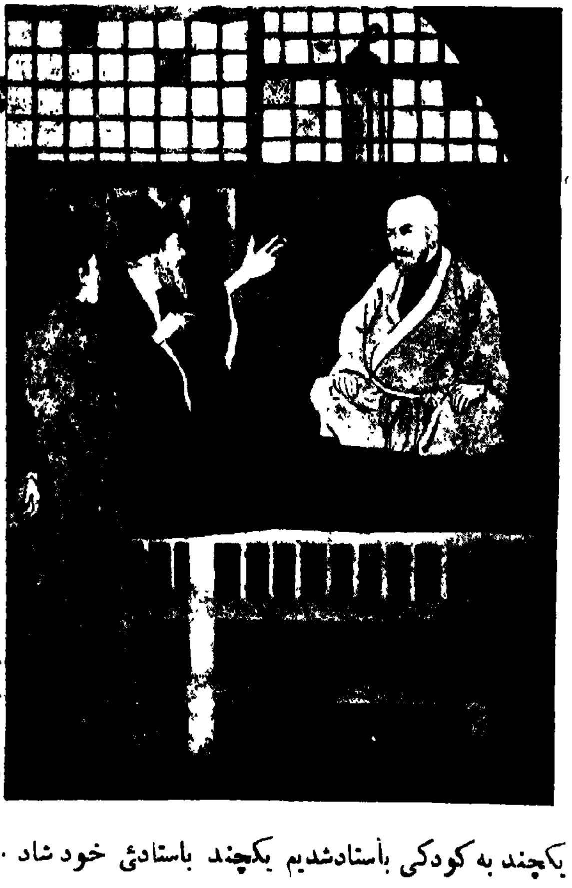
ہندسہ اور علم نجوم پر خیام نے متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب جیرو مقابلہ ہے۔ یہ کتاب فارسی اور فرانسیسی میں شائع ہو چکی ہے۔ ملک شاہ سلجوقی کی رصدگاہ بھی خیام ہی کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی تھی۔

خیام ایک فلسفی شاعر تھا۔ اسکا عقیدہ تھا کہ دنیا فانی ہے۔ اسلئے انسان کو چاہئے کہ نہ ماضی کو یاد کر کے مغموم ہو اور نہ مستقبل کی فکر کرے۔ بلکہ حد لمحات زندگی میں آئین انکو ہنسی خوشی

کتنی طرح اپنی رباعیات میں ادا کیا ہے۔

خیام کی رباعیات کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے مختصر مجموعہ میں ۷۶ رباعیاں ہیں اور سب سے ضخیم میں ۸۴۵ ۔

خیام کی موت کا واقعہ بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ کتاب الشفا کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب مسئلہ وحدت و کثرت پر پہونچا تو کتاب میں خلال رکھکر اسکو بند کردیا اور نماز پڑھی سجدہ میں گڑگڑا کر کہا "اے خدائے بزرگ و برتر! میں نے حتی المقدور تجھکو پہچاننے کی کوشش کی۔ میری اسی جہد کے صدقے میں مجھکو بخشدے"۔ سجدہ ہی میں تھا کہ اسکا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا



یکچند به کودکی باستاد شدیم یکچند باستادئ خود شاد ...





ے کو اول صاف کرکے دھوپ میں سکھاتے ھیں پھر اسکے دو
ھیں یہ کم عمر ستارساز تونبے کی تراش خراش کررھاھے ۔

یہ شخص خشک تونبے میں مختلف نشانات وغیرہ بنا رھا ھے ۔

ستار سازی

ستار ہندوستانی موسیقی کا ایک خاص آلہ ھے ستار نوازی کی طرح ستار سازی بھی بڑا مشکل اور محنت کا کام ھے۔ ستار ساز صرف بڑھئی کا کام نہیں کرتا بلکہ عام طور پر وہ خود بھی ستار بجانا جانتا ھے۔



بے میں ایک لمبی لکڑی لگاکر اس پر رنگ کرتے ھیں ۔





تاروں کو کس کر آواز دیکھی جا رہی ہے۔

برطانیہ کے نئے شہر

مشہور انگریزی مثل ہے کہ جوبات مانچسٹر کو آج سوجھتی ہے وہ لندن کو اگلے دن۔ جو لوگ شمالی انگلستان میں رہتے ہیں وہ اس مثل کی صداقت کے معترف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نئے وضع کے شہروں کے بنانے میں مانچسٹر نے واقعی بڑا کامیاب تجربہ کیاہے۔



نئی وضع کے وسیع مکانات صاف اور چوڑی سڑکیں اور پرانے گھنے درخت



اس شہر میں مکانات مختلف قسم کی ضروریات کو سامنے رکھکر بنائے گئے ہیں یہ فلیٹس بوڑھے آدمیوں کے واسطے ہیں۔

پچھلی لڑائی کے ختم ہونے پر مانچسٹر کارپوریشن نے ایک بڑا قطعۂ آراضی خرید کر وہاں ایک ایسا خوبصورت شہر بنایا ہے جسکی نقل آج برطانیہ کے ہر ترقی پسند حلقہ میں کی جائےگی اس نئے شہر کا نام ہے وائی دنشا



یہ مکان تین تین کمروں کے ہیں۔ باغ نے انہیں اور حسین بنادیا ہے۔



ممتاز شانتی

ادب العالیہ

محترمی، زاد کرمہٗ۔

آجکل کیلئے اپنے ایک عزیز ترین دوست کی ایک غزل حاضر کرتا ہوں۔ حافظ میں چند اشعار اسکے حاضر ہیں۔ تسکین صاحب اور ان جیسے اور بھی بہت سی بلند ترین شخصیتیں منظر عام پر آنا پسند نہیں کرتیں لیکن میں اسطرح کے ادبی شعر کو جو اپنا ہوا جا آپ ہی ہو سکتا ہے۔ چھپانا ادبی جرم سمجھتا ہوں۔

حضرت تسکین کس مرتبے کے انسان ہیں، اور کس مرتبہ کے شاعر یہ خود انکے کلام سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی ایک شخصیت رامپور میں ہے۔ پھر کبھی انشاء اللہ ان کا کلام پیش کیا جائیگا۔

جگر۔ مرادآبادی

احساسِ نامرادیٔ الفت نہ پوچھئے
کیا دل کے ٹوٹنے میں ہے لذت نہ پوچھئے

کچھ اور پوچھئے، یہ حقیقت نہ پوچھئے
کیوں آپ سے ہے مجھ کو محبت نہ پوچھئے

سجدوں سے طے مقامِ محبت نہ ہو سکا
کیا کیا ہوئی ہے سر کو ندامت نہ پوچھئے

ہے ابتدائے رازِ محبت بس اک نگاہ
ایسی نگاہ جس کی حقیقت نہ پوچھئے

کعبے میں بتکدے میں حرم گاہ ناز میں
دل کی کہاں کہاں ہے ضرورت نہ پوچھئے

کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں جز خیالِ یار
لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھئے

دونوں ہی بھول جانے کے قابل ہیں عشق میں
اب قصۂ مجاز و حقیقت نہ پوچھئے

تسکین قریشی

"گنگا کا کنارا"

اک صبحِ دلآویز کہ اتبک ہے مجھے یاد	بجھنے ہی کو تھا صبح کا لرزا ہوا تارا
شیشم کی پھنگوں پہ نظر پہلی کرن کی	واللّیل کی تفسیر تھا مسجد کا منارا
حاصل تھی بیاباں کو گلستاں کی جوانی	بھر پور جوانی پہ تھا گنگا کا کنارا
ممنونِ سحر تھی مری آہستہ خرامی	دل مائلِ پرواز تھا تفریح کا مارا
اتنے میں نظر آئی لئے ہاتھ میں گاگر	کھیتوں سے گذرتی ہوئی اک انجمن آرا
تصدیقِ جوانی کی ہر اک گام پہ مہریں	ہر سانس میں خاموش اداؤں کا اشارا
وہ سادگیٔ حسن کہ قربان ہوں تارے	آنکھوں کو نہ تنقید کی فرصت نہ یارا
شلوار کے گوشوں میں نہ بوٹے نہ شگوفے	ململ کے دوپٹے میں نہ سلمہ نہ ستارا
آنکھوں کی سیاہی میں وہ ڈورے کی گلابی	پچھم میں سرِ شام شفق تاب نظارا
پلکوں کے تلے پہلو بدلتی ہوئی شوخی	صندل کی گھنی چھاؤں میں لرزاں ہو پلپلا
پاکیزہ جوانی سے دمکتا ہوا چہرہ	جیسے کسی محراب میں قرآن کا پارہ
دھڑکے ہوئے سینے سے ابلتی ہوئی آہیں	ڈھلتا ہوا جذبات کے سانچوں میں شرارا
احساس کی نبضوں میں ترانوں کی حرارت	نغمات کی سانسوں پہ امنگوں کا گذارا
بیتاب جوانی کو جو ٹھوکر کہیں آئی	معصوم نگاہوں نے کیا جھک کے اشارا
شانوں پہ ڈھلک آئیں جو بکھری ہوئی زلفیں	بڑھ کر انہیں ساون کی گھٹاؤں نے سنوارا

دیکھے تو یقیں کر نہ سکے روحِ سلیماں
پیروں پہ مچلنے لگے تاجِ سرِ دارا

شاعر سی کہیں بھول کے آنکھیں جو ہوئیں چار	پھر مڑ کے نہ دیکھا گیا افسوس دوبارہ
اک آن میں نظروں سے مری ہو گئی اوجھل	جسطرح ہرن بھڑک کے نکل جائے طرارا
دی ضبط نے ارمان بھرے دل کی دہائی	ارمان بھرے دل نے تمنا کو پکارا
امید کی آنکھوں سے ٹپکنے یاس کی آنکھیں
ہر سانس نئی سینہ میں چلتا ہوا آرہ

کامل رشید

آگ کا سمندر!

دونوں کھڑکیوں کے درمیان ایک سڑک تھی بنگٹ ویران اور سنسان جو دن بھر ذرا ذرا سے نوتلے لڑکوں کی گالیوں سے گونجتی رہتی، اور رات کو گشت کرنے والے سپاہیوں کی بھیانک آوازوں سے، بڑکے توتلی زبان میں ایک دوسرے کو سڑی سڑی گالیاں دیتے اور سپاہی جاگتے رہو کے نعرے لگاتے۔ دونوں پرانی کھڑکیاں آمنے سامنے واقع تھیں۔ ایک کھڑکی میں لوہے کا پنجرہ لٹکا رہتا اور طوطا لوہے کی تیلیوں کو اپنی سیندوری اور ٹیڑھی چونچ سے کاٹنے میں مصروف رہتا جب وہ انہیں کاٹتے کاٹتے تھک جاتا تو زور سے چیختا جاگتے رہو! کبھی کبھی لڑکوں کی گالیوں کو دہرانے لگتا، دوسری کھڑکی میں ایک آرام کرسی پڑی رہتی جس پر کبھی کبھی ایک خوبصورت نوجوان لیٹا ہوا نظر آتا جس کے منہ میں سگرٹ دبا رہتا اور سگرٹ کا دھواں اس کے خیالات کی طرح کمرے کی تاریک فضا میں بل کھاتے کھاتے کہیں غائب ہو جاتا۔

کئی دن تک کھڑکیوں پر خاموشی رہی اور ان کے پس منظر میں کوئی حسن پیدا نہ ہوا، ایک طرف ہی طوطے کی سنی سنائی چیخیں گونجتی رہیں، دوسری طرف سگرٹ کا دھواں بل کھاتا رہا، سڑک پر دن کو لڑکے اور رات کو سپاہی چلاتے رہے۔

دن یونہی گذرتے گئے اور راتیں اسی طرح بیتی گئیں۔ برسات آتے ہی سڑک اور سنسان ہوگئی۔ بادل آسمان پر چھا گیا تیز ہوائیں چلنے لگیں، بجلی چمکنے لگی اب نہ دن کے وقت لڑکے گالیاں دیتے نہ رات کو سپاہی جاگتے رہو کی آوازیں لگاتے، اکیلا طوطا پنجرے کی تیلیوں کو کاٹتے کاٹتے کبھی کبھی چیخ اٹھتا یا نوجوان کے سگرٹ کا دھواں اپنے پیچ وخم سے اس کی ذہنی کشمکش کا اظہار کرتا دفعتہً طوطا چیخا جاگتے رہو ——— جاگتے رہو اور چیختا ہی چلا گیا۔ چند لمحے کے بعد ہی آواز آئی اندھے ہو ——— سوجھتا نہیں تمہیں؟ اور پھر ایک چھوٹی سی جلی ہوئی لکڑی جس کا ایک سرا اب بھی سلگ رہا تھا نوجوان کی آرام کرسی کے قریب آگری اور جلد ہی اسکا دھواں، سگرٹ کے دھوئیں میں مل گیا۔

کیا ہے؟۔ نوجوان نے غیر شعوری طور پر کھڑکی پر نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا "اپنی بلی کو بلاؤ، دیکھو اچھا نہ ہوگا۔ میرے طوطے کو نوچ ڈالا۔ تمہاری بدذات بلی نے!" ایک حسین دوشیزہ جو رنگین ساری میں لپٹی ہوئی تھی طوطے کا پنجرہ ہاتھ میں لئے کھڑکی میں کھڑی تھی، اور بجلی بار بار چمک کر اندھیری فضا میں اس کے حسن کی روشنی پھیلا رہی تھی۔

"میری بلی نے نوچ ڈالا آپ کے طوطے کو؟" نوجوان کہنے لگا "میں نے کبھی کوئی بلی نہیں پالی۔ مجھے بلیوں سے بڑی نفرت ہے کیا واقعی آپ کا طوطا زخمی ہو گیا؟"

"جی ہاں مگر آپ کو کیا آپ تو بلیاں پالئے اور محلہ کے سارے طوطوں کو زخمی کرتے رہیئے!"

"میں قسم کھاتا ہوں میرے یہاں کبھی بلی نہیں پالی گئی۔ معاف فرمایئے کسی اور کی بلی ہوگی!"

"میں نہیں کہہ سکتی کس کی تھی!"

وہ بڑی حسین ہے۔ نوجوان سوچنے لگا۔ اس کی گوری باہیں جو کئی بار کھڑکی سے باہر آکر چوڑیوں کی دلچسپ جھنکار سے ایک راگ سا بکھیر چکی تھیں، بڑی خوبصورت ہیں، بھری ہوئی سڈول باہوں کو خوبصورت ہی کہا جائیگا اور اس کی لمبی لمبی پلکیں جو نشیلی آنکھوں پر ڈھکی ہوئی تھیں بہت ہی دلفریب تھیں اور رخسار انگارے کی طرح چمک رہے تھے۔

"کیا واقعی آپ کے یہاں کوئی بلی نہیں"؟ صبح کو دوشیزہ نے نوجوان سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں، میں بلی پالنے کا سخت مخالف ہوں۔ یہ نہایت بے وفا جانور ہے اس میں محبت کی کوئی رگ بھی قدرت نے نہیں بنائی، اول سے آخر تک سنگدلی، بے رحمی اور حرص کی مٹی سے بنکر تیار ہوئی ہے"۔

"محبت کی کوئی رگ نہیں بلی میں؟" اس نے حیرت کرپوچھا اور مردوں میں؟

"مردوں میں؟" ——— وہ بولا مرد تو محبت ہی کے خمیر سے بنا ہے آگ اور پانی کو گوندھ کر قدرت نے مرد کا مجسمہ بنا دیا ہے"

"آگ اور پانی کی آمیزش سے جو چیز تیار ہوگی اسے محبت کیونکر چھو سکے گی اور عورت کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں"؟

"عورت کا دل و دماغ اس کے جذبات اور احساسات اسکی رگیں، اور اس کے اعصاب سب تنہا محبت ہی سے تیار ہوئے ہیں وہ بنائی گئی ہے پھولوں کے حسن اور ان کی نکہت سے!"

دوشیزہ کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی آنکھوں میں بجلیاں سی کوندنے لگیں گردن کی رگیں جلدی جلدی تڑپنے لگیں جیسے ان میں خون کی جگہ پارہ بھر دیا گیا ہو۔

"عورت کے متعلق آپ کی رائے بالکل صحیح ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

——— طوطا چیخا جاگتے رہو! نوجوان کی نگاہیں لکڑی کے ٹکڑے پر جا پڑیں وہ جل کر راکھ ہو چکا تھا اور جس جگہ جلتے جلتے اس نے خاکستر کی شکل اختیار کی تھی وہاں ایک سیاہ داغ پڑ چکا تھا نوجوان اسے دیکھتا رہا وہ خوب جانتا تھا اس کی تخلیق آگ اور پانی سے ہوئی ہے اور عورت؟ ——— وہ محبت ہی محبت ہے لیکن کیا محبت کی یہ چنگاری مجھے نہ چھو سکے گی۔ یہ سوچتے ہی سوچتے وہ اپنے خیالات میں اتنا محو ہوگیا کہ اپنے ماحول کا اسے کوئی احساس ہی نہ رہا۔

کوثر چاند پوری

لیکن طوطے کی چیخیں جلد ہی اسے محویت کے سمندر سے نکال لائیں وہ پھر اپنی ہنگامہ خیز دنیا میں لوٹ آیا اور سگرٹ سلگا کر دھواں زمین کا سیاہ داغ اور جلی ہوئی لکڑی کی راکھ پھر اس کی توجہ کا مرکز بن گئی جس وقت دوشیزہ کھڑکی میں آتی، طوطا پنجرے کی تیلیوں کو جلدی جلدی چونچ میں بھر کر غل مچانے لگتا جاگتے رہو!

نوجوان کتاب میز پر ڈال دیتا اور حسن و رعنائی کے ہجوم میں کھو جاتا وہ طوطے سے باتیں کرتے کرتے کبھی نوجوان کی طرف دیکھ لیتی، ایسا محسوس ہوتا کہ بجلیاں نگاہوں کے تاروں سے دل میں اتر رہی ہیں اور پھر رگوں میں پھیلتی جا رہی ہیں۔

رات کو جب ہر طرف سناٹا چھا گیا لڑکوں کو گالیاں اور میاں مٹھو کی چیخیں تاریکی اور خاموشی کے سمندر میں غائب ہو گئیں، کھڑکی کھل گئی اور دوشیزہ نیلی ساری پہنکر چراغ کی ہلکی روشنی میں وہاں آ بیٹھی، نوجوان آنکھیں بند کئے کرسی پر پڑا تھا اس کے تصور میں لڑکوں کی معصوم اور تتلاتی ہوئی زبان سے نکلی ہوئی گالیاں اور سپاہیوں کی بھیانک آوازیں گونج رہی تھیں، دوشیزہ کے الفاظ "تمہے ہو، سوجھتا نہیں کہیں؟" ——— اس کے دماغ سے ٹکرا رہے تھے وہ کلوروفارم سنگھائے ہوئے زخمی کی طرح بیہوش تھا لیکن زخم اس کے احساس میں نمایاں تھے کرسی کے سامنے چھوٹی سی میز تھی اس پر لیمپ جگمگا رہا تھا۔ دوشیزہ نے پنجرہ قریب رکھکر کہا میاں مٹھو ——— وہ لڑکیوں کی گالیاں دہرانے لگا۔ دوشیزہ نے زور سے پنجرہ پر ہاتھ مارا فضا میں ایک حسین راگ لہریں لینے لگا۔ طوطا چونک کر زور زور سے چیخنے لگا۔

جاگتے رہو! یہی وہ سبق اسے یاد تھے لڑکوں کی گالیاں یا سپاہیوں کی چیخیں۔ نوجوان کے دماغ سے بیہوشی دور ہونے لگی اس نے میز کی طرف دیکھا۔ لیمپ کی لو تھرتھرا رہی تھی اور شفاف چمنی پر دھوئیں کا داغ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ زمین کے داغ کی طرح سیاہ اور بڑا داغ۔ فوراً ہی اس کی نگاہ کھڑکی پر گئی وہاں بھی دیا ٹمٹما رہا تھا اور اس کی لو بھی کانپ رہی تھی مگر کوئی داغ نہ تھا ——— داغ تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی چیز جل کر خاکستر بنتی ہے لکڑی ہو یا لیمپ اور جس جگہ سے آگ سینکی جاتی ہے وہاں کوئی سیاہ دھبہ نہیں ہو سکتا۔ نوجوان نے جلدی سے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا۔ چراغ کے پاس ہی دوشیزہ نیلی ساری میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی ——— چاند آسمان کی نیلی چادر سے جھانک رہا تھا! نوجوان انگڑائی لے کر کھڑا ہو گیا، اور پھر کرسی پر بیٹھکر کھڑکی کو دیکھنے لگا۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے چراغ اور لیمپ کی روشنی تنگ اور سنسان سڑک کی تاریکیوں میں بغلگیر ہو رہی تھی اور دونوں کی شعاعیں اس طرح گھلتی ملتی جا رہی تھیں جیسے گنگا اور جمنا کا پانی ایک ہو جاتا ہے ——— روشنی ایک ہو کر دلوں کو چمکا رہی تھی، دوشیزہ کی لمبی لمبی پلکیں جلدی جلدی متحرک ہو رہی تھیں نوجوان کا دل دھڑک رہا تھا، میاں مٹھو بڑی مشکل سے نیند بھرے لہجہ میں بولے جاگتے رہو!

نوجوان نے کہا آپ کا طوطا دن بھر لڑکوں اور سپاہیوں کی نقل کیا کرتا ہے آپ اسے اچھی اچھی کہانیاں کیوں نہیں سکھا دیتیں؟

وہ بولی: لڑکوں اور سپاہیوں کی طرح کوئی اسے اچھا سبق پڑھانے والا تو ہو!

"یہ فرض میں انجام دے سکوں گا!"

"اچھا تو کوئی چھوٹی سی کہانی سنائیے "چھوٹی سی یعنی رات سے بھی زیادہ چھوٹی"۔ ——— کاش یہ رات چھوٹی نہ ہوتی اور پورے سال کی اندھیری اور خاموش راتوں کی کڑیاں اس سے مل جاتیں "اچھا میں کہانی کہتا ہوں"؟ نوجوان نے کہا۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے نوجوان کہانی سنا رہا تھا، محبت بھری، دلدوز کہانی۔ جب وہ کہانی کے اس حصہ پر پہنچا جہاں محبت کرنے والے دو دل مایوس ہو کر اپنی اپنی راہیں متعین کرنے لگے تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ وہ رونے لگی۔ آنسوؤں کے جھلملاتے ہوئے تارے اس کی نیلی، آسمان کی سی نیلی ساری میں جذب ہوتے گئے۔ ——— روزانہ رات کو جب میاں مٹھو اپنے زنگاری

غزل

ہر طرح سے بے خطا اپنی نظر پاتا ہوں میں — خود حجاب دوست ہی کو پردہ در پاتا ہوں میں
کامیابِ جستجو اپنی نظر پاتا ہوں میں — آئینہ کے سامنے آشفتہ سر پاتا ہوں میں
پھر محبت ہو گئی پھر دردِ سر پاتا ہوں میں — پھر خدا رکھے وہی شام و سحر پاتا ہوں میں
الاماں حسرتِ دامِ تعین الاماں — بال و پر والوں کو بھی بے بال و پر پاتا ہوں میں
جا رہی ہے جا رہو شاید کسی رہرو کی یاس — پھیکا پھیکا سا چراغِ رہگزر پاتا ہوں میں
غیر کا در جان کر میں نے تو رکھدی تھی جبیں — اب جو سر اٹھا تو ان کا سنگِ در پاتا ہوں میں
دیکھکر مجھکو چھپا لیتے ہیں وہ زلفوں سے رخ — جب کبھی پاتا ہوں تو شام و سحر پاتا ہوں میں
اللہ اللہ کس قدر جلوے فراواں ہو گئے — مدتوں سے تنگ دامانِ نظر پاتا ہوں میں

دیکھ کر بہزاد اسے آتا ہے اپنا حشر یاد
جس کسی کو صاحبِ ذوقِ نظر پاتا ہوں میں

بہزاد لکھنوی

پَروں کو پھلا کر سیندوری چونچ ان میں چھپا کر ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاتے اور سپاہی جاگتے رہو کی دو چار آوازیں لگا کر غائب ہو جاتے۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ جاتے۔ کبھی رات کی اندھیری دو روشنیوں کے درمیان حائل ہو جاتی، کبھی چاندنی ——— محبت آفریں اور رومان انگیز چاندنی دلوں کی تھرتھراہٹ۔ اِدھر سے اُدھر منتقل کرتی رہتی۔ نوجوان کہانی کہتا رہتا وہ غور سے سنتی رہتی۔ بیچ میں کبھی کبھی میاں مٹھو پَروں میں دبی ہوئی چونچ کھول کر بول اُٹھتے جاگتے رہو ——— اور پھر دوسری ٹانگ کر کھڑے ہو کر سو جاتے۔ محبت کی ہر داستان آخر میں مایوسی کے رنگ میں رنگ جاتی اور دوشیزہ کو رونا ہی پڑتا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے آنسو اس کے گلاب کے سے شاداب اور رنگین گالوں پر بہتے بہتے ٹھوڑی تک آ جاتے جو بالعموم اس کے گھٹنے پر رکھی رہتی تھی، ——— پلکیں بھیگ کر بھاری ہو جاتیں اور آنکھیں دریا میں پڑے ہوئے کنول کے پھول کی طرح آنسوؤں کی لہروں میں ہچکولے سے کھانے لگتیں۔

نوجوان کہانی کا سلسلہ توڑ کر پوچھتا: تم رونے کیوں لگتی ہو؟ روز ہی تمہاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

"تم کہانی ہی ایسی سناتے ہو کہ مجھے رونا آ جاتا ہے۔ آج تک تم نے کبھی یہ نہ کہا کہ دو محبت کرنے والے دل مل گئے۔ انہوں نے ہجر و فراق کے کٹھن راستوں سے گذر کر وصل و مسرت کی منزل تک رسائی حاصل کر لی۔ کیا محبت اور مایوسی ایک ہی چیز ہے؟"

"نہیں یہ بات نہیں" نوجوان بولا۔ "کبھی کبھی محبت کی ٹوٹی پھوٹی کشتی مشکلات کے تھپیڑے کھاتے کھاتے مصائب کے طوفانوں سے گذر کر ساحلِ مراد پر بھی پہونچ جاتی ہے۔"

"پھر تم ایسی ہی کہانی کیوں نہیں سناتے؟ شاید تمہیں کوئی ایسی کہانی یاد ہی نہیں!"

"ہاں تم سچ کہتی ہو میں کھڑکی میں آتے ہی ایسی سب کہانیاں بھول جاتا ہوں۔"

"کیوں؟ ——— کھڑکی میں آ کر تم ایسی کہانیاں کیوں بھول جاتے ہو، سچ بتاؤ۔" وہ اضطراب کے ساتھ بولی۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں نا!" نوجوان سر جھکا کر بولا۔ وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی وقت سپاہی دیوار کے پیچھے آ کر چیخا، جاگتے رہو۔ میاں مٹھو نے فوراً اسکا جواب دیا۔ اس نے شوق میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے نوجوان کو دیکھا ایسا معلوم ہوا وہ بھی اس سے جاگتے رہنے کا مطالبہ کر رہی ہے اور جس کی روح پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی محبت اور بیداری تو ایک ہی چیز ہے؟

"کیا محبت اور مایوسی ایک ہی چیز ہے؟" اس نے سپاہی کی بھیانک آواز کی گونج میں کہا۔ جواب تک رات کی کالی چادر کو ہلاتی اور جھنجوڑتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی "نہیں یہ بات نہیں" اس نے لیمپ کی تھرتھراتی ہوئی لَو پر نگاہیں جماتے ہوئے جواب دیا "محبت نہ مستقل مایوسی ہے نہ مسلسل کامیابی!"

"پھر وہ کچھ بھی نہیں غیر مستقل اور غیر مسلسل چیز تو ادھوری ہوتی ہے۔"

اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور کھڑکی سے جھک کر اندھیری سڑک پر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی، راستہ تاریکی میں چھپا ہوا تھا، سڑک بالکل نظر نہ آتی تھی ——— کیا محبت کا راستہ نظر نہیں آیا کرتا؟ ——— ہوا کا تیز جھونکا کھڑکی میں داخل ہوا اور چراغ گل ہو گیا۔ اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ نوجوان کے پاس کچھ روشنی تھی مگر یہ تو محبت کا پہلا قدم تھا۔ جو کبھی تاریک ہوتا ہی نہیں۔

تھوڑے ہی دنوں میں کھڑکی بند ہو گئی۔ طوطے کا پنجرہ غائب ہو گیا۔ چراغ کی روشنی ایک مستقل تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔ نوجوان اپنی کھڑکی میں بیٹھا رہتا اور سوچتا رہتا کیا واقعی محبت اور مایوسی ایک ہی چیز ہے؟ اب اس کے دل و دماغ پر بھی ناامیدی کی گھٹائیں چھاتی جا رہی تھیں۔ امید کی روشنی گل ہو چکی تھی۔

ایک دن کھڑکی کھل گئی۔ وہ بہت عمدہ لباس پہنے ہوئے تھی چہرے پر ہلکا سا غازہ لگا ہوا تھا۔ ہونٹ گہرے سُرخ تھے، ماتھے پر چھوٹی سی بندی جگمگا رہی تھی جیسے آسمان پر صبح کا ستارہ چمکا کرتا ہے ——— اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ شاید ابھی ابھی وہ محبت کی کوئی ناکام کہانی سنکر آئی تھی۔ نوجوان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ دیر تک دونوں آمنے سامنے کھڑے محبت اور مایوسی کے فلسفہ پر غور کرتے رہے۔ اس کے اُبھرے ہوئے رُخسار کبھی گہرے سُرخ ہو جاتے کبھی سرخی ہلکی ہوتے ہوتے زردی میں بدل جاتی۔ بہت دیر کے بعد اس نے کہا: "آپ نے اب تک جتنی کہانیاں سنائیں سب سچی تھیں محبت اور مایوسی میں کوئی فرق نہیں!"

"شاید نہ ہو" نوجوان بولا "مگر تم رو کیوں رہی ہو؟"

گذشتہ مہینہ میں، ایک ادھیڑ عمر کے بیرسٹر سے جو حسین چہروں کے مقابلہ میں اپیلوں کے مسودوں کو زیادہ غور اور توجہ سے دیکھنے کا عادی ہے میری شادی ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ ازدواج کی بنیاد محبت پر نہ ہو تو اسے ایک طویل اور نہ ختم ہونے والی مایوسی ہی کہا جائیگا ——— یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں کہ ہر مصیبت کا آغاز آنسوؤں ہی سے ہوا کرتا ہے مگر تم بھی تو رو رہے ہو؟"

گذشتہ مہینے میں میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے میری مصیبتوں کا آغاز بھی آنسوؤں پر ہوا ہے اور غالباً اس کا انجام بھی آنسوؤں پر ہی ہوگا۔ تم نے بالکل سچ کہا تھا محبت اور مایوسی ایک ہی چیز ہے۔ پہلے میرے اور تمہارے درمیان صرف ایک اندھیری اور خاموش سڑک ہی حائل تھی اور اب آگ کا ایک سمندر ہم دونوں کے بیچ میں شعلہ زن ہے۔ نوجوان کہتے کہتے رُک گیا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپکنے ہی لگیں۔ اس نے کھڑکی بند کر لی۔ نوجوان آرام کرسی پر گر پڑا اور غور سے اس مقام کو دیکھنے لگا

(باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

مرزا غالب کی شاعری میں ویدانت کی جھلک

پرمانند شرما

اردو شاعری تصوف کی دولت سے مالا مال ہے۔ اور جو پیشین گوئی خواجہ میر درد نے کی تھی وہ ہو بہو درست نکلی ؎

پھولے گی اس زباں میں گلزارِ معرفت ۔۔۔ یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

بقول مولانا عبدالسلام ندوی "شعرائے دہلی میں ذوق۔ نصیر اور مومن اس بادۂ حقیقت سے ناآشنا ہیں"۔ مگر مرزا غالب کا کلام بلاغت نظام محاسن شاعری کے ساتھ ساتھ صوفیانہ خیالات سے لبریز اور بوئے ویدانت سے عطر بیز ہے۔ اور تصوف اور ویدانت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرزا براہ راست ویدانت فلاسفی کے زیرِ اثر رہے۔ مگر ان کا رجحان طبع ہی صوفیانہ تھا۔ ان کا فطری میلان ہی "انا الحق" اور "سوہم" کی صدائے عارفانہ کا پیرو کار تھا۔ مرزا خود فخریہ فرماتے ہیں کہ مسائل تصوف کے بیان کرنے میں وہ یکتا ہیں ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اور یہ مقطع اس غزل کا ہے جس کا بیشتر حصہ صدائے مجذوب سے کم نہیں۔ اب ہمیں انصاف کی عینک سے یہ دیکھنا ہے کہ مرزا غالب کہاں تک مدارج ویدانت اور مسائل تصوف کے سلجھانے میں کامیاب ہوئے۔

انسان جب عالم ارواح سے عالم اجسام میں آتا ہے تو زندگی اس کے لئے ایک معمہ ہوتی ہے۔ نیرنگی قدرت جلوہ ہائے نو بہ نو۔ حیات و ممات کی تگ و دو۔ ہنگامہ ہستی سب اسے حیران و ششدر کر دیتے ہیں۔ اور وہ پکار اٹھتا ہے اس جنگلی حبشی کی مانند جو کہ شہر میں نووارد ہو۔ اُس آہوئے دشت کی طرح جسے تہذیب لاکر چڑیا گھر کی چار دیواری میں جکڑ دے۔ اس صغیر سن بچے کی مانند جو دوشِ آدم پر بیٹھا۔ آنکھوں میں حیرت کی دنیا لئے ایک میلے کا نظارہ کر رہا ہو۔ بے ساختہ اس کے منہ سے یہ سوال نکلتا ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔۔۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۔۔۔ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ۔۔۔ ابر کیا چیز ہے۔ ہوا کیا ہے

یہ بڑے نیک فال ہیں۔ یہی ویدانتی کی زندگی کا آغاز ہے۔ اب اسے ان سوالوں کا حل تلاش کرنا ہے۔ غور و خوض کی ندی کو عبور کر کے وہ اس نتیجہ پہ پہنچتا ہے جسے مولانا ثاقب بدایونی یوں بیان کرتے ہیں:

دنیا فریب ہستی ہستی فریب دنیا
میں اک فریب خوردہ دونوں کے درمیاں ہوں

مرزا بھی فرماتے ہیں:

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ۔۔۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

جب انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی چشم حقیقت وا ہو جاتی ہے۔ اور اسے اپنی زبوں حالی پر افسوس ہوتا ہے۔ ہر پیکر تصویر اسے "کاغذی پیرہن" کا فریادی بن کر اپنی رسوائی کا سبب پوچھتا ہے،

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

ناچار پھر غور و خوض کا دامن لیتا ہے۔ اور غیب سے آواز آتی ہے کہ او دوئی کے پیروکار! ابھی تیرا فقر قلندرانہ نہیں۔ ابھی تیرے تصور میں این و آں کا امتیاز باقی ہے۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

بُت شکنی تو کیا ابھی یہ بتِ عظیم یعنی ہستی انسان راہ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگ گراں ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
"ہم" ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

اس لئے "ہم" یا "اہنکار" جس کی بنا پہ ہستی کا وجود ہے کو سپرد فنا کرنا عِلِّ حقیقی کی پہلی شرط ہے۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اب عرفانِ الٰہی کی تجلیات سے نہایت لطیف اور نازک نقطے اس جویائے حق پہ نازل ہونے شروع ہوتے ہیں۔ گویا کہ "انا الحق" یا "سوہم" کی منزل کی طرف سرگرم سفر ہوتا ہے۔ اور سچے ویدانتی کو یقین ہو جاتا ہے کہ

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز ۔۔۔ تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

دوسرے مصرعہ کے مفہوم کو حضرت میر جو خود مرزا نوشہ کی طرح صوفی منش تھے اور لغوں خود

خوش رہا جب تک رہا جیتا — میر معلوم ہے قلندر تھا

اس طرح بیان کر گئے ہیں:

پایا نہ یوں کہ کر سکیے اس کی طرف اشارہ
یوں تو جہان میں اسکو ہم نے کہیں نہ پایا

انسان اپنی کوتاہ بینی کے باعث تجلیاتِ حق کا صحیح جائزہ نہیں لے سکتا اس پر مرزا فرماتے ہیں:

کھلتے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیں حقیقت شناسی کی دعوت دے رہا ہے لیکن اپنی نا اہلیت کے باعث ہم اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

وحدت وجود کثرت موہوم کی تمثیل ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے یوں پیش کیا ہے:

ہر جزو کو کل کے ساتھ بہ معنی ہے اتصال
دریا سے دُور جدا ہے پہ ہے غرق آب میں

مرزا رفیع الدین سودا نے بھی فرمایا ہے

میں ہوں خود دریا ولے کوتاہ نظر کے سامنے
ظرف و موج و قطرہ میرے رخ کا اک پردہ ہوا

حضرتِ شیفتہ جو مرزا غالب کے نہایت عزیز ہمعصروں میں سے تھے کہتے ہیں:

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

یہ وہ دائمی زندگی کی درمیانی اسٹیج ہے۔ اب اسے اپنی منزل نظر آنے لگی ہے۔ اسے ایک اور ایک ہی خدا دکھائی دیتا ہے۔ وہ خدا جو یگانہ اور یکتا ہے۔ اور جس میں دوئی کی بو نہیں

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی آتی تو کہیں دوچار ہوتا

دنیا کی ہر ایک چیز میں اسے جلوۂ حق نظر آتا ہے۔ "ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے"۔ سالک کامل کو تمام موجوداتِ عالم میں پرتوِ حسن دکھائی دیتا ہے۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اب انسان خدا کے سوا اور کسی کی ذات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسے تمنا ہے تو وصلِ خدا کی۔ دیگر کسی چیز سے اسے غرض نہیں کسی کا ڈر نہیں۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں آئے

اب اس نے دہانِ زخم پیدا کر لیا ہے۔ جسکی تلقین مرزا نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں کی تھی:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

اب اس کا دل تیغِ عشق سے مجروح ہو چکا ہے۔ جس آفتابِ حقیقی کو مخاطب کر کے مرزا غالب بے ساختہ پکار اٹھے تھے

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

اس کی شعاعِ منور سے ظلمت کدۂ عشق فروزاں ہو گیا۔ اب وہ جو پائے حق جو ہستی کے بحرِ ناپیدا کنار میں ساحل کا متلاشی تھا چین کا سانس لیتا ہے۔ اب وہ صحیح معنوں میں یزدانی بن چلا ہے۔ این و آں کا تصور۔ ما و تو کے شکوے اب اسے زیب نہیں دیتے۔ وہ دنیا کو "بازیچۂ اطفال" خیال کرتا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

اب حور و جنت کی خواہش دل سے عنقا ہے عبادت الٰہی کسی ثواب کی خاطر نہیں بلکہ خالصاً لوجہ کرنی چاہیئے۔ مرزا فرماتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لا کر بہشت کو

اپنے محبوب کو یاد ہے کہ ہر وقت دل کو دامِ کشاکش میں رکھتی ہے۔ اور عاشق بہشت میں بھی اپنے محبوب کے پرتو سے الگ ہونا گوارا نہیں کر سکتا۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

(بقول مولانا تمامی یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے)

ویدانتی کی منزلِ مقصود نہایت قریب آ پہنچی۔ حالتِ بے خودی میں اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ مرزا غالب کتنے عام فہم اور سلیس پیرایہ میں فرماتے ہیں:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۔۔۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

بے خودی وصلِ حقیقی کی شرطِ اعلیٰ ہے

دردِ لبستانِ محبت ابجد از خود رفتگی است
معنیِ بسم اللہ آں فہمد کسے کو بسمل است (درد)

لذت درد میں احساسِ درد کافور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

فکرِ درماں کافور۔ ذکرِ درد دُور۔ خود میر صاحب فرماتے ہیں

اس مرض میں ہے عبث فکر نہیں درماں کا

مشہور ویدانتی سوامی رام تیرتھ نے لکھا ہے

جاں ندارد قیمتے لیلیٰ را از جاں وا مگو
گرچہ جاں در باختی در راہِ جاناں دم مزن
گر ترا دردے ست از وے ہیچ از درماں مگو
دردِ او را بہ ز درماں داں ز درماں دم مزن

جب انسان اس مرحلے تک پہنچ جاتا ہے تو تفرقاتِ دیر و حرم۔ تکلفاتِ ہستی و عدم۔ اور تنازعاتِ کعبہ و کلیسا اس کے لئے کچھ وقعت نہیں رکھتے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

"ملتوں کا مٹاد بنا" ان کا جزو ایمان بن جاتا ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اب انسان کی نگاہ و نکتہ رس وا ہوتی ہے۔ اور وہ جزو میں کل کا تماشا دیکھتا ہے۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

اب زندگی کی وہ اسٹیج آگئی ہے جسے مرزا نے خود معراجِ زیست قبول کیا ہے۔ قطرہ کا دریا سے ہم آہنگ ہونا۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام وہ اچھا ہے جس کا کہ مآل اچھا ہے

ویدانتی کی منزلِ مقصود آن پہنچی۔ "سوہم" "اناالحق"۔ "سوہم"۔ "اناالحق" کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اب وہی جویائے حق جو نیرنگیٔ حیات کی رعنائیوں میں الجھ کر راہِ راست سے غافل ہوا چاہتا تھا۔ جس کا مقصدِ حیات ایک تاریک مستقبل تھا۔ اب عارفِ کامل۔ صوفی۔ ویدانتی بن گیا۔ اور مرزا غالب ارشاد فرماتے ہیں۔

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیئے

لیکن غالب کا تصوف یا ویدانت منصور کی "تنگ ظرفی" کا بھی قائل نہیں:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

یہ شعر غالب کے ان معترضوں کو چپ کرا دینے کے لئے کافی ہے جو کلامِ غالب میں ویدانت کی جھلک دیکھنا ایک سعیٔ بے سود خیال کرتے ہیں۔ اس ایک شعر سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا کے دماغ میں تصوف یا ویدانت کا معراج کس قدر بلند اور صحیح تھا۔ فرعون، نمرود اور منصور نے "اناالحق" کا نعرہ تو لگایا۔ لیکن انہوں نے اپنے تئیں محدود بنا لیا۔ اپنے آپ کو "وحدہٗ لاشریک" نہ جانا۔ حقیقی منزلت کو نہ پہچانا۔ اپنا شریک ایک دوسرا خدا فرض کر کے اس کی نقل اتارنا چاہی۔ اور حقیقی کبریائی کو چھوڑ کر نمائشی تکبر اختیار کیا۔

نمرود شد مردود چوں ؟ بودش نگہ محدود چوں

یہ الفاظ میرے نہیں۔ بلکہ دنیا کے معروف ترین ویدانتی سوامی رام تیرتھ کے ہیں۔ اور مرزا غالب نے کتنے سال پہلے منصور کی "تنک ظرفی" سے عارفانِ کامل کو متنبہ کر دیا تھا۔ یہی ہے مرزا کا کمال!

آگ کا سمندر ——— بقیہ صفحہ ۳۹

جہاں لکڑی کا ٹکڑا جل کر خاکستر بن گیا تھا اور ایک سیاہ نشان اب تک وہاں موجود تھا۔ اتنے میں لیمپ کی لو تھرتھرائی۔ نوجوان نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ شفاف چمنی پر دھوئیں کا ایک بے ترتیب دھبہ بن چکا تھا۔ اس نے شدتِ غم سے مجبور ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت سپاہی چلّایا جاگتے رہو!۔۔۔

لیکن طوطا اسکا جواب دینے کے لئے کھڑکی میں موجود نہ تھا۔۔۔۔"

ایرانی ریل کی مختصر تاریخ

جمشید مفخم

ایران کی بڑی ریلوے لائن Trans-Iranian Railway شمال میں بندر شاہ (جو بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی ساحل پر واقع ہے) اور ماژندران کے سرسبز علاقہ میں سے ہوتی ہوئی کوہستانِ ابرز کے تنگ درہ تالار تک پہونچتی اور متعدد سرنگوں میں سے نکل کر اور کئی چھوٹے چھوٹے پہاڑی حصوں سے گذر فیروز کوہ کو طے کرتی ریگستانِ نمک زار میں جا پہونچتی ہے یہاں سے میدانِ ورامین کو طے کرتی ہوئی طہران میں داخل ہو جاتی ہے اس کے بعد قم اور اراک (جسکا نام پہلے سلطان آباد تھا) کے اضلاع کو پار کرتی ہوئی دورود (جسکو پہلے بحرین کہتے تھے) سے گزرتی ہوئی لرستان کے پہاڑی علاقہ میں پہونچتی اور وادیٔ آب دز میں داخل ہو جاتی ہے۔ یہاں سے پچاس میل سے زیادہ فاصلہ تک ریل کو لمبی لمبی سرنگوں میں سے اور بڑے بڑے پلوں پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ اندیمشک (سابق صلاح آباد) کے پاس خوزستان کے میدان میں پہونچ جاتی ہے اور دزفل (قدیم سوسا) اور اہواز کے شہروں سے ہوکر اور دریائے قارون کو پار کرکے خلیج فارس میں بندر شاہپور پر (جہاں پہلے خور موسیٰ تھا) ختم ہو جاتی ہے۔

بندر شاہ سے بندر شاہپور تک اس ریلوے لائن کی کل لمبائی آٹھ سو ستھ میل ہے۔ اس میں سے شمال کی طرف اٹھانوے میل کا راستہ پہاڑی ہے، جنوب میں ایک سو پانچ میل تک چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ٹیلے اور خدب زمین ہے اور باقی حصہ ہموار سطح میدان میں ہے یا نمک زار ریگستان میں۔ ۲۴۴ پُل اور ۱۱۰ ریلوے سٹیشن ہیں۔

جغرافیائی حالات ٹیکنیکل رکاوٹوں اور تعمیری مہمات کے پیش نظر اس لمبی ایرانی ریل کا کھولا جانا بہت ہی مشکل کام تھا اور اس فن کے ماہروں کا خیال ہے کہ اس ریلوے لائن کی تکمیل گویا دورِ جدید کی ایک بڑی مہم کا سر ہونا ہے۔ اس لمبی لائن پر سفر کرتے ہوئے شمال سے جنوب تک مسافر کو طرح طرح کے قدرتی مناظر، کئی طرح کی آب و ہوا اور رنگا رنگ سین نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ ساحل کی دلدلی زمین پر چلتی ہے اور دوسری طرف سات ہزار دو سو فٹ کی اونچائی تک پہونچ جاتی ہے۔ سطح زمین، آب و ہوا اور زرعی حالات کے پیش نظر ہم اس لمبی ایرانی ریلوے لائن کو مندرجہ ذیل آٹھ طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

(۱) بندر شاہ اور شاہی کے درمیان کا اناسی میل لمبا ٹکڑا ماژندران میں بہشہر (سابق اشرف) کے ضلع کے شہروں بندر شاہ، بندر گز، بہشہر، ساری اور شاہی سے ہوکر گزرتا ہے۔ اس خطہ کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے اور زمین بہت ہی زرخیز۔ چاول، کپاس اور تمباکو بڑی کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس حصہ کی ریلوے لائن کے بنانے کا کام پہلے تجربہ کے طور پر ایک جرمنی کمپنی کو دیا گیا تھا۔ یہ لائن سنہ ۱۹۳۰ء میں بنکر تیار ہو گئی تھی۔

(۲) شاہی اور گدوک کے درمیان کا ٹکڑا تہتر میل لمبا ہے اور کوہ ابرز کے شمالی ڈھلان پر واقع ہے۔ جہاں تک قدرتی مناظر کی خوبصورتی اور حسن تعمیر کا تعلق ہے یہ ٹکڑا ایرانی ریلوے لائن کا بہترین اور حسین ترین حصہ ہے۔ گدوک کی چوٹی پر یہ لائن سطح سمندر سے تیرہ سو بیس فٹ تک کی اونچائی پر پہونچتی ہے۔ اس حصہ پر گہری گھاٹیاں، دشوار گزار پہاڑ اور ایسا پیچیدہ راستہ پڑتا ہے کہ بیچ میں کئی جگہ پل اور سرنگیں بنانی پڑیں اس علاقہ کی آب و ہوا معتدل اور مرطوب ہے اور یہاں چاول اور گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ جنگلات میں بانس کے درخت پائے جاتے ہیں اور قریب کے علاقہ میں کوئلہ کی کانیں ہیں۔

(۳) گدوک اور گرمسار کا درمیانی علاقہ چھیاسٹھ میل لمبا ہے اور کوہ البرز کے جنوبی ڈھلان پر واقع ہے۔ شہر فیروز کوہ کو چھوڑ کر یہ لائن دریائے حبلہ کی ترائی سے گزرتی ہوئی گرمسار کے ریگستانِ نمک زار میں داخل ہو جاتی ہے۔ ترائی میں سیمین دشت کے سٹیشن تک زمین قابلِ کاشت ہے لیکن مذکورۂ بالا شہر کے قریب زمین کوہستانی اور ناقابلِ کاشت ہو جاتی ہے۔ اس علاقہ کی آب و ہوا معتدل اور خشک ہے اور تمام علاقہ میں گیہوں بویا جاتا ہے۔ یہ علاقہ ریگستانِ نمک زار پر جاکر ختم ہوتا ہے۔

(۴) گرمسار سے اراک تک کا ٹکڑا دو سو چہتر میل لمبا ہے، اس کے راستہ میں طہران پڑتا ہے۔ ایرانی ریل اس ٹکڑے میں ایران کے وسطی میدان سے گزرتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ زیر کاشت ہے اور کچھ خشک اور بنجر۔ اس علاقہ کے شہر یہ ہیں:- ورامین، طہران، قم اور اراک۔ آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ یہاں گیہوں، چقندر اور دوسری کھانے کی چیزیں بکثرت بوئی جاتی ہیں۔

(۵) اراک والا ٹکڑا جسکو دو دریاؤں کا علاقہ کہنا چاہیئے ترانوے میل لمبا ہے۔ یہاں کی زمین اونچی نیچی اور یہاں کے پہاڑ ٹوٹے پھوٹے ہیں۔ اس لئے اونچی کھلی سرنگیں بنانا پڑیں اور زمین کو ہموار کرنا پڑا۔ اس لائن

کا سب سے اونچا نقطہ اسی ٹکڑے پر پڑتا ہے۔ بیرونآباد اسٹیشن سے اوپر سطح سمندر سے اس کی اونچائی سات ہزار دو سو فٹ ہے۔ یہاں کی آب و ہوا معتدل اور خشک ہے۔ زیادہ بلند مقامات جاڑوں کے موسم میں برف سے ڈھک جاتے ہیں۔ گیہوں اور جو کی پیداوار بڑی کثرت سے ہوتی ہے۔

(۶) دورود اور شہباززان کا درمیانی ٹکڑا اٹھاسی میل لمبا ہے، یہ لائن آب دیز اور آب سی ذریعے کور جو سزآر کہلاتا ہے) تنگ بزرگ میں سے نکل کر پار کرتی ہے تنگ بزرگ اس کوہستانی علاقہ میں واقع ہے جو ایران کے مرکزی میدانی حصہ کو خوزستان سے جدا کرتا ہے۔ ایرانی ریل کا یہ ٹکڑا سب سے زیادہ مشکل سے بنا اور اس پر خرچ بھی بہت ہوا کیونکہ لرستان کے کوہستانی سلسلہ اور متعدد نہروں اور بڑے بڑے دریاؤں کے باعث سرنگیں، پل اور ریشیار گیلریاں وغیرہ بنانا پڑیں۔ اس خطہ کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے اکثر پہاڑوں کی وجہ سے زمین بنجر اور ناقابل کاشت ہے۔

(۷) شہبازان اور اندیمشک کے درمیان کا ٹکڑا اکتالیس میل لمبا ہے۔ یہ خطہ بہت ہی ناہموار ہے اور گھاٹیاں اور پہاڑیاں بہت ہیں۔ بہت درے تو بالکل عمودی ہیں اس ٹکڑے کی ریلوے لائن بنجر ریگستان میں سے ہوکر گزرتی ہے اور یہاں کی آب و ہوا بے انتہا گرم اور خشک ہے۔

(۸) اندیمشک اور بندر شاہپور کے درمیانی ٹکڑے کی لمبائی ایک سو چھپن میل ہے۔ اس ٹکڑے کی ریل بالارود، آب دیز اور دریائے قارون کو پار کرکے خوزستان کے زرخیز علاقہ میں جا پہنچتی ہے۔ دریائے قارون کو یہ ریل اہواز پر پار کرتی ہے۔ دریا کا پل کوئی ہزار گز لمبا ہے۔ یہ لائن خلیج فارس میں بندر شاہپور پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں کی آب و ہوا گرم ہے۔ گیہوں، کپاس اور گرم آب و ہوا کی دوسری تمام چیزوں کی پیداوار بڑی کثرت سے ہوتی ہے اس حصہ کی لائن کے بنانے کا کام نمونہ کے طور پر ایک امریکی فرم کو دیا گیا تھا جس نے ۱۹۳۱ء میں اسکو تیار کردیا۔

اس ریلوے لائن کی چوڑائی چودہ سو پینتیس ملی میٹر ہے۔ یہی چوڑائی عام طور پر تمام ملکوں کی ریلوے لائن کی ہوتی ہے۔ اپنی ظاہری صورت میں بھی ایران کی یہ ریل ہر طرح جدید ترین وضع کی معلوم ہوتی ہے۔

اس پوری ریلوے لائن کا کچھ حصہ دو کمپنیوں کا بنایا ہوا ہے جنہوں نے یہ کام بطور آزمائش کے کیا تھا اور تھوڑا سا حصہ وزارت راہ کا بنوایا ہوا ہے جس نے زیادہ تر ایرانی اور غیر ملکی انجنیروں اور مزدوروں کی مدد سے اس کام کو پورا کیا۔ ان دو صورتوں سے قطع نظر یہ ریلوے لائن زیادہ تر اسکینڈی نیویا کی ایک کمپنی کی بنائی ہوئی ہے۔

مندرجۂ ذیل چھتیس کمپنیوں نے اس کے ٹھیکے لئے تھے!۔

ایرانی	۱۶
انگریزی	۲
اطالوی	۶
جرمن	۱
فرانسیسی	۲
بلجیم کی	۳
چکوسلاواکیہ کی	۱
سویزرلینڈ کی	۱
یونانی	۴

اس پوری لائن پر اول درجہ کے بجالوے اسٹیشن تعمیر ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کی عمارت اس کی اہمیت اور حیثیت کے مطابق بنائی گئی۔ سامان لانے اور اتارنے کیواسطے برآمدے اور ملازموں کے لئے رہنے کے مکانات بھی بنائے گئے۔

۱۹۲۱ء سے پہلے ایران میں بھاپ سے چلنے والے سو انجن تھے اور سامان اور مسافروں کے دو ہزار ڈبے تھے لیکن اب انجنوں کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے اور سامان اور مسافروں کے دو ہزار ڈبے تھے لیکن اب انجنوں کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے اور ڈبے ۸ ہزار سے زائد ہیں۔ اس ریلوے لائن کی تکمیل کے بعد ہی طہران / میانہ اور طہران / شاہ رود ریلوے لائنیں بھی بننی شروع ہوگئی تھیں اور اب ان پر بھی مکمل طور پر ریلوے مسافروں اور مال کی آمد و رفت ہو رہی ہے۔ جس زمانہ میں یہ ریلوے لائن بننا شروع ہوئی تھی اسوقت حکومتِ ایران نے بہت سے غیر ملکی کاریگر ملازم رکھے تھے لیکن اسی دوران میں حکومت نے خود ایرانیوں کو ریلوے کا کام سیکھنے کیلئے باہر بھیجنے کی تجویز بنائی تاکہ رفتہ رفتہ غیر ملکی کاریگروں کی ضرورت نہ رہے اور ایرانی انجنیروں اور کاریگروں ہی سے سارا کام لیا جانے لگا۔ چنانچہ آج بہ استثنائے چند ریلوے کے تمام ملازمین ایرانی ہیں۔

گلچیں سے

عشقِ کامل کے اصولوں کو نہ توڑا گلچیں!! — رحم کر شاخ سے پھولوں کو نہ توڑا گلچیں!!
کور ذوقی سے تری حسن چمن ہے برباد! — لب دوشیزۂ فطرت پہ ہے آہ و فریاد!
پھول کو کھلتے ہی پیغامِ فنا دیتا ہے! — اف رے بیدرد جوانی میں مٹا دیتا ہے!
حسنِ معصوم پہ تو مشقِ ستم کرتا ہے! — زندگی لوٹ کے دامانِ ہوس بھرتا ہے!
پھول شاداب ہیں جب تک تو پسند آتے ہیں! — پھینک دیتا ہے انہیں جیسے ہی مرجھاتے ہیں!
آہ تو رمزِ محبت کا شناسا ہی نہیں!! — تیرے دل میں خلشِ ذوقِ تماشا ہی نہیں!!
اے گرفتارِ طلسمِ خمِ گیسوئے مجاز! — آ بتا دوں تجھے میں عشقِ حقیقی کا راز!

عشق ہے تشنگیٔ شوق گوارا کرنا!!
دور سے حسنِ مجسم کا نظارا کرنا!!

ماہ رامپوری

پکار

شکیلہ اختر

نعمو کو لگتا جیسے اس کی دادی اماں کی عمر کا بہاؤ بڑھاپے کے باندھ سے رکا ہوا بس ہمیشہ سے ایک ہی جگہ پر ساکت ہو گیا؟ وہ چھوٹی سی تھی جب بھی دادی اماں موقع بے موقع نوکیلے دانتوں والی اور ڈورے لئے اس کے پھریرے اگاتے ہوئے زرد بالوں کی جڑوں کو کسنے کیلئے تیار رہیں۔ اور اب جبکہ وہ گڑیوں کے کھیل کھیلتے کھیلتے تھک کر بیزار ہو چلی تھی اس کی رگوں میں تیزی سے خون دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اور اس کو یہ لگتا تھا کہ آسمان پر سے اڑتی ہوئی چڑیوں کو جھپٹ لے یا زمین پر اتنے زور زور سے چلنے لگے کہ جسم کے عضو عضو رقص کرنے لگیں، تب بھی دادی اماں اسی مستعدی سے اپنی نگہبانی کا جال پھیلائے نعمو پر نظروں سے جھپٹے لگائے بیٹھی رہیں۔ اسے حیرت ہوتی کہ اس میں تو اتنی تبدیلیاں ہو گئی تھیں مگر دادی اماں اپنی جگہ پر جیسے کیل سے گاڑ دی گئی ہوں جس میں نہ تو کوئی حرکت ہی تھی اور نہ کوئی تبدیلی، نعمو نے جنم سے ان کے بال برف جیسے سفید ہی دیکھے تھے۔ سوکھے ہوئے مردے کی طرح سکڑی سکڑائی ہوئی دادی اماں اسے ہمیشہ سے ایک ہی جیسی لگتیں۔ جب وہ اپنی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں دکھا کر اس کو ڈانٹیں تو کبھی کبھی نعمو کو بھی ڈر لگنے لگتا تھا۔ انور نے ایک دن بوٹنی پڑھاتے ہوئے اسے سمجھایا تھا کہ درختوں کے تنوں میں ہر گذرتا ہوا سال اس کی عمر کی ایک جھری کے دائرے کا اضافہ کرتا رہتا ہے جس سے درختوں کے سن کا پتہ بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ نعمو بہت غور سے دادی اماں کے چہرے کو دیکھتی مگر ان کی جھریوں میں اسے کوئی اضافہ نظر نہیں آتا۔ دادی اماں نہا دھو کر اپنے روئی کے گالے جیسے بال دھوپ میں سکھاتیں تو نعمو کا جی چاہتا کہ ان کے چمکتے ہوئے تاروں پر ہاتھ پھیرتی رہے مگر دادی اماں کی چڑچڑی طبیعت سے اسے ڈر لگتا۔ وہ اکثر یہ سوچتی کہ یہ دادی اماں اتنا غصہ کیوں کرتی ہیں؟ بیٹے سارے گھر بھر کے پیارے ہوتے مگر دادی اماں کی آنکھوں کے خار کھینچے چلانے لڑکے اور اچھلتی کودتی ہوئی لڑکیاں ان کے ہاتھوں سے روز ہی دو چار دھموکے کھاتی ہی تھیں مگر نعمو کو تعجب لگتا کہ پالنے پر پڑے ہوئے ہاتھ پھیلا پھیلا کر ہمکنے والے ننھے ننھے بچوں سے انہیں کاہے کی بیر تھی؟ جب وہ دادی اماں کی تکتی ہوئی آواز سنتی کہ "ان بچوں سے کتنی نجاست ہے" تو اس کا جی چاہتا کہ دادی اماں کو اس بھول کی یاد دلائے کہ خود انہوں نے پہلے ہی کتنی نجاستیں پھیلائی تھیں۔ اسے بڑا غصہ آتا یہ بڑھیائیں اتنا بکنے کیوں لگتی ہیں۔ دادی اماں کے گلے میں بدرنگ ڈورے کے اندر چاندی کی تلوار جیسی دانت کھودنی تھی اسے بڑا الجھن لگتا تھا، اور وہ بڑے تعجب سے دیکھتی رہتی کہ کتنی تیزی سے اپنے دانتوں کو جھنجھوڑتی ہوئی وہ اپنے بکنے کی رفتار کو جاری رکھتیں ہیں۔ نعمو کو بڑھیوں کی بے تکی بک بک اور ان کے مسلسل دانت کھودتے رہنے سے بڑی نفرت تھی اور اس کی چڑ اسوقت انتہا تک پہونچ جاتی جب دادی اماں انور کو آتا ہوا دیکھکر ٹھیک نعمو کے پڑھنے کی میز کے سامنے اپنی سوکھی ٹانگوں کو بگلے جیسی سفید ساڑی میں لپیٹے ہوئے برآمدے کے پایہ سے لگ کر چبوترے پر ایک پہرے دار کی طرح بیٹھ جاتیں۔ ایسے وقت میں انور کو دادی اماں کسی بہت بڑے خزانہ پر بیٹھی ہوئی ایک اژدھا جیسی لگتی تھیں۔

دادی اماں کی ذات گھر بھر پر چھائی ہوئی تھی پھر بھی انہیں اس کی شکایت تھی کہ پھر بھی سنی ہی کیا ہے؟ کھانے، پینے، کپڑے، پہننے سے لیکر چال ڈھال ہنسی بولی اور بات چیت تک پر ان کی حکومت تھی "بچے زور سے کیوں چلے؟ منی کیوں روئی؟ اور نعمو کی ہنسی کس لئے؟ جوان جوان بیٹیاں ہنس ہنس کر جب انگریزی پڑھنے لگیں اور وہ بھی دور کے جوان رشتہ دار سے تو پھر گھر میں برکت کاہے کی رہے گی" اور دادی اماں اپنی بڑی بڑی آنکھیں انتقامی طور پر دکھاتی ہوئی کہتیں "کیا ان پر جوانی نہ آئی تھی کبھی؟ مگر یہ دیوانگی تو نہ تھی" اسوقت نعمو منو اور انور ایک دوسرے کو دیکھکر ہنستے ہوئے سوچتے کہ کاش کہیں سے دادی اماں کی ایک کھوئی ہوئی جوانی کے صحیفوں کو وہ الٹ سکتے۔ دادی اماں کو نوجوان اور بچوں سے ایک ازلی چڑ تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھیں کہ فطرت اپنے خزانے کی تنگی کی وجہ سے حیات تازہ کی لہریں ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی کمزور نگاہوں سے اپنی چھنی ہوئی بجلیوں کی چمک دوسری جگہ نہ دیکھ سکتی تھیں، بلندیوں سے زمین کی طرف بے سہارا گرتی ہوئی دادی اماں زینے پر چڑھنے والوں کو کس نظر سے گوارہ کر لیتیں؟

نعمو منو اور پرویز سامنے ہی اپنے اپنے راستے پر دوڑنے چلے جارہے تھے مگر بیچاری دادی اماں سامنے موت کی گنبد کی طرف ایک تنگ پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھیں۔ کاش وہ اپنی رفتار کو بند ہی کرسکتیں۔

پڑھتے پڑھتے اکثر نعمو کی نگاہیں دادی اماں کی جھولتی ہوئی جھریوں والے چہرے پر جم جاتیں اور وہ سوچتی کیسا اچھا ہوا جو دادا ابا زندہ نہ رہے نہیں تو یہ دونوں مل کر کیسی اجیرن کر دیتے زندگی۔ مگر بیچاری دادی اماں تو وہ کر ہی کیا سکتی ہیں اس کا؟ میز کے قریب پایہ سے لگی ہوئی بڑھیا کی اہمیت چونے سمنٹ اور اینٹ والے بیجان پایہ سے زیادہ نہ تھی۔ کتابوں پر سے پھسلتی ہوئی نگاہیں گردش کرتی ہی رہتیں اور ڈرائنگ کی پنسل کے ساتھ غیر ارادی طور پر انگلیاں ایک دوسرے سے مل ہی جاتی تھیں !

انور احسان مند تھا دادی اماں کی پاسبانی دو مردوں کے لئے

قابل اعتماد تھی، اور بیچاری دادی اماں کا تصور بغیر مستقبل اور خط فہمی کے آوازوں پہ چکر لگاتا جیسا ان کی نگاہوں کو گذری ہوئی یاد اور بیتے ہوئے زمانوں کی جھلک دکھاتا رہتا۔

دادی اماں انور کے جانے کے بعد سارا دن چوکی کے فرش پر یا تو بیٹھی رہتیں یا لیٹ جاتیں ان کا ہمیشہ سے یہی طریقہ تھا وہ سارا دن محلے کی آئی گئی لوگوں کباب بسکٹ والیوں، انڈا اور ترکاری بیچنے والیوں سے دیر تک عجیب انداز سے مزے لے لیکر باتیں کرتی رہتیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں اپنی بڑائی کا غرور جھلکتا، وہ اتنی دلچسپی سے گفتگو کرتیں جیسے گھر سے کبھی نہیں نکلنے کے باوجود سارے گھروں اور سارے لوگوں کو ایسے ہی جانتی ہیں جیسے اپنے گھر کے لوگوں کو۔ وہ باتیں کرتی کرتی اس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتیں پھر تو کبھی زور زور سے تنقید کرنے کی آواز آتی اور کبھی رازدارانہ سرگوشی کے ساتھ سر اور آنکھیں آہستہ آہستہ صرف جنبش کرنے لگتیں۔ نعمو دور سے دیکھتی رہتی دادی اماں کی آنکھیں کتنے ناول اور کتنے افسانوں کو اس آسانی کے ساتھ پڑھتی جاتی تھیں، کون کہتا ہے کہ ان کی دنیا محدود ہے! کاغذ، قلم، پتھر اور رسالے بکھیڑوں سے یکسر آزاد کیسی آسانی سے سچی کہانیاں روز کتنی ہی پڑھتی جاتی تھیں۔

دنیا کی ساری بڑھیوں کی طرح دادی اماں کو بھی طرح طرح کے کھانے بہت پسند تھے، باتیں کرنے کے علاوہ انہیں اس کی بڑی فکر رہتی تھی کہ اس وقت کے کھانے میں کیا ہے اور اس گھڑی کے کھانے میں کیا رہیگا؟ بیچارہ پرویز کتنی ہی کوشش کرتا، لاکھ سر پٹکتا کہ گھر میں مرغیاں رہیں اور انڈے دیں وہ اپنی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے لئے پھرتا رہتا مگر دادی اماں کے نوکیلے تیز دانت ایک بھی چوزہ، مرغی، بٹیر اور چاہا نہ چھوڑتے تھے۔ بیچارے بچے اپنے ذبح کئے ہوئے پالتو چوزوں کے اکڑے ہوئے جسم کو بڑے غم سے دیکھتے، ان کی غصیلی آنکھوں میں دادی اماں ایک ڈائن نظر آتیں جو دوسروں کی زندگی کھا کھا کر اپنی حیات کو سینچ رہی تھی۔

نعمو کی یاد میں دادی اماں بہت مشکلوں سے صرف دو ایک بار کہیں گھر سے باہر ملنے ملانے کو گئی تھیں۔ مگر ایک دن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے سگے بھانجے ڈپٹی صاحب کی طبیعت خراب ہے تو پھر ان سے نہ رہا گیا۔ ان کے مرحوم شوہر کی بہن کا، چنانچہ ان کا کوئی غیر نہ تھا۔ وہ اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی یاد کو برقرار رکھنے کے لئے انکے بھانجے کو بغیر دیکھے نہ رہ سکیں اس دن انہوں نے اپنی اچھی دھلی ہوئی سفید ساڑی پہنی، آنکھوں میں سرمہ لگایا، "دارالسلام" اپنا ہی گھر تھا، اسی لئے نعمو کو اپنے ساتھ لے تھک کر چور پریشان حال ڈپٹی صاحب کے گھر پر اتریں۔

دادی اماں نعمو کو لے کر بڑے کمرے میں چوکی کے فرش پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ رہیں۔ سامنے خاصدان میں پان زردہ کی ڈبیا اور عطردان رکھا گیا لیکن بیچاری دادی بڈھیاں ہو رہی تھیں بڑی مشکلوں سے وہ پان لے سکیں مگر نعمو کو پان لینے سے روک دیا کہ پڑھنے والیوں کی زبان موٹی ہو جاتی ہے اور کنواریاں عطر نہیں لگایا کرتیں۔

دادی اماں کو یہاں آکر معلوم ہوا کہ ان کے بھانجے اب پہلے سے اچھے ہیں۔ "ڈاکٹروں نے تو جواب تک دے دیا تھا مگر اللہ نے اپنا فضل کیا۔ پھر بھی بڑھاپے کی جان ہے کہاں سے طاقت آئے"۔ دادی اماں گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی تھیں اچانک اٹھ بیٹھیں انہیں کہنے والوں کی باتیں بہت بری لگی تھیں! "کون مزاج؟ بھلا کا ہے کو ایسا بوڑھا ہونے لگا! جب میں بیاہ کر آئی تھی تو اس کی مسیں نہ بھیگی تھیں۔ یہی کوئی دس بارہ سال ہوئے جب اسے آخری بار دیکھا تھا، اب بھلا اتنے سالوں میں بڑھاپا کیا اس پر برس پڑا؟"

فرش پر بیٹھتے ہی نعمو نے دریچہ سے لگ کر جیسے ہی باہر دیکھا اس کی آنکھیں بے اختیار مسرت سے چمک پڑیں۔ مکان کی پشت دو گز کے فاصلے پر ٹھیک سینما ہال کی طرف تھی، اسے سینما آئے ہوئے ایک عرصہ گذر چکا تھا اور اب اس کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ سینما ہاؤس کس طرف ہے؟ خوبصورت اور رنگین اشتہاروں سے چھپی ہوئی سینما ہال کی دیوار میں کچھ بند اور کچھ کھلے

غزل

آنکھوں آنکھوں میں جو گفتار ہوئی جاتی ہے
زندگی اور پُر اسرار ہوئی جاتی ہے
حسرتِ دید فسوں کار ہوئی جاتی ہے
ہر نظر آپ ہی بیمار ہوئی جاتی ہے
نشترِ بزم طرب زار ہوئی جاتی ہے
یاس پھر نقش بدیوار ہوئی جاتی ہے
فتنہ ساماں نگہِ یار ہوئی جاتی ہے
کوئی شے خواب سے بیدار ہوئی جاتی ہے
جیسے جیسے مرے نزدیک کوئی آتا ہے
اک نئی صبح نمودار ہوئی جاتی ہے
دل سے آداب محبت کا تقاضا کیوں ہے
یاد بھی تیری گراں بار ہوئی جاتی ہے
اک پریشانیٔ دل سے ہے پریشاں عالم
آرزو ہے کہ ستمگار ہوئی جاتی ہے

عزیز جونپوری

بڑے بڑے دروازے اور سب سے بڑھ کر سنہرے دروازے کا ہلتا ہوا پردہ نعمو کو پکار پکار کر دعوت دے رہا تھا۔ وہ تماشہ جائے اور ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر دریچہ سے لگی ہوئی اپنی بھوکی نگاہوں سے اس کی طرف تک رہی تھی۔ دادی اماں کی آوازیں اس کے کانوں میں جا تو رہی تھیں مگر اس کی نگاہیں دریچہ کے سامنے سینما ہال پر جم کر رہ گئیں جہاں طرح طرح کی ساڑیاں، قسم قسم کے کوٹ اور نئے نئے ڈیزائن کی چادریں اپنے شانوں پر ڈالے ہوئے لڑکیاں اور قیمتی سوٹ پہنے ہوئے لڑکے کھیل ہونے سے بہت پہلے ہی آکر خود اپنی نمائش کر رہے تھے۔

نعمو نگاہوں نگاہوں میں ہی دریچے کے سنگین جنگلے کے اس پار اس رنگین دنیا میں خود کو بھی آزاد محسوس کر رہی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ بھول گئی تھی کہ دادی اماں کے سخت گیر پنجے اس کی خوشیوں کا گلا دبوچے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ دادی اماں سے چھپ کر اپنی امی کے ساتھ وہ سیکنڈ شو میں سینما دیکھنے گئی تھی۔ فلم "بکا" نے اس کی روح کو ایک پکار دیا تھا مگر دادی اماں کے ڈر سے وہ پھر کبھی نہ جا سکی تھی!

دادی اماں کو بس سراج کو دیکھنے کی رٹ لگی ہوئی تھی مگر جب انکو معلوم ہوا انہیں کوٹھے پر چڑھنے کی تکلیف اٹھانی پڑے گی تو یکایک ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے سارے حوصلے پست ہو گئے۔ پھر بھی انہیں اپنی بات رکھنی تھی اور اسی کو دیکھنے کی خاطر وہ اتنی پریشان ہو کر آئی تھیں۔ انہوں نے نعمو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا مگر نعمو نمنائی۔ اس نے اپنے تماشے میں محو رہنا زیادہ پسند کیا اور بیچاری دادی اماں ذات کی نزاکت کا احساس کر کے کسی دوسرے کے سہارے آہستہ آہستہ ہانپتی کانپتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی اپنے بھانجے سراج کے سرہانے ہانپتی ہوئی کھڑی تھیں مگر ان کی نگاہیں سفید داڑھی اور مونچھوں کے الجھاوے میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ وہ بڑی مشکلوں سے اپنی نظر کو وہاں پر سے ہٹا سکیں۔ بیچارے ڈپٹی صاحب کچھ نہ بول سکتے تھے اشارے سے صرف سلام ہی کر سکے۔ ان کے ہاتھ کی کہنیاں کلائی اور چہرے کی ہڈیاں عجیب بھیانک طور پر باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اتنا بڑا تغیر اور وہ بھی صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں۔ دادی اماں حیران تک رہی تھیں۔ جیسے انہیں اپنی آنکھوں کا اعتبار نہ تھا۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ ان کا بھانجہ بڑھاپے کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے۔ اپنے بھانجے کی بیمار کھوکھلی نگاہوں کو دیکھتے ہی انہیں شدید طور پر ایک احساس ہوا جیسے بجلی کی ایک جانی تیز لہر ان کی رگوں میں دوڑ گئی۔ بڑھاپے اور بیماری نے ڈپٹی صاحب کو موت کی آخری منزل تک پہنچا دیا تھا اور انہیں دیکھ کر جیسے دادی اماں کو کچھ دیر کیلئے ٹھہر کر دم لینے کا سہارا مل گیا۔ مسہری پر پڑے ہوئے ایک مجبور بے بس انسان کو دیکھتے ہی انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ لوگوں نے وقت سے پہلے ہی ان پر بڑھاپے کا الزام لگا رکھا ہے۔ بڑھاپے کی منزل تو یہ ہوتی ہے اور دادی اماں ان مجبوریوں سے کہیں دور تھیں۔ خاموشی سے سرہانے کھڑی ہوئی دادی اماں اپنے پیروں میں ایک نئی طاقت محسوس کر رہی تھیں، آنے والی موت کے خیال سے ان کے رونگٹے کانپ گئے۔

حقائق و معارف

ملی ہے حسن کی شوخی و زورِ روشن کو
کہ دل تو دل ہی نہیں ہے قرارِ چلمن کو

قفس میں دیکھ کر کہتے ہیں ہم صیادوں کو
یہی وہ دن تو سجاتے تھے جب نشیمن کو

زمانہ لاکھ دے الزام برقِ ایمن کو
نگاہِ شوق نہ بھولے گی جلوہ افگن کو

دکھا رہا ہوں زمانے کو عشق کی فطرت
ملا رہا ہوں گریباں سے اپنے دامن کو

جلا ہو ساتھ نشیمن کے کل متاعِ چمن
فلک ذرا سی طرح پھونک دے مرے نشیمن کو

نہیں اسیروں کو آزادیٔ نظارہ بھی
کہ بند کرتا ہے صیاد چشمِ روزن کو

ہزار پردوں میں اہلِ نظر نے دیکھا ہے
ہزار جلوۂ رنگیں سے جلوہ افگن کو

خدا ہے ساری منازل کی منزلِ جاناں
تلاش کرتے مسافر یہاں ہیں رہزن کو

ہزار قتل کے پیمانے ڈالے قاتل نے
جدا نہ کر سکی تلوار میری گردن کو

لگائی آگ ہے گھر کے چراغ نے گھر میں
جلایا آتشِ گل نے مرے نشیمن کو

یہی ہے حاصلِ دنیائے عشق اے افقر
ملی نہ مر کے بھی دو گز زمین مدفن کو

وہی موت جو اس مسہری کے گرد منڈلا رہی تھی وہ اس جگہ زیادہ دیر تک رہنا نہ چاہتی تھی۔ انہوں نے جھک کر بڑی محبت اور ہمدردی سے عنقریب ہی مر جانے والے سراج کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر کہا "خدا کی رحمت سراج جلدی اچھے ہو جاؤ گے۔" مریض نے اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر ایک آخری سلام کیا۔ دادی اماں کو دعائیں دیتے ہوئے شرم آ رہی تھی جیسے وہ اپنے سے بڑے کو دعا دے رہی ہوں، وہ جلدی جلدی زینہ طے کرتی ہوئی نیچے آئیں۔ بڑی مشکلوں سے وہ اپنے تھکے ہوئے منتشر سانسوں کو روک رہی تھیں۔ مگر انکے چہرے پر مسرت کی سرخی چھا رہی تھی اور انہیں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ایک بڑا بوجھ ان کے سر سے اتار دیا ہو۔ وہ مطمئن انداز میں گاؤ تکیہ سے لگ کر سیدھی ذرا تن کر بیٹھ گئیں۔ "بیچارہ سراج بہت بدل گیا ہے نہ اپنی بیٹی، کیسا خراب تھا بیچارے کا بڑھاپا" نعمو اپنے سے قریب دادی اماں کی آواز سنکر چونک پڑی۔ نعمو پر جھکی ہوئی دادی اماں دریچے کا ایک اور پٹ کھولتی ہوئی مسکرا کر بولیں: "کیا ہے نعمو؟" "سینما ہال ہے نا دادی اماں۔ یہاں روز تماشے ہوتے ہیں بڑے اچھے اچھے بولنے والے اور گانے والے" نعمو نے ڈرتے ڈرتے ذرا تفصیل سے کہا۔

دادی اماں کی کچی پکی کھچڑی بھوں ان کی پیشانی کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں قوسِ قزح کی طرح ابھر اٹھیں۔ جھلملاتی ہوئی آنکھیں نعمو کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور پک کر سڑے ہوئے آم کے سکڑے ہوئے چھلکے جیسے ان کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اچانک طور پر بے اختیار ان کی زبان سے نکل گیا "نعمو بیٹی چلو ہم بھی سینما دیکھ آئیں۔"

سائنسی ترقی کے سو سال

ڈورا رسل

حال ہی میں "امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی" کی طرف سے لندن کے البرٹ ہال میں ایک دلچسپ صد سالہ جشن منایا گیا۔ یہ کالج شاہی فرمان کے مطابق ۱۹۰۷ء میں وجود میں آیا تھا لیکن انگلستان کے بہت سے دوسرے اداروں کی طرح یہ بھی پچھلے اداروں کی بنیادوں پر قائم ہوا۔ اس میں تین کالج شامل ہیں: "رائل کالج آف سائنس"، "رائل اسکول آف مائنز" اور "سٹی اینڈ گلڈز کالج"۔ ان کا تعلق بھی کچھ پچھلے اداروں سے ہے جن میں سب سے پہلا "رائل کالج آف کیمسٹری" تھا۔ اصل میں اس سال اسی کو قائم ہوئے سو سال ہوتے ہیں۔

۱۸۴۰ء کے زمانہ میں جب صنعتی دور کا آغاز ہو رہا تھا یہ محسوس کیا جانے لگا کہ سماج کی ترقی میں سائنس کا بہت حصہ ہوگا۔ کچھ جوشیلے لوگوں نے ۲۹ جولائی ۱۸۴۵ء کو ایک عام جلسہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ دسمبر میں ملکہ وکٹوریہ کی اجازت سے "رائل کالج آف کیمسٹری" قائم کیا گیا۔

اس کالج کے پہلے صدر ہز رائل ہائینس پرنس البرٹ تھے۔ انھوں نے صنعت و حرفت کے معاملے میں بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا کیونکہ ۱۸۵۱ء میں ایک بڑی نمائش منعقد کی اور ساؤتھ کنسنگٹن میں "مرکزی اداروں" کے لئے زمین خریدی تاکہ صنعتی تعلیم کے ذرائع اور پیداواری صنعت پر سائنس اور آرٹ کے اثرات میں اضافہ ہو۔ آج کل خود امپیریل کالج، اس کے دوسرے کالج اور مختلف سائنسوں اور فنون کے عجائب خانے یہیں قائم ہیں۔

رائل اسکول آف مائنز نومبر ۱۸۵۱ء میں قائم ہوا۔ اس سے پیشتر ہنری تھوما دی لا بیچے، جو بعد کو کان کنی کے اسکول کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، حکومت کی زیر نگرانی جزائر برطانیہ کی ارضی پیمائش کر چکے تھے۔

جب ۱۸۵۳ء میں علم کیمیا اور کان کنی کے اسکول مل کر ایک ہو گئے تو شروع شروع میں کان کنی کے عملی کام نے خالص سائنسی شعبوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ علم حیاتیات کے مشہور پروفیسر اور اسکول آف مائنز کے ڈین تھامس ہنری ہکسلے ۱۸۸۱-۹۵ء کی کوششوں سے خالص سائنسوں کا شعبہ ساؤتھ کنسنگٹن کی ہکسلے نامی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ یہی ۱۸۸۱ء میں رائل کالج آف سائنس بنا۔

ان تینوں بنیادی اداروں میں سے آخری یعنی سٹی اینڈ گلڈز کالج کا خاکہ بلدیہ لندن کی کارپوریشن اور لیوری کمپنیوں نے تیار کیا تھا اور ان ہی نے اسے مالی امداد بہم پہنچائی تھی۔ ان کا مقصد فنی تعلیم کو ترقی دے کر صنعت میں استعمال کرنا تھا۔ دسمبر ۱۸۸۴ء میں یہ نیا کالج بھی ساؤتھ کنسنگٹن ہی میں کھلا۔

غرض کہ عموماً رائل کالج آف سائنس کا تعلق عام سائنسی حیاتیاتی سائنسوں، طبعیات اور کیمیا سے ہے، اسکول آف مائنز کا تعلق ارضیات، تیل کے اجزائے ترکیبی، کان کنی اور دھاتوں کی سائنس اور سٹی اینڈ گلڈز کالج کا تعلق مکانکی، شہری، برقی اور کیمیاوی انجنیری میں ٹریننگ اور تحقیقات سے ہے۔

رنگنے کا پہلا مصنوعی مادہ "انیلین ماو" ۱۸۵۶ء میں رائل کالج آف کیمسٹری میں سر ڈبلیو۔ ایچ پرکن نے معلوم کیا تھا۔ اس تحقیق نے کالج میں تارکول کی پیداواروں اور رنگوں کے مادے کی ترکیب پر تحقیقی کام کے لئے ایک ایسوسی ایشن قائم ہوگئی۔

حال کی تحقیقات سے بہت سے خوبصورت اور دیرپا رنگوں کے کیمیاوی مادوں کا پتہ چلا ہے۔ سر ولیم ٹلڈن نے جو ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۹ء تک شعبہ کیمیا کے صدر رہے، ضروری تیلوں کے سلسلہ میں بہت سی بنیادی تحقیقات کیں اور ٹلڈن ہی نے سب سے پہلے قدرتی اور بناوٹی ربڑ کے بنیادی مادے "رسوپرین" کی بناوٹ کا راز ظاہر کیا۔

کان کنی کے اسکول کے طلباء سلطنت برطانیہ اور بہت سے دوسرے ملکوں مثلاً چین، میکسکو اور جنوبی امریکہ کی کان کنی کی ترقی میں حصہ لینے کے لئے ملک سے باہر جاتے ہیں۔ دھاتوں کی سائنس کے شعبے میں سڈنی گلکرائسٹ تھامسن نے برسی کار رائل گلکرائسٹ کے ساتھ فاسفوری کچے لوہے کے بارے میں تحقیقات کیں۔ اس سے ساری دنیا میں فولاد بنانے کے لئے بیسک بیسیمر اور "بیسک اوپن ہارتھ" کے طریقے اختیار کئے گئے۔

اسی اسکول میں دھات کی کعبی ساخت کے مطالعہ میں سر ولیم رابرٹس آسٹن اور ان کے ساتھیوں نے اضافہ کیا۔ سر ہنری کورٹ ہیرالڈ کارپینٹر اور ان کے ساتھیوں نے دھاتوں کے کعبوں کے متعلق خاص کام کیا۔

رائل کالج آف سائنس میں طبعیات کے پروفیسر چارلس ورنن بوائز (۱۸۷۶-۱۹۰۷ء) سنگ مردمک کے ریشوں پر کام کرنے کے لئے مشہور تھے۔ اسکے ذریعہ وہ ایسے زود حس آلات تیار کرسکے جن سے چاند کی سطح کے مختلف حصوں کی گرمی کا فرق معلوم کیا جا سکتا تھا۔ وہ ان چیزوں کے فوٹو کھینچنے کے طریقوں کے لئے بھی مشہور رہیں جو بڑی تیزی سے چلتی ہیں جیسے رائفل کی گولیاں

اور بجلی کی چنگاری۔

امپیریل کالج کی لیبوریٹریوں میں نئی قسم کے آلات کے ڈیزائن بھی تیار ہوئے ہیں جو جدید سائنس اور مختلف تحقیقات کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ غیر نامی کیمیا میں خلا کے طریقے کے آلات تیار کرنے کے لئے نہایت ہوشیاری سے کام لیا گیا۔ اسی کالج میں تجربات کی بنا پر مائکرو کیمسٹری کی نازک ٹکنیک کے لئے ایک خاص طرح کی مائکرو کیمیکل ترازو بنائی گئی ہے۔ برطانیہ میں برقیہ کی پہلی خوردبین کی تیاری اور جانچ میں ٹیکنیکل آپٹکس سیکشن کے ممبروں اور ایک تجارتی کمپنی نے حصہ لیا تھا۔

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امپیریل کالج میں انجنیری اور غیر نامی سائنسوں پر زیادہ کام ہوتا ہے لیکن یہاں حیاتیات اور نامی کیمیا پر بھی اتنا ہی اہم کام ہوا ہے۔ پروفیسر آئی۔ ایم۔ ہیلبرون نے سنہ ۱۹۳۸ء میں نامی کیمیا کی لیبوریٹری کو نئے ڈھنگ پر قائم کیا اور اسی کی ہدایات کے بموجب مشہور دوا پنیسلین اور بہت سی دوسری مرکب دواؤں اور کیڑوں کو مارنے والی دوا ڈی ڈی ٹی۔ کے متعلق کام ہو رہا ہے۔

جنگ سے بہت پہلے اسی کالج میں پروفیسر منڈی کی زیر نگرانی پودوں کی وباؤں کو مطالعہ نے برطانیہ کی وزارت خوراک کو خوراک کے ذخیروں کی حفاظت میں بہت مدد دی۔ یہاں پودوں کی بیماریوں وغیرہ پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے شہر سلف (ضلع بکس) میں خود کالج کے کھیت موجود ہیں۔ اس کا ملایا کے ربڑ، لنکا کی چائے اور سوڈان کے کپاس کے پودوں کی بیماریوں اور ساخت کے مسائل سے بھی تعلق ہے۔

یہاں ہوابازی، علم البحر، کیمیکل ٹیکنالاجی اور انجنیری میں جو کام ہوا۔ اس سے لڑائی میں بہت مدد ملی۔ برطانیہ کے پیٹرولیم وار ڈیپارٹمنٹ کے لئے پروفیسر لینڈر کی نگرانی میں ہوائی اڈوں سے کہر ہٹانے کے سلسلے میں بڑا اہم کام کیا گیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے شروع میں سر جارج تھامسن نے جو ایٹم کی قوت کے امکانات سے باخبر تھے، برطانیہ کی ہوائی وزارت سے امپیریل کالج لیبوریٹری کے لئے ایک ٹن یورنیم آکسائڈ ادھار لیا۔ یہی قریب قریب انہی نتائج پر پہنچے جن پر پیرس میں ڈاکٹر ہلبان اور پروفیسر جولیو پہنچے تھے۔ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء میں سر جارج تھامسن کی صدارت میں سارے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ پر جولائی سنہ ۱۹۴۱ء میں بڑے پیمانے پر ایٹم بم تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔

برادری کی شادی! —— نجمی قریشی بلالپوری

نگاہ شوق کو روشن کرے جمال ترا
انیس قلب فسردہ رہے خیال ترا
تصورات کی دنیا ہے تجھ سے نور افزا
مہ و نجوم پہ ہوتا ہے احتمال ترا
نصیب بدر کو ہر بار ماہِ نو ہونا
رہے عروج پہ یہ دور لازوال ترا
بنے کبھی مرے مستقبل حیات کی جان
ترا زمانہ رنگیں شگفتہ حال ترا

شریک حال مری کوئی آس ہو نہ سکی
زبان پھر بھی شکایت شناس ہو نہ سکی

وہ سرپرست قدامت کی مے سے چور رہیں
دلوں کا خون کریں اور بے قصور رہیں
جو اُن کے بس کا نہیں ہے خدا کے بس کا ہے
وہ پیش پیش اسی کام میں ضرور رہیں
وہ اک روایت کہنہ حدیث بوسیدہ
خدا کرے نری معصومیت سے دور رہیں
یہ کیا کہ منہ سے نہ کہنے پہ بھی ہوئے مجرم؟
جو ہم کو پاس ادب ہو تو بے شعور رہیں؟

حقوق اپنی محبت کے سب ادا کر دوں
یہ جی میں ہے کہ توکل کی انتہا کر دوں

اب اس مقام پہ پہنچے گا عشق لامحدود!!
جہاں ہے مجھ سے زیاں کار کو بھی سود ہی سود
ہزار بار بگڑتی ہے ہر غلط تدبیر!!
جہاں نصیب ہے دستِ مداخلت کو جمود
وہ "انیس" تو مری ہو گی اب ایسی منزل میں
جہاں نہیں ہیں کوئی بھی برادری کی قیود
سر نیاز جھکایا ہے تیرے نجمی نے
ہر ایک رات مبارک ہر ایک دن مسعود

تجھے یہ گردش قسمت سلام کہتی ہے
شکست خوردہ محبت سلام کہتی ہے

یہ سڑک

افسانہ

کرشن چندر سے اس عنوان کی معذرت کے ساتھ

آفتاب قزلباش

یہ لمبی اکہری سڑک کشمیری دروازے سے گذر کر جاتا گاندھی کی کٹیا اور کنگز وے ہوتی ہوئی دور جاکر سڑک اعظم میں اپنے آپ کو گم کر دیتی ہے۔ ہر روز میں اس سڑک سے گذرتا ہوں چونکہ رستہ لگ گیا ہے اسلئے فاصلہ معلوم نہیں ہوتا۔

قدسیہ بیگم کے نام سے موسوم ایک بہت بڑا باغ بھی اسی کے کنارے آج بھی موجود ہے باغ کے مہتمم غالباً اسے آثار قدیمہ میں سے سمجھکر اس کی نگہداشت کا بندوبست کرتے رہتے ہیں ورنہ روزانہ عورتوں اور مردوں کا ایک بڑا قافلہ اسی باغ سے گذر کر جمناجی کے اشنان کو جاتا ہے۔ باغ کی شبنم آلود سبز روشیں دیہاتیوں اور دوسرے ناسمجھ انسانوں کی پامالی سے بنجر گھاس میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اسی باغ کے پہلے دروازے پر ایک درخت ہے جو تمام سال یوں ہی معمولی سا ایک درخت رہتا ہے جس کا نہ کوئی سایہ ہوتا ہے نہ کوئی پھل، لیکن عین بیت جھڑ کے موسم میں ادھر کرسمس کا موقعہ آیا اور ادھر اس نے نیلے پھول کھلائے، تمام درخت نیلے پھولوں سے آراستہ ہو جاتا ہے۔ دور سے درخت کے آس پاس کی جگہ پھولوں کے عکس پڑنے سے نیلی معلوم ہوتی ہے۔

باغ کے دوسرے دروازے پر ایک اور درخت ہے۔ اس کے پڑوسی بڑے بڑے تناور یوکلپٹس کے درخت آسمان سے باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں سرخ پھول کھلتے ہیں۔ سرخ پھولوں کے گچھے اسقدر خوشبو ہواؤں میں سمو دیتے ہیں کہ مشام جاں تازہ ہو جاتی ہے۔

اسی سڑک کے دوسرے کنارے ایک بڑا شاندار ہوٹل ہے سوئس ہوٹل کے ایک حصہ میں دت صاحب فوٹوگرافر کی دوکان بہت دیدہ زیب ہے۔

آداب آغاجی!

آداب! پنڈت جی میں نے مسکراتے ہوئے پنڈت دت صاحب سے کہا۔ کہئے کیسا مزاج ہے؟

آپ کو مجاز بلا رہے ہیں اندر بیٹھے ہیں۔ پنڈت دت صاحب نے جواب دیا اتنے میں خود مجاز دوکان سے گنگناتے ہوئے نکل آئے ؎

جوانی جب بھی آتی ہے کفن بردوش آتی ہے

آؤ۔ آغا تمہیں تصویر دکھاؤں۔ یہ جوش، احمد علی، اور میں۔ سجاد ظہیر نے اپنے ہاں کھینچی تھی" مجھے آج ہی یہ تصویر بھیجی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کس کو؟

جی ہاں کیوں نہیں۔ مجاز صاحب آپ شام کو غریب خانے پر تشریف لایئے پھر وہاں ہونگی باتیں، اب تو اجازت بخشئے۔ میں نے لجاجت سے عرض کیا

اچھا۔ اچھا۔ جاؤ اجازت بخشی۔ شام کو تم خود ہی فصیح الدین صاحب کے کمرے پر آجانا میں وہیں ملوں گا۔ مجاز یہ کہتے ہوئے پھر اندر چلے گئے۔ وہ پھر گنگنانے لگے تھے ؎

غم پنہاں ہی علاج غم پنہاں ہو جائے
تم جو آجاؤ تو اشکوں سے چراغاں ہو جائے (مجاز)

میرے محبوب اور دل پسند شاعروں میں مجاز کی طرح ایک اور صاحب بھی محبوب ہیں اُن کا شعر میرے ذہن میں اُبھر آیا ؎

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے ویرانوں میں چپکے سے بہار آ جائے

میں مترنم ہوگیا۔ داہنے ہاتھ پر جو سڑک مڑتی ہے یہ سری رام روڈ ہے۔ اسی جگہ کہیں مشہور افسانہ نگار حمیدہ باجی رہتی ہیں۔ اے لیجئے فیض صاحب اپنی بیگم کے ہمراہ چلے آتے ہیں۔ آج فیض صاحب کو پاجامے، شیروانی، اور رام پوری ٹوپی میں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ فیض صاحب نے مسکراتے ہی اپنے بشاش چہرے کو بہار بداماں کر دیا۔

بھابی صاحب، آداب! میں نے فیض صاحب کی بیگم سے عرض کیا۔ انہوں نے بھی متبسم ہوکے جواب دیا۔ فیض صاحب نے کہا: بات بتانی نہیں ہے ہم لوگ یہیں قریب ہی سے آرہے ہیں۔ میں ہنس پڑا۔ جی چاہا کہ اب فیض کے ہمراہ ہی میں بھی چل پڑوں مگر بعد المشرقین کو کیا کروں؟ وہ اپنے گھر جا رہے تھے اور میں اپنے گھر سے جا رہا تھا۔ فیض صاحب کی علیحدگی سے زیادہ ان کی تغافل شعاری کا مجھے تلخ تجربہ ہے مگر انہیں دیکھکر اتنی خوشی ہوتی ہے کہ ان کے تغافل کی تکلیف بھول جاتا ہوں۔ فیض صاحب کا کلام مجھے بے حد پسند ہے۔ وہ ترقی پسند شاعروں کی فہرست میں چوٹی کے شعرا میں گنے جاتے ہیں۔ مگر ان کے اشعار کی نغمگی اور مصرعوں کی نشست اتنی برمحل ہوتی ہے کہ اب تک ذہنوں میں قدیم شعر کا جو سانچہ ہے اسپر نامانوس نہیں معلوم ہوتا۔ نئی ترکیبوں کی نوک پلک سے وہ اور رمزِ شعر میں حل کر دیتے ہیں۔

فوجی اخبار کا دفتر اسی سڑک پر کسی موٹر کمپنی کی عمارت میں جم گیا ہے۔ باہر سڑک پر حسرت صاحب اور بدر صاحب کسی مسئلے پر کھڑے ہوئے غور فرما رہے ہیں۔ بدر صاحب خدا کے فضل سے محبت والے شریف انسان ہیں۔ ملاقات میں سبقت کی کوشش کرتے ہیں۔ حسرت صاحب نے چٹکی بجاکر سگرٹ کا خاکستر جھاڑا۔ السلام علیکم آغا صاحب، میرے آداب کے جواب میں فرمایا۔ ارے بھی کبھی ملا کیجئے؟

میں نے عرض کیا حسرت صاحب آپ رہتے بھی تو خدا کے پچھواڑے ہیں۔

بھلا مجھ ایسے پیدل چلنے والے کے لئے یہ کونسی آسان بات ہے؟ - انشاءاللہ کسی دن ارادتاً حاضر ہوں گا۔

جب دل چاہے شوق سے آیئے - حضرت صاحب نے سر اوپر اٹھاتے ہوئے فرمایا - دلّی کا کچھ ذکر چل پڑا - دلّی میں اب کون دھرا ہے - لے دیکھے ایک مرزا محمد سعید صاحب ہیں - آپ کبھی کبھی ان کے پاس جایا کریں - بہت معقول آدمی ہیں -

میں نے بہت اچھا کہا - اور اجازت چاہی -

تھوڑی ہی دور چلکر ایک پیاؤ آتی ہے - وہاں ہر روز ایک سفید ریش جنکی بھنویں تک سفید تھیں - ماہ وسال کے پیہم مظالم سہتے سہتے ان کی کمر تک دوہری ہو گئی تھی - وہ یہاں بیٹھکر پان سگرٹ بیچا کرتے تھے - اللہ اللہ - اتنا معذور اور اپاہج بوڑھا اپنے گذارے کے لئے سگرٹ پان بیچنے پر مجبور -

آج بوڑھا وہاں نہیں بیٹھا تھا - اسے وہاں نہ پاکر میرے دل میں عجیب خیالات آنے لگے - میں ایک لمحہ کیلئے اسی مقام پر ٹھٹک گیا - نیم کے سوکھے ہوئے کھڑکھڑاتے پتے سرد ہوا کے جھونکوں کی تاب نہ لا کر زمین پر آرہے ہیں - سڑک پر دور تک ایک کے پیچھے ایک ہوا کی رو میں اڑے چلے گئے - میرے کلیجے میں کپکپی شروع ہو گئی - آج غالباً بوڑھے کی زندگی کا بھی پتہ ٹوٹ کر کہیں دور چلا گیا تھا - قیوم نظر نے کیا خوب کہا ہے -

ظالم کا کیا مشاہدہ ہے سے
اک اک کر کے کتنے پتے
اک آن دیکھے دیس کو پہنچے
جہاں نہ کوئی اپنا پرایا
پت جھڑ نے یہ رنگ جمایا

مجھے بہت دیر ہو گئی تھی میں نے ذرا جلد جلد چلنا شروع کیا -

کلرکوں کے سیلاب کو دفتر کی جانب امنڈتے ہوئے دیکھکر مجھے قرۃ العین کا وہ مضمون یاد آ گیا جو ساقی میں شائع ہوا تھا - کلرکوں کی دوڑ دھوپ - دفتر کی جانب فوجی لاریوں اور لانڈر پرستھ کالج کی موٹروں کے شور سے ایک ہنگامہ سا برپا تھا - ایک دن پیر طریقت حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فراق گورکھپوری، اور میں جناب آغا یعقوب دواشی صاحب کے ہاں دوپہر کے کھانے پر مدعو تھے - اسی سڑک پر چلے جا رہے تھے - سواری کوئی مل نہ رہی تھی - تانگے والوں نے پولیس کی زیادتی سے تنگ آ کر بطور احتجاج ہڑتال کر ڈالی تھی - بس کا بھلا آج کیا ٹھکانا تھا - بس والے پبلک کی تکلیف کا تو کیا خیال کرتے - انہیں کیا غرض کہ لوگوں کے ضروری کام محض ان کی کاہلی اور بے پروائی کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں -

جوش صاحب نے فرمایا کہ بمبئی میں تو اب یہ رواج عام ہوتا جا رہا ہے کہ کوئی موٹر نشین جب گزرتا ہے تو آپ کو لفٹ دینا وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھے گا - یہاں کے لوگوں میں یہ بات ابھی تک کیوں نہیں پیدا ہوئی - مجھے دیر ہو چکی تھی - جوش کی یہ بات مجھے یاد آ گئی تھی - میں نے رفتار تیز کر دی -

تانگے میں ایک صاحب گذرے - بڑے جھک کر انہوں نے آداب کا جواب دیا - یہ صاحب آجکل ایک سرکاری محکمے میں بہت بڑے افسر ہیں - میرے دفتر کے سامنے ہی روزانہ جاتے ہیں اور انہیں یہ بھی علم ہے کہ میں بھی وہیں تک جاتا ہوں - میں جوش صاحب کی یہ بات

شبابِ خام = علی احمد

سست ہے تیری رگوں میں ابھی خون کی گردش
کمسنی کی ابھی آتی ہے ترے جسم سے بو
نورسیدہ ہی ابھی لوچ ترے اعضا کا
ابھی نافہم ہے، نادان ہے، معصوم ہی تو
ابھی کل ہی تو دھڑکتے ہوئے دل سے اے دوست
ہنس کے چھوڑا ہے لڑکپن کا گریباں تو نے
مے کا ساغر ابھی پہونچا ہے ترے ہونٹوں تک
ابھی تھاما ہے گل و درد کا داماں تو نے
ابھی رکھا ہے جوانی کے سفینے میں قدم
ابھی سمجھائے گی یہ تیری نظر کیا تجھکو
ابھی دیکھا ہے سمندر کا کنارہ تو نے
ابھی طوفان و حوادث کی خبر کیا تجھکو
ابھی نوخیز کلی پھول بنی ہے کھل کر
نکہتوں کا ابھی پھینکا ہے تری زلف نے دام
مہر کی ضو میں ابھی آئی ہے کچھ حدت سی
چودھویں رات میں رکھا ہے ابھی ماہ نے گام
اجنبیت ہے تری خام اداؤں میں ابھی
تیرا ہر گام، مرا اندازہ تراشا ہد ہے
ابھی آئی ہے بھٹک کر تو اس آبادی میں
ابھی اس کوچۂ پرپیچ میں نو وارد ہے
آ کہ اس راہِ خطر سے تجھے کر دوں آگاہ
کہیں کر دے نہ تجھے تیری جوانی گمراہ

ابھی تک نہیں بھولا تھا" یہاں کے لوگوں میں یہ بات ابھی تک کیوں نہیں پیدا ہوئی" میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ سالم تانگے میں ان کی افسری جچتی ہے۔ میں ذرا اور آگے بڑھا تو کچھ ہنسی کی آوازیں آئیں۔ پیچھے کار دھیمی ہوئی۔ بھائی جان! میں آواز پہچان گیا۔ بغیر پیچھے مڑے میں نے کہا: تخشب صاحب کہاں کی تیاری ہے؟ آئیے آغا صاحب! ہم بھی اسی طرف چل رہے ہیں کنور مہندر سنگھ صاحب سحر نے اپنے شگفتہ چہرے اور روشن چمکدار آنکھوں سے مجھے نوازا۔

تخشب جارچوی، خوش گو، خوش فہم، اور خوش پوش نوجوان ہیں جنہوں نے اپنی رومانی اور مترنم غزلوں سے کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ تخشب صاحب نے اتنے قلیل عرصے میں ایک ایسی روش اختیار کرلی ہے جس میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ موٹر آہستہ آہستہ چل رہی تھی کنور صاحب نے شعر سنایا ؎

عشق سے ہے مشعلِ نظر ورنہ — زندگی کیا ہے اک اندھیری رات

سب نے شعر کی تعریف کی میں نے کہا کنور صاحب آپ کی اس غزل پر رسالہ "آجکل" میں مضمون شائع ہوا ہے حالانکہ آپ کی ذات والا صفات پر کئی مضمون ناکافی رہینگے۔ دلی کے ادبی حلقے میں آپ مشعل ہیں ورنہ یہاں تو اندھیری رات رہتی ہے۔

میں روزانہ سرما اور روشن صبح کی تابانیوں میں اس سڑک سے گذرتا ہوں۔ سورج کی رنگا رنگ شعاعوں کو گھاس پر اس کے موتیوں کے آر پار آتا جاتا دیکھتا ہوں۔ قطرے لرزتے ہیں۔ تھرتھراتے ہیں خدا جانے جوش سے ناچتے ہیں یا وحشت سے تڑپتے ہیں خدا انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مرزا نے کیا خوب کہا ہے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

روزِ روشن کا زوال شروع ہو گیا۔ سائے ڈھلنے لگے۔ دھوپ کی تمازت خنکی میں گھلنے لگی۔

خواجہ تصور ان پیارے آدمیوں میں ہیں جنکی بات ٹالنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ذہین اور ذکی صاحب ظہور الدین آذر کے کلاس فیلو ہیں۔ سنٹ اسٹیفنس کالج کے آل نٹ ہوسٹل میں پر اسرار میراجی جب اپنی نظم سناتے تھے تو میں ظہور کے بستر میں دراز ہو کر ان کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

ظہور کو انگریزی اور اردو ادب سے بے انتہا شغف ہے اور یہ جو پاکیزہ شوق انکے گھر کے ماحول نے ان میں پیدا کیا ہے۔ ظہور ایسا مخلص میزبان تصور ایسا دلچسپ رفیق، سلام ایسا ترقی پسند شاعر، مجاز ایسا پیارا بھائی اور صابر و شکیل کی نغمہ آفرینی غزلیں دلی یونیورسٹی میں ظہور کے کمرے کو آباد رکھتی تھیں۔

خواجہ تصور دلی لٹریری سوسائٹی کے سکریٹری ہیں۔ فوجی اخبار کے برابر ایک کوٹھی ہیں آج شام کو ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی صدارت میں انہوں نے ادبی جلسہ کیا ہے۔

آپ کہاں جا رہے ہیں آغا صاحب! کیا میٹنگ میں شریک نہ ہونگے؟ بھئی میں شاہد لطیف صاحب اور ان کی مشہور و معروف افسانہ نگار بیگم عصمت چغتائی کو لیکر آتا ہوں۔ وہ شاہد صاحب دہلوی کے ہاں سے ہماری طرف آئینگے۔ کون کون آ رہے ہیں میں نے تصور کی سائیکل لیتے ہوئے کہا۔ بہت اچھا جلدی کیجئے۔ خدا کرے شاہد اور عصمت دونوں آ جائیں۔ شاہد صاحب کو تو ایک مضمون پڑھنا ہے عصمت چغتائی پر بخاری صاحب نے جو مضمون لکھا ہے ان کی بجائے وہ حسن عسکری صاحب پڑھکر سنائینگے۔

کیونکہ دہلی پولی ٹیکنیک میں وقار عظیم صاحب نے ایک مشاعرہ کیا ہے۔ بخاری صاحب سنا ہے وہاں صدارت کرینگے۔ وامق جونپوری اور جاں نثار اختر اپنی نئی نظمیں سنائینگے۔ اور ہاں آج آغا سرخوش صاحب کی بھی تو نظم ہے۔ خدا جانے وہ صاحب وقت پر پہنچینگے یا مجھے خود ان کی تلاش میں دوڑنا پڑے گا۔

یونس واسطی اور اشرف انقلابی کا موضوعِ بحث جوش اور اقبال رہتا ہے۔ یہ دونوں متشدد نوجوان کافی ہاؤس، کناٹ پلیس۔ نرولا، اسٹیشن غرض کوئی جگہ ہو اپنے شاعر کے لئے صف آرا ہو جاتے ہیں۔ یونس اقبال کے گن گاتے ہیں اور پنج گانہ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور جوش کی آتش نوائی کے اثر سے اشرف آگ بگولہ ہیں ان کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑتا ہے۔ یہ مٹھیاں بھینچ کر کہا کرتے ہیں ؎ میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب۔

یونس اور اشرف اسوقت بھی بحث میں الجھے ہوئے میرے پاس سے گذرے۔

میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ حفیظ جالندھری صاحب کا انتظار ہے۔ یہ دونوں صاحب حفیظ کی فکر میں ہیں حفیظ کا ترنم لحنِ داؤدی سے کم نہیں ہے کتنی دفعہ حفیظ کے ترنم اشعار سن چکا ہوں مگر پھر بھی جی نہیں بھرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے بالاثر حفیظ جالندھری پڑھ رہے ہیں ؎

میرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں — سخن ہے نالۂ دل نغمۂ رباب نہیں

میں واپس چلا آیا۔ کل پھر صبح جگمگائے گی اس سڑک پر چلنے والے آئینگے اور چلے جائینگے۔ مگر نہ جانے یہ سڑک کب سے ہے اور کب تک اسی طرح رہے گی کتنی چاندنی راتوں اور جگمگاتے ہوئے دنوں کے جلوے اس نے دیکھے ہونگے کتنی بہاروں کی نکہتیں اس نے اپنے دامن میں چھپا رکھی ہوں گی۔ اور کتنے سبک خرام اس پر سے گذر کر نہ معلوم کہاں چلے گئے ہونگے۔

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشاں است — حالیہ غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

(حافظ)

قلعۂ رائسین اور اس کے کتبات

مائل نقوی

(۲)

پچھلی اشاعت میں جن کتبات کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

پہلے کتبہ کی تشریح:۔ اس کتبہ کی دوسری سطر میں جو "دتا محمودساہی" لکھا ہوا ہے وہ "بن محمود شاہ" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ محمود شاہ کا لڑکا غیاث الدین خلجی تھا جس کا ذکر اوپر کسی جگہ آچکا ہے۔ تیسری سطر میں "مالوہ دیش" کا مطلب صاف ہے۔ ہاں "اگدائے ایبا ددا" کی عبارت قابل غور ہے۔ لیکن تھوڑی سی فکر کے بعد یہ مشکل بھی حل ہوجاتی ہے۔ اس عبارت سے مطلب ہے "قلعۂ ایبا آباد" لیکن یہ ایبا آباد کیا؟ ایبا آباد، اسلام آباد کا بگڑا ہوا ہے۔ قلعۂ رائسین کے پائیں رائسین نام کا ایک قصبہ آباد ہے۔ شاہان مالوہ نے رائسین کا نام اسلام آباد رکھا تھا چنانچہ آج بھی رائسین کے ایک حصہ کا نام اسلام آباد اور دوسرے کا خیر آباد ہے۔ تاریخ فرشتہ میں جہاں مالوہ کا ذکر آتا ہے تو واقعات کے ذیل میں اسلام آباد کا نام اکثر آتا رہتا ہے۔ مثلاً شاہان مالوہ کے سلسلہ میں ایک جگہ ایک عبارت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ۔

> محمود شاہ سلطان نے شاہزادہ احمد شاہ غوری کو اسلام آباد کا علاقہ جاگیر میں عنایت کیا۔ شاہزادہ جب یہاں پہونچا تو قلعہ کے استحکام اور اس کے قدرتی جائے وقوع دیکھ کر قلعہ کی تسخیر کا ارادہ کیا اور اس غرض سے اسلام آباد پر ایک زبردست فوج جمع کی۔ محمود خلجی کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے جانباز سپہ سالار تاج خاں کی سرکردگی میں ایک جرار لشکر شاہزادہ کی سرزنش کے لئے روانہ کیا۔ تاج خاں کوچ در کوچ کرتا ہوا اسلام آباد پہونچا مگر قلعہ کی رفعت و استحکام کے آگے کچھ زور نہ چل سکا اور اسے ناکام ہونا پڑا۔ اس سے پہلے بھی سلطان کا باپ اعظم ہمایوں اپنی فوجی قوت اور حملے کے زور سے اس قلعہ کو زیر نہ کرسکا تھا۔[1]

چوتھی سطر میں جو "مالکاترکمانا مالاملوکا سلطانی" لکھا ہوا ہے اور جس کا اعادہ نویں، دسویں اور گیارھویں سطر میں بھی کیا گیا ہے وہ درحقیقت "ملک ترکمان الملک سلطانی" لکھا ہوا ہے جو غالباً ۱۴۹۱ء میں اس قلعہ کا حاکم تھا۔

پانچویں سطر میں "امرتا باباتاما" کا مطلب بھی سمجھ لیجئے۔ یہ "امرت بائی نامی" کی خرابی ہے جو تاریخ مالوہ میں ایک مشہور خاتون رہی ہے۔ غیاث الدین خلجی فرمانروائے مالوہ کے حرم میں مختلف نسل و مذہب کی پندرہ سو عورتیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے ساتھ سلطان کو بہت زیادہ محبت تھی اور اس خصوصیت میں امرت بائی سب سے ممتاز تھی۔ اب ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتبے کا مطلب صاف ہوگیا جو یہ ہے۔

> سمت ۱۵۴۷ مطابق ۱۴۹۱ء ساکھا ۱۴۱۳ پنگلہ ماگھ بدی تیرس وادی دنا، پوس نچھتر۔ (موافق سہ شنبہ ۲۳ جنوری ۱۴۹۱ء) جبکہ سلطان غیاث الدین بن محمود شاہ مالوہ کا بادشاہ تھا اور جب ترکمان الملک سلطانی اسلام آباد کا حاکم تھا حرم سلطانی کی نامور خاتون امرت بائی نامی نے یہ مندر تعمیر کرایا۔

مندر مذکور سری گنیش کی پوجا کے لئے تعمیر کردیا گیا تھا۔ مندر کے اندرونی حصہ میں گنیش جی کی مورتی بھی نصب کرائی گئی تھی۔ یہ مورتی تو اب موجود نہیں ہے لیکن مندر کے دروازے اور محراب کے اندرونی بالائی حصہ پر گنیش جی کی جو مورتیں کندہ ہیں وہ مکمل اور صحیح حالت میں ہیں۔ یہ مندر اب "بیبیا مندر" کے نام سے موسوم ہے اور عہد قدیم کی فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ صحن مندر کے شمالاً جنوباً دو زمین دوز وسیع دالان ہیں۔ شمالی دالان پر کوئی چھت نہیں ہے۔ جنوبی دالان محفوظ تہ خانہ کی صورت میں ہے۔

قلعہ کی دوسری جاذب نظر عمارت غانم الملک کی مسجد ہے۔ اس مسجد میں کتبہ کا ایک پتھر نصب ہے جس کا طول ۳ ½ فٹ اور عرض ۲ ½ فٹ ہے اور اسے ۲۷ خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دو خانوں میں حمد و نعت اور بادشاہ کی مدح کے اشعار ہیں۔ بقیہ ۲۴ خانوں میں ۱۷ شعر ہیں۔ یہ کتبہ اب تک محفوظ ہے۔ اشعار صاف پڑھے جاتے ہیں۔ تحریر میں خط نسخ استعمال کیا گیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اکثر اشعار غیر موزوں ہیں۔ نیز ان کا وزن بھی یکساں نہیں ہے۔ کوئی شعر کسی بحر میں ہے کوئی کسی بحر میں۔ بعض جگہ تو یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی شعر کے دو مصرعے بے ربط بھی ہیں، غیر موزوں بھی ہیں اور وزن جو کچھ بھی سمجھا جائے اس میں بھی ہم آہنگی نہیں۔ ان امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشعار کا مصنف اصول شعر اور عروض سے بیگانہ محض تھا۔

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد چہارم مرتبہ برگس ۱۹۰-۱۹۸

مسٹر غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد دکن نے اپنی کتاب "ایپی گریفیا انڈو سلیمیکا" میں اس کتبے کو شائع کیا ہے لیکن موصوف نے بعض اشعار کے پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ علاوہ ازیں کتبے کے جس قدر حصہ کی نقل انھوں نے شائع کی ہے اور اس سے جو تاریخی امور اخذ کئے ہیں افسوس ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ اتفاق نہیں ہے۔ یزدانی صاحب نے مسجد کی تاریخ تعمیر ۹۹۵ھ مطابق ۱۵۸۶ء تحریر فرمائی ہے جو کہ شہنشاہ اکبر کا عہد ہے لیکن سنہ تعمیر کا یہ تعین صحیح نہیں۔ کتبہ کے آٹھویں شعر کے پہلے مصرع سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر سلطان غیاث الدین فرمانروائے مالوہ کے عہد میں شروع ہوئی تھی آخری شعر میں تاریخ تکمیل بھی درج ہے جو کہ ۹۰۵ھ مطابق ۱۴۹۹ء ہے اور یہ بھی سلطان غیاث الدین ہی کا عہد حکومت ہے کیونکہ اس کا انتقال ۱۵۰۰ء یعنی تکمیل مسجد کے ایک سال بعد ہوا۔ نظم مذکور کی نقل ہم یہاں اس لئے درج نہیں کر رہے ہیں کہ غیر ضروری طویل ہونے کے علاوہ اس کے اکثر مصرعوں میں ربط و موزونیت تک نہیں ہے اور بجز اس کے کہ ناظرین کے مذاق سلیم پر بار ہو اس سے کوئی مفید نتیجہ بھی مرتب نہیں ہوتا محض نمونہ کے طور پر چند اشعار کی نقل کئے دیتے ہیں ؎

از عنایت گر بخواہی تاج بخشی بے شمار	لے نوزنا از ہمہ قادر توئی آمرزگار
غانم الملک و عالم ہر زمان شی تو شاد	ثانی از شمس و قمر آں مسجد گنبد نہاد
واں گر فردوس عالم روضۂ خورشید ساز	این است بیت اللہ مسجد جامع فرض نماز

یزدانی صاحب فرشتہ کے حوالے سے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ۹۳۴ھ مطابق ۱۵۲۸ء میں بابر نے میدنی رائے کو شکست دینے کے بعد رائسین، چندیری، سارنگ پور اور رنتھنبور کی مساجد کی از سر نو تعمیر اور مرمت کرائی تھی۔ کیونکہ میدنی رائے نے انھیں مویشی خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بابر چندیری سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ اس واقعہ کو اس نے تزک بابری میں خود اپنے قلم سے لکھا ہے اسکی تحریر کا ترجمہ یہ ہے:-

"میرا ارادہ تھا کہ فتح چندیری کے بعد رائے سنگھ (رائسین) بھلسن (بھلسہ) اور سارنگ پور پر حملہ کروں اور انھیں فتح کر کے سنگا کے خلاف چتوڑ پر فوج کشی کروں۔ مگر شمالی ہند سے بغاوت کی ناگوار خبریں آنے کے باعث میں نے چندیری سلطان ناصر الدین سابق بادشاہ مالوہ کے پوتے احمد شاہ کو عنایت کیا [۲]۔"

تیسرا کتبہ جو نظامت کے شمالی دروازے کے ستون پر نصب ہے اسکی عبارت حسب ذیل ہے:-

---

(۱) برگ جلد دوم صفحہ ۶

(۲) تزک بابری صفحہ ۴۶۳

سمت ۱۵۸۰ سومابچم ندی ماگھ
سلا ھدادو - جھارانا بھوماپتی
ماپھی خوبو گنگا جمنا پانی توتو

یہ کتبہ بہت دلچسپ اور تاریخی حوالجات کا مخزن ہے۔ پہلے کتبہ کا مفہوم ذہن نشین کر لیجئے "سمت ۱۵۸۰ سوماپچم ندی" تو دو شنبہ ۵ فروری ۱۵۲۲ء کے مطابق ہے۔ سلا ھدادو، اور جھارانا بھوماپتی انھیں باپ بیٹوں کے نام ہیں جنھیں تاریخ میں سلہدی اور بھوپت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "ماپھی" اصل میں معافی ہے اور یہ اصطلاح اس زمین کے لئے ہے جس پر سرکاری لگان معاف ہوتا ہے۔ "گنگا جمنا پانی تو تو" یعنی اس وقت تک جب تک کہ گنگا جمنا میں پانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک گنگا جمنا میں پانی رہیگا اسوقت تک یہ زمین بھی بطور معافی کے رہے گی۔

اب ناموں کی تشریح ملاحظہ ہو۔ سلہدی کا نام مالوہ اور چتوڑ کی تاریخ میں خاص واقعات کا حامل ہے۔ یہ شخص رانا سانگا والئی چتوڑ کا داماد تھا۔ رانا کی لڑکی درگاوتی کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی اس عہد میں محمود ثانی سلطان مالوہ (۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۷ء) میدنی رائے کا غیر معمولی اثر تھا۔ میدنی رائے مسلمان سرداروں کو نکلوا کر ان کے عہدے اور علاقے سلطان سے ہندوؤں کو دلواتا رہتا تھا۔ اسی سلسلے میں رائسین بھیلسہ اور سارنگ پور کے علاقے سلہدی کو دئے گئے تھے۔ ۱۵۲۶ء میں سلطان نے رائسین اور بھیلسہ کے کچھ گاؤں اسے بطور دائمی معافی کے بھی عطا کئے[۱]۔ کتبہ مذکور اسی دائمی جاگیر کا فرمان ہے۔

یہ شخص سخت محسن کش اور ناشکر گزار ثابت ہوا عطائے جاگیر کے تھوڑے دنوں بعد اپنے ولی نعمت سے باغی ہو کر مع اپنے بیٹے بھوپت کے بہادر خاں سلطان گجرات سے جا ملا اور اس کے ساتھ سازش کر کے اپنے آقا پر چڑھا لایا۔ بہادر شاہ نے مالوہ کو فتح کر کے رائسین اور سارنگ پور کے علاقے سلہدی کو جاگیر میں دے دئے۔ ۱۵۳۱ء میں بہادر شاہ کو اطلاع ملی کہ سلہدی نے چار سو مسلمان عورتوں کو اپنے محل میں بہ جبر رکھ چھوڑا ہے۔ سلطان نے اسکی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ سلہدی سلوانس کی طرف بھاگا جا رہا تھا کہ سلطان نے اسے گرفتار کر کے مانڈو میں قید کر دیا۔ یہاں سلہدی نے اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا اور شاہی دربار میں حاضر ہو کر مسلمانوں کے ساتھ کھانے میں شرکت بھی کی۔ اسکا نام صلاح الدین رکھا گیا اور اس بات کی اجازت دی گئی کہ رائسین جا کر اپنے اہل و عیال کو لے آئے۔ لیکن جس وقت وہ رائسین پہنچا رانی درگاوتی نے اسے اور اس کے بھائی لوکمن کو سخت لعنت ملامت کی کہ

---

(۱) تاریخ فرشتہ برگ جلد چہارم صفحہ ۲۶۱

قلعہ میں عورتوں کو تنہا چھوڑ کر خود فرار ہو گئے اور ان دونوں پر بے میتی کا عذاب نازل کرانے کی غرض سے زنان خانہ کے چاروں طرف رانی نے ایک عظیم چتا تیار کرائی اور سات سو عورتوں کے ساتھ دہکتی آگ کے شعلوں میں کود پڑی۔ سلہدی اور لوکمن اس منظر سے متاثر ہو کر اپنی نسل کے ایک سو آدمیوں کے ساتھ اچانک بہادر شاہ کے لشکر پر ٹوٹ پڑے اور مختصر سی لڑائی کے بعد مارے گئے۔ رانی کا محل تو اب اینٹ پتھر کا ڈھیر ہے۔ ہاں چتا کی جگہ بدستور محفوظ ہے اور اس کے وسط میں ایک مینار بطور یادگار کے تعمیر کیا گیا ہے۔ اسی کے قریب ایک لوہے کی لاٹھ پڑی ہوئی ہے۔ یہ چار فٹ لمبی، ۲ - اینچ مدور اور دو من وزنی ہے۔ جلم کے حسن اعتقاد میں یہ سلہدی کا عصا ہے۔ ایک سرے پر آہنی لٹو اور دوسرے سرے میں ایک سوراخ ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ لاٹھ کسی زمانہ میں ایسا کے مندر میں نصب ہو گی اور اس سے وقت کا اندازہ کیا جاتا ہوگا۔

چوتھا کتبہ نظامت کے جنوبی ستون پر ہے لیکن یہ اس درجہ خراب ہو گیا ہے کہ بجز سنہ اور چند ناموں کے باقی تحریر بالکل نہیں پڑھی جاتی۔ جو کچھ پڑھا جاتا ہے یہ ہے:—

"سمت ۱۵۹۹ سنی دنا نومی بدبھدا پدا"

"مہاراج ادھیراج پرتاپ ساہی دیو"

"مہاراجکما. پورن ملادیو"

"چندر بھان دیو"

ان میں سے پہلا نام پرتاپ ساہ کا ہے۔ یہ بھوپت کا خرد سال بچہ تھا اور اس کے بجائے پورن مل (جسے کتبہ میں پورن ملا لکھا ہوا ہے) قلعہ رائسین کا انتظام کرتا تھا۔ رائسین کو ۱۵۳۲ء میں ہمایوں نے فتح کیا۔[1] اس زمانہ میں یہاں ایک شخص ملوخاں نامی تھا جو کہ شاہان مالوہ کے عہد حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکا تھا۔ ہمایوں کے پیٹھ پھیرتے ہی ملوخاں نے نربدا سے بھیلسہ تک تمام علاقہ دبا لیا اور مانڈو کو اپنا پایۂ تخت قرار دیکر قادرشاہ کے لقب کے ساتھ مالوہ کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ ان واقعات کی خبر پا کر پورن اور بھوپت دونوں بھائی چتوڑ سے مالوہ کی طرف بڑھے اور رائسین پر قبضہ کر لیا مگر کچھ ہی عرصہ بعد انھیں قادرشاہ کی اطاعت اختیار کرکے باجگذار بننا پڑا۔ اس وقت سلہدی کا لڑکا پرتاب خورد سال تھا۔ چندیری اور رائسین اس کی جاگیر میں تھی اس لئے پورن مل اس کی جاگیر کا منتظم ہو گیا۔[2]

پانچویں کتبہ میں اس فرمان کا حوالہ ہے جس کے ذریعہ قادرشاہ نے رائسین اور نواح کے مواضعات پرتاب کو جاگیر میں دیئے تھے۔ قادرشاہ کچھ زیادہ عرصہ تک حکومت کا لطف نہ اٹھانے پایا۔ ۱۵۴۲ء میں شیرشاہ نے مالوہ کا رخ کیا اور قادرشاہ کو تخت سے اتار کر مالوہ پر اپنی حکومت قائم کی۔ بمقام گاگرون پورن مل کو حکم ملا کہ شیرشاہ کے دربار میں حاضر ہو۔ دربار میں اس کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا گیا اور بحفاظت تمام اُسے اپنے علاقہ پر واپس بھیج دیا گیا مگر سیاسی مصالح کی بنا پر اُسے اس امر کا پابند کیا گیا کہ بطور ضمانت کے اپنے بھائی چھتر مل کو دربار شاہی میں روانہ کردے۔ پورن مل نے بحسن و خوبی اس حکم کی تعمیل کی۔[2]

چھٹے کتبے میں اُس شاہی فرمان کا ذکر ہے جس کے ذریعہ شیرشاہ نے رائسین معہ مضافات پرتاب کو بطور جاگیر کے مرحمت کیا تھا۔ ۱۵۴۳ء میں شیرشاہ کو پرچہ گزرا کہ پورن مل نے نہایت ظلم و ستم سے کام لے کر دو ہزار عورتوں کو اپنی بیویاں بنا کر محل میں رکھ چھوڑا ہے جن میں کچھ مسلمان عورتیں بھی ہیں۔ ایک معتمد یادگار کا بیان ہے کہ ان عورتوں میں سادات بلگرام کی وہ خواتین بھی تھیں جنھیں پورن نے بہ جبر حاصل کیا تھا۔ شیرشاہ اس خبر کے سنتے ہی یلغار کرتا ہوا مالوہ کی طرف بڑھا اور قلعہ رائسین کے سامنے ڈیرے ڈال دئے۔ مندرجہ ذیل مصرع سے اس واقعہ کی تاریخ نکلتی ہے:—

"قیام بارگاہ باشد مبارک"

محاصرہ نے کسقدر طول کھینچا۔ ۹۵۰ھ آخرکار پورن مل نے اطاعت قبول کی۔ شیرشاہ نے اس کی جان بخشی کی لیکن حکم دیا کہ قلعہ خالی کردے اور اپنے تمام ساز و سامان اور سپاہ کو لے کر بعافیت باہر نکل جائے۔ جب تک شیرشاہ رائسین کے قریب خیمہ زن رہا پورن مل کو مہمان سلطانی بنا کر قیام شاہی کے قریب مقیم رکھا گیا۔ اس زمانہ میں ہر وقت بیوہ عورتوں، یتیم بچوں اور مظلوم رعایا کی کثیر جماعت شیرشاہ کے راستوں پر جمع رہتی تھی اور پورن مل کے مظالم کی داستانیں بیان کرکے فریاد کرتی تھی۔ پورن مل کو اپنی حسین ترین رانی رتن دلی کی طرف سے بھی اندیشہ تھا اس لئے موقع پاکر اُسے تہ تیغ کر دیا۔ اس کی پاداش میں اُسے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ شیرشاہ نے قلعہ رائسین کو اپنی سلطنت کے خاص قلعوں کی فہرست میں داخل کیا اور اس میں ہر وقت ایک ہزار مسلح سپاہ کا قیام رہنے لگا۔ اکبر کے عہد میں یہ علاقہ فتح ہو کر قلمرو مغلیہ میں شامل ہوا۔ قلعہ کی سیاسی اہمیت بدستور برقرار رہی۔ اورنگ زیب کے بعد سردار دوست محمد خاں نے جب ریاست بھوپال کی بنیاد ڈالی اس وقت اس نواح میں سخت شورش پھیلی ہوئی تھی۔ سردار موصوف نے اس شورش کو فرو کیا۔ اس کے صلہ میں انھیں قلعہ رائسین کی سند عطا کی گئی۔ ۱۷۹۱ء میں بھوپال کے ایک سردار مرید محمد خاں نے یہ قلعہ مرہٹہ سردار بالا راؤ انگلیہ کے حوالے کر دیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد میاں وزیر محمد خاں نے جو خاندان شاہی کے ایک رکن تھے اُسے واپس لے لیا۔ اسوقت سے اب تک قلعہ رائسین فرمانروایان بھوپال کے قبضے میں ہے۔

---

[1] اکبرنامہ [2] تاریخ شیرشاہی ص۲۹۰

برطانیہ کے نئے مکانات

نارمن جوڈن موس

(سپاہی لڑائی کے میدانوں سے واپس آرہے ہیں۔ ان کے واسطے اچھے اور زیادہ سے زیادہ مکانوں کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۱۸ء کے بعد بھی جب ایسی ہی مشکل برطانیہ کو درپیش تھی تو اس وقت اس کے ایک بڑے شہر نے اس مشکل کو کس طرح حل کیا تھا۔ اس زمانہ کی منصوبہ بندی اب تک کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے اس لئے آج بھی اس گتھی کو سلجھانے میں اس منصوبہ بندی سے مدد لی جاسکتی ہے۔)

۱۹۱۹ء میں مانچسٹر کی مجلس تعمیرات کے سامنے ایک ایسا مشکل کام تھا جس کی تکمیل بظاہر ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ لڑائی کے ختم ہو جانے پر سپاہی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے آرہے تھے۔ تعمیرات اور مرمت کا کام رکا پڑا تھا اور لاگت بہت زیادہ آتی تھی۔ اٹھارہ ہزار مکانات کی کمی تھی اور باون ہزار نئے مکانوں کی ضرورت صنعتی اور حرفتی توسیع کا بھی خیال رکھنا تھا۔ ضروریات کو کفایت کرنے کے لئے شہر میں مکانوں کے واسطے جگہ بھی نہ تھی۔

شہر کے بڑے نقشہ کش نے نئے مکانوں کے واسطے موقع کی زمین تلاش کرنے کے بعد رپورٹ دی کہ شہر کی جنوبی سرحد کے پار کچھ زمین افتادہ موجود ہے۔ یہ زمین قدیم ٹے ٹن خاندان کی جاگیر تھی اور یہی آراضی اس مشکل کو حل کر سکتی تھی۔ اس افسر نے اس آراضی کا جائزہ جتنا زیادہ لیا اسی قدر زیادہ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ جب اس نے وہ وسیع زمین دیکھی جو باغوں کے لئے مختص تھی تو اس کی آنکھوں کے آگے ایک ایسے شہر کا نقشہ کھنچ گیا جو باغوں سے بھرا ہوا ہو۔ اس نے خیال کیا کہ اگر اس جگہ شہر آباد ہو گیا تو یہ بڑا خوبصورت شہر ہوگا جس میں باغات بھی ہوں گے، صفائی بھی ہوگی، شہر سے قریب بھی ہوگا لیکن شہر کی گندگی اور دھوئیں وغیرہ سے امن رہے گا۔

لیکن بہترین "پلاننگ" کی ضرورت تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ نیا شہر قریب کی دیہاتی زندگی کی خوشگواری میں حارج نہ ہو بلکہ قریب کے دیہات کو خود اس شہر کے حسن میں اضافہ کرنا چاہئے۔

شہر کی مجلس تعمیرات نے ماہر تعمیرات پروفیسر ایبر کرومبی کے مشورہ کیا اور جب عضائے مجلس کو دریافت ہوا کہ شہر کے بڑے نقشہ کش کی رائے مناسب اور معقول ہے تو مجلس نے قدم آگے بڑھا ہی لیا۔ اسی اقدام پر پورے منصوبہ کا دارومدار تھا۔ مجلس نے یہ تجویز پاس کی کہ وہ قطعۂ زمین خرید لیا جائے۔ تجویز کے منظور ہو جانے پر ۱۹۲۶ء میں خاندان ٹے ٹن کی یہ قدیم جاگیر خرید لی گئی۔ پارلیمنٹ کے ایک خصوصی قانون کے ذریعہ اس کے قریب کے تین کلیسائی حلقے مانچسٹر ہی کا ایک جزو بن گئے۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج مانچسٹر کارپوریشن کی ملکیت میں ۴ ہزار ۵ ایکڑ زمین ہے۔ یہ قطعۂ آراضی پورے ضلع کی ۳۲ فیصدی ہے۔ اس کا نام "وائی دنشا" رکھا گیا۔

اس صورت میں نئے شہر کی پلاننگ اور اس کا مرفہ جس پیمانہ پر ممکن ہو سکا وہ دیہاتی اضلاع کے کارپردازوں کی بس کی بات نہیں تھی۔ تمام ابتدائی کام، سڑکیں، نالے، پانی، گیس اور بجلی کی فراہمی یہ سب کچھ کرنا پڑا بلکہ دریائے مرسی کے اوپر پل بھی بنانا پڑا۔ یہ سب کچھ صرف اس لئے کیا گیا اور تمام خرچ اس لئے برداشت کیا گیا تاکہ ایسے مکان بن سکیں جن سے آگے چل کر کرایہ وصول ہو سکے۔

مسٹر بیری پارکر نے جنہوں نے لیچ ورتھ کا ماڈل ٹاؤن اور ویلوین گارڈن کے مضافات کے نقشے تیار کئے تھے اس نئے شہر کا نقشہ بنایا۔ اس نقشے کو بناتے وقت مسٹر بیری نے بہ یک وقت ایک سائنسدان، ایک ٹیکنی شین، ایک آرٹسٹ اور ایک ماہر عمرانیات کے سے فکر و نظر سے کام لیا۔

مکانات بناتے وقت ہر طبقہ کے آدمیوں کی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا تھا اور مکانات چھوٹے بڑے کنبوں کے لئے الگ الگ بنائے گئے تھے۔ بڑے کنبے والوں کے لئے سونے کے کمرے دو، تین اور چار رکھے گئے، بوڑھے آدمیوں کے واسطے سنگل اور دو منزلہ بلاک اور سہ منزلہ فلیٹ غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے۔ ایسے کنبوں کے واسطے جو مکانات پر فلیٹس کو ترجیح دیتے ہیں زیادہ بڑے بلاک بنائے گئے۔ مناسب موقع و محل پر مکانات کی نجی تعمیرات کی بھی ہمت افزائی کی گئی۔ جو مکانات کارپوریشن نے بنائے ان کے لئے حد تعمیر بارہ مکان فی ایکڑ رکھی گئی اور نجی طور پر بنائے جانے والے مکانات کے واسطے دس، آٹھ اور چھ مکان فی ایکڑ۔

کچھ دنوں سے "نیبر ہڈ یونٹ" کا خیال ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مکانوں کے ہر گروپ میں اس کے اپنے بازار، اسکول، گرجا گھر، سینما، ہوٹل، ہسپتال، کتب خانے اور حمام وغیرہ ہوں۔ یہ تمام چیزیں ماہرین کی رائے اور مشورہ سے مہیا کی جانے والی تھیں۔ ستمبر ۱۹۴۲ء تک آٹھ ہزار سے زیادہ ایسے مکانات کارپوریشن بنا چکی تھی اور آٹھ سو اکسٹھ نجی طور پر بن چکے تھے۔ دور حاضرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے آٹھ اسکول، بارہ گرجا گھر، چار ہوٹل اور دو سینما بھی تیار ہو چکے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پوری تیاری کے بعد ان مکانات میں اسی ہزار آدمی رہ سکیں گے۔ نئے پبلک ادارے اور نیا ہسپتال بننا ابھی باقی ہے۔

اسکولوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس شہر کی پلاننگ کس قدر

غور و خوض کے بعد بنی گئی ہے۔ تمام مدرسوں کا محل وقوع ایسا رکھا گیا ہے کہ آتے جاتے بچوں کو کسی بڑی سڑک کو جہاں آمد و رفت زیادہ ہو پار کرنا نہیں پڑتا۔

اس شہر کے مضافات میں مکانات بنانے کی ممانعت ہے اس وجہ سے اس کے اردگرد ہرے بھرے کھیتوں کا ہونا لازمی ہے۔ ان کے علاوہ خود شہر کے اندر بھی مناسب مقامات پر باغات اور سڑکوں کے کنارے درختوں کا انتظام کیا گیا ہے

ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اندرون شہر بڑی بڑی سڑکیں ہیں بعض سڑکیں امریکی وضع کی ہیں جن کی کل چوڑائی تین سو فٹ (۹۱ میٹر) ہے ان پر گاڑیاں بہ آسانی چلتی پھرتی ہیں اور اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ شہر کی عمارتیں اور مکانات ان کے غل غپاڑے سے محفوظ رہیں۔

ان باغوں اور عمدہ سڑکوں کی وجہ سے شہر کی خوبصورتی پورے طور پر قائم رہ سکتی ہے۔ اس علاقہ میں نے ٹن خاندان کا پرانا باغ اور ہال جس جگہ اور جس حالت میں تھا بالکل اسی طرح رہنے دیا گیا ہے۔ وہاں پبلک کی آمد و شد کے واسطے سڑک بنا دی گئی ہے "پیل ہال" کو جہاں پہلے ایک پرائیویٹ پارک تھا اور جو اب اسی نے ٹن جاگیر کا ایک جزو ہے "میونسپل گولف کورس" بنا دیا گیا ہے۔ اس علاقہ میں جابجا باغات اور تفریحی مقامات کے لئے جگہ برقرار رکھی گئی ہے

اس نئے شہر کی خوبصورتی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ (باقی صفحہ ۹۰ پر)

نقد و نظر

تعمیرِ ملت مصنف:- جناب محمد شریف چشتی ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)، ناشر:- کتب خانہ پنجاب - لاہور۔ ۲۰×۲۰/۱۶ کے ۱۶۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غیر موزون طریقۂ تعلیم اور غلط زاویۂ نظر کے باعث ہندوستان میں اسلامی تصورات اصولی طور پر صحیح راستے سے بھٹک چلے ہیں۔ اسی لئے ظاہری الفاظ باقی رہنے کے باوجود ان کی اصل روح مفقود ہوتی جارہی ہے۔ ارکان اسلام کی پابندی کی جاتی ہے لیکن محض رسمی طور پر، ان کی غرض وغایت کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے چشتی صاحب نے اس ہیئت منقلب کو محسوس کرتے ہوئے مسائل دین پر عالمانہ انداز میں بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس وقت جبکہ سیاسی بدنظمی ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہے ایک مرکز پر آنا مسلمانوں کے لئے کس درجہ ضروری ہے۔ اس کتاب میں کسی خاص مذہبی فرقے یا سیاسی جماعت کی پیروی کرنے کے لئے دعوت نہیں دی گئی بلکہ بحیثیت مجموعی اصل روح اسلامی سے سینوں کو معمور کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے لیکن وقت اور ضرورت کے لحاظ سے ایسی جتنی بھی کوششیں ہوں، لائق تحسین کہی جاسکتی ہیں۔

سرخ افسانے مترجم:- جناب اسرار احمد آزاد۔ ناشر:- نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۸ صفحات۔ مجلد۔ قیمت تین روپے۔ اس وقت جب سرزمین روس پر آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی اور سرخ فوج کے بہادر سپاہی اپنے وطن کی عزت و آبرو اور آزادی برقرار رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا بیٹھے تھے، چند حساس دل و دماغ متاثر ہوئے اور انہوں نے ان حوادث و سانحات کو افسانوں کے پیرائے میں لکھ دیا۔ یہ افسانہ نگار میدان ادب میں کسی خاص شہرت کے حامل نہیں، اس لئے ان کی نگارشات میں افسانوی چابکدستی و فنکاری کی کمی ہے لیکن اصلیت سے قریب اور حقائق پر مبنی ہونے کے باعث ان میں وہ خوبی ضرور ہے جو صداقت کو خیالی افسانوں سے زیادہ جاذب نظر اور حیرت انگیز بنا دیتی ہے اور اسی لئے ان کی قدر کی جاسکتی ہے۔ ان افسانوں نے ان سپاہیوں کے دلوں میں جو میدانِ جنگ میں خود برسرپیکار تھے یا جو میدان جنگ سے دور اپنی باری آنے پر وقت اور موقع کے منتظر بیٹھے تھے جرمنوں کے خلاف نفرت و حقارت کے بیج بوئے اور زبردست جوشِ عمل بھی پیدا کیا اور انہوں نے پورے عزم و ارادے کے ساتھ نازیت کے استیصال کا بیڑا اٹھالیا۔ اسلئے ظاہر ہے کہ ان کی کوششیں کامیاب رہیں اور اس طرح افسانہ نگاروں کا مقصد بھی، پورا ہوگیا۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ روسی فتوحات کے سلسلے میں جانباز سپاہیوں کے ساتھ ساتھ وہ لائق افسانہ نگار بھی تعریف کے مستحق ہیں جن کے انیس ۱۹ ادب پارے اس مجموعے میں شریکِ اشاعت ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے روسی لڑائی کا سارا پس منظر داستانِ عبرت بن کر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ترجمہ کافی اچھا اور تعریف کے لائق ہے۔ افسانوں کا انتخاب بھی برا نہیں ہے۔

ستارے مصنف:- علامہ نجم آفندی صاحب اکبرآبادی۔ ناشر:- دکن اردو اکاڈمی۔ ادارۂ شرقیہ۔ حیدرآباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۵۶ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت دس آنے۔ یہ تینتیس ۳۳ نظموں کا مجموعہ ہے جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ لیکن شروع کی اکثر نظموں میں جو حیدرآباد اور اس کے ماحول سے یا مزدور و کسان سے متعلق ہیں، خاص طور پر اور باقی میں کہیں کہیں ایسے الفاظ شامل ہیں جن کو بچے آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ ضرورت تھی کہ حاشیہ پر یا کتاب کے آخر میں ان کی تشریح کردی جاتی تاکہ بچے دوسروں کی مدد کے بغیر ان کا مطالعہ کرسکتے تاہم آخری آدمی کے قریب نظمیں بہت اچھی ہیں۔ ان کا ماحول بھی بچوں کے عام مذاق کے مطابق ہے۔ وہ آسانی سے انہیں زبانی یاد کرکے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان نظموں کے بیچ میں جن صفحات پر کچھ جگہ خالی رہ گئی تھی، مولانا حالی مرحوم کی رباعیات شائع کردی گئی ہیں۔

کامیاب مرغی خانہ مصنف:- خواجہ بدرالسلام صاحب فروغی۔ ناشر:- کتب خانہ دارالبلاغ۔ محمد نگر میو روڈ۔ لاہور۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۸ صفحات۔ جلد معمولی۔ قیمت دو روپے۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد جب سے لام بندی کا سلسلہ شروع ہوا ہے، حکومت ہند برطرف کئے ہوئے نوجوان سپاہیوں کو مختلف کاموں میں مصروف رکھنے کے لئے بے شمار منصوبے بنا رہی ہے۔ انہی منصوبوں میں سے چند مرغی خانے سے متعلق ہیں۔ حکومت کا منشا یہ ہے کہ فوجی تھوڑی بہت تربیت کے بعد مرغیوں کی پرورش اور ان کے رکھ رکھاؤ کے طریقے سیکھ جائیں اور اس نئے روزگار سے اپنی گذر اوقات کرسکیں۔ ایسے لوگوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔ لائق مصنف نے مرغیوں کے دڑبے اور باڑے بنانے سے لے کر ان کی پرورش، نسل کشی اور حفاظت کے تمام طریقے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرڈالے ہیں۔ اگر ان ہدایات پر اچھی طرح عمل کرتے ہوئے یہ سلسلہ شروع کیا جائے تو فائدہ خاطر خواہ ہوسکتا ہے۔ کتاب میں موضوع سے متعلق تصویریں اور خاکے بھی شامل ہیں جن کے باعث وہ زیادہ دیدہ زیب اور کارآمد بن گئی ہے۔

اجالے سے پہلے مصنف:- جناب مدھوسودن۔ بی اے۔ ناشر:- اردو محل، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۱۶ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ۱/۸۔ اس مجموعے میں بقول مصنف پندرہ افسانے ہیں لیکن تکنیک کے نقطۂ نظر سے ان کو افسانوں کی بجائے صرف خاکے کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ ان میں ایسے لوگوں کی ذہنی الجھنوں کے نقوش موجود ہیں جو غربت و افلاس یا جنسی بھوک سے تنگ آکر نہایت مجبوری اور پریشانی کے ماحول میں دن گذار رہے ہیں۔ بھوک سے تنگ آکر خودکشی کرلینا، کوشش کے باوجود ملازمت کا نہ ملنا، بڑھاپے کے لالچ میں غریب لڑکی کا کسی رئیس کے پلّے بندھ جانا، رسم و رواج کی پابندیوں کے باعث پڑوس کی لڑکیوں پر قبضہ نہ ہوسکنا، روزمرّہ کے ایسے پامال واقعات ہیں کہ انہیں

ف۔ ح

ایک نیا رنگ دے کر افسانہ بنانے کے لئے زبردست صلاحیت درکار ہے۔ نیز مدھوسودن صاحب کا اندازِ بیان بھی ان کے افسانوی کرداروں کی طرح اس قدر الجھا ہوا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر ایک بار سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اکثر جملوں بندش اور الفاظ کا استعمال غلط ہے۔

تعلیماتِ اقبال

مصنف:- پروفیسر محمد یوسف خاں صاحب سلیم چشتی، بی اے (آنرز) ناشر:- اقبال اکیڈیمی۔ بیرون موچی دروازہ۔ لاہور۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۱۵۲ صفحات۔ جلد معمولی۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ علامہ اقبال مرحوم عصرِ جدید کے ممتاز شاعر ہوتے ہوئے شاعر سے زیادہ مفکر، مصلح اور قومی رہنما تھے۔ ان کی تعلیمات شعر کے پردے میں جلوہ گر ہوئیں اور ان کے اشعار نے تعلیم کے ایک نئے پیرائے کا آغاز کیا۔ انہوں نے جبہ و دستار سے بے نیاز رہ کر مسجد و منبر کی آڑ لئے بغیر اپنی قوم کے افراد کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور اس طرح دعوتِ حق دی کہ سننے والوں کے دلوں پر ہر لفظ نقش ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کتاب میں علامہ مرحوم کی جملہ تعلیمات کا خلاصہ موجود ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب نے موصوف کے بہت قریب رہ کر خود ان سے بالاستیعاب ان کی تعلیمات کو سمجھا اور اب کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس میں علامہ مرحوم کی صرف شاعری ہی مدِّنظر نہیں ہے بلکہ ان عقائد و افکار کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو نثر کی صورت میں زبان و قلم سے نکلے تھے۔ اقبال اکیڈیمی نے اس کتاب کو اور ایسی بہت سی کتابوں کو شائع کر کے ایک قومی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

عالمِ برزخ

مصنف:- سید بشیر ہندی۔ ناشر:- اردو محل۔ لاہور۔ $\frac{17 \times 27}{16}$ کے ۴۸ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ۔ ایک ایکٹ کا مختصر سا ادبی ڈرامہ ہے جس کا پہلا سین عالمِ ارواح میں اور دوسرا کرۂ ارض پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کرداروں میں شیطان، ایک فرشتہ، ایک نازائیدہ روح اور ایک مردہ شامل ہیں۔ ان غیر ارضی مخلوقات کی زبان سے بشیر ہندی صاحب نے اس کرہ کے مذموم ماحول اور باشندگانِ ارض کی خبیث عادتوں اور ناشائستہ حرکتوں پر تبصرہ کرایا ہے۔ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ دنیا ظلم و ستم اور نفس پرستی کی وجہ سے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ بعض باتیں خلافِ حقیقت اور ایسی بے جوڑ سی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قابل مصنف نے سیاق و سباق کا پوری طرح لحاظ نہیں رکھا۔ طرزِ تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف لبنان کے مشہور ادیب جبران خلیل جبران سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔

برطانیہ کے نئے مکانات

بقیہ صفحہ ۸

کہ اگر نئی وضع کا شہر بناتے وقت زیادہ سے زیادہ کو بھی دخل دیا جائے اور اکثر چیزیں بطور آزمائش کے بھی نقشہ میں داخل کی جائیں تب بھی اسکیم شاندار طریقہ پر کامیاب رہتی ہے۔ اس پرانے نقشے سے برطانیہ کے نئے شہروں کے نقشے تیار کرتے ہوئے بڑی مدد لی جا سکتی ہے۔ شہر "مائی دنشا" ایک زندہ مثال ہے اس بات کی کہ برطانیہ اپنے شہریوں کے آرام و آسائش کے لئے کیا کیا کر سکتا ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ دو غزلیں .... لسان القوم حضرت صفی لکھنوی ....

۲۔ صفی لکھنوی کا شعر(۱) ...... پروفیسر سید آغا اشہر لکھنوی ......

۳۔ خاکستر (افسانہ خلیل جبران) جناب حبیب اشعر دہلوی .. ...

۴۔ چھایا ناٹک .... جناب جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی ....

۵۔ پروان (افسانہ) .... جناب موہن لال یا ور ....

۶۔ مدورا .... جناب ل۔ ن۔ گمبل ....

۷۔ ایک ماشہ پورے نیم (افسانہ) جناب ظفر عمر ....

۸۔ جزائر شرق الہند کے ثقافتی حالات ڈاکٹر اے۔ اے۔ باکے ......

۹۔ اقبال کے متضاد نظریے (۲) حضرت مکش اکبرآبادی .. ..

۱۰۔ امید کی کرن (نظم) ...... جناب احمد ندیم قاسمی ... ..

۱۱ تبصرہ .... جناب جمیل الدین احمد........

۱۲۔ جدید اردو شاعری ..... پروفیسر اولیس احمد ادیب ....

۱۳۔ رخصتی کے آنسو......... محترمہ ع۔ ق۔ بیگم .. ..

۱۴۔ ہندوستانی فوج میں لڑکوں کے دستے ۔ جناب پی۔ گنگولی .....

فواد یونیورسٹی



یونیورسٹی کی عمارت کا ایک عام نظارہ

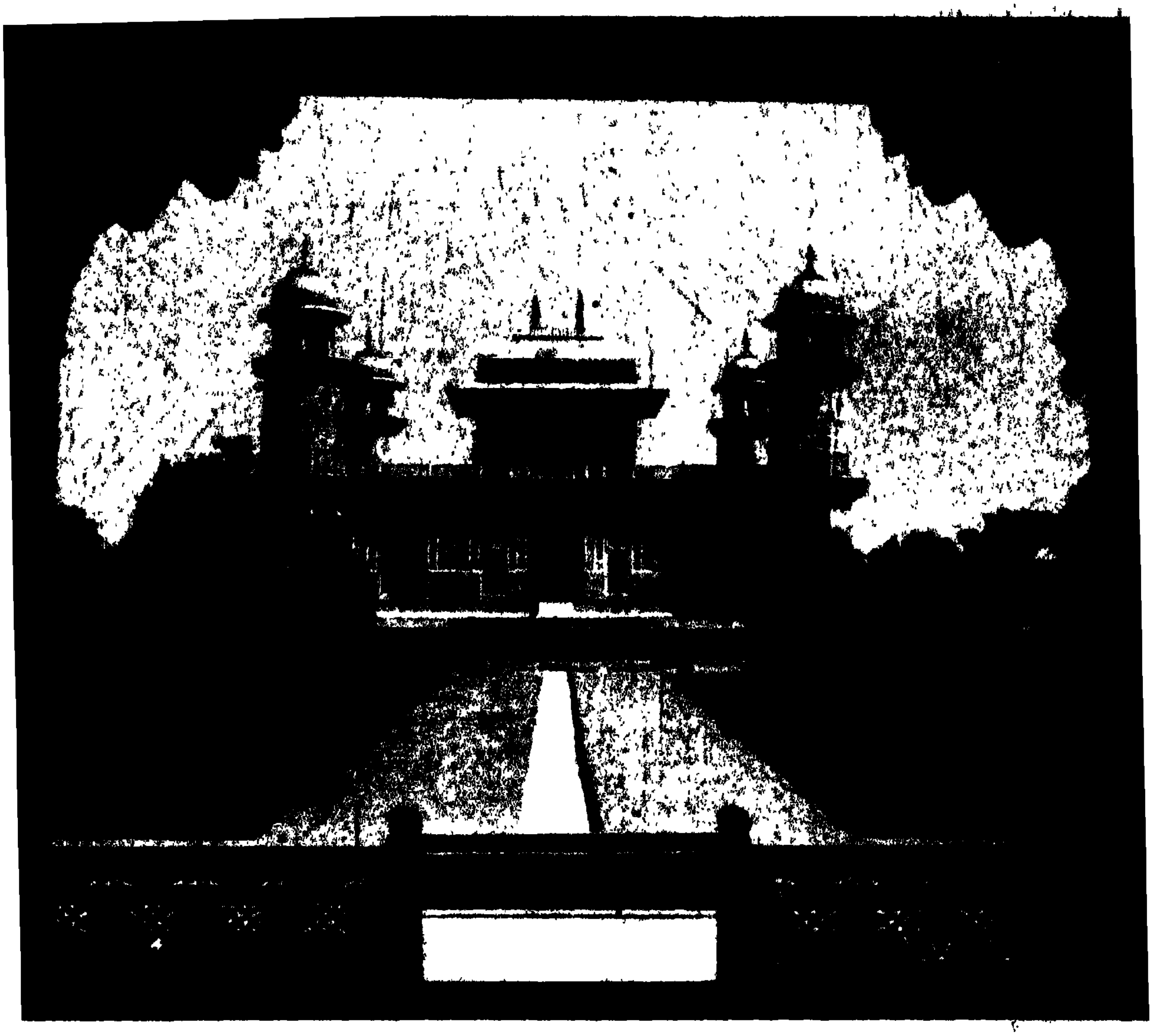
قاہرہ میں فواد اول یونیورسٹی مصر کی بہت بڑی درسگاہ ہے۔ اسمیں آرٹس، سائنس اور انجینئری کے تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ سائنس کی تجربہ گاہ میں تمام آلے جدید ترین وضع کے ہیں اور طریقۂ تعلیم بھی نئے مغربی طرز کا ہے۔ انجینئری کے شعبہ میں کئی ورک شاپ ہیں۔ وہاں طلبا اپنے ہاتھ سے نئی نئی کلیں اور پرزے بناتے ہیں۔ اگرچہ یونیورسٹی میں تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں لیکن وقت کی ضرورت کے پیش نظر زیادہ زور سائنس اور انجینئری پر دیا جاتا ہے۔

تجربہ گاہ میں سائنس کے طلبا پانی سے بجلی بنتے دیکھ رہے ہیں۔



یونیورسٹی کے کارخانے میں طلبا انجینئری کا کام سیکھ رہے ہیں

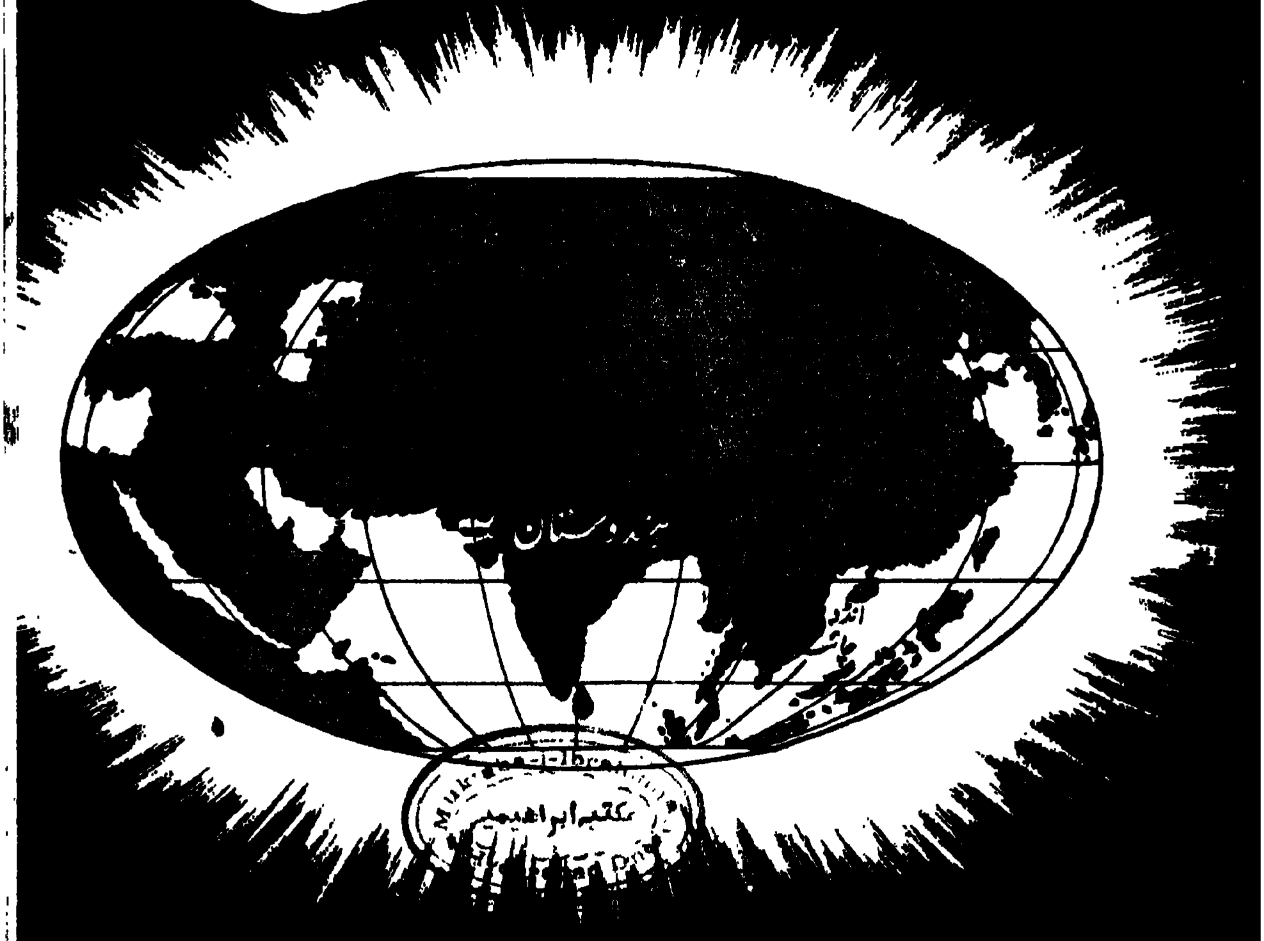




اعتماد الدولہ کا مقبرہ

اعتماد الدولہ ملکہ نورجہاں کا باپ تھا ۔ جہانگیر کے مزاج میں اسکو بڑا دخل حاصل تھا ۔ ملکہ کے تعلق سے بادشاہ سے اسکی قربت اور بھی بڑھتی گئی یہانتک کہ وزارت کا درجہ پایا ۔ اسکی یادگار میں شہنشاہ جہانگیر نے اسکا مقبرہ آگرہ میں خاص اہتمام اور بڑی رقم کے صرفہ سے تعمیر کرایا ۔ آج تک یہ مقبرہ فن تعمیر کا ایک بہت ہی اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے ۔ آگرہ میں تاج محل کیوجہ سے اسکی حیثیت ذرا کم ہوگئی ہے ورنہ جہانتک اسکی خوبصورتی اور فنی صنعت گری کا تعلق ہے یہ عمارت تاج محل سے بڑھ کر نہیں تو اس کے پلہ کی ضرور ہے ۔ اس عمارت کے متعلق مولانا نور احمد فریدی کا ایک دلچسپ مضمون اس شمارہ میں ملاحظہ کیجئے ۔

آجکل





اعلیحضرت محمد ظاهر شاه والتی افغانستان



والاحضرت شهزاده احمد شاه

آج کل

اُردو کا پندرہ روزہ

نئی دہلی

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۴ - نمبر ۱۹ | فہرست | یکم مارچ ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی، بی اے (علیگ) ایل، ایل، بی

نائب مدیران: راجیندر ناتھ شیدا، ایم اے — فضل حق قریشی، دہلوی — مشیر احمد، ایم اے

ادارۂ مطبوعاتِ متحدہ، پوسٹ بکس ۱۶۲ دہلی

رفتارِ زمانہ

جاپان پر برطانوی فوج کا قبضہ

رائٹر کے نامہ نگار خصوصی نے کورے سے اطلاع دی ہے کہ برطانوی فوج کے پہلے دستے جب کورے کی بندرگاہ پر پہونچے تو وہاں کے سمندری اڈے پر برطانوی جھنڈا لہرا دیا گیا۔ قبضہ کرنے والی ان برطانوی فوجوں نے امریکی فوج کے دسویں دستہ سے ہیروشیما کا چارج لے لیا۔ بم سے تباہ شدہ کورے پر اب برطانوی فوجوں کا قبضہ ہے۔

جاپان کے چار ہزار مربع میل علاقہ پر برطانیہ کا قبضہ ہونا قرار پایا ہے۔ اس علاقہ پر کل ۴۰ ہزار فوج کا پہرا رہیگا۔ اس میں سے ابھی یہ پہلا دستہ پہنچا ہے جس میں بحریہ کے صرف تین سو سپاہی ہیں۔ جس وقت برطانوی فوج کا جہاز "ایچ - ایم - ایس گلینزفی" ہانگ کانگ سے کورے کی بندرگاہ پر پہنچا تو اس کے استقبال کے لئے تھوڑے سے امریکی اور برطانوی سپاہی موجود تھے۔ اس جہاز کے ساتھ کئی حفاظتی جہاز بھی تھے۔

تاوقتیکہ کل برطانوی فوج وسط فروری تک جاپان نہ پہنچ جائے اہم مقامات پر عارضی طور پر آسٹریلیائی فوج کا قبضہ رہیگا۔ کورے ایک پوشیدہ بحری اڈا تھا۔ قبضہ کرنیوالی فوجوں کا سب سے پہلا فرض یہ ہوگا کہ وہ جاپانیوں کے تمام جنگی سامان اور تنصیبات کو برباد اور منتشر کر دیں۔ آسٹریلیا کے چیف انجینیر کرنل میک گون کا خیال ہے کہ صرف بارودی سامان ہی کو برباد کرنے کے واسطے ایک سال درکار ہوگا۔

یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ جوہری بم سے تباہ شدہ ہیروشیما پر فوجی قبضہ نہیں کیا جائیگا بلکہ نیوزی لینڈ کی پولیس کی ایک جمعیت کیتائچی پر پہرہ دیگی۔ یہ ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔

ہندوستان کی تجارت دوسرے ملکوں سے

اس وقت ہندوستان میں سب سے زیادہ مال ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے آرہا ہے۔ درآمد کے سلسلے میں ایران اور انگلستان علی الترتیب دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہیں۔ گذشتہ سال اپریل سے اکتوبر تک کے سات مہینوں میں ان تینوں ملکوں سے چھیالیس کروڑ تیس لاکھ، تیس کروڑ نوے لاکھ اور تیس کروڑ ستر لاکھ روپے کی چیزیں درآمد ہوئیں۔ ان چیزوں کے عوض ان تینوں ملکوں نے علی الترتیب تیس کروڑ تیس لاکھ، چون لاکھ اور چھتیس کروڑ چالیس لاکھ روپے کا مال منگایا۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد پہلی مرتبہ ہندوستان کا مال گذشتہ اکتوبر کے مہینے میں برما اور آبنائے کے دوسرے ملکوں کو بھیجا گیا۔ اسی اکتوبر کے مہینے میں اسپین کو بھی جو دورانِ جنگ میں غیر جانبدار ملک کی حیثیت سے رہا تھا، ہندوستانی مال کی مقررہ مقدار نصیب ہوئی جسکی قیمت صرف دس لاکھ روپے ہوئی۔ پچھلے سال اپریل سے اکتوبر تک جو ہندوستانی مال روس نے لیا وہ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں کل سامان کے پانچویں حصے سے بھی کم تھا۔ مجموعی حیثیت سے جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان نے انیس کروڑ روپے کا مال منگا کر ستائیس کروڑ ستر لاکھ روپے کا مال باہر بھیجا۔ ان اعداد و شمار کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی تجارت کے مستقبل کی بابت اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

اقتصادی و سماجی مجلس کے ہندوستانی صدر

یہ امر اہلِ ہند کے لئے باعثِ مسرت ہے کہ تنظیم اقوام متحدہ کی اقتصادی و سماجی مجلس کے پہلے صدر کی حیثیت سے سر راما سوامی مدلیار کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ اس سے قبل ہندوستانیوں کو اتنا بڑا اعزاز بہت کم نصیب ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک کی اہمیت سیاستِ عالم میں بڑھتی جا رہی ہے جو اس کے مستقبل کے لئے نہایت مفید رہیگی۔ ہندوستان کے نام ایک پیغام بھیجتے ہوئے خود موصوف نے فرمایا "مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان کو نہ صرف تنظیم اقوام متحدہ کا رکن بنایا گیا بلکہ اسکے ایک اہم حصے یعنی اقتصادی و سماجی مجلس کا پہلا صدر بھی منتخب کر لیا۔"

برقیات کا مستقبل

الیونغی ایٹیڈ پریس آف امریکہ کے سائنسی نامہ نگار نے پیشین گوئی کی ہے کہ ریڈیائی لہروں سے ابھی نہایت سے مفید اور عجیب و غریب کام لئے جانے والے ہیں۔ مثلاً باورچی خانہ میں کام کرنیوالے کو ایک آرام پہنچنے والا ہے کہ بجلی کے ذریعہ سے ناشتہ اور کھانے کی طشتریاں اور رکابیاں صاف کی جا سکیں گی۔ رکابیوں کی چکنائی وغیرہ صاف نہیں بلکہ جلا دی

جایا کرے گی اور لطف یہ کہ اس عمل سے رکابی اور دوسرے اسلحہ صاف کئے جانیوالے برتنوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔ گویا ان لہروں سے صابون اور پانی کا بھی کام لیا جائے گا اور خشک کرنے کے لئے صافی کا بھی کیونکہ اس برقی عمل کے بعد برتن خود ہی بالکل خشک ہو جایا کرینگے۔ اس کے علاوہ اور بھی کام لئے جائینگے۔ مثلاً ایسی رکابیاں بنائی جائیں گی جو کھانے کی میز پر رکھی جانے سے پہلے ایک لمحہ میں گرم ہو جایا کریں گی۔ ایسے چولھے جو کھانے کو ایک لمحہ سے بھی کم میں گرم کر دیا کرینگے، ایسے آلے جو ایسی آوازوں کو بھی پکڑ لیا کرینگے جن کو انسانی کان سننے سے قاصر ہیں۔ دودھ وغیرہ سیال اشیاء تو پہلے ہی سے بجلی کے ذریعہ جانچی جا رہی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہو جائیگا کہ رات کے اندھیرے میں آپ کو کار چلاتے ہوئے فضا میں اپنی کار کی رفتار لکھی ہوئی نظر آ جایا کرے گی۔ بظاہر یہ باتیں ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں لیکن پچھلے چند سال میں جو ایجادیں اور دریافتیں ہو چکی ہیں اگر ان کی ترقی جاری رہی تو آئندہ دس بیس سال میں یہ سب باتیں ممکن ہو جائینگی اور ہم آپ سب اپنی آنکھوں سے انہیں وقوع پذیر ہوتے دیکھ لیں گے۔

شام کی سماجی اور اقتصادی ترقیاں

غیر ملکی حکومت کے ماتحت سینکڑوں سال تک جمود و تعطل کی زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد ملک شام نے اپنی اقتصادی اور سماجی ترقی و تجدید کے لئے قدم اٹھایا ہے۔ اس ملک میں رہنے والے غیر ملکیوں کی رائے ہے کہ اگر شام اور لبنان اس آزادی کو حاصل کرنا اور اس سے مستفید ہونا چاہتے ہیں جس کی ضمانت بڑی قوتوں نے حال ہی میں دی ہے تو ظاہر ہے کہ ترقی و تجدید کے میدان عمل میں قدم بڑھانا ان کے لئے لازمی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر شام کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ وہ زراعت کے لئے نت نئی کلیں خریدے اور زراعت سے متعلق ہر قسم کی صنعت و حرفت کو وسیع کرے۔ بالفاظ دیگر وہ ملکی پیداوار کو اتنے بڑے پیمانے پر پھیلائے کہ ذاتی ضروریات پوری ہونے کے بعد فالتو مقدار باہر بھیجی جا سکے۔ شام کی موجودہ آبادی صرف تیس لاکھ ہے لیکن کسی زمانے میں وہ دو کروڑ تھی۔ لڑائی کے پہلے دریائے فرات کے کنارے، اقلیم الدروز میں جرمن حکومت کا ذخیرہ اناج تھا اور ڈیڑھ کروڑ لوگ آباد تھے۔ شام کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ اس کے بعض علاقے یوکرین کے علاوہ دنیا میں شاداب ترین سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن قدیم طریقۂ آبپاشی اب نہ صرف غیر موزوں ہے بلکہ اہل ملک کے لئے بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ ماہرین فن زراعت کا خیال ہے کہ صرف فرات کی معاون نہروں کے آس پاس نئے طریقوں سے آبپاشی اور کھیتی باڑی کرنے سے دس لاکھ ایکڑ زمین کو غیر معمولی طور پر مفید تر بنایا جا سکتا ہے۔ نیز شام کے تین بڑے دریاؤں کے کنارے برق آبی کے کارخانوں کے ذریعہ دس لاکھ گھوڑوں کی قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ان تمام منصوبوں کے لئے شام کو اعلیٰ قسم کے جدید ترین ساز و سامان اور مستند فن کاروں کی ضرورت ہے۔ اسکی صرف یہی ایک ضرورت ہے کہ وہ فی الحال روپیہ قرض لے۔ چنانچہ شام میں قائم شدہ امریکی بنک سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔

سراوک برطانوی نظام میں

بورنیو کے شمال مغربی ساحل پر ایک نہایت رومان پرور آزاد ریاست سراوک ہے جس پر سفید قوم کا ایک بڈھا راجہ جس کی عمر ۷۰ سال ہے حکومت کرتا ہے۔ اس کا نام سر چارلس بروک ہے۔ اس ریاست کا رقبہ تقریباً پچاس ہزار مربع میل ہے جس میں سے تیس ہزار ایکڑ کے رقبے میں صرف ربڑ کی کاشت ہوتی ہے۔ اسکا صدر مقام کچنگ ہے جو بندرگاہ بھی ہے۔ ریاست کی موجودہ آبادی پچاس ہزار ہے۔ راجہ کی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ صرف تین لڑکیاں ہیں لیکن رعیت ان میں سے کسی ایک کو بھی وارث تخت بنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے راجہ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اسکی وفات کے بعد حکومت کا تختہ نہ الٹ جائے۔ چنانچہ اس نے باشندگان ریاست کی مقامی مجلس کے سامنے حکومت برطانیہ سے یہ استدعا کرنے کی تجویز پیش کی کہ وہ اس ریاست کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا لے۔ یہ تجویز فوراً منظور ہوئی اور حکومت برطانیہ نے بھی اسے قبول کر لیا۔ راجہ کا خطاب اسکی وفات تک قائم رہیگا لیکن اس دوران میں ملک کے معاملات کو سدھارنے کے لئے برطانیہ کی طرف سے ایک پریزیڈنٹ جنرل متعین کر دیا جائیگا۔ راجہ کے بعد مستقل طور پر یہ ریاست برطانوی نظام میں شامل رہیگی۔

آئندہ طیاروں کی بناوٹ اور رفتار

طیارہ سازی کے سلسلے میں آئندہ اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ طیارے کی بناوٹ ایسی ہو جو آواز سے زیادہ تیز رفتاری کے لئے موزوں ثابت ہو سکے۔ اس مقصد کیلئے یہ ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اس تیز رفتاری کے اثرات کو انسان برداشت کر سکے۔ ہر چند طیارے میں بیٹھنے والا مکمل طور سے اندر بند ہوتا ہے اور اگر طیارہ دو ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی چل رہا ہو تو اسے کچھ پتہ نہیں لگ سکتا لیکن رفتار کو کسی ایک حد سے آگے بڑھانے یا گھٹانے کی صورت میں بے شک خطرہ ہے جیسا کہ کسی تیز گاڑی کے یکایک رک جانے کی حالت میں ہوتا ہے۔ دوسرا مسئلہ طیارے کو اڑاتے یا زمین پر اتارتے وقت قابو میں رکھنے کا ہے۔ ان تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے آئندہ طیاروں کے پر ایسے رکھے جائیں گے جو دونوں بچ تاکہ طیارے کو اڑاتے وقت ان سے کام لیا جائے اور پھر اسکی رفتار تیز ہو جانے کے بعد سارے پر تہ ہو کر پچھلے حصے میں چلے جائیں۔ البتہ اسے زمین پر اتارتے وقت انکی ضرورت دوبارہ پڑا کرے گی۔

ہندوستانی انجنیروں کو نیا اعزاز

ملک معظم کی حکومت نے ہندوستانی انجنیروں کی مسلسل وفادارانہ اور شجاعانہ خدمات کے صلے میں ان کو رائل (شاہی) ہونیکا خطاب دیا ہے یعنی سمجھنا چاہیئے کہ آئندہ ان کے دستے کا نام "شاہی ہندوستانی انجنیروں کا دستہ" ہوگا۔

اس وقت یہ دستہ نو گروہوں پر مشتمل ہے جن میں سے تین کو قائم ہوئے سو برس سے زیادہ ہوگئے ہیں باقی چھ جنگ کے دوران میں بنائے گئے ہیں۔ ان کی استعداد اور قابلیت کا معیار امن اور جنگ دونوں زمانوں میں بہت بلند رہا ہے خصوصاً سرحدی معرکوں پر پچھلی جنگ عظیم اور موجودہ لڑائی کے دوران میں ان کی خدمات قابل رشک رہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی انجینیروں کے صرف تیس یونٹ تھے جن میں سب ملاکر دس ہزار افسر اور سپاہی تھے ۱۹۴۵ء میں ان یونٹوں کی تعداد سات سو گیارہ ہوگئی جن میں سب ملاکر دو لاکھ تیس ہزار افسر اور سپاہی ہیں۔ اس جنگ کے دوران میں ہندوستانی انجینیروں کے تمام درجوں کو بہادری کے ایک سو اٹھانوے انعامات ملے جن میں ایک وکٹوریہ کراس اور ایک جارج کراس بھی شامل ہیں۔

نجی عمارتوں کیلئے سرکاری اینٹیں

حکومت ہند نے حال ہی میں عمارتی سامان کے استعمال پر سے زمانۂ جنگ کی پابندیاں اٹھالی ہیں اور معلوم ہوا ہے کہ وہ زبردست ذخیرہ جو اس وقت کنٹرول کے تحت حکومت کے پاس موجود ہے عوام کو دیدیا جائیگا تاکہ عمارتی سرگرمیوں میں اضافہ ہو۔ چنانچہ مرکزی محکمۂ تعمیرات عامہ اور دہلی کے نجی بھٹوں کے مالکان کے پاس ۲۵ کروڑ اینٹوں کا ذخیرہ ہے بہت جلد شہر کے ضرورتمندوں کو مناسب قیمت پر دیدیا جائے گا۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کے لیبر ڈیپارٹمنٹ نے تمام صوبجاتی حکومتوں کے پاس تجویز بھیجی ہے کہ اگر سرکاری کاموں کے لئے فوری ضرورت نہ ہو تو فالتو اینٹوں کا تمام ذخیرہ عوام کو دیدیا جائے اسی طرح دوسرا عمارتی سامان بھی دیا جائے گا۔ اسلئے امید ہے کہ بہت سی نئی عمارتیں بننی شروع ہوجائیں گی اور فی الحال مکانوں کے ملنے میں جو دقت ہو رہی ہے وہ باقی نہیں رہیگی۔

صوبجاتی انتخابات

ہندوستان میں عام انتخابات کا جو سلسلہ ماہ جنوری سے شروع ہوا وہ وسط اپریل تک جاری رہے گا۔ گیارہ صوبجاتی مجالس مقننہ کے لئے کل ۱۵۸۵ نشستیں ہونگی۔ جن کے لئے امیدواروں کی تعداد بے قیاس ہے۔ کئی صوبوں میں انتخابات کے نتائج بھی برآمد ہوچکے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس، آل انڈیا مسلم لیگ اور دوسری بہت سی سیاسی جماعتیں ان عام انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں۔ صرف کانگریس نے ہزار سے زیادہ امیدوار کھڑے کئے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ان امیدواروں کو مدد دے رہی ہے جو مسلم لیگ کی مخالفت میں ہیں۔ مسلم لیگ نے اپنی طرف سے اتنے ہی امیدوار کھڑے کئے ہیں جتنی نشستیں ہیں یعنی تقریباً ۴۹۲۔ ان دو بڑی جماعتوں کے علاوہ ہندو مہاسبھا، نیشنلسٹ مسلم، کمیونسٹ پارٹی، ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی اور اچھوتوں کی جماعت کے امیدوار بھی کل ہند اعتبار سے مقابلے میں موجود ہیں۔ صوبجاتی جماعتیں مثلاً پنجاب میں یونینسٹ، بنگال میں کرشک پرجا اور بمبئی میں انڈیپنڈنٹ پارٹی اور احرار اپنے اپنے صوبوں میں حصہ لینگے۔ مندرجہ ذیل نقشے سے معلوم ہوگا کہ تمام صوبوں میں کل نشستیں کتنی ہیں اور ان کی تقسیم کس طرح ہے:-

صوبہ	کل	عام	مسلمانوں کیلئے
مدراس	۲۱۵	۱۴۶	۲۹
بمبئی	۱۷۵	۱۱۴	۳۰
صوبجات متحدہ	۲۲۸	۱۴۰	۶۶
پنجاب	۱۷۵	۴۲	۸۶
صوبجات متوسط	۱۱۲	۸۴	۱۴
آسام	۱۰۸	۴۷	۳۴
صوبہ سرحد	۵۰	۹	۳۶
اڑیسہ	۶۰	۴۴	۴
سندھ	۶۰	۱۸	۳۴

عام اور مسلمانوں کی نشستوں کے علاوہ ہر صوبے میں کچھ نشستیں یورپینوں، یونیورسٹیوں، جاگیرداروں، سوداگروں، اچھوتوں، عورتوں، ہندوستانی عیسائیوں، اینگلو انڈینوں اور دوسری ادنیٰ جماعتوں کے لئے مخصوص ہیں۔

کل ہند زنانہ کانفرنس

ہمیشہ نیا سال نت نئے منصوبوں اور نئی نئی تحریکوں کو اپنے آغوش میں پروان چڑھاتا جلوہ گر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی بہت سی قابل ذکر باتیں عمل میں آئیں جن میں سے کل ہند زنانہ کانفرنس کو جس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا خاص اہمیت دی جاسکتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں اس کانفرنس کے جلسے باقاعدگی سے منعقد نہ ہوسکے۔ تاہم مستقبل کے منصوبوں سے اس کمی کی تلافی ہوجائیگی۔ کانفرنس کا یہ اٹھارہواں سالانہ اجلاس تھا جس میں پہلے کی بہ نسبت غیر معمولی طور پر بہت زیادہ غیر ملکی خواتین شامل ہوئیں۔ ان میں ایک ایسی مصری خاتون بھی شامل ہوئیں جنہوں نے تمام خواتین مصر کی جانب سے خواتین ہند کے نام پیغام مسرت پیش کرتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ اپنی ہندوستانی بہنوں کا ساتھ دینے کیلئے تیار رہینگی۔ محترمہ صدر صاحبہ نے میثاق خواتین کا مسودہ سناتے ہوئے فرمایا کہ اب ہندوستان کی عورتیں صرف اپنے حقوق منوانے ہی کو نہیں چاہتیں بلکہ ان میں سے ہر ایک فرد ایک شہری رکن کی حیثیت سے مردوں کے دوش بدوش خدمت خلق کے لئے تیار رہے۔ اس موقع پر بہت سی تجاویز منظور ہوئیں جن میں سے بعض ہندوستان کے سیاسی مسائل سے متعلق بھی تھیں۔ باقی میں عام عورتوں کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی تھی۔

غزل

جگر مُرادآبادی

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے، عرفانِ محبت عام نہیں

اب لفظ و بیاں سب ختم ہوئے اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

یہ تونے کہا کیا؟ اے ناداں! فیاضیِ قدرت عام نہیں
تو فکر و نظر تو پیدا کر۔ کیا چیز ہے جو انعام نہیں

یارب یہ مقامِ عشق ہے کیا؟ گو دیدہ و دل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں

اللہ کے علم و حکمت کے محدود اگر اکرام نہیں
ہر سانس کے آنے جانے میں کیا کوئی نیا پیغام نہیں

کیوں عیش و طرب کے متوالے تکلیفِ توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے۔ آوازِ شکستِ جام نہیں

آتا ہے جو بزمِ جاناں میں۔ پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے۔ یاں[1] ہوش و خرد کا کام نہیں

ہر خلدِ تصورِ پیشِ نظر، ہر جنتِ نظارہ حاصل
پھر بھی ہے وہ کیا شے سینے میں ممکن ہی جسے آرام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
میکش یہی اب تک سمجھے تھے شائستہ دورِ جام نہیں

عشق اور گوارا خود کر لے ناگاہ شکستِ فاش اپنی
کچھ دل کی بھی اُن کے سازش ہے، تنہا یہ نظر کا کام نہیں

یہ حسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کس کو ہے خبر اس کی؟ لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

زاہد ترے ان سجدوں کے عوض سب کچھ ہو مبارک تجھ کو مگر
وہ سجدہ یہاں ہے کفرِ جبیں جو سجدہ کہ خود انعام نہیں

اُس حسن کا شکوہ کیا کیجیے؟ محدود ہو جس کی اک دنیا
اس سعیِ طلب کو کیا کہیے؟ جو سعیِ طلب ناکام نہیں

سب جس کو اسیری کہتے ہیں، وہ تو ہے اسیری ہی لیکن
وہ کون سی آزادی ہے یہاں جو آپ خود اپنا دام نہیں

کل مجلسِ وعظ میں۔ دنیا پر اک بحث تھی خشک و بے معنی
ناگاہ کسی نے دی یہ صدا، بے بادہ فروغِ جام نہیں

اک شاہدِ معنی و صورت کے ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگر میخانۂ فطرت میں لیکن
محتاجِ نگاہِ ساقی ہے وہ رند جو دُرد آشام نہیں

نوٹ [1] اس لفظ کو میں بھی متروک سمجھتا ہوں۔ لیکن اس مقام پر مجبوری ہے۔ "یاں" کے بجائے "اب" کہا جا سکتا تھا، لیکن میرا مذاق گوارا نہیں کرتا۔ میں نے اپنے کلام میں پہلی مرتبہ اس مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جگر عفی عنہٗ

ہندی، اردو، ہندوستانی

اے ایس بخاری

عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان ہو لیکن اس سلسلہ میں بہت اختلاف رائے ہے کہ وہ زبان کونسی ہونی چاہئیے، یہاں تک کہ ہندوستانی کا دعویٰ بھی اس کی غیر مشخص خصوصیت کے باعث باطل ہو جاتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کے نظرئیے، جو درج ذیل ہیں، خاص طور پر دلچسپ ہیں جبکہ یہ محکمہ کئی سال سے ایک ایسی زبان میں پروگرام مرتب کرنے کی مشکلات کا سامنا کر رہا ہے، جو اس ملک کی زبان سے زیادہ سے زیادہ سننے والوں کے لئے قابل قبول ہو۔ حسب ذیل سطور ان استفسارات کے جواب میں لکھی گئی تھیں، جو پانچ سال پہلے پنجاب کے ایک کالج کے پرنسپل[1] نے کئے تھے لیکن یہ سوال جواب آج بھی اتنی ہی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

مکرمی ......

آپ کے استفسارات ملے، وہ تمام سوالات جو آپ نے مجھ سے کئے ہیں، بالکل وہی ہیں، جو میں مستقبل قریب میں خود آپ سے اور ان حضرات سے کرنے والا تھا، جو زبان کے معاملہ میں دلچسپی لیتے ہیں اور جن کے مشورہ و امداد سے بڑی حد تک مجھے ان باتوں کا جواب دینا ہے۔ تاہم قرعۂ فال خود میرے نام ڈال کر آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ آپ کے سوال خالص لسانی یا ادبی اعتبار سے اتنے مشکل نہیں ہیں کہ ان کے جواب دینے کی کوشش نہ کی جائے۔ حالانکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ یہ نہایت شد و مد کے ساتھ میرے نظریوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینگے۔ خیر! میں اس معاملہ میں آپ جیسا خوش قسمت نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس شخص کی طرح نازک حالات میں ہوں، جس کے لئے صرف نظرئیے قائم کر لینے کافی نہیں ہیں۔ میرے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان نظریوں کو دائرۂ عمل میں لانے کی صورت پیدا کروں اور اس پر مستزاد یہ کہ مجھے بیک وقت سرکار عالیہ اور کم از کم اکثریت عامّہ سے آنکھیں برابر رکھنی ہیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لہٰذا ان حدود میں رہتے ہوئے جو مجھ پر عائد کر دی گئی ہیں، میں حتی الوسع پوری وضاحت کے ساتھ آزمائشی جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

(۱) انڈین کانگریس نے "ہندوستانی" کو اپنے لئے سرکاری زبان کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا آزاد کا خطبہ صدارت ہندوستانی زبان کا ایک مثالی نمونہ سمجھا جا سکتا ہے؟ —— آخر کیوں نہیں؟

مگر آپ چاہیں تو اس طرح استدلال کر سکتے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ خود کانگریس میں ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جو خطبہ میں استعمال ہونے والی زبان پر خاموش رہتے ہوئے، آزاد کو کچھ مراعات دینے کے لئے چاہے رضامند ہو جائیں، لیکن اگر کسی واضح مقصد کے ماتحت مجبور کیا جائے تو وہ اس خطبہ کو ہندوستانی زبان کا مثالی نمونہ تسلیم کرنے کے لئے کبھی متفق نہیں ہونگے۔ ایسی صورت میں براڈکاسٹنگ کے ڈائرکٹر کو خطبۂ آزاد کی آڑ لینے سے بھلا کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ میں اپنے ذاتی اطمینان کے لئے اس طرح ایک نقطہ پیدا کروں تو کیا ہوتا ہے۔ اس سے اصل دشواری کا حل ممکن نہیں۔ اور پھر اُن لوگوں کو کیا جواب دیا جائیگا، جو ہندوستان کی زبان کے سلسلہ میں کانگریس کا حکم ماننے کے لئے سرے سے رضامند ہی نہیں ہیں۔

(۲) آپ بنگالی، تامل اور دوسری زبانوں میں براڈکاسٹ کرتے ہیں، اسکا مطلب یہ ہوا کہ آپ کسی تدبیر سے طبقاتی زبانوں کو بدلنا نہیں چاہتے اور نہ کوئی ایک زبان اختیار کرنی چاہتے ہیں کیا آپ کا منشا اردو کو ہندوستانی سے بدل دینے کا ہی ہے؟ ——

اردو کو ہندوستانی سے بدل دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہم لفظ "ہندوستانی" استعمال کرنے لگے ہیں، اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب جو مائکروفون پر بولا کرتے ہیں، بدستور اسی ہندوستانی میں لکھتے ہیں، جس کے وہ شروع سے عادی ہیں اور وہی لفظ استعمال کرتے ہیں، جو ان کے قلم کی کشش کے ساتھ زیادہ آسانی سے دائرۂ تحریر میں آسکتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایک آدھ جملہ یا لفظ بدل دینے کے سلسلہ میں ایسا مشورہ قبول کر لیتے ہیں جس سے مفہوم زیادہ عام فہم ہو جائے، لیکن یہ مشورہ بہت معمولی ہوتا ہے اور اسکا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ اردو کو ہندوستانی سے بدل دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود انھوں نے بھی کوئی تبدیلی اس خیال سے نہیں کی، جسکی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

(۳) اردو کا دائرہ کس حد تک ہے؟ کن کن اسٹیشنوں کو اردو زبان میں نشر کرنے کی اجازت دی گئی ہے؟

مجھے یقین ہے کہ آپ ہماری اس کوشش میں ساتھ دینگے اور اتفاق رائے رکھیں گے کہ ہر اسٹیشن کو چاہیئے کہ وہ حتی الامکان اور پورے خلوص کے ساتھ اس علاقہ کی لسانی اور ثقافتی ضرورتوں کا لحاظ رکھے جہاں سے وہ اپنے لئے ماہرین کو مدعو کرتا ہے۔ مجھے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اردو کے ماہرین صوبہ سرحد، پنجاب، دہلی، صوبجات متحدہ اور

---

[1] سلہ:- ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی پرنسپل ایم اے او کالج امرتسر

کسی حد تک بمبئی سے بھی مختلف اعداد و شمار میں میسر آسکتے ہیں۔ ان علاقوں میں دوسری زبانیں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں۔ مثلاً ہندی تدریجی اعتبار سے صوبجات متحدہ دہلی اور پنجاب میں اور گجراتی اور مرہٹی بمبئی میں بولی جاتی ہیں، اس لئے آپ دیکھیں گے کہ قدرتی طور پر اردو کو ان اسٹیشنوں کے پروگرام میں شامل کرنا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کے کچھ ماہرین مشرقی اور جنوبی ہندوستان میں بھی موجود ہیں لیکن ایسے ماہرین نہ تو تعداد میں زیادہ ہیں، نہ انھیں کوئی بڑا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان اسٹیشنوں کے آس پاس کے اردو سننے والے اپنے ریڈیو سٹ کے نٹو گھما کر دہلی سے ملا لیا کریں، اسی بنا پر مشرقی اور جنوبی ہندوستان کے اسٹیشنوں سے اردو کو نشر ہونے کا موقع نہیں ملتا بس مختلف علاقوں میں لسانی صورت حالات کا جو جائزہ میں نے لیا ہے، وہ یہی ہے۔ میں اس سلسلہ میں کوئی پیشین گوئی نہیں کرسکتا کہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ، یہ لسانی حالات کس طرح بدلتے رہیں گے۔

(۴) وہ زبان جو آپ کے سرکاری بلیٹین میں (خبروں اعلانوں وغیرہ میں) استعمال ہوتی ہے، اس علاقہ کی زبان ہوسکتی ہے اور نہیں بھی ہوسکتی، جہاں سے وہ بلیٹین نشر کیا جارہا ہے۔
لیکن کیا آپ اپنی سرکاری "ہندوستانی" اپنے اردو مقررین کے سر زبردستی منڈھ دینا چاہتے ہیں؟ آخر کیوں؟

ہم کبھی اصرار نہیں کرتے کہ ہمارے اردو مقررین اس زبان کو استعمال کریں، جسے آپ نے سرکاری "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کرنا، نہ صرف حد سے زیادہ دقت طلب ہوگا، بلکہ میرا خیال ہے خلاف مصلحت بھی ہوگا کہ مقررین کو ایسی زبان اختیار کرنے کے لئے مجبور کیا جائے، جس کے وہ عادی نہ ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کبھی کبھی سلاست زبان مدنظر رکھنے کے مشورے دئے جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ احتیاط رکھی جاتی ہے کہ ان مشوروں سے اصل اسلوب کی صورت مسخ یا خراب نہ کی جائے، جو کسی مقرر نے اختیار کرنے کے لئے پسند کیا ہو۔

اس ضمن میں مذکورہ بالا سوال ۱۲ کا جواب بھی ملاحظہ کر لیجئے!

(۵) کیا یہ مناسب ہے کہ اردو ادب وغیرہ پر تقریر ایک ایسی زبان میں ہو جسے ہنوز بنا سنوار کر ایسے روپ میں پیش کرنا ہے جس کی وضاحت گاندھی جی نے "ہندوستانی" کے نام سے کی ہے؟

اس امر کا فیصلہ کہ مقررہ موضوع پر تقریر کس زبان میں ہو ان سامعین پر منحصر ہوتا ہے، جن تک اس تقریر کے الفاظ پہنچانے مطلوب ہوں، اس لئے مناسب ہوسکتا ہے کہ اردو ادب پر تقریر، تامل تلیگو، یا بنگالی زبان میں بھی کرائی جائے۔

(۶) اگر کسی صوبہ کی عدالتی زبان اردو ہو تو کیا آپ اس حقیقت کو کوئی اہمیت دینگے؟ اور اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟

تاوقتیکہ کوئی غیر معمولی صورت حالات موجود نہ ہو، صوبہ کی عدالتی زبان کو بڑی وسعت کے ساتھ استعمال کیا جائے گا اور اس صوبہ سے نشر ہونے والے پروگرام میں اس کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھنا لازمی ہوگا۔

(۷) اگر ایک صوبہ کے روزانہ اخبارات سب کے سب یا زیادہ تر اردو زبان میں شائع ہوتے ہوں تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اردو اس صوبہ کی حاوی زبان ہے؟

میں "حاوی زبان" کا اصطلاحی لفظ استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کیونکہ اس طرح غلط فہمی پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ الفاظ زبان پر آجائیں، جو میرے اصل منشاء کے خلاف ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کسی زبان کی صحافتی سازگاری اس امر کی بین دلیل ہے کہ وہ زبان اس علاقہ میں کثرت سے بولی جاتی اور استعمال ہوتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ بھی آسانی کے ساتھ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایک خاص علاقہ میں ایک زبان کے رسائل و اخبارات کسی دوسری زبان کے رسائل و اخبارات کے مقابلہ میں زیادہ ہوں تو بالکل ظاہر ہے کہ اسی اول الذکر کے جاننے والے اور ماہرین زیادہ تعداد میں میسر آسکتے ہیں۔

(۸) اگر ایک صوبہ میں جہاں عدالتی زبان اردو ہو اور تمام روزانہ اخبارات اردو میں شائع ہوتے ہوں تو کیا یہ حقیقت کہ بہت سے ریڈیو سٹ ہندو حضرات نے لے رکھے ہیں، اس صوبہ کے متعلق آپ کے محکمہ کی لسانی حکمت عملی متعین کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟

اس سوال کا قطعی اور مفصل جواب دینا ناممکن ہے۔ آپ آسانی سے بطور خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ لوگ جنھوں نے حقیقتاً ریڈیو کے لائسنس لئے ہیں، اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے لیکن ان کے مطالبات پر غور و خوض کرنے کے لئے دو اور باتوں کا لحاظ رکھنا بھی لازمی ہے۔ اول یہ کہ ہمیں صرف انھیں لوگوں کا لحاظ رکھنا نہیں چاہیئے، جو حقیقتاً لائسنس یافتہ ہیں، بلکہ ان کا بھی جن کے لئے لائسنس لینا ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں صرف اسی پروگرام کا لحاظ نہیں رکھنا چاہیئے، جس کا مطالبہ کیا جائے، بلکہ اس کا بھی جو ہمارے لئے فراہم کرنا ممکن ہو۔ بالفاظ دیگر ہمارے پروگرام لازمی طور پر ایک حد تک منحصر ہیں ان حضرات پر، جو ہمیں آسانی سے مل سکیں۔

(۹) کیا اردو کو آپ کے محکمہ نے ممنوع قرار دے دیا ہے؟ کیا اسے ہندوستانی سے ممیز کیا جاسکتا ہے؟

اردو کو ہمارے محکمہ نے ممنوع قرار نہیں دیا ہے۔ "ہندوستانی" کی اصطلاح میں اردو شامل ہے۔

میں ایک لمحہ کے لئے بھی یقین کرنے کے واسطے تیار نہیں ہوں کہ یہ جوابات

آپکو مطمئن کردینگے ان سے خود میرا بھی اطمینان نہیں ہوتا، لیکن آل انڈیا ریڈیو میں رہتے ہوئے مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہے اور سب سے زیادہ قابل عمل صورت اختیار کرنی ہے، خواہ اس طرح اپنے ملبند نظریوں کی تکمیل میں کسر ہی کیوں نہ رہ جائے۔ ہم نے اپنی سالانہ رپورٹ میں، جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ان میں سے چند سوالات کو چھیڑا ہے۔ میں اس رپورٹ سے چند انتخابات منسلک کر رہا ہوں۔ یہ شاید آپ کے لئے مفید رہیں۔

اس سے بھی آپکو اطمینان نہیں ہوگا تاہم یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس ضمن میں بہت سی دشواریوں کا سامنا ہے اور ان کا حل آسانی سے ایک ایسا شخص پیش نہیں کرسکتا جو میری طرح زانوئے ادب تہ کئے ابھی پڑھنے اور سیکھنے کے لئے آمادہ ہو۔ آپ کو اپنے پرانے تعلقات کا واسطہ دیتا ہوں۔ میرے اس جواب کو پھاڑ پھوڑ کر نہ پھینک دیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، میری مدد کریں۔ بات یہ ہے کہ اگر سلیقہ سے کوئی تعمیری تنقید کی جائے تو میں اسے سننے کے لئے ہر وقت تیار ہوں لیکن خواہ مخواہ کے محض طعن وتشنیع سے نہ تو کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے، نہ مسرت۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے ترکش میں ملامت کے تیر نہیں ہیں اور اسی لئے مجھے کسی بات کا ڈر نہیں ہے اور پھر آپ کی ملامت کی پرواہ کسے ہے۔ کم سے کم مجھے تو نہیں لیکن خدا کے لئے اپنے مشورے ضرور بھیجئے۔ مجھے ان کی سخت ضرورت رہے گی۔

۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء — آپ کا مخلص

احمد شاہ بخاری

محکمہ ریڈیو کی رپورٹ سے انتخاب

۱۱۶۔ مسئلہ زبان کے سلسلہ میں ترقی پسند عوام کی رائے سے بالعموم ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لسانی اختلافات کو دور کرکے، زبان کی دشواریوں کو کم کردینے کے حق میں ہیں تاکہ ارتقائی منزلیں طے کرکے ایک مشترکہ زبان وجود میں آجائے۔ جہاں تک عملی اقدامات کا تعلق ہے، براڈکاسٹنگ کا محکمہ ایسے طرزِ عمل کی پزیرائی کے لئے تیار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فی الحال اس نقطۂ نظر سے، سب سے زیادہ مفید زبان انگریزی ہوسکتی ہے۔ اس ملک میں انگریزی زبان کا مستقبل خواہ کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ فی زمانہ وہ ہندوستان کے ہر حصہ میں استعمال ہوتی اور سمجھی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے اور اسی لئے آل انڈیا ریڈیو نے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ پھر اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہمارے سننے والوں میں یورپین حضرات کی تعداد کسی طرح بھی نظرانداز کئے جانے کے لائق نہیں ہے، یہ بالکل خلاف مصلحت ہوگا کہ انگریزی زبان کو ترک کردیا جائے، جبکہ خود ہمارے ہندوستانی سننے والوں میں بھی ایک بہت بڑا طبقہ اسکا عادی ہے اور بلاشبہ روزمرہ کی زندگی میں اسے استعمال کرتا ہے۔ اسکے بعد دوسری زبان جو سب سے زیادہ آل انڈیا ریڈیو کے پیش نظر رہتی ہے "ہندوستانی" ہے۔ یہ اصطلاحی لفظ آزمائش کے طور پر آل انڈیا ریڈیو نے اس زبان کے لئے اختیار کیا ہے، جو آریائی بولنے والے ہندوستان کے بہت بڑے حصہ میں بولی یا کم سے کم سمجھی جاتی ہے۔

۱۱۷۔ لفظ "ہندوستانی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ "اردو" اور "ہندی" دونوں کا حاوی رہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آل انڈیا ریڈیو بہت سی عملی دشواریوں سے بچ جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ صورت بھی اعتراضات سے پوری طرح چھٹکارا نہیں دلاتی۔ اردو اور ہندی قواعد صرف ونحو کے اعتبار سے عملی طور پر یکساں ہیں اور اسی طرح دونوں میں بے قیاس الفاظ مشترک ہیں۔ تاہم تین باتیں وجہ تفریق پیدا کرتی ہیں۔ اول یہ کہ ہندی عموماً دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے، اور اردو زبان عربی فارسی خط میں۔ دوسرے یہ کہ بہت سے تاریخی اور سماجی اسباب کی بنا پر ہندی کو ہندوؤں کے ساتھ اور اردو کو مسلمانوں کے ساتھ تعلق حاصل ہے۔ تیسرے یہ کہ اپنے ذخیرۂ الفاظ کو وسیع کرنے کے لئے اردو مصنفین عربی اور فارسی سے اور ہندی مصنفین سنسکرت سے استفادہ کرنے پر مائل ہیں۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ ایک طرف ایک ایسی تحریر ہو، جس میں کسی مسلمان نے عربی فارسی رسم الخط میں عربی، فارسی الفاظ کی بھرمار کردی ہو اور دوسری طرف ایک ایسی تحریر ہو، جس میں کسی ہندو نے دیوناگری رسم الخط میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار کردی ہو اور اس طرح ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان اتنی وسیع خلیج حائل ہوجائے کہ شاید ہی کوئی شخص ان دونوں کو پڑھنے کے بعد یکساں سہولت کے ساتھ سمجھے اور بلاشبہ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ سمجھ سکیں تاہم یہ انتہاپسندی کی صورتیں ہیں۔ ان کے درمیان مختلف نمونے اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس شخص کی ہمت یقیناً لائق تعریف ہوگی، جو ہر نمونے پر مہر لگائے اور پھر اسکے ہندی یا اردو ہونے کی بابت آخری فیصلہ کردے۔ براڈکاسٹنگ میں ایسا کرنا بھی زیادہ دقت طلب ہوگا۔ کیونکہ بولے جانے والے الفاظ رسم الخط سے الگ ہوتے ہیں اور رسم الخط ہی اردو اور ہندی کے مابین ایک اہم امتیازی اختلاف پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا آل انڈیا ریڈیو ان دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح نہیں دے سکتا، بلکہ ان دونوں زبانوں کو (بشرطیکہ وہ حقیقتاً دو زبانیں ہوں) "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کرے گا اور انفرادی طور پر سننے والوں کو موقع دیگا کہ اس امر کا فیصلہ وہ خود کرلیں کہ "ہندوستانی" کے نام سے پیش کی ہوئی چیز "اردو" ہے یا "ہندی"۔

۱۱۸۔ بولے جانے والے الفاظ تین طرح استعمال ہوتے ہیں۔ اعلانات میں خبروں میں اور مرسلہ نگارشات میں۔ مثلاً تقریروں، ڈراموں وغیرہ میں۔ اعلانات زیادہ تر نپے تلے لفظوں اور جملوں پر مشتمل ہوتے ہیں، جو رفتہ رفتہ معیاری حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے اعلانات آسان زبان میں بیان کئے جاتے ہیں اور چند رسمی قاعدوں کے سوا، ان پر کبھی کوئی اعتراض نہیں اٹھا ہے۔ تاہم ہندوستانی خبروں کے بلیٹن نے کبھی نہ ختم ہونے والے اختلافات کا موضوع پیدا کر رکھا ہے۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ بہت سے موضوعات، جن سے دنیا بھر کی خبریں متعلق ہوتی ہیں، ایسے نظریوں، مسئلوں اور تحریکوں کو پیش کرتے ہیں، جن کو ادا کرنے کے لئے بہت سی ہندوستانی زبانیں ابھی پیچھے ہیں لہذا ایسے معاملات کی روزانہ تفصیل شگفتہ زبان میں پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور جب مقصد یہ ہو کہ ایسے وسیع علاقے میں، جو بمبئی سے لے کر پشاور تک پھیلا پڑا ہو، خبریں زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھی جا سکیں، مسلسل طور پر یہ کوشش مد نظر رہی کہ زیادہ عام فہم لفظوں اور مقبول عام جملوں کو چُن چُن کر استعمال کیا جائے۔ یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ الفاظ کے انتخاب میں زیادہ قابل عمل اور روادارانہ نصب العین کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ لہذا بعض صورتوں میں صحیح معیار سے انحراف ناگزیر ہو گیا اور اس نے وہ انفرادی طور پر ان سننے والوں کے لئے، جو زبان کے معاملہ میں بکھیڑے کے نیتر ہیں، بالکل خلاف توقع رہا۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے ہندوستانی خبروں کے بلیٹین پر برابر نکتہ چینی ہوتے رہنا کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ کبھی یہ صورت ہندی تعصب کی بنا پر پیدا ہوئی اور کبھی فارسی تعصب کی بنا پر اور عموماً دونوں اعتبار سے بیک وقت۔ پھر بھی سارے ملک میں یہ جذبہ ضرور کار فرما ہے کہ آل انڈیا ریڈیو ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان کی تخلیق و ترویج میں پوری طرح اعانت کرے۔ حقیقتاً اسی جذبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو اس کوشش میں ہے کہ "ہندوستانی" کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے۔

۱۱۹۔ مرسلہ نگارشات کے سلسلے میں مصنفین و مقررین کو بار بار یاد دہانی کی جاتی ہے کہ ان کی زبان جتنی زیادہ آسان ہوگی، اتنی ہی زیادہ تعداد سننے والوں کی ہوگی۔ لیکن ظاہر ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے عملہ کا اصرار ایک مقررہ حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مصنفین (اور خصوصاً اعلیٰ قسم کے مصنفین) کسی طرح کی پابندی پر اظہار ناراضگی کرتے ہیں اور یوں بھی اپنے اس طرز تحریر کو بدل دینے میں جس کے وہ عادی ہو گئے ہیں، انھیں دشواری محسوس ہوتی ہے۔

۱۲۰۔ تاہم زبانوں کی دشواریاں صرف زبانوں کی کثرت کے باعث ہی پیدا نہیں ہوتیں، ان کا بہت بڑا سبب وہ مطمح نظر ہے، جو آجکل ہندوستانی زبان کے سلسلہ میں قائم کر لیا گیا ہے۔ یہ مطمح نظر اسوقت بالکل بہاؤ کی حالت میں ہے اور بلا حجت رہنمائی کی سخت کمی ہے۔

نقطۂ نمائندگی کے لحاظ سے ہمارے سننے والوں کو حسب ذیل گروہوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:—

ا۔ یورپین۔ انھیں صرف انگریزی زبان سے سروکار ہے۔

ب۔ مغربی نژاد ہندوستانی۔ جملہ اغراض و مقاصد کے لئے انکی مادری زبان انگریزی ہے۔

ج۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی۔ اپنا روزانہ کا زیادہ کام انگریزی میں انجام دیتے ہیں اور کبھی تقریر کے لئے دعوت دی جائے تو انگریزی کو ذریعہ بنانا پسند کرینگے۔ لیکن پورے خلوص کے ساتھ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستانی زبان ترقی کرے گی اور ایک نمایاں حیثیت حاصل کرے گی۔

د۔ اوسط درجہ کے ہندوستانی۔ انگریزی پڑھ لکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ انگریزی پروگرام سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے اہل نہیں ہوتے۔

ہ۔ محبانِ وطن۔ انگریزی کی بجائے ہندوستانی زبان اختیار کرنے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی ہندوستانی زبان ہو تو بری طرح گھبرا جاتے ہیں۔

و۔ قوم پرست۔ ہندوستان کے لئے ایک زبان عامہ مروّج کرنے کی کوشش میں ہیں، جس کی حمایت اپنی مادری زبان کے علاوہ کرتے ہیں۔

ز۔ صوبوں کے رہنے والے۔ زبان عامہ سے کوئی سروکار نہیں لیکن پھر بھی اپنی مقامی بولی کو رواج دینے کے لئے لڑائی مول لے لیتے ہیں۔

ح۔ علیحدگی پسند۔ اپنی لسانی ثقافت کے معاملہ میں حد سے زیادہ بدگمان ہیں اور قومی اتحاد یا صوبجاتی تعلقات کے نام پر کوئی حملہ، جو اس پر کیا جائے، گوارا نہیں کرینگے۔

ط۔ جمہوریت پسند۔ زبان سے ادا ہونے والے کسی آئٹم کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ تاوقتیکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ہر لفظ بہت سے ناخواندہ سننے والوں کے لئے بھی لائق تفہیم ہے۔

ی۔ ادب نواز۔ زبان سے ادا ہونے والے کسی آئٹم میں حصہ لینے یا سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اگر اس کو مکروہ یا مسخ کر دیا جائے، یا وہ اعلیٰ ادبی معیار سے گرا ہوا ہو۔

ک۔ دیہاتی۔ عام طور پر قانونی عدالتوں اور سرکاری افسروں کے طفیل اپنے صوبہ کی "عدالتی زبان" سے آشنا ہوتے ہیں لیکن اپنی صرف اسی بولی سے لطف اٹھاتے ہیں، جو اکثر تحریری زبان میں نہیں ہوتی۔

۱۲۱۔ رایوں میں اسقدر تفاوت ہوتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو لسانی کوشش کے معاملہ میں سب کو خوش رکھنے کی کامیابی کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ یہ کرنے کی امید ہو سکتی ہے کہ وہ تنگ نظری سے کام نہ لیتے ہوئے پھونک پھونک کر احتیاط سے قدم بڑھائے اور کم سے کم تفاوت کو زیادہ سے زیادہ فہم و فراست کے ساتھ ممتزج کر دینے کی کوشش کرے۔

("نو ہورائزن" سے)

اکبر الہ آبادی کابل میں

حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کی ایک مشہور نظم اور اس کے دو فارسی ترجمے ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کے مجلہ "کابل" سے اخذ کرکے ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں۔ مستغنی اور صبا کا شمار افغانستان کے مشہور شعرا میں ہوتا ہے۔ اس "سہ آتشہ" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی اردو زبان اور یہاں کے شعرا کا کلام غیر ممالک میں بھی کس درجہ مقبول ہے۔ "ادارہ"

مستغنی

مسلماں باشدت از اعتلائے خود خبر چیزے
بمعراجے کہ اول داشتی داری نظر چیزے
ندر دو جاہ از کف دادہ ات داری اثر چیزے
ہمی سوزد ز اقبالِ حریفانت جگر چیزے

تو ہر گم کردہ راہے را بعالم رہنما بودی
بہر چیزے کہ اکنوں نام گیرند آشنا بودی

بہر علمے کہ می گویند دانا بیشتر بودی
بہر دام از مقامِ خویش گامی پیشتر بودی
بفرقِ خوب و زشت اہلِ جہاں را رہبر بودی
تو از ہر کار عالم با وقوف و با خبر بودی

تو مغرب را بسوئے علم و عرفاں رہنما گشتی
تو عالم را بکار سعی و کوشش مقتدا گشتی

کسے کے داشت قدر و عز و جاہ و شوکت و شانت
کسے کے داشت صدق و قول و حسن عہد و پیمانت
جہانرا کام جاں شیریں ز حرف شکر افشانت
تمامِ خلقِ عالم بود مداح و ثنا خوانت

تو از راستی چوں سرو قامت را علم کردہ
سر تسلیم پیشت جملۂ آفاق خم کردہ

تو بودی آنکہ بود از اتفاق سدِ رو ہمینت
تو بودی آنکہ بود از چرخ برتر جای تمکینت
تمام خلقِ عالم تر زبان حرفِ تحسینت
کلیدِ گنجِ عرفاں داشت طبعِ حکمت آئینت

ز روئے صدق از بس حق پرستی بود مطلوبت
تمامِ اہلِ عالم زان سبب گردید مغلوبت

نہ آندم بود کذب و کینہ، حقد و بخل و بہتانت
نہ بر عقل و طبیعت بود غالب نفس و شیطانت
نہ ہرگز بدگمانی داشت دل با این و با آنت

اکبر

مسلمانو بتاؤ تو تمہیں اپنی خبر کچھ ہے
تمہارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے
حریفوں کی تعلّی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے

تمہیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہوکر
کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہوکر

کوئی آگے نہ تھا تم سے ترقی کی تگ و دو میں
کوئی دن میں چمکتا تھا تو تم ممتاز تھے سو میں
تمہیں نے فرق بتلایا تھا سب کو گندم و جو کا
تمہیں سے سیکھ کر بنتی تھیں عالم مغربی قومیں

شرف پایا تھا تم نے امتیازِ حق و باطل سے
مخالف بھی تمہاری قدر دانی کرتے تھے دل سے

تمہاری عزتیں تھیں اوج تھا، رتبہ تھا شانیں تھیں
تمہاری بات کی احکام تھے، کہنا تھا آئینیں تھیں
تمہارے ذکر میں سرگرم دنیا کی زبانیں تھیں
تمہیں تم تھے زمانے میں تمہاری داستانیں تھیں

غرور و ناز کم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو
سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو

تمہارا اتفاق باہمی دیوارِ آہن تھا
مخالف ایک کا جو تھا وہ گویا سب کا دشمن تھا
تمہاری ہمتوں کا عرشِ اعظم پر نشیمن تھا
تمہارے ہاتھ میں آفاق کا ہر علم ہر فن تھا

تم اپنی حق پرستی سے دہلا دیتے تھے دنیا کو
خدا کے سامنے جھک کر جھکا دیتے تھے اعدا کو

نہ یہ آپس کے جھگڑے تھے نہ یہ ناحق پرستی تھی
طبیعت پر نہ دیوِ نفس کی یہ چیرہ دستی تھی
نہ دل میں بدگمانی تھی نہ ہمت میں یہ پستی تھی

صبا

مسلماناں شمارا از خود ست آیا خبر چیزے
بآن اوجِ جدا گردیدہ تان ہم نظر چیزے
خبر گر ہست در دل این خبر دارد اثر چیزے
شدہ اوجِ حریفاں باعثِ سوزِ جگر چیزے

بخاطر می رسد آیا چہ بودید و چہا گشتید
ز شہراہِ ترقی تا چہ حد نا آشنا گشتید

بمیدانِ ترقی راہِ اول گام تو بکشود
تو در صد میدِ خشیدی اگر دہ دیگری را بود
تمیز گندم و جو را بعالم داشت فرمود
ز فیضِ بینشت مغرب رہِ علم و ہنر پیمود

ز تو شد امتیاز حق و باطل در جہاں پیدا
مخالف ہم بہ تقدیر تو شد اندر سرش سودا

شمارا عزت و اوج و علا در تبہ و شان بود
شمارا قول و فعل و حکم و آئین فکر و اذہان بود
باوصاف شما جاتاں زباں با شکر افشان بود
بدنیا وصف یکتائی تان برجستہ دستان بود

سرِ گردن کشاں خم گشتہ بود از بہرِ تعظیمت
غرور و ناز عالم جبہ سائے مجد و تکریمت

شمارا اتفاق باہمی دیوار آہین بود
مخالف گر یکے تن کس شدے با جملہ دشمن بود
علو ہمت تان عرشِ اعظم را نشیمن بود
بدستت در جہان جانا کلید دانش و فن بود

ز فیضِ حق پرستی عالمے بودے ترا مرعوب
بشان ایزدی اعدائے خود را داشتی مغلوب

نہ آندم ایں تقاضت نے چنیں ناحق پرستی بود
نہ بالائے طبیعت نفس را ایں چیرہ دستی بود
نہ در دل بدگمانی بود نے ہمت بہ پستی بود

منوّر بود چشم و جسم و جان از نور عرفانت
نمود اوصاف صدق و راستی مشهور آفاقت
بہر سو خلق عالم صید کردے حسن اخلاقت

نماندست این زمان آن صدق قول و حسن ظن باقی
نہ آں شوق کمال و کوششت در علم و فن باقی
نہ آں مہر ولایت ماندہ با اہل وطن باقی
ز اوصاف نکوئیت نیست چیزے این زمن باقی
برائے نفس خویش امروز تنہا این و آن خواہی
خدائے خلق را بر خویش تنہا مہربان خواہی

کنون از حب اسلامی است یکسر سینہ ہا خالی
ز رحمت مہر و الفت باشد آہ این خانہ ہا خالی
بود ایں خانہ ہا افسوس اکنون زین ہوا خالی
چرا دلہا بدینسان از وفا گشت اے خدا خالی

مسلماں را چرا باہم نباشد بے غرض الفت
ہمیں شاعر میان شعر دارد الغرض الفت

چہ گویم حال دل کز جور و غم زیر و زبر گشتہ
جگر خوں زیادش دیدۂ خونبار تر گشتہ
نفس در سینہ از فکر غمم نیشتر گشتہ
دلم امروز ازین نطق و بیان خونیں جگر گشتہ

مراد دلیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

ترا باید سخن زان مردم دانشور آموزی
بعالم ہرچہ از علم و معارف بہتر آموزی
خواص خشک و تر اے مایۂ بحر و بر آموزی
سفر کن در جہان تا ہرچہ آن نیکو تر آموزی

خدارا اے جوانان وطن بیچشے د فرسنگے
بحفظ مملکت امروز باید غیرت و ننگے

حدیث دلفریبت ہر دلے مسرور می سازد
کلام نغز زنگ از ہر طبیعت دور می سازد
دل ویران ما شعر نکو معمور می سازد
تو سلطنتی بغیرت ذوق اگر مجبور می سازد
نمی بخشد سخن بے التفات گوش تاثیرے
اگر اکبر وگر مہدی کند بالغرض تقریرے

نظر میں مظہر نور حقیقت ساری ہستی تھی
تمہاری وضع دلکش تھی تمہاری شان عالی تھی
خوش اخلاقی تمہاری مظہر شان جمالی تھی

نہیں ہے ہائے افسوس اب تمہارا وہ چلن باقی
نہ وہ حسن عمل باقی نہ اب وہ حسن ظن باقی
نہ وہ ذوق ہنرمندی نہ شوق علم و فن باقی
نہ دل میں ہے وہ جوش حب یاران وطن باقی
جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کو راحت رسانی کی
توقع کیا اسی پر ہے خدا کی مہربانی کی

غضب ہے حب اسلامی سے خالی سب کا سینا ہے
حسد سے ناتواں بینی ہے بے مہری ہی کینا ہے
اس اپنے ہی مزے کیواسطے ہر اک کا جینا ہے
یہی قومی ترقی کا ذرا سوچو تو زینا ہے؟

کہاں ہے اب مسلمانوں میں باہم بے غرض الفت؟
جو باقی شاعروں میں ہے تو ہے وہ اک غرض الفت

میں تم سے کیا کہوں اس وقت دل پر کیا گذرتی ہے
تصور دل میں آتا ہے تو آنکھ اشکوں سے بھرتی ہے
طبیعت بات کرنیکو بھی مشکل سے ٹھہرتی ہے
خلش سینے میں ایسی ہے کہ وہ بیچین کرتی ہے

مراد دلیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

وہ باتیں جن سے تو میں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو

خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

سخن معقول و موزوں ہو تو سب کا دل بہلتا ہے
کلام خوش کلاماں رنگ با معنی بدلتا ہے
زباں سے نعرۂ مدح و ثنا ہر دم نکلتا ہے
مگر شوق عمل ہو واقعی تب کام چلتا ہے
توجہ گر نہ ہو دل سے تو پھر تاثیر کیونکر ہو
کلام دلکش اکبر ہو یا مہدی کا لکچر ہو

بہ ہستی دیدۂ تان مظہر نور حقیقی بود
بشان عالی و اوضاع دلکش در جہاں بودی
بہ حسن خلق خود صید دل اہل زباں بودی

نماند افسوس اوضاعے ازاں دور زمن باقی
نہ آں حسن عمل باقی و نے آں حسن ظن باقی
نہ آں ذوق ہنرمندی نہ شوق علم و فن باقی
نہ در دل جوشش آں حب یاران وطن باقی
ہمہ خواہد کہ اندر نفس خود راحت رساں باشد
بریں حالت توقع ہم کہ خالق مہرباں باشد

اسف کز حب اسلامی تمامی سینہ ہا خالیست
حسد با ناتوان بینی و بدخواہی و بے مہری است
بہرکس ذوق و فکر راحت و آسایش نفسی است
کمے بنگر کہ ایں خود نردبان نعت قومی است

چہ شد دور از غرض آہ الفت خاص مسلمانان
نمی بینم نشانی جز بشعر شاعرے از آن

چہ گویم راز دل با تو کہ از غم زاری باشد
بہ تصویرش دو چشم از الم خونبار می باشد
سخن گفتن کنون بر طبع من دشوار می باشد
خلش ہا در درون سینہ نشتر وار می باشد

مراد دلیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

سخن ہائے کزان اقوام گشتہ نامور آموز
بگیر اخلاق نیکو صنعت آموز و ہنر آموز
بیفزا تجربہ اندر جہان طرز سفر آموز
خواص خشک و تر آموز علوم بحر و بر آموز

خدارا جان من بر عقل و فہم و ہوش خود افزا
دلت را منزل غیرت نما در جوش خود افزا

حدیث نغز دلہا را مسرت بار می سازد
کلام خوش بمعنی رنگ را بیمار می سازد
مبادا وصف آں زبان ہمالم گفتار می سازد
کہ ملت خویش را شایستہ کردار می سازد
نمی بخشد سخن بے التفات گوش و دل تاثیر
اگر اکبر سراید شعر یا مہدی کند تقریر

پھیلتی ہوئی کائنات

علی مہدی نقوی

سائنس کی تاریخ میں اہم دریافتوں کی کمی نہیں۔ ایک کے بعد ایک زیادہ سے زیادہ اہم حقیقتیں دریافت کی جاچکی ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیں گی فیثا غورث نے ثابت کیا کہ زمین گول ہے کوپرنکس نے بتایا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ نیوٹن نے کشش زمین کا قانون دریافت کیا۔ ۲۴ نومبر ۱۸۵۹ء کا دن بھی سائنس اور فلسفہ کی تاریخ میں یادگار رہیگا جس روز ڈارون کی شہرۂ آفاق تصنیف (Origin of Species) شائع ہوئی اور جسکی ۱۲۵۰ کاپیاں اشاعت کے دن ہی فروخت ہوگئیں۔ ۱۸۹۵ء میں مائیکلسن اور مورلے نے تجربہ کے ذریعے ایتھر اور زمین کی اضافی حرکت کی تکذیب کی۔ اس تجربہ کی تشریح کے طور پر ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے نظریۂ اضافتِ خصوصی دریافت کیا اور پھر ۱۹۱۵ء میں نظریۂ اضافتِ عمومی جس نے نیوٹن کے مشہور قانون ثقل کی جگہ لی۔ ۱۹۰۰ء میں پلانک نے نظریہ قدر (Quantum Theory) کا بنیادی اصول پیش کیا۔ ان تمام دریافتوں نے مختلف اوقات میں سائنس اور فکر کی دنیا میں ہیجان پیدا کردیا ہے لیکن جتنی بحث ایڈون پی۔ ہبل (Edwin P. Hubble) کے پھیلتی ہوئی کائنات کے نظریہ پر، جو اس نے ۱۹۲۸ء میں پیش کیا تھا، ہوتی ہے اتنی اس سے پہلے کبھی کسی نظریہ پر نہ ہوئی تھی۔

اس نظریہ کو سمجھنے کے لئے فلکی طبیعات کی نئی دریافتیں جاننا ضروری ہیں کہکشاں جو اندھیری رات میں چمکدار راستہ کی طرح نظر آتی ہے اور جو شاعروں کے لئے لطیف اشاریت کی حامل ہے، ماہرین طبیعات کے نزدیک محض بہت سے ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ ان ستاروں میں سے ایک ہمارا سورج بھی ہے۔ باقی ستارے جو تعداد میں تقریباً ایک کھرب ہیں بہت کچھ ہمارے سورج سے مشابہ ہیں۔ یہ ستارے ایک دوسرے سے بہت زیادہ فاصلہ پر واقع ہیں اور بہت بڑی جسامتیں رکھتے ہیں لیکن یہ ہم سے دور ہونے کے سبب ہمیں بہت چھوٹے چھوٹے اور ایک دوسرے کے پاس نظر آتے ہیں۔ اکثر جگہ یہ ستارے ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں کبھی کبھی اتنے قریب کہ وہ چمکدار نقطوں کی بجائے روشنی کے پھیلے ہوئے ٹکڑے سے نظر آتے ہیں لیکن دوربینوں سے دیکھنے سے اکثر معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ بہت سے ستاروں سے مل کر بنے ہیں۔

ہماری کہکشاں میں علاوہ ستاروں کے گیس کے جلتے ہوئے ہیولے بھی ہیں۔ یہ ہیولے سحابی کہلائے جاتے ہیں۔ انھیں انگریزی میں نیبولا (Nebula) کہتے ہیں۔ یہ ستاروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ آسمان پر بعض سیاہ سیاہ دھبے سے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل ٹھنڈی اور تاریک گیس کے ٹکڑے ہوتے ہیں جن میں سے روشنی گذر نہیں سکتی۔ انھیں تاریک نیبولا کہتے ہیں۔ کہکشاں کے وسط میں ایک لمبا کالا حصہ ہے جسکی وجہ سے کہکشاں بیچ میں سے دو حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ یہ حقیقت میں ایک تاریک نیبولا ہے۔ بعض تاریک نیبولا آس پاس کے روشن تاروں کی روشنی میں چمکتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔

یہ تو ہماری کہکشاں کا حال ہے۔ آئیے اب ہم کائنات کی وسعتوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے اپنی زمین سے چل دیں۔ ہمیں بہت تیز رفتار سے اڑنا چاہئیے کیونکہ کائنات بہت وسیع ہے اور ہمیں غیر معمولی طور پر زیادہ وقت لگیگا۔ اگر ہم روشنی کی رفتار، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے چلیں (آئن سٹائن ہمیں اس سے زیادہ تیز روشنی سے چلنے کی اجازت نہیں دیگا ورنہ اسکا نظریۂ اضافیت بنیادوں سمیت نیچے آرہے گا) تو کئی ہزار سال کے بعد ہم ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ستارے ایک دوسرے سے بہت زیادہ دور کے فاصلہ پر اور بہت کم تعداد میں ہونگے۔ پھر بھی ہم چلتے رہیں تو کچھ عرصہ کے بعد ہم اپنی کہکشاں کو پیچھے چھوڑ دینگے اور خلا کے لیسے سمندر میں پہنچ جائیں گے جہاں مادہ نام کو نہیں ہے۔ خلا کا یہ سمندر اتنا بڑا ہے کہ میں آپ کو آسانی سے اندازہ نہیں دلا سکتا۔ اگر ہم پھر بھی اپنے سفر کو جاری رکھیں تو کیا ہوگا؟ کیا خلا کے اس سمندر میں ہماری کہکشاں کی طرح اور بھی جزیرے ہیں؟ کیا ہماری محدود کائنات سے آگے اور بھی کچھ ہے؟ کیا ہماری کہکشاں کے علاوہ ستاروں کے اور مجموعے بھی فضا میں تیر رہے ہیں؟

جواب اثبات میں ہے۔ ایک نہ ایک دن ہم ضرور ستاروں کے کسی دوسرے مجموعے میں پہنچ جائیں گے۔ اس مجموعے میں بھی ہماری کہکشاں کی طرح ستارے ہیں۔ روشن اور تاریک نیبولا ہیں۔ ان کہکشاؤں کے ستارے ہماری کہکشاں کے ستاروں کے مانند ہیں۔ ان کہکشاؤں کو ہم کائناتی جزیرے کہیں گے۔ ہماری اپنی کہکشاں بھی ایک کائناتی جزیرہ ہے۔

کل کائنات میں بہت سے کائناتی جزیرے ہیں۔ ان کی دریافت کو مدت گذر گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ باقی تمام کائناتی جزیرے ہماری اپنی کہکشاں سے بہت مشابہ ہیں۔ ان میں ستاروں کی تعداد اور مادہ کی مقدار بھی تقریباً برابر ہے یہ جزیرے ایک دوسرے سے دس لاکھ نوری سال کے اوسط فاصلے پر ہیں۔ ایک نوری سال اس فاصلے کو کہتے ہیں جو روشنی ایک سال کے عرصہ میں طے کرتی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے یہ فاصلہ ہماری زمین کے فاصلوں کی نسبت بہت بڑا ہے۔

وہ اہم نظریہ جو میں اس مقالہ میں

ہمارا ان کائناتی جزیروں ہی سے تعلق ہے جیسا کہ میں نے کہا ان کائناتی جزیروں کی دریافت کو تو ایک مدت گذر گئی لیکن ان کی باقاعدہ سائنسی تحقیق نسبتاً حال ہی میں ہوئی ہے۔

ابھی تک دنیا کی سب سے بڑی دوربین سو انچی دوربین ہے جو ماؤنٹ ولسن پر کیلی فورنیا میں نصب ہے۔ ان کائناتی جزیروں کا باقاعدہ مطالعہ اسی دوربین کے ذریعے ہبل نے کیا ہے۔ اس نے اس دوربین کی مدد سے لاکھوں کائناتی جزیروں کے عکس لئے ہیں ۱۹۲۹ء میں اور اس سے قبل، ہبل، ہماسن کی مدد سے، ان کائناتی جزیروں کی رفتار اور ان کے زمین سے فاصلے دریافت کر رہے تھے۔ یہ کام بہت محنت اور ہوشیاری کا تھا لیکن وہ بہت تندہی سے اس کام پر لگے ہوئے تھے انہوں نے بہت سے جزیروں کا مشاہدہ کیا اور ان کی جسامت، رفتار اور دوری کا اندازہ لگایا۔

اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے ان تجربوں کے نتیجے کے طور پر دیکھا کہ یہ کائناتی جزیرے بلا استثنا ہماری زمین سے دور بھاگ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک کائناتی جزیرہ ہم سے جتنی زیادہ دور ہے اتنی ہی سرعت سے دور بھاگ رہا ہے اور ہم سے اور دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ کیا نسبت کیوں؟ یہ محض اتفاق تو نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں نے جتنے کائناتی جزیروں پر بھی تجربے کئے ان میں سے ہر ایک کے لئے اس حقیقت کو صحیح پایا انہیں یقین تھا کہ یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے۔

ان تجربوں کی تشریح کے لئے ہبل نے جو نظریہ پیش کیا وہ بہت دلچسپ ہے۔ ہبل کا خیال ہے کہ کائنات بحیثیت کل بہت تیز رفتاری سے پھیل رہی ہے اور کائناتی جزیرے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نے حساب لگایا کہ ہر ایک ارب تیس کروڑ سال کے بعد کائناتی جزیروں کے مابین فاصلہ دوگنا ہو جاتا ہے اس لئے کائنات کا قطر بھی اس عرصہ میں دوگنا ہو جاتا ہے۔

آئیے کچھ دیر کے لئے ہم وقت کے اعتبار سے پیچھے کی طرف چلیں۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ اب سے چند کروڑ سال پہلے مختلف کائناتی جزیرے کن کن مقامات پر تھے ہمیں تصور کرنا چاہئے کہ یہ کائناتی جزیرے اپنی موجودہ رفتار سے الٹی سمت میں دوڑنے لگے ہیں جو جزیرے جتنی زیادہ دور ہیں اتنی ہی زیادہ سرعت سے کائنات کے مرکز کی جانب حرکت کر رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوگا کہ بہت عرصہ گذرا یہ کائناتی جزیرے ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ کیا تعجب ہے کہ کبھی وہ سب ایک ہی جگہ پر جمع ہوں اور اس وقت کل کائنات مادہ کے ایک وسیع ٹکڑے پر مشتمل ہوگی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ دو ارب سال گذرے وہ تمام مادہ جو اب منتشر ہے کہ ایک بڑے گیس کے بلبلے کی شکل میں تھا اچانک کسی حادثے کے سبب یا کسی نامعلوم وجہ سے اس کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے۔ ان ٹکڑوں نے ایک دوسرے سے دور بھاگنا شروع کر دیا یہی ٹکڑے اب کائناتی جزیروں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں جو ٹکڑا جتنا زیادہ تیز رفتار تھا اتنا ہی آگے نکل گیا اسی وجہ سے تمام کائناتی جزیرے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اگر کائناتی جزیروں کا یہ مفروضہ صحیح ہے اور کائناتی جزیروں کی عمر دو ارب سال ہے تو ہم ایک اہم نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی رو سے کوئی شے روشنی کی رفتار (ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل) سے زیادہ تیزی سے حرکت نہیں کر سکتی۔ پس ان جزیروں کی تیز رفتاری کی انتہا بھی یہی ہے۔ وہ کائناتی جزیرے جنھوں نے دو ارب سال گذرے اس رفتار سے حرکت کرنی شروع کی اب کائنات کے مرکز سے دو ارب نوری سال کے فاصلے پر ہونگے۔ کوئی کائناتی جزیرہ کائنات کے مرکز سے

"فریبِ نظر"

کس قدر دلسوز ہے افسردہ تابستاں کی رات … ہے کسی مضراب زن کا منتظر سازِ حیات
نیلگوں افلاک پر ہے ماہ پاروں کا ہجوم … جگمگاتا ہے مہِ نو، مسکراتے ہیں نجوم
اب کہاں وہ عالمِ ہستی کے اندازِ جنوں … کارفرما ہے جہاں میں ساحرِ شب کا فسوں
دور سے آتی ہے اک مبہم صدائے دردناک … ہو فضا میں جیسے محو نالہ کوئی جانِ پاک
ہر ستارے پر مسلط اک سکوتِ دلگداز … ہو رہا ہے "ظلمتِ رخشندہ" سے راز و نیاز
ہیں صبائیں نرم موجیں بادۂ سرجوش کی … خامشی ہے پاسباں اس جنتِ گلپوش کی
ہے جمالِ حسن عکس افگن دلِ غمناک پر … لالہ رُخ حوریں زر افشاں ہیں بساطِ خاک پر
اُٹھ چکا ہے خود بخود سیمائے ماضی کا نقاب … مضمحل ہے ذرہ ذرہ، سرنگوں ہے ماہتاب

قلبِ مضطر میں نظر آتے ہیں آثارِ شکیب
ہمنشیں! فطرت نہ دیتی ہو کہیں مجھکو فریب!

افسر سیمابی

اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کائنات محدود ہے اور کائنات کا نصف قطر ۲ ارب نوری سال سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

ہبل کے تجربوں پر آج تک بحث کی جا رہی ہے۔ کیا یہ واقعی صحیح ہے کہ کائناتی جزیرے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں؟ ہبل کہتا ہے کہ غالباً اسکا نظریہ صحیح ہے اور ابھی تک ہم نے فطرت کے وہ قانون اور اصول دریافت نہیں کئے جن سے اسکے نظریہ کی تکذیب کی جا سکے۔ پھر بھی اس نظریہ پر بہت سے اعتراض ہیں۔

وہ روشنی جسکے ذریعے ہم ان کائناتی جزیروں کو مشاہدہ کرتے ہیں ہم تک کئی کروڑ سال کے بعد پہنچتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ کائناتی جزیرے ہم سے بہت زیادہ دور ہیں اتنے عرصہ تک روشنی مسلسل چلتی رہی ہے۔ ممکن ہے اتنی مدت میں روشنی کی خصوصیتیں بدل چکی ہوں ممکن ہے کہ اسی تبدیلی کے نتیجہ کے طور پر یہ کائناتی جزیرے دور بھاگتے نظر آتے ہوں۔

ممکن ہے کہ پلانک کا مستقلہ Planck's Constant وقت گذرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ گھٹ رہا ہو۔ لیکن یہ بات آپکی سمجھ میں نہیں آئیگی۔ دراصل اس بات کو ابھی تک بڑے بڑے سائنس دانوں نے بھی نہیں سمجھا خود ہبل بھی اسکی وضاحت سے قاصر ہے۔

اس مسئلہ کا صحیح حل تلاش ہونے تک ابھی کچھ وقت اور لگے گا۔ ممکن ہے کہ ماؤنٹ پالومر پر دو سو انچ دوربین نصب کئے جانے پر کچھ مزید روشنی ڈالی جا سکے۔ بہرحال سائنسداں ناامید نہیں ہیں۔ ہمیں بھی امید کرنی چاہیئے کہ کچھ عرصہ بعد کوئی اور شخص اس مقالہ کا بقیہ حصہ تصنیف کر سکے گا۔

امید موہوم

اب بھی امید ہے موہوم سہی خام سہی
یہ بھی اک شعبدۂ حسرت ناکام سہی
یا مرے مشق تصور ہی کا انجام سہی
خود فریبی سہی۔ دھوکہ سہی۔ اوہام سہی
پھر بھی امید ہے امید پہ جیتا ہوں میں

ان چمکتے ہوئے خوابوں ہی سے دامن بھر لوں
سعی بے سود سہی اس کی تمنا کر لوں
زندگانی کے لئے کچھ تو سہارا مل جائے

لٹ رہے ہیں مرے اشکوں کے گہر یونہی سہی
میری آہوں میں نہیں جذب و اثر یونہی سہی
مضمحل ہے جو مرا ذوق نظر یونہی سہی
برسر جنگ ہے تقدیر اگر یونہی سہی
فکر کیا دور کا زہراب جو پیتا ہوں میں

اے غم دل مری حالت پہ مجھے رہنے دے
بحر زخار محبت میں یونہی بہنے دے
کون جانے مری کشتی کو کنارا مل جائے

غلام ربانی تاباں

تخیل کے دیوتا سے

میرے ارمان بھرے باغ میں تو
ایک غنچے کی طرح
ہمہ دم، صبح و مسا
مسکراتا ہے مرے خواب کی جنت بنکر
میں سمجھتا ہوں کہ دوست!
تو ہے رنگیں محل کے مانند
جو مرے دل نے کیا ہے تعمیر
اور یہی ایک محل ہے جہاں
مجھکو اس پاپ بھری دنیا میں
اک سکوں اور سنہرا سا سکوں ملتا ہے
میں کبھی عالم تنہائی میں جب ہوتا ہوں
سوچتا ہوں کہ محبت بھی حقیقت ہے کوئی

یا کہ صحرا ہے جہاں
یہ بھٹکتی ہوئی وحشت دل انسانی کی
اور یہی جا کے بھٹک جاتی ہے
یا کہ پھر ایک شرارہ ہے جسے
یہ ہوائیں چمنستانوں کی
اک بھڑکتا ہوا شعلہ سا بنا دیتی ہیں
لیکن اے خوابوں کے مالک میرے!
میری الفت ہے یہاں سب سے الگ

میں تجھے چاہتا ہوں
اور تجھے خود نہیں معلوم محبت میری
کیا خبر تجھ کو کہ تو جان تمنا ہے مرا
تیری یادوں میں گزرتے ہیں مرے یہ دن رات
میں خیالوں کے سمندر میں بہا کرتا ہوں
میری دنیا میں فقط تو ہی مرا مندر ہے
جب کبھی رنج و الم کے بادل
میرے ان پیارے چمن زاروں میں
گھر کے آجاتے ہیں اور ٹوٹ کے چھا جاتے ہیں
تو ترا ایک ہی ہلکا سا خیال
جیسے پورب کی ہواؤں کی طرح
دم کے دم میں ہی اڑا دیتا ہے

خلیل الرحمن اعظمی

ایرانی فن تعمیر

ایم۔ ایم تقی

ایران کے قدیم ترین آثار میں بالائی محاذ، نقش رستم، فیروز آباد، تخت جمشید اور شوش کے ہخامنشی محلات شامل ہیں۔ یہ محل ستون دار ہیں جن کی چھتیں پتھر کے اونچے پتلے اور کٹاؤ دار ستونوں پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ ان کی وضع قطع سیدھی سادی ہے۔ بہت سے ستونوں پر ایک بڑے برآمدے کی چھت ٹھہری ہوتی ہے جو ایک یا زیادہ اطراف سے کھلا ہوتا ہے۔ اس کے آگے ستونوں کی قطاروں والا ہال، اور ادھر ادھر چوکور مینار ہوتے ہیں۔ ہخامنشی ستون یونانی ستونوں سے زیادہ شاندار ہیں۔ ان کے اوپر کے حصے پر دو کمریں جڑے ہوئے آدھے آدھے سانڈ بنے ہوتے ہیں اور آگے جھکے ہوئے سروں پر چھت کے شہتیر ٹھہرے رہتے ہیں۔

ہخامنشی عہد (۵۵۹ - ۳۳۱ ق۔م) کے فن تعمیر پر ہخامنشی بادشاہوں کے مفتوحہ ممالک کا اثر پڑا۔ اس طرح نہ صرف مواد، بلکہ تعمیرات کے اکثر اجزا آشور، بابل، مصر، میڈیا، اور ایشائے کوچک سے حاصل کئے گئے ہیں۔

چبوتروں کی عام ساخت اور عمارتوں کا سطح زمین سے اٹھا ہوا ہونا آشور اور بابل کے قدیم محلوں کے ڈھنگ پر ہے۔ اسی طرح کٹاؤ دار ستون، جن کے نچلے حصہ پر گل بوٹے بنے ہوئے ہیں، اور ان کے بالائی حصے مصری طرز کے ہیں اور برابر کے چوکور مینار ہیٹی خیلانی انداز کے۔ سجاوٹ کے لئے ہخامنشیوں نے مینا کی ہوئی رنگ برنگی اینٹیں جن میں کر دم دھات ملی ہوئی تھی استعمال کیں ان پر اکثر آدمیوں اور مویشیوں کی تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ ایران میں سب سے پہلے ہخامنشیوں ہی نے بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں صنف، رقبہ اور شان و شوکت کے کچھ ایسے نظریے چھوڑ گئے جن سے فن تعمیر کی ترقی میں چند کتنی صدیوں تک فائدہ اٹھایا جاتا رہا۔

ہخامنشیوں کے زوال اور ساسانیوں کے عروج (۳۳۱ - ۲۲۶ ق۔م) کی درمیانی پانچ صدیوں کی تعمیرات میں سے اب کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ اس لئے اس زمانہ کو تعمیر کے لحاظ سے بالکل کورا سمجھنا چاہیئے۔ اس کے باوجود یہ بات ماننی پڑے گی کہ پارتھیوں (۲۳۱ ق۔م ۲۵۰ء) نے اپنے عراق کے صدر مقام حاترا میں بے ستون کی محرابی چھتوں والی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اس طرز کو ساسانیوں نے جنہوں نے ایران پر ۲۲۶ء سے ۶۵۱ء تک حکومت کی، ترقی دی۔ ساسانی عہد میں ایران کے فن تعمیر میں انقلاب عظیم واقع ہوا یعنی مواد کے انتخاب، عمارتوں کے اسلوب اور زیب و زینت میں پرانی چیزوں کو بالکل ترک کر دیا گیا۔ مٹی اور پتھر کی جگہ ساسانیوں نے کھریا کے گارے کے ذریعہ انگھڑ گول پتھر لگوائے البتہ یادگاروں اور پل جیسی ٹھوس تعمیرات میں پتھر استعمال کیا گیا۔ ساسانی عہد میں پتھر کی تعمیرات کی مثالیں طاق کسریٰ، طاق بستان، اور دزفول میں دریائے کارون کا پل ہیں۔

ساسانیوں نے تعمیر کا ایک اسکول ایجاد کیا جس میں ستونوں کیلئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے محرابی تعمیرات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس میں قابل قدر ترقیاں ظہور میں آئیں۔ جنوبی ایران میں اردشیر کے محل کے جو آثار پروفیسر ہرزفیلڈ نے معلوم کئے ہیں ان میں ایک محراب دار چھت سو فٹ اونچی ہے۔ یہ ۲۲۶ء میں تعمیر ہوئی اور یورپ کی اس قسم کی چھتوں میں بارسلونا کے گرجا کی چھت کو چھوڑ کر باقی سب سے پچپن فٹ زیادہ چوڑی ہے۔ بغداد کے قریب مدائن کا بڑا محل جو تیسفون کہلاتا ہے اس کی محراب اتنی لمبی اور چوڑی ہے کہ آج تک کوئی محراب اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔ یہ ایک سو گیارہ فٹ اونچی اور چھہتر فٹ چوڑی ہے۔

ساسانی عہد کے ایران کا دوسرا بڑا کارنامہ گنبدوں کی تعمیر اور ترقی ہے۔ ساسانی گنبد رومی گنبدوں کی طرح گول یا ہشت پہلو کمروں کے اوپر نہیں ہوتے بلکہ یہ چوکور کمروں پر ہوتے ہیں۔ ان مربعوں کے چاروں کونوں پر محرابیں ہوتی ہیں اس طرح وہ اوپر جاکر ہشت پہلو ہو جاتے ہیں۔ یہ خاص ڈاٹ والی تعمیریں نہ صرف ایرانی بلکہ عام فن تعمیر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ساسانی محلوں کا خاص تناسب، جن میں مرکزی ایوان کے دونوں جانب ایک سے کمرے ہوتے ہیں، ظاہر کرتا ہے کہ اس عہد میں مشرقی معماروں نے پہلی مرتبہ اپنی تعمیروں میں مرکزیت اور یکسانیت کا خیال رکھا تھا۔ ایران اور عراق کی سرحد پر آخری عمارت قصر شیریں ساسانی عہد کے معماروں کی ساری خصوصیتوں، یعنی محرابی چھتوں، محرابوں، گنبدوں، ڈاٹوں اور محوری پلیننگ کی حامل ہے۔

ایران میں ۶۵۰ء میں اسلام کے آنے کے بعد بہت سی مسجدیں تعمیر ہونی شروع ہوئیں۔ یہ دور اٹھارویں صدی تک برقرار رہا۔ انہی میں ایران کی کچھ سب سے اہم اور خوبصورت عمارتیں وجود میں آئیں۔

مذہب نے ایرانی تعمیر کے قدیم اسالیب میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس لئے قدیم ساسانی طرز کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ مساجد کا فن بھی ترقی کرتا گیا۔

ایران میں ۱۰۳۰ء میں سلجوقی ترکوں کے فرماں روا ہو جانے سے تعمیرات کا ایک نیا عظیم الشان عہد شروع ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا احساس کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آئندہ مغلوں کے حملوں کی وجہ سے اس عہد کی بہت سی تعمیرات برباد ہوگئیں۔ سلجوقیوں کا فن تعمیر مضبوطی، عمدگی، جوش اور توازن کے لئے خاص طور پر اہم ہے۔ اس زمانہ میں بیب کا اسلوب جاری ہوا جس سے ساری ساخت نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نئے اسلوب کی سب سے مشہور مثالوں میں سے ایک گورگان کے مقام پر گنبد قابوس ہے۔ سلجوقی عہد کی مسجدوں اور عبادت گاہوں کے بڑے بڑے گنبد خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تجربہ کرتے کرتے یہ تقریباً مثالی گنبد تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس فن کے ایک خاص ماہر ایرک شورڈر کا بیان ہے کہ یہ معمار اس درجہ کامیاب تھے کہ نیوٹن کے زمانہ کی ترقی ریاضیات ہی اسی تعمیر میں ممکن بنا سکتی تھی۔ لیکن اصفہان میں مسجد جامع اس قسم کی پہلی تعمیر ہے۔

اس کے بعد ڈالٹون کا نمبر آتا ہے جنہوں نے سلجوقی عہد میں سب سے زیادہ ترقی کی۔

سلجوقی عہد کی ایک بڑی خصوصیت عمارتوں کی سجاوٹ ہے جس نے آئندہ ایران کی شان و شوکت میں چار چاند لگا دیئے۔ ان کے زمانہ میں مسالہ کے کام، برتنوں کی پچی کاری اور دیواروں کی نقاشی میں خاصی ترقی ہوئی۔ تیرہویں صدی میں منگولوں کے حملے کی وجہ سے ایران کے بہت سے تعمیری کارنامے برباد ہو گئے اور اس صدی میں نئی تعمیریں بھی وجود میں نہیں آئیں۔ صدی کے ختم کے قریب نومسلم منگول حکمرانوں غازان خان اور خدابندہ الجیتو نے چودھویں صدی کے تعمیری نشاۃ الثانیہ کی ابتدا کی کیونکہ انہوں نے ایران کی سب سے خوبصورت تین عمارتیں بنوائیں (۱) اصفہان کی مسجد جامع کے حصے (۲) سلطانیہ میں الجیتو کا عظیم الشان مقبرہ (۳) ورامین کی خوبصورت مسجد۔ آخری دو عمارتیں ٹائلوں کی خوبصورتی کیلئے قابل ذکر ہیں ساتھ ہی ساتھ اصفہان اور ورامین دونوں جگہوں پر ایسا عمدہ اور دلکش مسالہ استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ اب تک کبھی نہیں کیا گیا تھا۔

پندرہویں صدی میں تیمور نے اپنی سلطنت کے وسیع ذرائع سے فائدہ اٹھا کر رومی شہنشاہوں کی طرح شاہی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ پرانے اسالیب پر بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں اور انہیں بڑی لاگت لگا کر سجایا۔ اس عہد کی تعمیرات ایشیا کی ساری تعمیرات سے زیادہ حسین ہیں، خاصکر دیواروں کے رنگین ظروف کی وجہ سے۔

ساخت میں بھی اہم جدتیں ظہور میں آئیں۔ ان میں سب سے خاص ایک نئی قسم کا گنبد تھا جو تھا تو پہلے ہی جیسا مگر اس کے اوپر پیاز نما خول سا چڑھا ہوا تھا اور درمیان کا حصہ خالی ہوتا تھا۔ اسے پہلے پہل تیمور نے سمرقند میں بنوایا تھا پھر یہاں سے یہ خراسان، تبریز اور پھر سارے ایران میں گیا۔ اس کے بعد یہ ہندوستان میں بھی آیا اور ہندوستانی فن تعمیر کی نمایاں خصوصیت بن گیا۔ اس کی اہم مثال دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کا گنبد ہے۔

تیموری فن تعمیر کا سب سے بڑا کرشمہ مشہد کی گوہر شاد نامی مسجد ہے جسے تیمور کے بیٹے شاہ رخ کی بیوی نے بنوایا تھا۔ اس میں چار بڑے ایوان ہیں۔ جنوب مغربی ایوان جو ایوان مقصورۃ کہلاتا ہے شاندار نیلے گنبد سے ڈھکا ہوا ہے۔ سر پرسی سائکس کے لفظوں میں "چوک کی خوبصورتی، رعنائی، عمدہ تناسب اور ٹائل کا کام اسے وسطی ایشیا کی سب سے عمدہ مسجد بنا دیتا ہے"۔

تیمور سینکڑوں ہندوستانی سنگ تراشوں کو ایران لے گیا اور اپنے محل میں اس سے کہیں زیادہ پتھر لگوائے جتنے اب تک ایران میں لگوائے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی کی وجہ سے ایران کے عہد تیموری میں پتھر کی عمارتیں وجود میں آسکیں۔

ایران پر سولہویں صدی میں صفوی خاندان کی حکومت قائم ہونے سے قومی نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اب کئی صدیوں کے بعد پھر ایرانی خاندان برسر اقتدار آیا تھا۔ فن تعمیر کی ترقی شاہ عباس اول (۱۵۸۷-۱۶۲۹ء) کے عہد میں شباب پر آئی۔ اس کے وسیع تعمیری پروگرام میں دارالخلافہ اصفہان میں سایہ دار سڑکیں، محلات، سرکاری دفاتر، مسجدیں، مدرسے، بازار، کارواں سرائیں اور باغات شامل تھے۔ اسے شہر کو خاص منصوبے کے مطابق بنانے والا پہلا بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔

عہد صفوی کی مایۂ ناز تعمیر اصفہان کی "مسجد شاہ" ہے۔ اگرچہ اس کی طرز مشہد کی "مسجد گوہر شاد" ہی جیسی ہے اور اس میں کسی خاص چیز کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ رعنائی اور شان و شوکت میں ایران کی ساری مسجدوں سے بہتر ہے۔

اس زمانہ کے دوسرے شاہکار "مسجد شیخ لطف اللہ"، شاہ عباس کے محل کا باہری دروازہ، شاہ عباس کے "چہل ستون" اور "چہار باغ" نامی محل اور "مدرسہ مادر شاہ" ہیں۔

اٹھارویں صدی کے ختم تک ایران میں تعمیرات کا سلسلہ تقریباً

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عیادت

مجھے سخت ناپسند ہے

افسانہ

بخدا مجھے سخت ناپسند ہے۔ لفظ عیادت ہی سے مجھے دلی بیر ہے۔ آپ اس شریف رسم کی نیکیاں اور اچھائیاں گنوا کر مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مجھے میرا یہ نظریہ بدلنے پر مجبور نہ کریں۔ گستاخی معاف، میں اس بارے میں ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ مجھے کج خلق، بدتہذیب، جاہل، گنوار کے معزز خطابات سے نوازنے کی کوشش فرمائیں گے، مگر یقین فرمائیے میرے دل میں آپ کی طرف سے ذرا بھی میل نہ آئے گا۔ مجھے ان اعزازی الفاظ کے لئے آپ سے ذرا بھی ملال نہیں ہوگا لیکن خدارا ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرما کر ایک صرف ایک بار آپ بھی میرے ہمنوا بن جائیے۔ صرف ایک بار میرے اس نظریہ کی تائید فرما دیجئے۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھے گا۔ میرا سر فخر و مسرت سے بلند ہو جائے گا۔ بخدا بہت تلخ تجربوں کے بعد یہ نظریہ قائم کیا ہے میں نے بڑی بڑی کٹھن آزمائشیں جھیلی ہیں۔ بارہا ایک سو چار ڈگری بخار کی حالت میں چار چار گھنٹے متواتر مہربان پرسان حال سے طویل طویل گفتگو کی سعادت حاصل کی ہے۔ یعنے بار ہا رات بھر کے شدید درد سر اور نزلہ و اعضا شکنی کی اذیت دہ بیداری کے بعد کسی شفیق "عیادت گر" کے طفیل سارا دن پلک تک نہیں جھپکا نے پائی ہوں اور ان بے پناہ و گرانبار غمگساریوں کو میں نے بڑے صبر و تحمل سے برداشت کیا ہے۔ اپنے دل میں بھڑکنے والی بغاوت کی آگ کا کبھی دھواں تک باہر نہیں آنے دیا۔

لیکن کبھی کبھی صبر کا یہ پیمانہ (پیمانہ نہیں گھڑا) لبریز کی حد سے بھی کئی قدم آگے ہی بڑھ جاتا ہے۔ مہلک یا تکلیف دہ بیماریوں کا ذکر نہیں، آپ ذرا کسی لطیف قسم کے آرام دہ سے مرض کا تصور کیجئے۔ ہلکا ہلکا درد سر، ہلکی ہلکی حرارت یا معمولی سی معدہ کی خرابی۔ ایسی شاعرانہ اور لطیف مند بیماریاں روز روز تھوڑی آتی ہیں۔ جب کبھی تندرست رہتے رہتے جی اکتا گیا ہو۔ روزمرہ کے یکساں معمول سے دل الٹتا ہوا اور ایسے میں اچانک کسی ایسی بیماری کی زیارت نصیب ہو جائے تو آپ ہی کہدیجئے دل خوشی سے دیوانہ نہیں ہو جاتا؟ اللہ اللہ، کس قدر مسرت ہوتی ہے۔ کتنا اطمینان، کتنی تسکین، تین چار روز نہیں تو کم از کم دو ایک روز، تو دن بھر کے لئے آرام کرنے کا بہانہ مل گیا۔ نہ کسی سے ملیں گے۔ نہ کہیں جائیں گے۔ ایک الگ خاموش سے کمرے میں لیٹ کر مزے سے کتابیں پڑھیں گے۔ افسانوں کے پلاٹ سوچیں گے۔ کوئی بھولے بسرے گیت گنگنائیں گے اور .... لیجئے سارا تخیل درہم برہم، تمام منصوبے الٹ ——— اب بھاری بھرکم اور مخلصانہ مزاج پرسیاں ہیں اور ہماری مظلوم جان حزیں!

"کیوں طبیعت سست ہے کچھ؟ کونین کھا لیجئے اور گرم گرم چائے پیجئے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیے گا۔" "بی بی آپ اب تک اٹھی کیوں نہیں! ہمارے قمیص کے بٹن ٹانک دیجئے۔ سکول کو دیر ہو رہی ہے۔ اٹھئے نا، بھلا کیا ہوا ہے آپ کو؟"

"اجی آپا، میری اچھی آپا۔ بس اٹھ جائیے جلدی سے۔ سچ، چائے پیتے ہی ساری سستی دور ہو جائے گی۔ لیجئے آپ نہیں آتیں تو میں بھی چائے نہیں پیتا۔"

"ارے یہ تو یہاں ہیں۔ میں سارے میں ڈھونڈ آئی۔ کیوں دشمنوں کا جی تو اچھا ہے؟ (دشمنوں کا) سر دباؤں؟"

"بیٹیا آج اٹھنا نہیں۔ کتنا دن چڑھ آیا۔ کیا کہا طبیعت خراب ہے؟ کل سر دھو یا تھا نا! اتنی ہوا چل رہی تھی۔ میرا تو ماتھا جبھی ٹھنکا تھا مگر تم کسی کی سنتی تھوڑی ہو؟ چلو باہر دھوپ میں چل کر بیٹھو۔ جان کھلے گی۔ میں تمہاری دُلائی لے چلتی ہوں۔"

"کیا بات ہے منی، ابتک باہر نہیں نکلیں۔ جی تو اچھا ہے؟ بس کوئی نہ کوئی تکلیف تمہیں تو جیسے دیکھتی ہی رہتی ہے۔ کتنی دفعہ کہا عطر لگا کر باغیچہ میں نہ نکلا کرو۔ واقعی ہنسی کی بات نہیں۔ سچ کہتا ہوں مجھے کسی پر بھی اعتبار نہیں۔ کسی کے ہاتھ کی چیز مت کھایا کرو۔ آج سے کبھی کوئی کھانے کی چیز کہیں سے گھر میں آ تو جائے ....."

"ہائیں، آپ تو ابھی تک لحاف میں لپٹی پڑی ہیں! میں تو اسی ٹرین سے آ رہا ہوں۔ گاؤں جانا تھا۔ سوچا گھڑی کی گھڑی ملتا چلوں۔ آپ تو بہت زرد نظر آ رہی ہیں۔ چہرہ بالکل اترا ہوا ہے۔ آگے ہی کونسا پہلوان تھیں۔ اب رہی سہی کسر اس بیماری نے پوری کر دی۔ دراصل آپ زیادہ پڑھ پڑھ کر بیمار اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ (تشخیص ملاحظہ ہو) آپ کی بھاوج تو ہمیشہ فکر کرتی رہتی ہیں کہ بی بی کو اتنی کتابیں نہیں پڑھنی چاہئیں۔ مگر آپ کسی کی مانتی ہی نہیں ......"

اور میں لاشعوری طور پر محسوس کرنے لگتی ہوں جیسے اس دنیائے فانی سے ہمارے کوچ کا وقت بس نزدیک تر آ گیا ہے۔

اگر ان قلعہ شکن اور حوصلہ شکن یا بیماری شکن حملوں سے پسپا ہو کر اپنے نرم گرم بستر کو خیر باد کہہ کر قہر درویش برجان درویش کمرہ سے "برآمد" ہو گئے تو خیریت ورنہ پھر ذرا دیر بعد بالکل غیر متوقع طور پر آ گئے "ترقی پسند" گروہ کے کوئی رکن اعظم۔

"کیا ہوا؟ یہ ابتک بستر میں دبکی بیٹھی ہیں۔

شیریں

آپ لوگ کس قدر پست ہمت ہیں، تکلیف کو کتنا مانتی ہیں۔ یہ سب دل کشی کی کمی کا نتیجہ ہے اور پھر ساتھ ہی آپ کی اپنی قوت ارادی کا فقدان کہ ذرا سی بیماری میں یوں دل چھوڑ دیتی ہیں۔ مجھے دیکھئے ابھی ابھی پانچ میل لمبی دوڑ لگا کر آیا ہوں اور اب کہئے تو آٹھ میل پورے اور دوڑ سکتا ہوں۔ حالانکہ کل سے سخت نزلہ ہو رہا ہے۔ رات بخار بھی تھا......"

اگر اب بھی بے شرمی اور ڈھٹائی کا دامن نہ چھوڑا تو لیجئے فیصلہ کن بم بول دیا گیا۔ دو خطرناک قسم کی بزرگ آنکھیں جالی کے کواڑ سے چپکی ہوئی نہایت حسرت بھری نظریں کمرہ میں پھینک رہی ہیں ——— ایک منٹ ——— دو منٹ پورے پندرہ منٹ کی احمقانہ خاموشی ——— ! اور آخر ڈھٹائی کو دم دبا کر بھاگنا ہی پڑتا ہے "اندر آ جاؤ نا بابا" اور اب بابا سینکڑوں ہزاروں بزرگانہ ہمدردیاں نصیحتیں۔ اور تشویشناک آہوں کو اپنے جلو میں لئے ہماری اس خود ساختہ قسم کی بیماری کا پرسا دیتے ہوئے پلنگ کی پٹی کے ساتھ لگ کر آرام سے بیٹھتے ہوئے اپنی قیمتی زندگی کی کسی ستر ہزار مرتبہ دہرائی ہوئی داستان جانفزا کی از سر نو مشق شروع کر دیتے ہیں اور میں ان کی چہدری اور عمر کی بیشمار منازل طے کئے ہوئے گھسی پٹی ڈاڑھی پہ نظریں جمائے سوچنے لگتی ہوں کہ وہ شاعران کرام کس قدر اذیت پسند اور نا تجربہ کار رہے ہیں جو مرتے مرتے بھی عیادت کی آرزو دل میں لئے رہتے تھے "وہ خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس" قسم کے اشعار۔ یہ حقیقت ان سے پوشیدہ کیوں تھی کہ اگر مزاج پرسی کرنے والے عنایت فرما ذرا پہلے تشریف لے آتے تو آپ کی روح شام کی بجائے دوپہر ہی کو کوچ فرما گئی ہوتی۔ اور پھر سرہانے رکھی ہوئی کتابیں جیسے میرا منہ چڑانے لگتی ہیں۔ گیتوں کے بول کسی بھوت کی طرح فضا میں ناچنے لگتے ہیں۔ جی الجھنے لگتا ہے۔ دم گھلتا معلوم ہوتا ہے اور دل سے ایک باغیانہ دردناک صدا آتی ہے "وہ مجھے ناپسند ہے۔ بخدا مجھے سخت ناپسند ہے۔ لفظیات ہی سے مجھے دلی بیر ہے......"

غزل

[illegible] بیمار ہوں میں
[illegible] بیمار ہوں میں
[illegible] تیرا بیمار ہوں میں
[illegible] تیرا بیمار ہوں میں
[illegible] بیمار ہوں میں

یاور

احساس

آؤ کچھ دیر ذرا غور سے سن لو تم بھی
کوئی اس مادّی دنیا سے پرے لیجا کر
ایسی دنیا میں بلاتی ہے ہمیں یہ آواز
زندگانی بھی جہاں ہے مگر موت سے دور
بولو یہ دلنشیں آواز سنوں یا نہ سنوں؟
ہو اجازت تو اس آواز میں کھو جاؤں میں!

دے رہا ہے کوئی آواز پہ آواز ہمیں
بخشنا چاہتا ہے سوز بھرا ساز ہمیں
جس جگہ عاشقوں کی پاؤں میں زنجیر نہیں
چاند تارے بھی ہیں لیکن فلک پیر نہیں
ہوش میں کھوں؟ کہ دماغ اپنا معطل کر لوں؟
حکم دو تو ابھی کانوں کو مقفل کر لوں!!

اسد رضوی

ایرانی فن تعمیر

بقیہ صفحہ ۱۶

ختم ہو گیا۔ نئی تحریکیں پیدا نہ ہو سکیں۔ اگرچہ "امام زادے" (امام زادوں کے مقبرے) تعمیر ہوتے رہے لیکن کوئی اہم تعمیر وجود میں نہ آئی۔

بیسویں صدی میں بھی رضا شاہ کی تخت نشینی تک کوئی بڑی عمارت تعمیر نہ ہو سکی۔ جیسا کہ وقت کا تقاضا تھا رہائشی مکانات، ہوٹل، سینما ہاؤس جدید اسکول اور ہسپتال ضرور بنے لیکن یہ ضرورت کی چیزیں ہیں جنمیں نہ کوئی خاص خیال ہے اور نہ تاثر۔ کچھ اسکول، تجارتی عمارتیں اور سرکاری دفتر مغربی روس کے شاندار بارونق اسلوب پر بھی بنے ہیں۔

رضا شاہ کی تخت نشینی پر قومیت کی تجدید کو حکومت کی مدد حاصل ہوئی۔ نئی تحریک قومیت کی پشت پناہ بنی۔ یہ خیال تھا کہ اسلام اور اس کا تمدن ایران کے لئے بیگانہ ہے جو تعمیرات پر بھی اثر انداز ہوا لیکن یہ تاریخ کے غلط مطالعہ کا نتیجہ تھا کیونکہ درحقیقت اسلام نے کبھی بھی ایران میں اپنے تعمیری نمونوں کو جنم دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایران کی نئی عمارتیں یا تو کنکریٹ کی بنی ہوتی ہیں جن میں کمرے کھڑکیاں اور دروازے مستطیل نما چپٹے ہوتے ہیں جیسے کہ عام طور پر ہندوستان کے صنعتی شہروں میں نظر آتے ہیں اور یا بڑی بڑی سرکاری عمارتیں ہیں جو سامنے سے ہخامنشی اور ساسانی انداز کی ہیں اور ان کے اندرونی حصے جدید قسم کے۔ کٹاؤ دار اور اونچے اونچے ستون اور ان کی چوٹی پر سانڈوں کے کمریں ملے ہوئے جوڑے پھر نظر آنے لگے ہیں۔ یہ ہخامنشی اسلوب ہے طہران میں پولیس کا بڑا دفتر اور بنک اسی قسم کے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایرانی ذوق سلیم اور فنی اور تمدنی ورثہ کے میل سے عنقریب جدید اور خوبصورت صنعتیں وجود میں آئیں گی۔

دکھنی مثنویوں کے موضوع

نصیر الدین ہاشمی

ہم نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں تفصیل کے ساتھ اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ دکن میں اردو زبان کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی، پہلا شاعر اور پہلا نثار کون تھا، اس موقع پر اس کی صراحت طوالت کا موجب ہوگی، البتہ موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ دکھنی ذخیرہ جو اس وقت تک ہمدست ہوا ہے اس کے لحاظ سے پہلی دکھنی مثنوی نظامی کی ہے جو کدم راؤ و پدم سے موسوم اور سنہ ۸۶۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

دکن میں تقریباً پانچ سو سال تک دکھنی زبان مروج رہی نظم اور نثر اسی زبان میں تحریر ہوتی رہیں، سنہ ۱۲۰۰ھ اور اس کے بعد بتدریج شمالی ہند کے ارباب کمال شعرا اور مصنفین کی وجہ سے شمالی ہند کی اردو کا جو دکھنی سے زیادہ فصیح اور صاف تھی رواج ہوگیا۔

دکھنی زبان کے عروج کا زمانہ سنہ ۱۰۰۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک قرار دیا جا سکتا ہے، اسی دو سال کے عرصہ میں ہمیں نظم و نثر کی زیادہ کتابیں دستیاب ہوتی ہیں، اس کے بعد جو کتابیں قلمبند ہوئی ہیں وہ دکھنی کے بجائے اردو زبان میں ہیں، یہاں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دکھنی زبان اردو کے سوا کوئی اور تھی، نہیں بلکہ دکھنی کی ترقی یافتہ اور صاف صورت اردو ہے، دکھنی زبان کو ہم "قدیم اردو" سے موسوم کرتے ہیں،

نفس مضمون پر کچھ لکھنے کے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ اس زمانہ کے ماحول کا تذکرہ کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ قدیم اردو شاعری کس ماحول میں پروان چڑھی، اور زمانہ کی سیاسی، معاشرتی اور تمدنی فضا کیا تھی،

اگر ہم اس زمانہ کی دکن کی سیاسی حالت پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ سیاسی فضا ایک عرصہ دراز تک نہایت مکدر رہی، خون کے بادل ہر وقت منڈلاتے رہے، اول تو بہمنی سلطنت کا شیرازہ حکومت منتشر ہونے لگا تو صوبہ داروں نے خودمختاری کا ڈنکا بجایا، اور اپنی حکومت قائم کر لی، لیکن ان میں آپس میں ایک وقت کے سوا کبھی اتحاد اور اتفاق نہ ہوا، ہر وقت ایک سلطنت دوسری سلطنت پر دست درازی کرتی رہی، تاکہ اپنی قلمرو کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے، اس کے قطع نظر دو اور حکومتیں بغلی دشمن کی طرح موجود تھیں، جن میں ایک ویجانگر کی حکومت تھی جو دکن کے جنوب میں وسیع حصہ پر حکومت کرتی تھی اور ہر وقت اس کوشش میں رہی کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی حکومت کے زرخیز اور آباد حصے اور سرحدی اہم قلعے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے جائیں، ویجانگر کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی بلکہ گولکنڈہ، بیجاپور، احمدنگر اور برار کے حکمرانوں نے مل کر ویجانگر کے حصے بخرے کر لئے، لیکن اس کے بعد پھر اندرونی جھگڑے آئے دن برپا رہے، دکھنی بادشاہوں کی کم سنی کے باعث اکثر مرتبہ امرا سلطنت آپس میں حسد و رقابت سے فتنہ و فساد کا بازار گرم رکھتے تھے، کشت و خون ہوتا رہا، ویجانگر کی آفت سے بچ جانے کے بعد مرہٹوں سے بیجاپوری عادل شاہی حکومت کو دست و گریبان ہونا پڑا، لیکن اس سے زیادہ ایک تیسری حکومت نے دکن کی فتح کا ارادہ کر لیا تھا، مغلیہ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ دکن کی اسلامی حکومتوں کو مغلیہ حکومت کے زیر نگیں کر لیا جائے اور مغلیہ علم دکن پر بھی لہرانے لگے، مغلیہ حکومت کی اس خواہش نے دکھنی حکمرانوں کو چین لینے نہیں دیا، اور بالآخر گولکنڈہ اور بیجاپور سنہ ۱۱۰۰ھ کے قریب مغلیہ حکومت کے جزین گئے، عالمگیر کے بعد پھر خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو عرصہ تک جاری رہا، حتیٰ کہ آصفجاہ اول نے حکومت اپنی قائم کر لی، مگر اس کے بعد ایک صدی تک سلطنت آصفیہ کو بھی جنگ و جدل سے سروکار رہا، غرضکہ اس سے ظاہر ہے کہ دکھنی شاعری کے پروان چڑھنے کے وقت خونی فضا تھی، جنگ و جدل کے بادل ہر وقت محیط رہے، قتل و خون کا بازار گرم رہا، ہنگامۂ کارزار برپا اور میدان رزم و پیکار شعلہ زن تھا، اور دوسری طرف جب جنگ و جدل سے فرصت ہوئی تو پھر عیش و طرب، نغمہ و سرود کا بازار گرم ہوگیا، دکھنی شاعری کے عروج اور معراج کا زمانہ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ جگت گرو، محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کا دور حکومت ہے، اور ادھر گولکنڈہ میں محمد قلی، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا دور حکمرانی ہے، ان کے زمانہ میں عیش و عشرت کی جیسی کچھ گرم بازاری رہی وہ تاریخ سے پوشیدہ نہیں ہے، فن موسیقی کی قدردانی اور گانے بجانے والوں کی سرپرستی نہایت فراخ دلی سے کی جاتی تھی، رقص و سرود کی محفلیں عام طور سے ہوتی تھیں، مسلمانوں اور ہندوؤں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، معاشرتی ہو یا غیر معاشرتی بغیر طوائف کے گانے کے مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، ہر وقت بزم عیش و طرب برپا رہا کرتی، اس وقت کی عام معاشرت میں سادگی، بلند مشربی، عالی دماغی کا وجود نابود ہونے لگا تھا، تمدن اور شائستگی میں پیچیدگی اور تکلف نے جگہ لے لی تھی، عالی شان عمارتوں کی زیبائش اور آراستگی جنت نظیر باغوں اور فردوس منظر گلزاروں کی چمن بندی اور گلشن آرائی میں بے دریغ روپیہ صرف ہو رہا تھا، ان عالی شان ایوانوں اور رشک ارم خیابانوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسموں، گل رخسار حسینوں، زاہد فریب رانیوں کی کرشمہ و ادا کی سحر آفرینیوں غمزہ اور عشوہ کے راز و نیاز سے آنکھوں بہر لطف اندوز اور شادکام ہونے کا موقع ملتا تھا، عیش و عشرت اور تعیش کی انتہائی منزلیں طے ہو رہی تھیں۔

یہ تھی وہ فضا اور یہ تھا وہ ماحول جس میں دکھنی شاعری پھولی پھلی، دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے جس کام کی ابتدا کی تھی اس کو کس طرح معراج پر پہنچایا، انھوں نے دکھنی نظم کو ترقی دے کر اس میں کیا کیا گل بوٹے پیدا کئے شاعری کے باغ کی

آبیاری کرکے اس چمن کو کس طرح تروتازہ اور معطر کردیا، کیسے کیسے پھول کھلائے، اور کس طرح ایک باغ کو سرسبز اور گل و گلزار سے آراستہ و پیراستہ کردیا۔

دکھنی شعرا نے فارسی شاعری کو نمونہ قرار دے کر اپنی شاعری کی بسم اللہ کی تھی، اسی لئے فارسی مثنویوں کے موضوع ان کی شاعری کے موضوع بن گئے، لیکن انھوں نے بعض نئے موضوع بھی پیدا کئے جس کی صراحت صفحات آئندہ میں آئے گی۔ یہاں اس امر کا بھی خیال رہے کہ زمانۂ قدیم میں شمالی ہند میں زیادہ تر غزلوں کا رواج رہا مثنوی کی جانب بہت کم توجہ کی گئی، مگر اس کے برخلاف دکن میں پہلے پہل کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم یعنی مثنوی کا زیادہ رواج رہا جو مثنویاں دستیاب ہوتی ہیں ان کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، طویل مثنویاں جن کے اشعار کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک ہے، دوسری وہ مختصر مثنویاں جن کے اشعار سو کے اندر ہیں، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، دکھنی شاعری فارسی شاعری کو پیش نظر رکھ کر شروع کی گئی تھی اس لئے مثنویوں کا ایک بڑا حصہ فارسی مثنویوں کے ترجمہ پر مشتمل ہے، مگر ان کا ترجمہ محض ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ انھوں نے بہت کچھ اضافہ بھی کردیا ہے جس کی وجہ سے وہ ان کی اپنی مثنویاں معلوم ہوتی ہیں، اس تفصیل کے بعد اب ہم اپنے موضوع کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

(۱) رزمیہ مثنویاں

اردو زبان کی شاعری پر یہ حرف گیری کی جاتی ہے کہ اس میں عشق و عاشقی، شاہد و ساقی، مے و مینا کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن اگر دکھنی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ اس میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہے، چنانچہ دکھنی مثنویوں میں ہمیں ایسی کئی مثنویاں ملتی ہیں جو رزمیہ ہیں، ان میں جنگ کے حالات اور واقعات، لڑائی کی کیفیت، حملہ کی تیاری، سامان حرب کی تفصیل وغیرہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے، میدان جنگ کی ہنگامہ آرائی، دار و گیر کا نقشہ پوری تفصیل کے ساتھ کھینچا ہے، رزمیہ مثنویوں میں ایک تو وہ مثنویاں ہیں جو فارسی سے ترجمہ ہوئی ہیں اور دوسری وہ مثنویاں ہیں جو دکھنی شعرا کی اپچ ہیں،

اول الذکر مثنویوں میں خاور نامہ، جنگ نامہ محمد حنیف، ظفر نامہ، روضۃ الشہدا وغیرہ زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، خاور نامہ چوبیس ہزار شعر کی مثنوی ہے جس کو بیجاپور کے شاعر رستمی نے عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطانہ شہر بانو کے حکم سے سنہ ۱۰۵۹ھ میں صرف ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مرتب کیا ہے، جنگ نامہ کو سیوک نے سنہ ۱۰۹۲ھ میں اور ظفر نامہ کو لطیف نے سنہ ۱۰۹۵ھ میں قلمبند کیا ہے، روضۃ الشہدا سنہ ۱۱۳۰ھ میں لکھی گئی ہے، ان کے علاوہ اور بھی مثنویاں ہیں جن کی صرف طوالت کا موجب ہے۔ ثانی الذکر مثنویوں میں نوسرہار، فتح نامہ نظام شاہ، علی نامہ، جنگ نامہ عالم علی خاں وغیرہ خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں، نوسرہار واقعات کربلا سے متعلق ہے اس کو احمد نگر کے شاعر اشرف نے سنہ ۹۰۹ھ میں قلمبند کیا ہے، فتح نامہ نظام شاہ کو شوقی نے سنہ ۹۸۰ھ میں مرتب کیا ہے، اس میں جنگ تلی کوٹہ کے حالات نظم کئے ہیں، جنگ تلی کوٹہ وہ مشہور جنگ ہے جو دکن کے مسلمان حکمرانوں اور وجیانگر کے راجہ رام راجہ میں ہوئی تھی، علی نامہ بڑی اہم مثنوی ہے، اس کو بیجاپور کے ملک الشعرا نصرتی نے سنہ ۱۰۷۶ھ میں تصنیف کیا ہے، جنگ نامہ عالم علی خاں میں آصف جاہ اول اور عالم علی خاں کے جنگ شکر کھیڑہ کے حالات نظم کئے گئے ہیں یہ مثنوی سنہ ۱۱۳۶ھ میں مرتب ہوئی ہے،

(۲) تاریخ، سوانح، مناقب اور سیر

دکھنی زبان میں تاریخ و سوانح اور مناقب کے عنوان پر بیسیوں مثنویاں مرتب ہوئی ہیں، ان میں سب سے قدیم مثنوی گولکنڈہ کے شاعر فہمی کی مثنوی ہے جو توصیف نامہ سے موسوم اور سنہ ۱۰۷۲ھ میں قلمبند ہوئی ہے، اس میں سیدنا عبدالقادر جیلانی کے مناقب اور اوصاف نظم کئے گئے ہیں، دوسری مثنوی ابراہیم نامہ ہے جس کو بیجاپور کے شاعر عبدل نے سنہ ۱۰۱۲ھ میں تصنیف کیا ہے، اس میں ابراہیم عادل شاہ کے حالات ہیں، نصرتی کے علی نامہ کا تذکرہ اس عنوان میں بھی کرنا ضروری ہے، اس میں علی عادل شاہ کے حالات نہایت وضاحت سے نظم کئے گئے ہیں، تاریخی اہمیت کے متعلق مولانا ڈاکٹر عبدالحق کی صراحت قابل ملاحظہ ہے

غزل

جب تصور میں تجھے لاتا ہوں میں ــ زندگی میں کیف سا پاتا ہوں میں
کھو گیا تیرے خیالوں میں دماغ ــ رنج و غم سب بھولتا جاتا ہوں میں
دیکھتا ہوں تجھ کو اپنے آپ میں ــ خوبیوں پر تیری اتراتا ہوں میں
تو بہار جنت تخیل ہے ــ اپنے گلشن میں تجھے لاتا ہوں میں
اللہ اللہ عشق کی کیفیتیں ــ روح میں اک چین سا پاتا ہوں میں
تو نے بخشا عشق و مستی کا سرور ــ بےخودی میں تیرے گن گاتا ہوں میں
مل گیا ہے اپنی منزل کا نشاں ــ اے فلک راہ چھوڑ دے آتا ہوں میں
دور حاضر کا ہوں وہ زند الست ــ مے کو میخانے میں ٹھکراتا ہوں میں
دیکھتا ہوں جب تماشائے جہاں ــ زندگی سے اپنی گھبراتا ہوں میں
پھر خیال آتا ہے یہ میں کون ہوں ــ لڑکھڑاتے ہی سنبھل جاتا ہوں میں
مجھ میں تو موجود میں تجھ میں نہاں
تیرے دم سے جی کو بہلاتا ہوں میں

مشتاق احمد

"تاریخ سے واقعات کو ملا لیجئے کہیں فرق نہ پائے گا بلکہ بعض باتیں شاید ایسی اس میں ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر ہے۔ باوجود اس کے واقعات کی تفصیل، مناظر قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچا ہے"

حیدرآباد کے شاعر رشید نے سنہ ۱۱۸۵ء میں اعجاز احمدی نام سے آنحضرت کے حالات لکھے ہیں، اس عنوان میں ارکاٹ کے شاعر مولانا باقر آگاہ کا تذکرہ ضروری ہے، جنہوں نے آنحضرت صلعم کی سیرت، اہل بیت کے مناقب اور سیدنا عبدالقادر جیلانی وغیرہ کے حالات نظم کئے گئے ہیں، مولانا آگاہ کی کتابیں جو سب کی سب مثنوی کی صورت میں ہیں سنہ ۱۱۹۸ھ سے سنہ ۱۲۱۲ھ تک مرتب ہوئی ہیں، ان کے اشعار کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے، یہ امر خاص طور پر قابل تذکرہ ہے کہ آگاہ نے آنحضرت صلعم کے حالات میں زیادہ تر آپ کے پاکیزہ اخلاق اور عادات اور تعلیمات کا تذکرہ کیا ہے، زمانہ مابعد کے مورخین کی طرح جنگ کے حالات کو اہمیت نہیں دی ہے،

اخلاقی مثنویاں

دکھنی زبان میں کئی ایک اخلاقی مثنویاں بھی ہیں، ان میں سے گولکنڈہ کے شاعر قطبی کی "تحفہ" (سنہ ۱۰۴۵ھ) اور شغلی (بیجاپور) کی پند نامہ قابل تذکرہ ہیں، ان کے علاوہ کئی اور مثنویاں، بیجاپور، گولکنڈہ اور ارکاٹ وغیرہ میں تصنیف ہوئی ہیں، جن میں اخلاقی مسائل نہایت خوبی سے نظم کئے گئے ہیں۔

تصوف کی مثنویاں

فارسی شاعری میں تصوف کی ابتدا حضرت ابوسعید ابوالخیر سے ہوئی ہے، جنہوں نے رباعیات میں تصوف کے نکات حل کئے ہیں، شیخ کے بعد حکیم سنائی، اوحدالدین کرمانی، خواجہ فریدالدین عطار، عراقی اور پھر مولانا روم کے نام آتے ہیں جنہوں نے فارسی مثنویوں میں تصوف کے اسرار اور نکات کو بیان کیا ہے، سلوک اور حقیقت کی عقدہ کشائی کی ہے، رومی کے بعد سعدی اور حافظ آتے ہیں جنہوں نے مثنوی کے بجائے غزلوں میں تصوف کی نغمہ سرائی فرمائی ہے۔

دکھنی شعرا کے لئے یہ فارسی مثنویاں ایک ماڈل ثابت ہوئیں اور انہوں نے بھی دکھنی زبان میں بیسیوں مثنویاں لکھیں، شاہ برہان الدین جانم، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین اعلیٰ وغیرہ کے علاوہ بحری، عشرتی، وجدی وغیرہ کی مثنویاں تصوف میں اہم حیثیت رکھتی ہیں ان کی مثنویوں میں حقائق اور سلوک کے وہ نکات بیان کئے گئے ہیں جن کو خود تصوف کے ادبیات کا ایک قیمتی جزو قرار دیا جا سکتا ہے، دکھنی شعرا میں کئی ایک ایسے افراد شامل ہیں جو اپنے وقت کے مرشد کامل اور پیر طریقت تھے، ابا عن جد تصوف کی چاشنی رکھتے تھے، فقیری کے ساتھ شاعری کرتے تھے، انھوں نے اپنی مثنویوں میں تصوف کے مختلف مسائل کو عنوان قرار دے کر طبع آزمائی کی ہے، توحید، رسالت، شفاعت، معرفت، مشاہدہ نفس، تزکیہ نفس، خودی اور بےخودی وغیرہ امور پر اظہار خیال کیا ہے،

مذہبی مثنویاں

دکھنی مثنویوں میں ایسی بیسیوں مثنویاں ہیں جن کو مذہبی مثنویوں کے تحت تعارف کرایا جا سکتا ہے، ایسی مثنویوں میں معراج نامے، وفات نامے، معجزات، مذہبی قصے، عقائد اور فقہ وغیرہ کی مثنویاں شامل ہیں، کئی ایک شعرا نے ان پر طبع آزمائی کی ہے، معراج ناموں کی تعداد ہی پچیس تیس سے زیادہ ہے، کئی ایک شعرا نے اس عنوان پر اظہار خیال کیا ہے، اسی طرح فقہ اور عقائد کے عنوان پر بہت کچھ ذخیرہ موجود ہے، حضرت موسیٰ، مریم وغیرہ کے قصے بھی ہیں،

عشقیہ مثنویاں

دکھنی زبان میں عشقیہ مثنویاں یا عشقیہ داستان کے متعلق بیسیوں مثنویاں ملتی ہیں، مشرق اور مغرب کی کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں حسن و عشق کے مضامین اور عاشقی کی تمنا نظم نہ کی گئی ہو، اگر یہ کہا جائے کہ شاعری کا خاص موضوع عشق و محبت ہی ہے تو بیجا نہیں، فارسی میں عشقیہ مثنویاں بے شمار ہیں ہر دور کے شعرا نے اس موضوع کو اپنی شاعری کا عنوان قرار دیا ہے، فارسی کی طرح دکھنی شعرا کے یہاں بھی ایسی مثنویاں سینکڑوں ہیں اور ہر دور میں لکھی گئی ہیں، جو دکھنی مثنوی قدیم سے قدیم اب تک دریافت ہوئی ہے وہ ایک عشقیہ مثنوی ہی ہے، نظامی اس کا مصنف ہے، اور سنہ ۸۶۵ھ میں مرتب ہوئی ہے،

عشقیہ مثنویوں میں وجہی کی قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک، جنیدی کی ماہ پیکر، ابن نشاطی کی پھول بن، طبعی کی بہرام و گل اندام، نصرتی کی گلشن عشق، غلام علی کی پدماوت، مقیمی کی چندر بدن، امین کی یوسف زلیخا، خوشنود کی ہشت بہشت وغیرہ دکھنی ادبیات میں بہت اہم حیثیت رکھتی ہیں۔

دکھنی مثنویوں میں بعض ایسی بھی ہیں جن پر مختلف شاعروں نے علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کیا ہے مثلاً لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا، قصہ رضوان شاہ وغیرہ، دکھنی عشقیہ مثنویوں سے اس زمانہ کے حالات، رسم و رواج، اور معاشرت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، اکثر مثنویاں اپنے زمانہ کی صحیح تصویریں ہیں،

نیچرل مثنویاں

ہم بیان کر چکے ہیں کہ دکھنی مثنویوں میں دوسری مثنویاں ایسی ہیں جن کے اشعار کی تعداد سو کے اندر ہے، اس قسم کی مثنویوں میں بھی صفحات ماقبل کے موضوع پائے جاتے ہیں اور اہم حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً علی عادل شاہ کی مثنوی خیبر نامہ جو جنگ خیبر کے حالات پر مشتمل ہے، اخلاقی مثنویوں میں نصیحت لقمان مصنفہ قربی، اور پند نامہ وغیرہ تصوف کے عنوان پر بیسیوں مثنویاں ہیں، جن کا اظہار

طوالت کا موجب ہوگا۔

دکھنی شاعری میں نیچرل شاعری یا مناظر قدرت اور وصف نگاری کے متعلق بھی بہت کچھ ذخیرہ دستیاب ہوتا ہے، اس قسم کی نظمیں اکثر و بیشتر مثنوی کی صورت ہی میں ہیں، نیچرل عنوان پر جو مثنویاں ملتی ہیں ان کو ذیل کے عنوان میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

عیدین، نوروز، بسنت، موسم بارش، سالگرہ، رسومات شادی بیاہ لوازمات شاہی، شاہی محل، قصر و ایوان، باغات، پھول پھل، سبزترکاری، چونکہ نیچرل شاعری کے عنوان سے ہم نے علیحدہ تفصیل کے ساتھ ایک مضمون قلمبند کیا ہے اس لئے یہاں مزید وضاحت نہیں کی جاتی۔

تبصرہ

صفحات گذشتہ میں دکھنی مثنویوں کے موضوع کی صراحت ہوچکی ہے، دکھنی مثنویوں کے متعلق چار امور خصوصیت سے غور طلب ہوتے ہیں۔

(۱) واقعہ نگاری، یہ مثنوی کا اہم جزو ہے، واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ واقعہ کا اظہار ایک ماہر فن مصور کی طرح کریں، تمام خصوصیات حتی کہ جزئیات کو بھی نظرانداز نہ کریں۔ اس معیار سے دکھنی مثنویوں کو جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہوتی ہیں رزمیہ مثنویوں میں انھوں نے بتایا ہے کہ جنگ کی ابتدا کس طرح ہوئی، فوج کیسی تھی، کوچ کس طرح ہوا، کیسا مقابلہ ہوا، کیونکر جنگ ہوئی، داؤں پیچ تلوار اور نیزہ کے مقابلے کیونکر ہوئے، کیا ان کیسے چڑھائی، ہتھیاروں کی جھنکار توپوں کی گرج، گولوں کی بارش، لہو کی روانی، مقتولین کی حالت، زخمیوں کی بے چینی اور پکار، باجوں کی آواز غرض کہ ایک ماہر فن مصور کی طرح انھوں نے واقعہ کا فوٹو کھینچ دیا ہے، اسی طرح تاریخی اور سیر کی مثنویوں میں صحیح حالات کا اندراج کیا ہے، عشقیہ داستانوں میں انھوں نے اپنے چشم دید حالات اور سنی ہوئی باتوں کو ایسے اچھے پیرائے میں بیان کیا ہے جس نے واقعہ نگاری میں جان ڈالدی ہے۔

(۲) دوسری خصوصیت حسن ترتیب ہے، ہر مثنوی میں حسن ترتیب دیکھا جاتا ہے، جو مسالہ شاعر کو ملتا ہے وہ اجمالی ہوتا ہے، غیر مرتب واقعات ہوتے ہیں شاعر ان کو ترتیب دے کر مربوط کرتا ہے، موقع موقع سے تخیل کو کام میں لاتا ہے، جذبات میں اثر پیدا کرتا ہے، اس خصوصیت کے لحاظ سے نظر ڈالا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکھنی مثنویوں میں تسلسل بیان موجود ہے، جو واقعات نظم کئے گئے ہیں وہ عمدگی سے کئے گئے ہیں، اور اپنے تسلسل کے لحاظ سے مربوط ہیں، ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ ملا ہوا ہے، اسی وجہ سے داستان کا لطف حاصل ہوتا ہے، تاریخی اور رزمیہ مثنویوں میں بھی انھوں نے اس امر کا خصوصیت سے خیال رکھا ہے اس لئے ان کی مثنویاں حسن ترتیب کی اچھی مثال ہیں، انھوں نے جہاں تخیل سے کام لیا ہے وہاں داد دی جاسکتی ہے، ان کی اکثر مثنویاں پُر اثر اور موثر ہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ دیکھی جاتی ہے کہ مثنوی میں جن اشخاص کا تذکرہ ہوتا ہے ان کے کیرکٹر کا لحاظ کرنا نہایت ضروری ہے، مرد، عورت، بچے، جوان، امیر، غریب، مفلس، بادشاہ، فقیر، سوداگر، عالم و جاہل، غرض یہ ہر ایک کا ایک علیحدہ کیرکٹر ہوتا ہے، شاعر کا فریضہ ہے کہ ان پر لحاظ رکھے اور خصوصیت قائم کرے،

(۴) چوتھی چیز کیرکٹر کا اتحاد ہے، ہر ایک شخص کا جو کیرکٹر قائم کیا گیا ہے اس کو برقرار رکھنا چاہئے،

ان دونوں امور کے لحاظ سے دکھنی مثنویوں کو جانچا جائے تو ہمیں ناکامی نہیں ہوتی، دکھنی شعراء نے اپنی مثنویوں میں ان امور کا خاص خیال رکھا ہے، وہ ان خصوصیات سے پوری طرح واقف تھے اور جہاں تک ممکن ہے اس کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ اگر چہ اس موقع پر مثال دے کر واضح کیا جاسکتا تھا لیکن طوالت کے خوف سے اس کو نظرانداز کیا جاتا ہے، اس تفصیل سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ دکھنی مثنویاں کس قدر ہمہ گیر ہیں، اور کن کن موضوعات پر حاوی ہیں، ان موضوعات کے مدنظر مصنف "تاریخ مثنویات اردو" کی رائے کی پوری تردید کی جاتی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب میں ظاہر کی ہے۔

"ابتداً جو مثنویاں دکھنی اردو میں لکھی گئی ہیں، وہ عموماً نعتیہ یا مذہبی ہیں، اس کے بعد قصص، افسانہ، فلسفہ تصوف اور رزمیہ عنوانات مستقل نہیں پائے جاتے۔ ہاں ضمناً کہیں کہیں لکھنے لگے ہیں، رزمیہ کے لئے مراثی کا میدان بہت وسیع ہے، لیکن خاندان میر انیس سے پہلے اس خصوص میں کوئی کارنامہ قابل ذکر نہیں" (تاریخ مثنویات اردو مصنفہ جلال الدین جعفری صفحہ)

صفحات ماقبل میں جو صراحت کی گئی ہے اس سے بخوبی ہمارے خیال کی تصدیق ہوسکتی ہے، دکھنی مثنویوں کے متعلق ہم نے اپنی زیر تصنیف کتاب میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

غزل

تھک گئے چارہ گر بھی آخرکار — ہائے مجھ کو شفا نہیں ہوتی
عشق، کہتے ہیں نور یزداں ہے — یہ تجلی فنا نہیں ہوتی
اک نظر بھر کے دیکھ لینے کی — ہائے اتنی سزا نہیں ہوتی
کتنی دیکھیں ادائیں ہم نے بھی — تجھ سی لیکن ادا نہیں ہوتی
یاد تیری کبھی مرے دل سے — ایک دم بھی جدا نہیں ہوتی
عشقِ حسنِ بتاں میں اے پارس
مجھ سے یادِ خدا نہیں ہوتی

پارس روجھانوی

ہندوستانی دنیائے فلم

ایک ایرانی کی سرسری نظر

م ۔ ن ۔ سیمی

میں نے کم و بیش دنیا کی مختلف زبانوں مثلاً انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ فرانسیسی کے متعدد فلم دیکھے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جو فلم ملک ہندوستان میں تیار ہوتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے نرالے ہوتے ہیں معمولی سے معمولی فلم میں بھی ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کی نظیر مغربی فلموں میں مشکل نظر آتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہندوستانی فلمی کہانیوں میں بعض اوقات تو اس قسم کے رموز پنہاں ہوتے ہیں کہ ان تک دماغ کی رسائی مشکل ہے تاوقتیکہ انہیں دو یا تین بار نہ دیکھا جائے۔ دو تین بار دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مشرقی افکار و خیالات کو کس خوش اسلوبی سے انجام دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان چیزوں سے حقیقت کو اخذ کرنا اور اشعار کی برجستگی و موقعیت کو سمجھنا اہل زبان ہی کا کام ہے لیکن اس کے باوجود ہر فلم میں ایکٹر اور ایکٹرس اپنے مخصوص انداز میں اس طریقہ سے ایکٹنگ کرتے ہیں کہ غیر ممالک کے لوگ بھی اگر تمام نہیں تو کم از کم ۵۰ فیصدی ضرور سمجھ لیتے ہیں۔ اور یہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی فلم بنانے والوں کی دماغی و ذہنی قابلیت پر دلالت کرتا ہے۔

ہندوستان کے لاتعداد ایکٹر اور ایکٹرسوں میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ جنہیں شائقین سنیما بہت سراہتے ہیں۔ مثلاً "ایک دن کا سلطان" میں صادق علی نے بحیثیت ہمایوں کام کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں کو جو شجاعت و جوانمردی اور صداقت اپنے باپ بابر سے وراثت میں ملی تھی اس کو صادق علی اس عمدگی سے نبھاتا ہے کہ حقیقت کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح فلم ہمایوں میں سلاطین مغلیہ کے محلات۔ آداب و رسوم شہنشاہ کی جلوہ افروزی پر مخصوص نقرے اور دیگر درباری امور اس طریقے سے انجام دئے گئے ہیں کہ دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دراصل دربار بابری کا بذات خود مشاہدہ کر رہا ہے۔ اسی طرح ہمایوں میں شاہی جلوس۔ بابر کا اپنے بیٹے کے لئے اپنی جان قربان کرنا اور سلطنت کا وارث بنانا سلاطین مغلیہ کا ایفائے عہد اور دوسری درباری چیزوں کا اس انداز سے مظاہرہ کیا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ فلمی کہانیاں لکھنے والے بھی اچھے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً فلموں میں یہ بات پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فلم اکثر ایسے برجستہ فقروں اور مفید اقوال پر مشتمل ہوتا ہے کہ سننے والے نہ صرف اس سے لطف اندوز ہی ہوتے ہیں بلکہ ان کے دل میں ایک خاص جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ محبت اور عشق و تعشق کی داستان اس انداز سے مرتب کی جاتی ہے کہ نوجوان طبقہ کیلئے اس میں ایک روحانی کیفیت مضمر ہوتی ہے جو انہیں پاکیزگی اور نظافت کا درس سکھاتی ہے۔ زہد اور تقویٰ کا بڑا پاس رکھا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عاشق و معشوق کی جدائی اور وصال اور دوسرے مصائب روزگار جس کا قریباً ہر شخص سے سابقہ پڑتا ہے کی اس طریقہ سے نمائش کی جاتی ہے کہ دیکھنے والے کو خاطر خواہ تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ سب سے عجیب چیز جو مجھ کو پسند ہے وہ عاشق و معشوق کے اخلاقی تعلقات کا پہلو ہے۔ مثلاً اکثر فلموں میں دیکھا ہے کہ شراب و رقص کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ بہت کچھ دیکھنے میں آتا ہے مگر یہ کبھی نہیں دیکھا جاتا کہ عاشق معشوق کا پردۂ سینما پر بوسہ لے یا ایسی حرکات ادا کرے جو عفت کے منافی ہوں اور فساد اخلاق کا باعث ہو سکیں۔ غرض ہر فلم کی بنیاد تقریباً اخلاق پر مبنی ہوتی ہے۔ بہت سے فلموں مثلاً۔ تاج محل۔ ہمایوں۔ تدبیر۔ تقدیر۔ بیسویں صدی۔ آئینہ۔ غلامی۔ قسمت۔ بسنت۔ نجمہ۔ پھول۔ اشارہ۔ ایک دن کا سلطان۔ رتن۔ ہمراہی کی مہینوں نمائش ہوتی ہے اور پھر بھی شائقین سینما کی طبیعت سیر نہیں ہوتی اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان تمام فلموں میں کسی نہ کسی طریقہ سے ایک نئی زندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے جس میں اخلاق۔ اصول زندگی اور شرافت کا راز پنہاں ہے۔ ان تمام چیزوں کو دیکھنے کے بعد میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری مستقبل قریب میں شاندار کامیابی حاصل کر سکے گی اور یقیناً مشرق میں سب سے نمایاں حیثیت حاصل کرے گی۔

ایک چیز اور عرض ہے جو شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ مصری فلموں میں عبدالوہاب (جو ملک مصر کا بہترین مغنی ہے) سے ہر فلم میں ایک زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ مصر بہت کم تعداد میں فلم تیار کرتا ہے مگر وہ سب بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ مگر ان کی دلچسپی کا باعث محض عبدالوہاب اور اس کے گانے ہیں۔ لیکن ہندوستانی فلموں میں کم و بیش ہر ایکٹر اور ایکٹرس مترنم آواز میں گاتے ہیں کہ ہر فلم ان کے گانوں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ رہا اس کی مشرقی خوبصورتی کا سوال تو یہ دیکھنے ہی سے پتہ چل سکتا ہے کہ فلمی گلستان میں کیسے کیسے رنگیں اور دلفریب شگفتہ گل نظر آتے ہیں اگر ان کی تعریف کروں تو خوف ہے یہ میرے معمولی خیالات کہیں کتابی صورت اختیار نہ کر لیں امید ہے قارئین کرام اسے ادبی یا افسانوی نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ ایک ایرانی دل کے جذباتی نظر کے تحت مطالعہ فرمائیں گے۔

شہ پارہ

[illegible]

غزل

نظیر لودھیانوی

افسانۂ فراق رقم کر رہا ہوں میں
صدیوں کے واقعات بہم کر رہا ہوں میں

شرح بہائے حسن رقم کر رہا ہوں میں
صد ماہ و آفتاب بہم کر رہا ہوں میں

جب خود کیا تھا عہد وفا تم نے مہرباں
اس دن کو یاد تیری قسم کر رہا ہوں میں

تیرے لب خموش سے ہے خواہش کلام
یا زندگی میں سیر عدم کر رہا ہوں میں

ہوتی ہے تیرے واسطے اغیار کی ثنا
شوق عرب میں پاس عجم کر رہا ہوں میں

تقدیر پڑ رہی ہے غم جاوداں مجھے
سامان صد نشاط بہم کر رہا ہوں میں

رکھتا ہوں اعتماد جو ایمان غیب پر
اور اپنے اختیار کو کم کر رہا ہوں میں

ہر بار چومتا ہوں جو سنگ سیاہ کو
کعبے میں احترام صنم کر رہا ہوں میں

یاں پی رہا ہوں توڑ کے توبہ کو اے کریم
یہ اعتراف عفو و کرم کر رہا ہوں میں

وہ دے تو دولت ایماں کروں نثار
دل اور جگر کو نذر ستم کر رہا ہوں میں

وہ مجھ سے سخت جان کو کیا آزمائیں گے
خود امتحان تیغ دو دم کر رہا ہوں میں

میں خوب جانتا ہوں کہ ہے مے کشی حرام
اے دوست چارۂ تپ غم کر رہا ہوں میں

اک بت کا ہاتھ ہاتھ میں تھامے ہوئے نظیر
کس شان سے طواف حرم کر رہا ہوں میں

دکھیاری

راہی بلگرامی

نیا ڈوبی جائے... راہی
من اندھیارا، جگ اندھیارا
پاپ بھنور ہے، دور... کنارا
ٹوٹی نیا دل کا... سہارا
آنکھ سے اوجھل کھیون ہارا

مکھ منڈل کمھلائے... راہی
پھر اٹھیں گھن گھور گھٹائیں
بانکے پیا کی بانکی ادائیں
رم جھم رم جھم ناچیں گائیں
امرت جل ہر سو برسائیں

کون انہیں سمجھائے... راہی
برہا کی ماری اک دکھیاری
راہ میں بیٹھی۔ درد کی ماری
دیکھ رہی ہے باٹ تمہاری
من میں لاگی۔ پریم کٹاری

ہردے بیٹھا جائے... راہی

عراقی پارلیمنٹ



نائب السلطنت پارلیمنٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا عراق میں پارلیمنٹ کا افتتاح بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہوا۔ صدر کابینہ فخامتہ حمدی الباچہ چی تھے۔ لیکن آپ

وزیر اعظم فخامتہ حمدی الباچہ چی اور انکے ساتھی



کی کاب
تھوڑے
ہوئے
ہوچکی

راکٹ

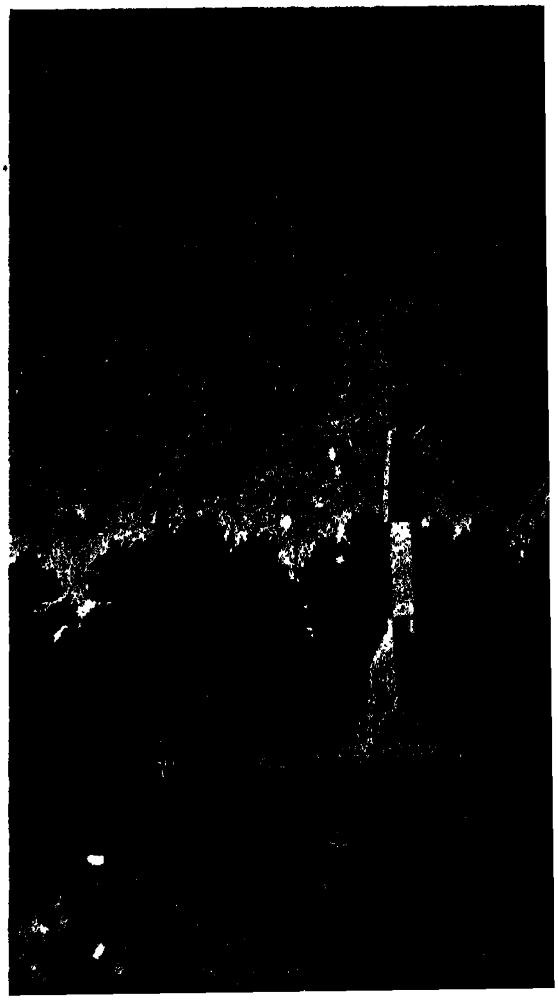
«کوکس ہیون» میں بہت سے مشہور اور تجربہ کار سائنسدان «وی ٹو» راکٹ کا طرح طرح سے جائزہ لے رہے ہیں اور نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ وہ جلد ہی بڑے اہم نتیجوں پر پہونچیں گے اور دنیائے سائنس میں ایک ہل چل مچ جائیگی۔

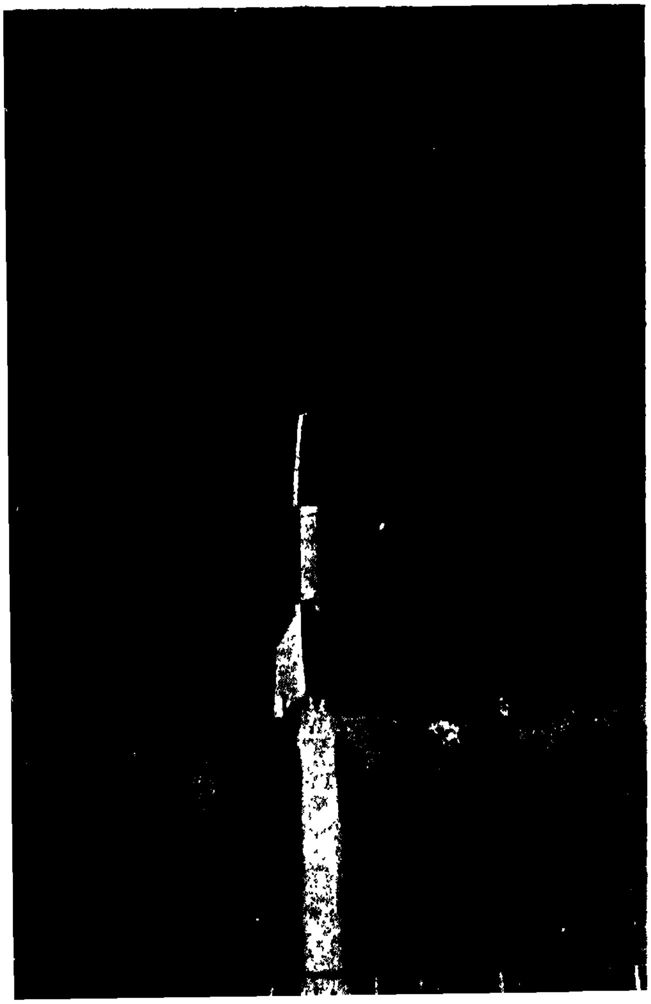


ے اس زاویہ پر پہونچ چکا ہے جس سے فائر کیا جاتا ہے

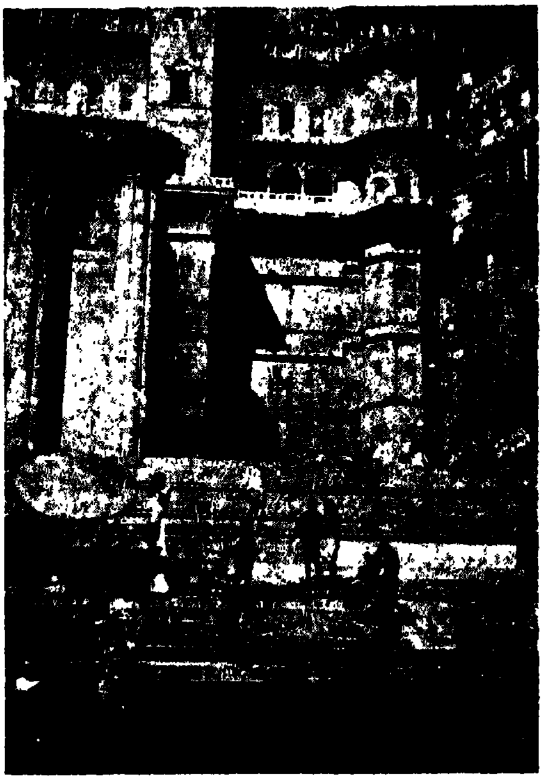
کٹ بس اب حرکت میں آنے ہی والا ہے۔

پرواز شروع کرنے کے وقت راکٹ کی حالت۔





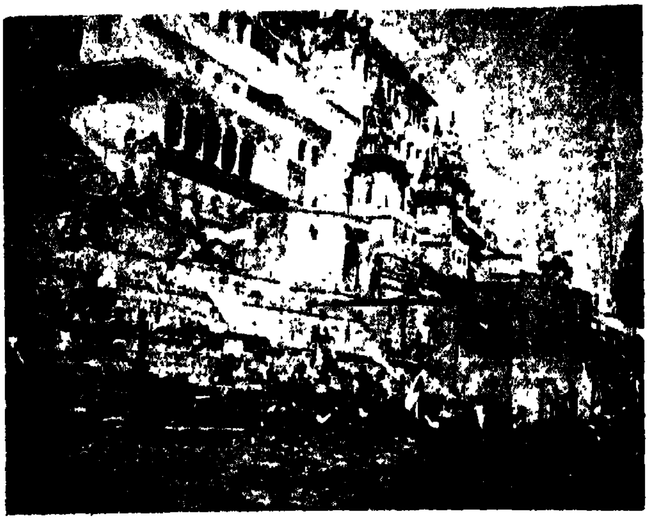
بنارس



دریا کے کنارے گھاٹ بنانا بڑے بن کا کام سمجھا جاتا ہے۔ راجے مہارجے بڑے صرفہ سے ایسے ایسے گھاٹ بنواتے ہیں۔

بنارس ہندوستان کا بہت پرانا شہر ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں اسکا نام کاشی آیا ہے۔ یہ شہر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ گنگا ہندوؤں کا بہت ہی پوتر دریا ہے۔ کاشی میں ہندوؤں کے مندر بہت ہیں اور یہ لوگ دوردور سے یہاں تیرتھ کو آتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ شہر ۱۲۰۰ ق.م میں راجہ کاش نے آباد کیا تھا۔ بدھ مذہب والے بھی اس شہر کو مقدس مانتے ہیں کیونکہ سارناتھ جو بنارس کے قریب ہی ہے وہ مقام ہے جہاں گوتم بدھ نے سب سے زیادہ اپدیش دئیے۔ ہیون سان نے جو ساتویں صدی میں بنارس پہونچا تھا بیان کیا ہے کہ اسنے وہاں تقریباً تین ہزار بھکشو دیکھے۔ ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شہر ہندوستان کے تمام مذاہب کا نمائندہ ہے کیونکہ ہندوؤں کے مندروں اور بودھوں کے پاٹھ شالاؤں کے علاوہ مسلمانوں کی بھی ایک بڑی مسجد یہاں موجود ہے۔ یہ ہے اورنگزیب کی بنائی ہوئی شاہی مسجد جو سترھویں صدی کی یادگار ہے۔

شہر میں بڑی چہل پہل، گھما گھمی اور ریل پیل رہتی ہے۔ اسکا محل وقوع بہت ہی اچھا ہے اور قدیم و جدید [illegible]



دریا کے کنارے بہت نیچے تک سیڑھیاں بنی رہتی ہیں جب پانی اتر جائے تب بھی پانی تک پہونچا جاسکے۔



بنارس کے ایک گھاٹ کا کنارہ۔ اشنان کرنے والے کپڑے کنارے پر رکھ جاتے ہیں جو لوگ انکی نگرانی کرتے ہیں وہ ایک دو دو آنے جمع کرکے کافی امیر ہو جاتے ہیں۔

دریائے گنگا میں تیرنے والی چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں





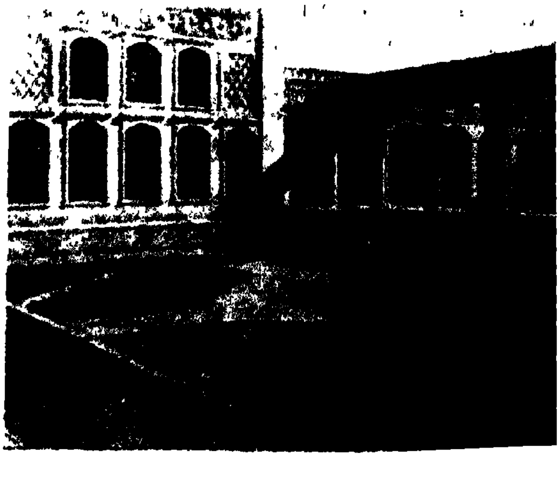
ستن جی مارکر، کے اسکول واقع مارکرآباد کے اساتذہ اور طلبا۔ یہ تصویر ناره
ں ہے لیکن پھر بھی اس سے اسکول کے متعلق اچھی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

زد اور ہندوستان کا سنجوگ



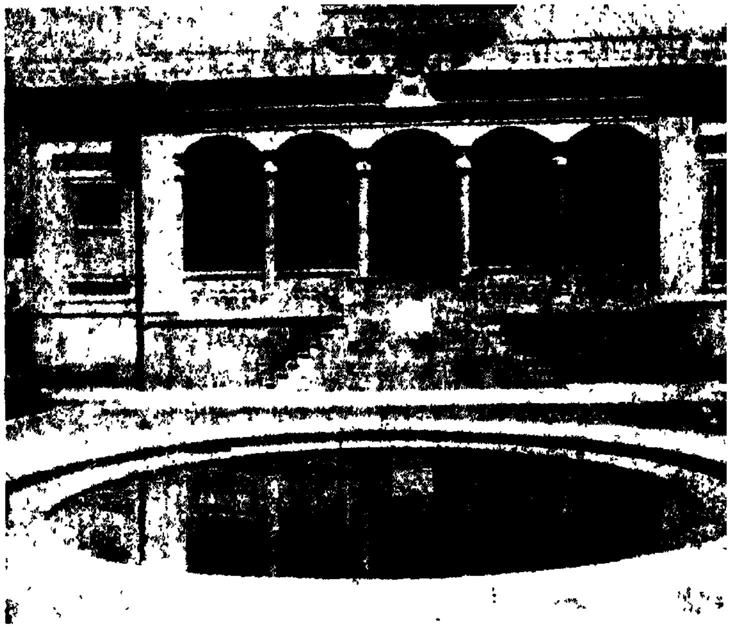
پستن جی مارکر جنھوں نے یزد میں بہت سے علمی اور دوسرے ادارے قائم کئے۔

یزد ایران کا ایک بہت پرانا شہر ہے اور یہاں کے ریشمی اور اونی کپڑے بہت مشہور ہیں۔ واقعی یہ ہونے بھی بہت دیدہ زیب اور آرام دہ ہیں۔



یہ شہر ہمیشہ سے پارسیوں کا خاص مسکن اور اور مرکز رہا ہے۔ اب بھی یہاں تقریباً دو ہزار زردشتی آباد ہیں۔ یہ لوگ اپنی قدیم تہذیب اور رہن سہن کے طریقوں پر ابتک قائم ہیں۔ اہل یزد بہت عرصہ سے ہندوستان سے وابستہ چلے آئے





یزد کا ایک آتش کدہ

ہیں۔ خاص طور پر بمبئی میں یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ انکے علاوہ کاروبار کے سلسلہ میں بھی یہ لوگ اکثر ہندوستان آتے جاتے رہتے ہیں۔

یزد میں مدرسے شفاخانے اور رفاہ عام کے دوسرے ادارے بہت سے ہیں اور انکے بانی اکثر زردشتی ہیں۔

« فردوسی گھنٹہ گھر » جو مارکر کے اسکول اور یتیم خانہ کے سامنے بنا ہوا ہے۔ یہ بھی مارکر ہی تعمیر کرایا ہوا ہے۔



[illegible]



ایک تبتی لاما دارجیلنگ کے بازار میں



ا لڑکیاں۔ انکی کمر پر انکی مخصوص ٹوکریاں
تی ہیں۔ گورکھے ہندوستانی فوج کا ایک
بہت بڑا جزو ہوتے ہیں۔

لداخ

اور اسکے باشندے



لیہ کی ایک عبادت گاہ۔ پجاری باجا بجا رہے ہیں



[illegible] شہر لیہ میں



برطانوی پارلمینٹ کی خواتین ممبر



مس فلورس ہور سبرو



سز نکل



مس ایلن والکنسن ←



→ لیڈی ایسٹر



بیگم پارا۔ «موشن پکچر پروڈیوسرس ایسوسی ایشن» نے آپکو خوبصورتی کے مقابلہ میں پہلا انعام دیا

یوگ سار - یا عطر روح

یوگ سار (عطر روح) جین مت کی ایک بلند مرتبہ اور مقدس کتاب ہے۔ یہ سری یوگیندر دیو کا فرمان اعظم ہے جنکی شخصیت بہت بلند اور تعلیم عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے کئی بند ۱۵ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کے اجمل میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ اب ایک اور حصہ بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ہوتی ہے اس سے تشکیل سب کی
جزو اہم ہے تخیل سب کی
تخیل ہی سے ہے رستگاری
تخیل ہی سے قیدیں ہیں ساری
جینے کا ہے کیا مطلب سمجھ لے
اے جینے والے یہ سب سمجھ لے

یہ راز پنہاں خاطر نشیں ہو
حق الیقیں سا حق الیقیں ہو

تو چیز کیا ہے یہ جان لینا
ہے شرط خود کو پہچان لینا
نیکی ہی کا دم بھرتا رہے گا
نیکی ہی نیکی کرتا رہے گا
راحت سی راحت حاصل نہ ہوگی
پھر بھی فراغت حاصل نہ ہوگی
کھائے گا چکر گردان رہیگا
آواگون سے حیران رہیگا

ہے ذات ہی کا دیدا لازم
ہے آگہی کا اظہار لازم
ممکن اسی سے ہے رستگاری
رکھنا ہمیشہ یہ شغل جاری
اچھی طرح یہ نکتہ سمجھ لے
اس قول کا تو منشا سمجھ لے
کوئی نہیں اور ایسا وسیلہ
ہو رستگاری جس کا نتیجہ

پنڈت [illegible] لکھنوی

یادگارِ محبت

بسا ہوا ہے تصور میں اک جواں پودا
حسیں گلاب کا گلریز و گلفشاں پودا
وہ عہدِ شوقِ و تمنا کی یادگارِ حسیں
کہ جسکی یاد ہے ایوانِ لوحِ دل کی مکیں
وہ جسکے پھول تھے سرمایۂ بہارِ چمن
متاعِ نازِ چمن وجہِ افتخارِ چمن
نسیم جس کو بصد شوق گدگداتی تھی
بہار جس کی جوانی پہ مسکراتی تھی
عنایۓ ماہ جسے چومتی تھی آ آ کر
ستارے تھپکیاں دیتے تھے جسکو گا گا کر
نثار جسپہ درِ آبدارِ شبنم کے
فرشتے جسپہ لٹاتے تھے ہار شبنم کے
عروسِ شام جسے گود میں سلاتی تھی
نگارِ صبح جسے خواب سے جگاتی تھی
شعاعِ مہرِ درخشاں نثار ہوتی تھی
ہزار بار تصدق بہار ہوتی تھی!

وہ مستِ نازِ جوانی وہ نازنیں پودا
چمن فروز و دل افروز و دلنشیں پودا
جبینِ شعر مچلتا تھا جس کے دامن میں
وہ آئینہ تھا عروسِ سخن کا گلشن میں
وہ اسکی سایۂ گل ہیں زمرد یں شاخیں
وہ عکسِ سرخیٔ غنچہ سے احمریں شاخیں
وہ پتیاں کہ ورق دفترِ جوانی کے!!
نظر فروز مرقع تھے زندگانی کے!
وہ برگِ تازہ و تر وہ شبابِ رعنائی
عیاں ہر ایک طرف آب و تابِ رعنائی
نہالِ شوق تھا جنکے سبب ہرا ہو کر
نسیمِ صبح جلاتی تھی صبحدم جھولا
نظر میں اب بھی ہیں وہ مستِ ناز کلیاں
شباب پرور و سیمیں جانِ نکہت و بو کلیاں!
بسے ہوئے ہیں ابھی غنچۂ جمیل خوابوں میں
مگر گلاب وہ کیا تھا سب گلابوں میں
وہ میری پاکِ محبت کا تحفۂ معصوم
وہ یادگارِ تمنا کہ جس سے ہوں محروم
خیال اس کا تصور پہ چھا رہا ہے ابھی
مجھے وہ نقشِ حسیں یاد آ رہا ہے ابھی
شبابِ گل کی حسیں یادگار بنکے رہے
جہاں رہے وہ سراپا بہار بنکے رہے

[illegible]

قطعات — رشیدہ ناصر ککرالوی

[illegible]

[illegible]

پژمردہ چمن

[illegible]

نورِ سحر کا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک ہنگامہ

افسانہ

میں ایک ہنگامہ پسند نوجوان ہوں۔ روزنئی شور انشوری چاہتا ہوں۔ بے تکی نہ ہو تو ہاضمہ ٹھیک رہتا ہے۔ بھوک خوب کھل کر لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ میری طوفان خیز شخصیت کو جلسوں میں نہیں بلاتے کہ کہیں بات پولیس اور اخباری سرخیوں تک نہ پہنچ جائے۔ مگر اس ناقدری کی مجھے مطلق شکایت نہیں ہے۔ کیا کروں طبیعت ہی ایسی پائی ہے۔ عادت سے مجبور ہوں عادت جس کا دوسرا نام ہے فطرت ثانیہ۔

کالج میں خاکسار کے ہنگامہ پرور کمالات کا بڑا چرچا تھا۔ مشتے نمونہ از خروارے چند کارناموں کا بلا مبالغہ تذکرہ کروں گا۔ مگر اس سے حاشا و کلا اپنے منہ میاں مٹھو والی بات مقصود نہیں۔ ایک روز کالج میں حوض کے پاس ایک ہم جماعت کے ساتھ باتیں کر رہا کھڑا تھا۔ دفعتاً خدا جانے کیا جی میں آئی کہ بغیر پیشگی نوٹس کے۔ اس کو حوض میں دھکیل دیا پھر ہنس کر کہا۔ "آداب عرض"۔ اور پھر دوسروں کو آوازیں دینے لگا۔ "یارو آؤ تماشا دیکھو۔ حوض میں پیراکی کا ریکارڈ قائم ہونے والا ہے"۔ ایک روز لڑکے تنگ زینہ سے اتر رہے تھے میں پیچھے تھا۔ چنانچہ سامنے والے لڑکے کو زور سے دھکیل دیا۔ پھر کیا تھا؟ تو چل میں آیا۔ سب چیخیں مارتے ہوئے نہایت غیر مہذب طریقہ پر لڑھکتے ہوئے تہ بہ تہ نیچے پہنچنے لگے۔ گویا ڈھیروں لڑکا جمع تھا۔ آخر میں خود یہ خاکسار بھی قہقہے مارتا اور قلا بازیاں کھاتا ہوا نازل ہوگیا۔ پھر اٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "آداب عرض"۔ ایک روز امتحان کے ہال میں (دیکھئے راز کی بات ہے) نہایت بے تکلفی سے کاپی کر رہا تھا۔ ایک ایسے لکچرار صاحب گارڈ تھے جن کو میں پسند نہیں کرتا تھا اور وہ بھی مجھے سخت ناپسند کرتے تھے۔ گویا ایک دوسرے سے نفرت و حقارت کا غیر رسمی باہمی سمجھوتہ تھا۔ کاپی کی حرکت دیکھ کر پہلے تو انھوں نے ٹوکا، پھر تنبیہہ کی، بالآخر رپورٹ کرنے کی دھمکی دی۔ میں کب دبنے والا تھا۔ مارنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ عرض کیا۔ "باہر نکلو تو سہی، وہ مزا چکھاؤں کہ عمر بھر یاد کرو"۔ دوسرے لڑکے میری ہاں میں ہاں ملانے لگے اور ایک شور مچ گیا۔ وہ ان استادوں میں تھے جو میری ہردلعزیزی سے خوف کھاتے تھے۔ چنانچہ معاملہ رفع دفع کرنے میں ہی انھیں خیر نظر آئی۔ لکچرار صاحب کی پیٹھ پھرتے ہی میں نے کہا۔ "اجی آداب عرض"۔ میری جرأت و بے باکی کو دیکھ کر ساتھی اکثر شہ دیتے تھے اور ایسے ایسے کام کراتے تھے کہ جن کے تصور سے اچھے اچھوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ مثلاً ایک روز ایک پروفیسر صاحب پیدل گھر جا رہے تھے۔ تھوڑے فاصلہ پر بندہ ایک ہم جماعت کے ساتھ پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ یہ پروفیسر صاحب ہماری جماعت کو نہیں پڑھاتے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر غیر ہردلعزیز تھے۔ مشہور تھا کہ وہ روز بیوی سے لڑ کر آتے ہیں۔ اسی لئے لڑکے ان کی بیوی کی غائبانہ قدر کرتے تھے۔ اب میرے ساتھی نے کہا۔ "یار جا کر اس کے ایک دھپا لگاؤ"۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ فوراً آمادہ ہوگیا۔ معاوضہ طے ہوگیا۔ میں تیزی سے ہم پرواز ہوگیا۔ پیچھے سے جا کر ان کے پیٹ پر ایک زوردار دھول ایسی جمائی کہ وہ اچھل پڑے اور آگ بگولہ ہو کر پلٹ کر دیکھا۔ میں نے فوراً الجاجت سے عرض کی۔ "اوہ! معاف کیجئے۔ بڑی غلط فہمی ہوئی۔ میں سمجھا، میرا دوست ہے"۔ "یہ معاف کیجئے" والا نسخہ ایسا تیر بہدف ہوتا ہے کہ وہ مسکرا کر فرمانے لگے۔ "کوئی مضائقہ نہیں"۔ اس کے بعد میں اپنے ساتھی سے جا ملا اور کہا۔ "آداب عرض"۔

کالج سے نکلا تو قدرے افسوس ہوا کہ اب وہ ولولے اور زلزلے کہاں! مگر پھر بھی حتی الامکان مواقع زندہ دلی کے نکال لیا کرتا۔ سائیکل اکثر غلط سائڈ سے چلایا کرتا اور اس رفتار کے ساتھ کہ راہ گیر طنزاً کہتے "بیچارہ سیدھا جنت میں جا رہا ہے"۔ کئی بے گناہ بندوں اور کم از کم ایک پولیس کے جوان کو دیکھتے بھالتے ٹکر دے چکا ہوں اور صاف بچ کر نکل گیا ہوں۔ اب تو میرے پاس موٹر سائیکل ہے۔ فرائے بھرتا ہوا خیال کی رفتار سے گزرتا ہوں تو لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی تو حادثہ ہوگا، گر پڑوں گا، زخمی ہوں گا۔ دیکھوں حادثہ کا شکار ہونے میں کیا لطف ہے! خطرے میں پڑنا ہی تو مقصد حیات ہے۔ طوفان آتا ہے۔ بجلی کڑکتی ہے، ہوا دنیا کو جھنجوڑ ڈالتی ہے چھتیں اڑ جاتی ہیں۔ درخت سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ دلوں پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ میں لطف اٹھاتا ہوں یہ ہے زندگی۔ بس ہو یا ریل، میلہ ہو یا مجمع، انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی موجوں سے کھیلتے ہوئے بڑھنے میں لذت محسوس کرتا ہوں "پش" یعنی گھسنے کا فن خوب جانتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اکثر نوجوان اس وصف سے محروم ہیں۔ زندگی کے جم غفیر میں دھکا پیل اور کشاکش اور "گھس" سے گھبراتے ہیں۔ پس و پیش اور جھجک اور ہچکچاہٹ دکھاتے ہیں احساس کمتری کے مظاہرے کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ مگر جناب! آپ کی دعا سے میں ان کمزوریوں کو پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوست کہتے ہیں، کاش تم شاعر ہوتے! تمہارا تخلص ہنگامہ رکھ دیا جاتا۔ غرض یہ کہ اسی "گھس پیٹ" کی بدولت فدوی نے ایک اچھی جگہ ملازمت حاصل کرلی۔ والد صاحب قبلہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو چکے تھے۔ ضلع میں ہماری زمینیں تھیں اور خدا رکھے ہیں، ان کی دیکھ بھال خاطر خواہ نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ اللہ اللہ کرنے اور غلہ زیادہ اگاؤ کی مہم میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے ضلع کو سدھارے۔ والدہ کبھی وہاں رہتیں اور کبھی شہر میں میرے پاس۔ اب جو میں ذرا بے فکری سے گزارنے لگا تو انھیں میری شادی کی فکر ہوئی۔ اِدھر اُدھر تنقیدی نظریں دوڑانے لگیں۔ خاندان میں کوئی لڑکی میرے لائق نظر نہیں آئی، نہ انھیں نہ مجھے۔ مگر خاندان کے باہر ایک لڑکی میرے لائق نظر آگئی تھی، انھیں نہیں، مجھے۔

ایک صاحب ہیں۔ نام نامی جو یہاں بدلا گیا ہے یہ ہے، کمال الدین وکیل ہائیکورٹ۔ یہ صاحب

ناکارہ حیدرآبادی

ایک دبلے پتلے میانہ قد آدمی ہیں۔ بلا کے تیز غیظ و غضب کے لئے سارے خاندان میں مشہور۔ ذرا سی بات بھی ناگوار ہوتی تو بھڑک اٹھتے۔ اچک اچک کر اس زور سے چیختے چلاتے کہ سننے والے تھرا اٹھتے۔ قانون اور جوتہ دونوں ہاتھ میں لے کر بحث کرنے پر تل جاتے۔ رد و قدح میں کسی کی نہ سنتے، اپنی تیز آواز کو بغایت بلند رکھ کر مخالف کو مرعوب کر دیتے۔ مقدمہ کمزور ہوتا یا نظائر نہ ہوتیں یا بحث پھسپھسی ہو کر رہ جاتی تو آنکھیں نکال نکال کر، ہاتھ نچا نچا کر اپنا کلام فر فر سنا کر توازن قائم کر لیتے۔ ان کی کامیاب وکالت کی ایک وجہ یہ سخن طرازی تھی ــ ایسے طرار آدمی کی لڑکی طلعت سے میرا دل شادی کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی تھی تو پردہ نشین مگر اتفاق سے دو ایک بار میں نے اس کی جھلک دیکھ لی تھی اور درپئے شادی تھا۔

شادی کے بارے میں میرا نظریہ بھی سن لیجئے۔ میری پر زور رائے میں عشق و عاشقی اور کورٹ شپ وغیرہ مراحل کے بعد شادی بے کیف چیز ہے۔ عشق کی شادی کا تو میں قائل ہی نہیں۔ ایسی مثالیں میرے سامنے ہیں جہاں شادی کے بعد عشق تو درمیان سے اٹھ گیا، فقط میاں بیوی رہ گئے۔ بعض صورتیں ایسی بھی دیکھنے میں آئی ہیں جہاں "عشق" کا سر اڑ گیا اور جوڑا "شق" ہو گیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ شادی کا وہی قدیم مشرقی طریقہ ٹھیک ہے۔ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھے نہ ہوں، ایک دوسرے سے ملے نہ ہوں۔ لڑکی وہی خوب ہے جو دل کے قریب ہو مگر نظروں سے دور۔ حالانکہ عام نظریہ تو اس کے خلاف ہے کہ لڑکی دل کے قریب نہ سہی، نظروں کے سامنے ضرور رہے تاکہ عبادت یعنی تجھ کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں والی بات نہ بھی ہو تو کم از کم محبت کی باتیں صرف و محض رسماً ہوا کریں کچھ اپنی کہیں، کچھ اس کی سنیں۔ یعنی محبت مقدم، شادی موخر۔ مگر موخر کو مقدم اور مقدم کو موخر بنانا مجھے پسند تھا۔ ان دیکھی ان جانی لڑکی سے شادی میں ایک لطف ہے، ایک رومان ہے۔ تھوڑی بہت ہنگامہ کی سی کیفیت رہتی ہے جس میں لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب کہیں۔ "آداب عرض"۔

والد صاحب قبلہ نے زمین کے مقدمہ کا ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ اسی سلسلہ میں وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ مقدمہ تو خیر و خوبی سے ختم ہو گیا۔ مگر اس کے بعد ان کے اصرار پر میں اکثر ان کے ہاں جاتا تھا۔ والد صاحب قبلہ جب شہر آتے ان سے ضرور ملتے۔ ایک بار والدہ بھی طلعت کی والدہ سے ملاقات کر آئی تھیں اور خصوصاً طلعت کے بارے میں اچھے تاثرات لائی تھیں۔ تجسس کے مارے میں نے سوالات کئے تو میری معلومات میں حسب ذیل اضافہ ہوا تھا (نام ہمارے خاندان کی مستورات کے ہیں) رنگ زبیدہ کا ہے چہرہ کتھرا ہے سلطانہ کا سا۔ ناک فاطمہ کی سی ہے۔ قد زیب کا ہے۔ آنکھیں عین مین حلیمہ کی ہیں۔ پیشانی نسیمہ کی سی ہے۔ بھویں بلقیس کی سی ہیں۔ ہونٹ پتلے پتلے نورجہاں کے سے ہیں۔ زیادہ دبلی نہیں مگر موٹی بھی نہیں، پیچھے سے بالکل کریم النسا معلوم ہوتی ہے۔ ان متفرقات کو جوڑ کر ذہن میں میں نے ایک سراپا از قسم چوں چوں کا مربہ کھینچ لیا تھا اور اس میں رنگ فرصت کے اوقات میں بھر لیا کرتا تھا۔ اس کوشش میں رہتا تھا کہ طلعت کی جھلک تھوڑی بہت اور نظر آئے تو مزید مد اس آرٹ کو پہنچے۔ اس نیت سے ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور حاضری دیتا۔ مگر کبھی کبھی دیگر مصروفیتوں کے باعث کئی دن ناغہ ہو جاتا تو وکیل صاحب کہتے۔ "دیکھو اتنے لمبے لمبے وقفے دے کر آؤ گے تو تمہارے والد صاحب کو اطلاع دے دوں گا کہ لاڈلے میاں آوارہ گرد ہو گئے ہیں۔ میرے ہاں آنا کم کر دیا ہے۔ مذاق نہ باشد۔ صاحبزادے مجھ سے ڈرا کرو۔ ورنہ کہیں کے نہ ہو گے"۔ اکثر ہم دونوں میں بحثیں ہوتیں۔ موضوع مختلف ہوتے۔ کمال صاحب حسب عادت زناٹے سے گفتگو کرتے اور خاکسار پر چھا جانا چاہتے۔ مگر یہ ناچیز بھی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتا۔ آجکل کے دوسرے نوجوان میری جگہ ہوتے تو یقین ہے ان کے سامنے وہ نوجوان شرما شرما کر "ہیں ہیں ہیں" کرنے لگتے۔ پیلے اور پلپلے پڑ جاتے۔ ہنسی مفارقت کر جاتی۔ ڈانٹ ڈپٹ سن کر پسینہ پسینہ ہو جاتے۔ چہرہ پر زلزلے کے آثار ہویدا ہو جاتے، رنگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ تھوک نگل نگل کر لکنت کے دریا بہا دیتے۔ مگر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، بندہ دل کا مضبوط ہے۔ وہ نامراد احساس کمتری سے کوسوں دور ہے۔ چیخ چیخ کر دوسروں کو مرعوب کرنا مجھے بھی آتا ہے۔ چنانچہ زبان برداشتہ بولتا چلا جاتا۔ یہ مناظرہ کوئی اجنبی سنتا تو یہی خیال کرتا کہ دو رشتہ داروں میں جائداد پر جھگڑا ہے اور نوبت بس تھوڑی ہی دیر میں دنگہ فساد تک پہنچنے والی ہے۔ بالآخر قوت گویائی صرف ہو جاتی تو بظاہر قائل نہ ہو کر مگر معقول بن کر وہ فرماتے "تم کیا جانو جی؟ ابھی بچے ہو۔ اچھا آؤ۔ اب شطرنج کی بازی ہو جائے"۔ پھر خاص پیٹنٹ ہنسی ہنستے۔

اکثر جنگ کا تذکرہ رہتا۔ کئی بار بندے کا دل گدگدایا کہ چلو فوج میں بھرتی ہو کر جنگ پر جائیں۔ فرقہ وارانہ اور غیر فرقہ وارانہ بہت سے ہنگامے دیکھے۔ یہ ہنگامہ قیامت صغریٰ بھی دیکھ آئیں۔ بڑا لطف رہے گا۔ کمیشن کے لئے درخواست دینے کا ارادہ بھی کیا۔ مگر والدین روکتے رہے۔ جنگ پر ہمارا مباحثہ بھی بیحد سنسنی خیز ہوتا۔ خاکسار اپنا کوئی ناچیز خیال ظاہر کرتا۔ وکیل صاحب دل میں تو اس کو صحیح سمجھتے مگر بظاہر مخالفانہ گفتگو بڑے شد و مد کے ساتھ کرتے، کچھ تو مجھے آزمانے کی خاطر اور کچھ نئے نکتے حاصل کرنے کی غرض سے۔ تبادلہ خیالات اس قدر پر زور اور اس قدر پر شور ہوتا کہ ہٹلر اور چرچل بھی کبھی ملتے تو شاید اس سے زیادہ جوش اور گرمی ان کے کلام میں نہ ہوتی۔ مگر میں برابر اپنے مورچوں پر ڈٹا رہتا۔ بالآخر وکیل صاحب یوں گریز کرتے۔ "مجھ سے بحث کر کے کیوں مفت میں ہلکان ہوتے ہو؟ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔

جنگ کے بہت سے فائدے ہیں۔ سب فائدے گنانے کا یہاں موقع یا گنجائش نہیں مختصراً چند فائدوں کا ذکر کروں گا۔ بقیہ آپ ذہن سے بڑھا لیں۔ ایک بہت بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ سائنس کی ایجاد و اختراع کی قوتیں تیز ہو جاتی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ راتب بندی ہوتی ہے۔ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد۔ مگر اس اصول راتب بندی کی رو سے معدہ کا جہاں تک تعلق ہے سب بھائی بھائی ہیں۔ مساوات اور دانہ چارہ۔

میرا مطلب ہے، بھائی چارہ قائم ہے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ بہت سے بے روزگاروں کو روزگار ملتا ہے۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ دیکھتے دیکھتے مالدار بن جاتے ہیں۔ پانچواں فائدہ یہ ہے کہ بہت سی اسکیمیں اور منصوبے باندھے جاتے ہیں۔ لیکن ایک سب سے بڑا فائدہ تو شوہروں کے طبقے کو پہنچا ہے۔ فرض کیجئے آپ ایک شوہر ہیں۔ آپ میں اور آپ کی بیوی میں کسی بات پر ایک زوردار مکالمہ ہو گیا ہے۔ اب اگر آپ ذرا بھی سمجھدار ہیں تو بات بنتی نہ دیکھ کر یہ کریں گے کہ بیگم صاحبہ کو الٹی میٹم دے دیں گے۔ "میں جنگ پر جا رہا ہوں۔ درخواست کا فارم لا رکھا ہے۔ آج ہی خانہ پری کر کے داخل نہ کر دوں تو نام پلٹ کر رکھ دینا۔" اب چاہے بیگم صاحبہ کا پارہ ڈیڑھ سو ڈگری ہی کیوں نہ ہو، اس "خوراک" سے فی الفور اتر جائے گا۔ وہ کہیں گی "آپ تو خفا ہو گئے۔ میں جھگڑا تھوڑی کر رہی تھی۔ میں تو ایک بات کہہ رہی تھی۔" یہ سن کر آپ اور اینٹھ جائیں گے۔ فرمائیں گے "نہیں، میں ابھی چلا۔" بیگم صاحبہ منت سماجت کریں گی، اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلائیں گی۔ سفارشیں پہنچائیں گی۔ مختصر یہ کہ انقلاب آ جائے گا۔ اب یہ آپ کے حوصلے پر موقوف ہوگا کہ چاہے اپنا جیب خرچ بڑھا لیں، چاہے گھر دیر سے آنے کا معاہدہ کر لیں۔ چاہے اپنے دوستوں کی برائی کرنے پر امتناع عائد کرا دیں۔ وا افسوس اب جنگ ختم ہو گئی ہے۔ جن شوہر صاحبان کو یہ گر معلوم نہ تھا انہیں آئندہ جنگ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ مجبوری ہے ؎

والد صاحب قبلہ یہ منتر حسب موقع پڑھا کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔ لیکن والدہ صاحبہ کو پتہ نہ تھا کہ عمر کے لحاظ سے والد صاحب قبلہ جنگ پر جانے کے قابل نہیں ہیں (خدا کرے یہ افسانہ والدین کی نظروں سے نہ گزرے ورنہ وہ بھنائیں گے اور یہ پچھتائیں گی) اب والدہ نے دیکھا۔ ایک طرف تو شوہر جنگ کے محاذ کے فراق میں پابہ رکاب معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف صاحبزادے کے دل میں رہ رہ کر جنگ کی ہوک اٹھتی ہے۔ انہوں نے سوچا پکڑ کر لڑکے کی کہیں شادی کر دوں۔ پھر دیکھوں کس طرح جنگ کا نام لیتا ہے! توبہ نہ کر لے تو میرا ذمہ۔ آجکل کے لڑکے زن مرید ہیں۔ بیوی کو چھوڑ کر بازار تک نہیں جاتے۔ میدان جنگ تو دور کی بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے والد صاحب قبلہ سے مشورت کی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کو والد صاحب کی ذات سے براہ راست تعلق نہ تھا۔ اختلاف کی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے فوراً "ایضاً" کر دیا۔ خاکسار نے دیکھا۔ اماں مشاطہ کو بلا کر اسم نویسی کی ڈاک چاروں طرف بھیجنے پر کمربستہ ہیں تو پریشانی ہو گئی۔ کہیں اور دست سوال دراز نہ کرنا چاہتا تھا۔ پردے کی آڑ کے باوجود نظر طلعت پر جمی ہوئی تھی۔ مگر یہاں ہمت جواب دے رہی تھی۔ نہ خود فدوی عرضی گزرانتا تھا نہ والدین کو سلسلہ جنبانی کرنے دیتا تھا۔ کئی بار ارادہ کر کے گھر سے چلتا۔ کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ یوں کہیں گے اور ایسا کہیں گے۔ مگر کچھ بھی نہ کہا جاتا۔ بات حلق کے دروازے تک آ کر لوٹ جاتی۔ خدا معلوم کیا خیال کریں؟ یہ شخص غرض لیکر آتا تھا اور ہم اس کو بے غرض سمجھا کئے۔ ڈانٹ دیں۔ انکار کر دیں۔ اس حقیر پُرتقصیر کی خودداری کے آبگینہ کو ٹھیس لگ جائے گی۔ اسی باعث اماں کو یہ کہہ کر ٹال رہا تھا "ذرا ٹھہر جائیے۔ ذرا ٹھہر جائیے۔" ایک روز شام کو گیا۔ وکیل صاحب نے کہا "آج طبیعت سست ہے۔ سینما چلیں گے؟" میں نے کہا۔ "بہت اچھا۔" دیکھا آج بہت چڑچڑے ہو رہے تھے۔ شاید کوئی مقدمہ ہار گئے تھے۔ میں نے کہا۔ "تقدیر سنتے ہیں اچھی ہے۔" پکار اٹھے "کیا خاک اچھی ہے! آج ایک مقدمہ چوپٹ ہو گیا۔" میں نے وضاحت کی۔ "میں فلم کی تعریف کر رہا تھا۔" بھڑک گئے اور فرمانے لگے "کیا خاک اچھی ہے؟ لوگوں کا مذاق بگڑا ہوا ہے۔ بار بر دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔ "کہتے ہیں، بار بر کچھ بری نہیں۔" پلٹ کر بولے "کون کہتا ہے، بری نہیں۔ لوگوں کا مذاق بگڑا ہوا ہے۔ تقدیر میں چلیں گے۔"

آج وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادی کو بھی ساتھ لے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا۔ "آپ چلئے۔ میں موٹر سائیکل پر آتا ہوں۔" بگڑ کر فرما گئے۔ "موٹر سائیکل کو مٹا لو

پریم میں ہے انیائے

گھور نرک ہی پریم کی اگنی، اس میں جو گر جائے
جیون کا سکھ شانت اگر تن من پھونک جلائے
آشاؤں کے مندر ڈھائے کلیجے کلپائے
پریم میں ہے انیائے، مورکھ پریم میں ہے انیائے

بھونرا بیچ کے کان میں آ کر من کی بات سنائے
رو رو کرے پکار پر تو کلی مسکائے
کانٹوں کے جھرمٹ میں پھنس کر تڑپ تڑپ مر جائے
پریم میں ہے انیائے، مورکھ پریم میں ہے انیائے

پریت کی ریت نرالی ساجن کام ہر ایک انوکھا
اوپر میٹھا بھیتر کڑوا، پریم ہے کیول دھوکا
جو کھائے یہ دھوکا پاپی جیون بھر پچھتائے
پریم میں ہے انیائے، مورکھ پریم میں ہے انیائے

گوری گوری گال پر کالی لٹ کا جال بچھا کر
سندر روپ مستک اوپر چندن تلک لگا کر
نین لگا کر پیت بڑھا کر انت میں آنکھ چرائے
پریم میں ہے انیائے، مورکھ پریم میں ہے انیائے

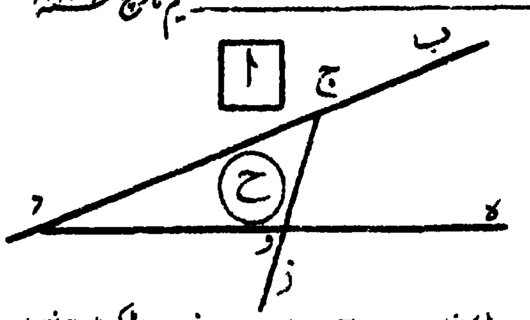
پریم کے کارن راج تیاگ کر راجہ بنے بھکاری
مایا موہ کا جال ہے پریتم، پریم بڑا اہنکاری
بل چھینے اور تیج گھٹائے من کو روگ لگائے
پریم میں ہی انیائے، مورکھ پریم میں ہی انیائے

شکوہ بھاکری

چولہے میں۔ میں کہہ رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو اور رحم ہو کہ موٹر سائیکل، موٹر سائیکل کی رٹ لگائے جا رہے ہو۔" میں نے دل ہی کہا غلطی ہوئی۔ مجھے یہ کہنا چاہئے تھا، میں موٹر سائیکل پر نہیں، آپ کے ساتھ چلوں گا۔ تب وہ لازماً یہ کہتے نہیں آؤ موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھاتے آؤ۔ موٹر میں جگہ نہیں ہے۔ خیر روانہ ہوئے۔ وہ موٹر چلا رہے تھے۔ پردے کے پیچھے زنانہ تھا۔ آج پہلی مرتبہ طلعت کا دربردہ قرب نصیب ہوا تھا۔ اور اس لئے طبیعت جولانی پر تھی۔ خیالات کی ریل پیل تھی، یہ موٹر بھی ایک چلتا پھرتا بلکہ دوڑتا گھر ہے۔ زنانہ حصہ الگ، مردانہ الگ۔ موٹر میں نکلے تو آدمی گویا خانہ بدوش ہو جاتا ہے۔ موٹر میں چاہو بیٹھو، لیٹو، سو جاؤ۔ کم و بیش گھر کا آرام رہتا ہے۔ موٹر میں ساتھ بیٹھ کر نکلیں تو سب گویا ایک خاندان کے فرد بن جاتے ہیں۔ واہ وا موٹر بھی کیا عمدہ ایجاد ہے! مگر آج یہ حضرت بہت غضبناک ہیں۔ کیا باپ کا اثر بیٹی میں بھی آتا ہے؟۔

چلتے وقت تو کہا تھا، تقدیر میں چلیں گے۔ مگر نہیں معلوم پھر کیا سوچا، خیال اور راستہ دونوں بدل دیئے۔ ارادے اور موٹر دونوں کا اسٹیرنگ ایک دوسرے ہی سینما کی طرف موڑ دیا۔ سینما کے کمپونڈ میں داخل ہوتے ہی میں اتر گیا۔ وہ موٹر زنانہ کی طرف لے گئے۔ بڑا ہجوم تھا۔ ٹکٹ گھر پر "کیو" قطاریں لگی ہیں۔ قلت و گرانی کے اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا، رزق بٹنے والا ہے اور بھوکے انتظار میں کھڑے ہیں۔ بندے کو یہ قطار والا طریقہ سخت ناپسند ہے۔ وہ پہلا زندہ دلانہ طریقہ ٹکٹ لینے کا خوب تھا۔ زید، بکر، عمرو سب گھس رہے ہیں۔ دھنس رہے ہیں۔ دھکیل رہے ہیں، کھینچ رہے ہیں۔ وہ کشمکش، وہ گڑبڑ، افراتفری کیا مزے کی بات تھی! مگر یہ بھونڈا طریقہ۔ اس میں نہ جان ہے نہ لطف۔ نہ ورزش ہے نہ کسرت۔ بس مرل بنے کھڑے ہیں۔ یہ پولیس والے ہماری ہر دل پسند چیز کو چھیننے کے درپے ہیں۔ یہ تہذیب ہم کو بالکل مردہ دل بنا کر چھوڑے گی۔ ٹکٹ لے کر اندر گئے۔ فلم کا نام یاد نہیں آتا۔ گو مضائقہ نہیں۔ نام سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہندوستانی فلمیں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ کوئی ایسی خراب فلم کا نام یاد کر لیجئے جس میں بڑا رش رہا ہو۔ بس یہی نام کافی ہے۔ کھیل ختم ہوا۔ وہ مستورات کو موٹر میں بٹھا کر لائے۔ میں موٹر میں داخل ہوا۔ موٹر چلی، پھر ـــ کیا بتاؤں کیا پیش آیا۔

زیر بحث سینما ایک چوراہے پر واقع تھا۔ پھاٹک کے سامنے والی سڑک تعمیر و ترمیم کے مرحلے سے گذر رہی تھی۔ مگر ذرا ٹھہریئے۔ میں افسانوں میں سین سینری اور مکانات اور مقامات کا حلیہ یا حدود اربعہ ٹھیک طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ جہاں اس کا موقع آتا ہے، اس صفائی سے کترا کر نکل جاتا ہوں کہ کسی کو محسوس تک نہیں ہوتا۔ یہ ایک بڑا نقص ہے۔ مانتا ہوں۔ مجھ میں افسانہ نویس کی بہ نسبت نقشہ نویسی سمجھنے کی استعداد زیادہ ہے۔ چنانچہ آیئے اس سینما کا محل وقوع ایک نقشے کے ذریعہ ذہن نشین کر دوں تا کہ دل پر نقش ہو جائے اور سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ ملاحظہ ہو



ا سینما ہے۔ ب ج د، ہ و د اور ز و ج سڑکیں ہیں جو نقاط ج، د، و پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتی ہیں۔ ح وہ حلقہ ہے جہاں پولیس کا جوان کھڑا رہتا ہے اور ہاتھ ہلاتا ہے اور سیٹی بجاتا ہے جس کو ٹریفک کنٹرول کہتے ہیں۔ سڑک ب ج د جس سے دوسری سڑکیں نقاط مذکور پر مل کر من تو شدم تو من شدی کا ورد کرتی ہیں زیادہ چوڑی نہیں ہے مگر اب تعمیر کی وجہ سے آدھی کھلی آدھی بند تھی۔ مندرجہ بالا نقشہ سے باہر مگر قریب ہی ایک دوسرا سینما تھا۔ اب دونوں جگہ کھیل ختم ہوئے اور نبی نوع انسان خارج ہوئی تو جناب! ایک ہنگامہ ہو گیا۔ موٹریں، بگھیاں، تانگے، ٹھکریں، رکشا، سائیکلیں، پیدل سب کا حشر ہو گیا۔ سب راستے رک گئے۔ چیخ پکار، بھانت بھانت کے ہارن، سائیکل کی گھنٹیاں، پولیس کی سیٹیاں۔ اس شور محشر میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وکیل صاحب کی موٹر کمپونڈ ہی میں رک گئی۔ ایک تو کھیل زٹل، دوسرے بھوک لگی تھی۔ اب یہ ہالٹ کا حکم جو ملا تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ ناقابل اشاعت کلمات زبان سے پھول کی طرح جھڑ رہے تھے۔ اندر سے ان کی اہلیہ نے وجہ سکون و جمود دریافت کی۔ باہر سے شوہر نے لاحول پڑھ کر روئے زمین کا نقشہ کھینچا۔ اندر سے "اے ہے" اور "توبہ ہے" کی صدائیں گوش گذار ہوئیں، اور پھر پردے میں سے صورت حال کے مشاہدے کی کچھ ناکام، کچھ کامیاب کوششیں ہوتی رہیں۔ کاش بندہ ایک صفا کو اپنی آنکھیں مستعار دے سکتا کہ لیجئے ملاحظہ فرمائیے تماشا!

مگر اس ہنگامۂ دار و گیر میں بندے کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس نہ ہوئی موٹر سائیکل، ورنہ اس مجمع میں بے دھڑک کودا پڑتا۔ واللہ کیا نظارہ تھا! دل بے چین ہو گیا۔ ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ اضطراب کے عالم میں ناخن چبانے لگا۔ شرطیہ کہہ سکتا ہوں، میرا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ میں نے وکیل صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر پیچھے پردہ پر نظریں خود بخود پڑ گئیں اور پھر ـــ اور پھر اچانک بلاقصد و ارادہ فدوی کی زبان سے نکلا "میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"کیا کہا؟ کیا کہا؟ صاحبزادی سے شادی؟ پھر کہو۔ ذرا پھر کہو"۔

میں نے ہونٹ کاٹ لئے۔ بیوقوف! یہ کیا کر دیا؟ زندگی کے چوراہے پر چوکڑی بھول گیا۔ ان کے موڈ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہئے تھا "میں آپ کی صاحبزادی سے شادی نہیں کرنا چاہتا"! مگر میں نے کہنا شروع کیا۔

"جی ہیں.... جی ہیں.... یہ کیا میں میں کر رہے ہو؟ عجیب بے ڈھب آدمی ہو وقت نہ ساعت، موقع نہ محل۔ جو منہ میں آیا بک دیا۔ بھلا یہ بھی کوئی موقع تھا؟ اس ہنگامہ میں شارع عام پر۔ (پھر گردن موڑ کر) بیگم! بیگم! سنتی ہو مسعود تمہاری بیٹی مانگ رہا ہے۔ توبہ! بہری ہو گیا؟ تمہاری بیٹی مانگ رہا ہے۔ جی ہاں یہیں اس گڑ بڑ گھٹالے کے وقت مانگ رہا ہے۔ ہاں دیکھو تو یہی"۔

وہ ہنسنے لگیں، پھر مجھے یوں مخاطب کیا۔ "میاں مسعود۔ واہ واہ واہ! اچھا وقت نکالا۔ آفریں ہے"۔ اور زور سے ہنسنے لگیں۔

شوہر فرمانے لگے "عجیب بے ڈھنگے آدمی ہو۔ کوئی تک نہیں۔ کوئی کل سیدھی نہیں۔ بھئی واہ! عجیب آدمی سے سابقہ پڑا۔ حد ہو گئی نرالے پن کی۔ کمال ہے۔ اچھا جاؤ، ہم نے تم کو اپنی فرزندی میں قبول کیا۔ کیا یاد کرو گے؟"

میاں بیوی دونوں پر ہنسی کا دورہ پڑا۔

قریب تھا کہ فدوی جامے اور موٹر دونوں سے باہر ہو جائے۔ بے ساختہ بول اٹھا۔ "آداب عرض"۔

"جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ تمہارے والد صاحب قبلہ نے بات چھیڑی تھی۔ پرسوں خط آیا تھا، مگر میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا تھا"۔ اپنی مخصوص ہنسی ہنسنے لگے۔ احقر کی خانہ آبادی کا ہنگامۂ عظیم عنقریب بپا ہونے والا ہے۔ سطور ہذا کو دعوت کا رقعہ تصور کیجئے اور ضرور شرکت فرمائیے۔ آداب عرض۔

غزل — شفیق کوٹی

یہ نقش جو رہِ الفت میں پائے جاتے ہیں
قدم ہی سے نہیں سر سے بنائے جاتے ہیں

وہ تیرِ ناز برابر لگائے جاتے ہیں
مگر یہ زخمِ جگر مسکرائے جاتے ہیں

جو کر گئے ہیں محبت کا اک جہان ویراں
کہیں وہ سانحۂ دل سے بھلائے جاتے ہیں

وہ دن جو اوّلِ الفت میں تھے امید فزا
بھلا رہا ہوں مگر یاد آئے جاتے ہیں

مجھی کو اذن نہیں باریاب ہونے کا
سب اُن کی بزم میں اپنے پرائے جاتے ہیں

الٰہی راہِ محبت میں دستگیری کر
کہ اب ہمارے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

جگر بھی خون ہوا دل بھی ہو چکا پانی
مگر ابھی وہ ہمیں آزمائے جاتے ہیں

یہ جلوے۔ آہ یہ بجلی سے کوندتے جلوے
نظر میں روح میں دل میں سمائے جاتے ہیں

خرامِ ناز کی رنگینیاں۔ ارے توبہ
قدم قدم پہ شگوفے کھلائے جاتے ہیں

وہ راہِ عشق کے پیچ اور خم معاذ اللہ
خیال سے ہی پسینے سے آئے جاتے ہیں

حریمِ ناز کہاں اور ہم شفیق کہاں
وہاں تو صاحبِ قسمت بلائے جاتے ہیں

رشک اور غالبؔ

نصیر احمد ناصر

فطرت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے میل ملاپ رکھے اور کشمکش حیات میں ان سے تعاون کرے لیکن باوجود اس کے انسان نامعلوم جذبہ کے ماتحت ان سے رشک و رقابت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ رشک ایک مشہور جبلت ہے جو انسان کے جذبۂ حمیت کو ابھار کر اس کے اندر عمل و کردار کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ ہم میں یہ زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اپنی پسندیدہ چیزوں پر بلاشرکتِ غیرے قابض رہیں اس خواہش سے انسان میں رشک کا جذبہ پیدا ہوتا ہے خصوصاً یہ جذبہ اسوقت زوروں پر ہوتا ہے جبکہ ہمارے قبضہ و تصرف میں مداخلت کا اندیشہ ہو۔

رشک کو ہمدردی سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے اس لئے اس سے سماج میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔ مگر دوسری طرف یہ ہماری جد و جہد کی رفتار کو تیز کر دیتا ہے۔ بہرصورت رشک اس خوف سے پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ہم اس فائدہ سے محروم نہ ہو جائیں جو اب تک ہمیں حاصل ہے۔

محبت اپنی شدید ترین صورت میں اجتماعی قوت کے خلاف عمل کرتی ہے۔ ایک طرف تو وہ عاشق میں خود غرضی پیدا کرتی ہے اور دوسری رشک کے جذبہ کو ابھارتی ہے حقیقت یہ ہے کہ رشک راہِ محبت میں وہ خار ہے جس کے ہر زخم سے ایک نیا زخم کھانے کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور جس کی لذتِ زخم سینۂ کوہ سے جوئے آب لانے کی ہمت پیدا کرتی ہے۔

عاشق حسن کی وسعتوں میں اپنے سوا غیر کے سایہ کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ غیر کی نگاہِ خیال کی جنبش تک برداشت کرنے سے عاجز ہے۔ وہ حسن کی جلوہ پاشیوں کو اپنی ہی دنیا تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور شرابِ حسن سے سرشار رہنے کا متمنی ہے۔

رشک حسنِ تغزل کا غازہ ہے۔ یہ پیکر شعریت میں روح کی مانند جلوہ نما ہے اور شفق کی مانند شام ادب کی پر بہار زینت ہے۔ اس کی نفسیاتی تشریح کا موضوع شعرائے مشرق کا ہمیشہ مطمح نظر اور مرغوب خاطر رہا ہے۔ اس کی ہی بدولت انہوں نے گلستانِ ادب میں اپنے جذبات و تخیلات کے وہ تخم بوئے ہیں جن سے گلزارِ ادب رنگ برنگ پھولوں سے فردوسِ نظر بنا ہوا ہے۔

عشق میں رشک کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اس لئے عشق کی تفسیر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اسے رشک کے تمام ارتقائی مدارج کی کیفیات سے مزین نہ کیا جائے۔ غالب اردو شاعری کا پہلا اور آخری شاعر ہے جس نے رشک کی تمام کیفیات کا ایک دلآویز مرقع ارباب ذوق کے پیش نظر کیا ہے۔

غالبؔ کی شاعری انسانی زندگی کے احساسات و جذبات ہی کی آئینہ دار نہیں بلکہ ان کے موثرات و اثرات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس لحاظ سے اگر اسکی شاعری کو نفسیاتی شاعری سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ غالبؔ نے فلسفۂ رشک کی نفسیاتی تشریح جس صحت و خوبی سے کی ہے یہ اسی کا حصہ ہے۔ اس جگہ ہم ان کیفیاتِ رشک کو غالبؔ ہی کی زبان سے بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

عقل انسانی جذبۂ محبت کی دشمن ہے، وہ عشق کی بڑھتی ہوئی وارفتگی کو اس کی ابتدائی حالت میں اپنی منطقی براہین سے روکنے کی کوشش کرتی ہے کبھی عاشق کو محبت کے حسرتناک انجام سے خوف بداماں کرنے کی سعی کرتی ہے تو کبھی دوست کی بے وفائیوں کی یاد دلا کر اس کے دل میں نفرت اور بدظنی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس طرح اس کے جذبۂ عشق کو دبانا چاہتی ہے غالبؔ رشک کی بے تابیوں اور عقل کی عیارانہ کوششوں کی تمثیل آرائی یوں کرتا ہے۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

فراق یار کی جگر سوز تلخیوں سے کون ہے جو الحذر نہیں پکارتا ہے اور کون ہے جو شبِ وصال کا آرزومند نہیں ہے مگر غالبؔ شبِ ہجراں کی کاوشوں کو اس شبِ وصال کی عشرتوں پر ترجیح دیتا ہے جس میں غیر اس کی آتش رشک بھڑکانے کے لئے موجود ہو۔ چنانچہ خدا سے دعا کرتا ہے۔

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غالبؔ اپنے محبوب کو رقیب کے ساتھ بات چیت کرتے دیکھ لیتا ہے تو جل اٹھتا ہے۔ اسے ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔ محبوب اس امتناع سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ عاشق کو ڈر ہے کہ کہیں رقیب باتوں باتوں میں ان کے درمیان بدگمانی اور رنجش نہ پیدا کر دے چنانچہ اسے تسلی دیتا ہے کہ وہ رقیب کی باتوں میں آنے والا نہیں مگر غالبؔ کو تو بدآموزیٔ غیر کا خوف ہی نہ تھا اسے تو رشک تھا ہمکلامی پر محبوب سے صاف کہدیتا ہے۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیٔ عدو کیا ہے

بزم عشرت میں عاشق اور محبوب محبت کے مزے لے رہے ہیں۔ دل مسرت اور روحیں شاد ہیں۔ کیف و مستی کا عالم طاری ہے۔ لیکن جب محبوب عاشق کو صہبائے مستی کا ایک اور جام پلانے کے لئے دوست کی شکایت میں لب لعلیں کو جنبش دیتا ہے تو فوراً رشک کی تیغ تیز عاشق کے دل کو گھائل کر دیتی ہے اور بیتاب ہو کر محبوب سے شکوہ کرتا ہے۔

ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ

ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

اہل دل کی بزم میں بھلا حسن کا چرچا نہ ہو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ لوگ حسن کی تعریف میں رنگیں زباں تھے کہ کوئی ستم ظریف غالب کے دوست کی تعریف کرنا شروع کر دیتا ہے سب حاضرین کے منہ سے بے ساختہ تحسین و آفرین نکلتی ہے۔ غالب بھلا اپنے دوست کے حسن کی تعریف غیروں کی زبان سے کیسے سن سکتا تھا۔ اس کا دل رشک سے خون ہو جاتا ہے لیکن بے چارگی کا یہ عالم ہے کہ اہل محفل کو دوست کے تذکرہ سے منع نہیں کر سکتا کہ مبادا وہ اس امتناع کو نفرت پر محمول سمجھ کر محبوب کو اس سے بدظن کر دیں۔ غالب مجبوری عشق اور بے تابی رشک کی اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا

کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

محبوب عاشق کو قتل کرنے کے بعد اس کی نعش کو اپنے ہی کوچے میں دفن کرنا چاہتا ہے۔ عاشق شوق شہادت سے مسرور ہوتا ہے کہ دفعتاً اس خیال سے کہ لوگ شہید ناز کے مزار کی وجہ سے اس کے محبوب کے گھر کا پتہ آسانی سے لگا سکیں گے کانپ اٹھتا ہے اور وفور رشک سے بے قرار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ غالب کے نزدیک رشک کو محبت کی مانند فنا نہیں۔ چونکہ ان دونوں کا روح کے ساتھ تعلق ہے اور روح غیر فانی ہے اسلئے دیکھئے کتنے ارمان بھرے الفاظ میں دوست سے وصیت کرتا ہے۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل

میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

غالب کی شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی واقعہ کی تمام جزئیات کی منظر آرائی کرنے کے بجائے اس واقعہ کے کسی ایک پہلو کو یوں بیان کرتا ہے کہ اس واقعہ کی ایک مکمل تصویر از خود چشم تخیل کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ غالب کو اس جگہ ان مجبوریوں اور لاچارگیوں کے اثرات کا بیان کرنا مقصود ہے جو عاشق کو حالت رشک میں پیش آتی ہیں مگر بجائے مجبوریوں کے بیان کرنے کے ماحول کی ان کیفیات کی منظر کشی کرتا ہے جو ان مجبوریوں کی اصلی موجب ہیں۔ کس سادگی سے محبوب سے کہتا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

عشق میں رشک ہی ایک ایسی تحریک ہے جو انسان کو بڑی سے بڑی قربانی کرنے پر آمادہ کرتی ہے — یہ فطرت انسانی کی بڑی اہم تحریکات میں سے ایک تحریک ہے۔

اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کرتا ہے۔

گذرا اسد مسرت پیغام یار سے

قاصد پہ مجھکو رشک سوال و جواب ہے

محبت کا تقاضا ہے کہ دوست کو پیغام بھیجا جائے مگر قاصد کے بغیر یہ کام سرانجام نہیں ہو سکتا۔ مجبوراً عاشق قاصد کو خط دے کر بھیجتا ہے۔ لیکن پھر جذبۂ رشک سے بے اختیار ہو کر قاصد کے ہمراہ ہو لیتا ہے۔ محبت قاصد کو دوست کے پاس بھیجنے کے لئے بے تاب ہے اور رشک اس کو روکنے پر مجبور ہے۔ محبت اور رشک کی اس بلیا بانہ کیفیت اور کشاکش کی غالب اس طرح تمثیل آرائی کرتا ہے۔

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

محبت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ رشک کی وارفتگیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ شدت رشک سے عاشق کے احساسات پر اتنے تاثرات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دشمن کے دل میں اپنے محبوب کی آرزو تک برداشت کرنے سے معذور ہو جاتا ہے اور گھبرا کر خدا سے دعا کرتا ہے۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے

نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

فطرت انسانی کا مطالعہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔ کہ رشک حسن کی جلوہ پاشیوں کو اپنی ہی دنیا تک محدود رکھنا چاہتا ہے اور وہ کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے محبوب کے حسن پر غیر کی نگاہ پڑے۔ چنانچہ غالب رشک کی اس کیفیت کی شبیہ آرائی یوں کرتا ہے۔

تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی لیکن

وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

فرط رشک سے فطرت انسانی میں بدگمانی جس انتہائی صورت میں نمودار ہوتی ہے اس کی ارتقائی حالتوں کی دو دلکش تصویروں کا

ملاحظہ کیجئے۔

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
رخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

انسان جب محبت کی ارتقائی منزلوں کو عبور کرتا ہے تو ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ جلوۂ دوست میں یوں فنا ہو جاتا ہے کہ اپنی ذات کو بھی بیگانہ سمجھنے لگتا ہے اور خود اپنے آپ سے رشک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فطرت کی اس ستم ظریفی کو غالبؔ جس دلگداز انداز میں بیان کرتا ہے اسی میں اس کی ہمہ گیر شہرت کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ مجسمہ بے کسی بن کر نالہ کرتا ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

بادی النظر میں یہ شعر فطرتِ انسانی کے اصول کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ فطرتِ انسانی کے تجربہ سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ رشک کی انتہائی شدت کی حالت میں اگر دوسرے محرکات بھی بدگمانی پیدا کریں تو انسان پر ایسی حالت کا وارد ہونا ممکنات میں سے ہے جس سے وہ اپنے آپ سے رشک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تصوف آشنا دل اس شعر کی صداقت اور وجدانی کیفیت سے پوری طرح آشنا ہے۔

محبت کے ساتھ رشک اور رشک کے ساتھ بدگمانی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ عشق جنوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسی حالت میں عاشق سے وحشت انگیز حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں حتیٰ کہ وہ بیجان چیزوں سے بھی رشک کرنے لگتا ہے۔ کبھی محبوب کے نقاب کے ابھرے ہوئے تار کو رقیب کی نگاہ کا عکس سمجھ کر جلتا ہے تو کبھی بوئے گل کو عاشقِ محبوب تصور کر کے اس سے بدگماں ہوتا ہے۔ غالبؔ رشک کی مجنونانہ کیفیت کی تمثیل آرائی یوں کرتا ہے۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

یا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

انسان کی محبت کی انتہا یہ ہے کہ وہ فضائے سماوی سے ہم گزر کر عالمِ بالا میں پہنچ جائے لیکن غالبؔ کے رشک کی ارتقائی کیفیت یہ ہے کہ وہ خالقِ حقیقی سے بھی بدظن ہو جاتا ہے۔ اثباتِ خودی کی ایسی زبردست مثال جو غالبؔ کے اس شعر میں پائی جاتی ہے کہیں بھی نہیں ملتی۔ غالبؔ خدا کے مقابلے میں اپنی ہستی کو مستقل تصور کرتا ہے اور اسے محبت کی دنیا میں اپنا ہمسر سمجھتا ہے اور نہیں چاہتا ہے کہ وہ اپنے دوست کو خدا کے بھی حوالے کرے مگر جب اس دوست کو رقیب کے ہمراہ سفر کرتے دیکھ لیتا ہے تو اس نظارے سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ جل کر دہائی دیتا ہے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

نذرِ غالب

حیات و موت کا اب پوچھنا کیا — تمنائے دلِ بے مدعا کیا
سہارا عشق میں تھا دوسرا کیا — تمہاری یاد کو میں بھولتا کیا
شکایت کر کے ان سے بے رخی کی — پشیماں رہا ہوں دل میں کیا کیا
عطائے خاص تھی روزِ ازل کی — ترا غم تا قیامت بھولتا کیا
تمنا سے مجھے کر دے سبکدوش — نہیں ایسی کوئی تیری ادا کیا
قدم لیتی ہے منزل ہر قدم پر — ہماری جستجو کا پوچھنا کیا
فضاؤں میں اداسی چھا گئی ہے — جہانِ غم سے کوئی اٹھ گیا کیا
کرم ہو یا ستم سب ہی برابر — محبت میں روا کیا نا روا کیا
سبیلِ موت بھی اب تک نہ نکلی — تمہارے غم سے تھی امید کیا کیا
مسلم احتیاطِ حسن پوشی — نگاہِ شوق سے پردہ بھلا کیا
گری بجلی وہاں اٹھا اِدھر خاک — مرا گھر کیا مرے گھر کی بنا کیا
سلامت فطرتِ ایذا پسندی — مداوائے دلِ درد آشنا کیا

وجودِ عشق سے قائم ہیں اکرمؔ
ہماری ابتدا کیا، انتہا کیا

اکرمؔ دہلوی

برطانوی نو آبادیات کی خارجی حکمتِ عملی

ایچ، وی ہاڈسن

اگر آپ مجھ سے اس سوال کا ایک دو جملوں میں جواب چاہیں کہ آجکل دنیا کے معاملات کے متعلق نو آبادیات کے لوگ کیا سوچ رہے ہیں تو میں جواب دوں گا کہ ان کے خیالات بہت کچھ ہمارے ہی جیسے ہیں ہماری طرح وہ ممالک بھی جمہوریتیں ہیں، ان کے باشندے امن و امان پسند کرتے ہیں اور جنگ کے اثرات سے نکل کر راہ ترقی پر گامزن ہونے کے خواہشمند ہیں۔ اس لئے وہ ادارۂ اقوام متحدہ کے وفادار ممبر رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں لیکن ہماری ہی طرح انھیں بھی اس کا پختہ یقین نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں یہ ادارہ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔ ان کا یہ بھی عقیدہ نہیں ہے کہ اس ادارہ کے ممبروں کو مسلح اور خبردار نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ ان کا خیال ہے کہ اس ادارہ کو خود اپنی فوجیں رکھنی چاہئیں جو دنیا کے لوگوں کے سامنے جوابدہ ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جنگ سے بہت پہلے بین الاقوامی پولیس کی تجویز پیش کرنے والے ملکوں میں سلطنت برطانیہ کی پہلی نو آبادی نیوزیلینڈ تھی۔ بین الاقوامی پولیس ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ بین الاقوامی حکومت بھی ہونی ضروری ہے۔

یہ نو آبادیاں نہ صرف سلطنت برطانیہ میں شامل ہونے کی وجہ سے برطانوی ممالک ہیں بلکہ ان کے نظریے بھی برطانیہ سے ملتے جلتے ہیں۔ ان ممالک کے لوگ ہر مسئلہ کو اس کی اچھائیوں اور برائیوں سے جانچتے ہیں۔ وہ مقررہ نظریوں مثلاً علیحدگی وغیرہ کے پجاری نہیں ہیں اور نہ ہی دنیا کو مستقل دوستوں اور دشمنوں میں تقسیم کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر لوگ عقل اور سمجھوتے سے کام لیں تو ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب میں دنیاوی معاملات میں ان ملکوں کے نظریوں کا ذکر کرتا ہوں تو آپ اپنے خیالات کی نوعیت کو سمجھتے ہوں گے۔

جیسے ہم اہل برطانیہ، جو یورپ کے قریب ایک جزیرے میں آباد ہیں، مخصوص خیالات رکھتے ہیں، اسی طرح ان ملکوں کے جغرافیائی حالات بھی ان کے نظریے بناتے ہیں۔ مگر چونکہ ہماری طرح یہ بھی چھوٹی مگر نسبتاً طاقتور قومیں ہیں اس لئے ان کے نظریے بھی ہمارے ہی جیسے ہیں۔ کیا آپ کو اس ملک کو چھوٹا کہنا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے؟ اگرچہ رقبہ کی نسبت سے یہ ملک کہیں زیادہ طاقتور ہے پھر بھی یہ روس اور امریکہ کی نسبت چھوٹا ہی ہے۔ اس کے باوجود اس کے اس قدر اثر کا راز دوسرے چھوٹے ملکوں اور نو آبادیات سے ہمدردی میں ہے۔ ساتھ ہی اس کی طاقت کی وجہ یہ ہے کہ یہ سلطنت برطانیہ کی چھوٹی چھوٹی قوموں میں آگے آگے ہے۔

برطانیہ اور خود مختار نو آبادیات ایک ہی نظام شمسی کے مختلف سیارے ہیں۔ یہ آزاد قومیں آسمان کے مختلف ستاروں کا ایک جمگھٹ ہے۔ ان میں سے ہر ایک خود کو انسانیت کا مرکز سمجھتا ہے۔ ہم اہل برطانیہ کبھی کبھی یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے اور ان کے درمیان وہی نسبت ہے جو زمین اور چاند کے درمیان ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے آپ کو ایک ایسی زمین کا تصور کرنا پڑے گا جس کے ساتھ آدھا درجن چاند ہوں جو حجم کے لحاظ سے زمین کا $\frac{1}{2}$ سے لے کر $\frac{1}{4}$ تک ہوں اور اس نظام میں اور بھی چھوٹے بڑے بہت سے ستارے شامل ہوں۔ تبھی بین الاقوامی معاملات میں آپ برطانیہ اور نو آبادیات کی صحیح اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

کنیڈا کی بیرونی حکمت عملی

اس نظام شمسی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ چاند زمین کو اپنی طرف زیادہ کھینچتا ہے کہ زمین چاند کو، اور یہ کہ کس کا محور زیادہ بنیادی ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ اس میں بہت سے ستارے شامل ہیں لیکن ان کی حرکتیں اور محور جدا جدا ہیں۔ بین الاقوامی معاملات میں ہماری طرح نو آبادیات کے خیالات کو ساری سلطنت کے خیالات سمجھنا چاہئے۔ یہ نو آبادیات پورے نظام کے حصے ہونے کے ساتھ ساتھ جداگانہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جغرافیائی حالات مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے مفاد اور حکمت عملی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً کنیڈا کو برطانیہ اور امریکہ کے آپس میں اچھے تعلقات رہنے میں خاص دلچسپی ہے۔ اگر ہم اور اہل امریکہ متفق نہ ہوں تو کنیڈا کو مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا۔ آپ نے امریکی قرضہ کے متعلق بحث و مباحث کے سلسلہ میں یہی محسوس کیا ہوگا۔ یہ بحث واشنگٹن میں اب تک جاری ہے۔ کنیڈا اس گفت و شنید کی ناکامیابی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے ناکام رہنے کے معنی یہ ہیں کہ اسٹرلنگ بلاک کے گرد حلقہ اور بھی سخت ہو جائے گا۔ کنیڈا کے علاوہ سلطنت برطانیہ کے سارے ممالک اسٹرلنگ بلاک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں کنیڈا برطانیہ اور دوسری نو آبادیات کو مال برآمد نہ کر سکے گا۔ لہٰذا کنیڈا نے اسٹرلنگ بلاک کے حفاظتی حلقوں کی کارروائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کیونکہ اس سے کنیڈا کی برآمد کو نقصان پہنچتا تھا۔ اور وہ بھی ہماری طرح اپنی برآمد پر منحصر ہے۔ ساتھ ہی کنیڈا اسٹرلنگ بلاک کا ممبر بھی نہیں بن سکتا۔ اس کی ہزار میل لمبی کھلی سرحد امریکہ سے ملتی ہے اس لئے وہ ڈالر بلاک کے ممالک سے تعلقات منقطع نہیں کر سکتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کنیڈا برطانیہ اور امریکہ کے اقتصادی تعلقات

یعنی آزاد تجارت پر منحصر ہے۔ سیاسیات کا بھی یہی حال ہے۔ کینیڈا کی خارجی حکمت عملی کے لئے یہی ضروری ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں اتحاد رہے۔ ساتھ ہی کینیڈا کا نقطۂ نظر بھی ہے جو برطانیہ اور امریکہ سے مختلف ہے۔ وہ خود کوئی بڑی طاقت نہیں ہے لیکن درمیانی طاقتوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ جہاں تک روپیہ، سامان اور سپاہیوں کا تعلق ہے پچھلی جنگ میں اس نے تین بڑی طاقتوں کو چھوڑ کر باقی سب سے زیادہ امداد پہنچائی ہے مثلاً فرانس سے بھی زیادہ۔ اسے اس میں کوئی عذر نہیں کہ فرانس چوتھی بڑی طاقت شمار کیا جانے لگے اور چین حفاظتی کونسل کا مستقل ممبر بن جائے لیکن اس کا یہ مطالبہ ضرور ہے کہ درمیانی طاقتوں کو، جن میں وہ سب سے بڑی طاقت ہے، اپنی مرضی سے اظہار خیال اور عمل کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ آجکل وہ ایٹم بم کا پورا راز جاننے والی تین بڑی طاقتوں میں ہے۔ اس لئے بین الاقوامی معاملات میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ کینیڈا اس راز کو اس وقت تک افشا کرنا پسند نہیں کریگا جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس سے ادارۂ اقوام متحدہ کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں جن میں درمیانی اور چھوٹی طاقتیں بھی شامل ہیں۔

کینیڈا اور دوسری نوآبادیات نے سان فرانسسکو میں ادارہ اقوام متحدہ میں چھوٹی طاقتوں کے اختیارات بڑھانے کی تحریک کی رہنمائی کی۔ انھیں یالٹا کا فارمولا پسند نہیں تھا جس کی رو سے پانچ بڑی طاقتوں میں سے ہر ایک کو حفاظتی کونسل کے فیصلے رد کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ فارمولا تو برقرار رہا لیکن کچھ دوسری باتوں میں نوآبادیات میثاق اقوام متحدہ کو بہت کچھ اپنی مرضی کے مطابق بنوانے میں کامیاب ہو گئیں مثلاً وہ اقتصادی اور سماجی کونسل کی اہمیت بڑھوا سکیں جسے وہ جنگ کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ نوآبادیات جن کی سرحدیں محفوظ ہیں اور جن کی کبھی دوسری طاقتوں سے کوئی خاص دشمنی نہیں رہی، بین الاقوامی جھگڑوں میں اقتصادی معاملات کو زیادہ اہمیت دیتی ہوں پھر بھی اس میں شک نہیں کہ ان کی کوششوں نے اتحادی قوموں کے میثاق کو بہتر بنا دیا ہے۔

سان فرانسسکو میں نوآبادیات کی مشہور شخصیتوں میں جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم فیلڈ مارشل اسمٹس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بین الاقوامی معاملات میں اسمٹس کے نام کے ساتھ دو بڑے نصب العین وابستہ ہیں اور یہ دونوں میثاق میں شامل ہیں یعنی انسانوں کے حقوق اور فرائض اور دوسرے آزاد قوموں میں تعاون کی صلاحیت پر محکم اعتقاد۔ یہ اعتقاد سلطنت برطانیہ کی نوآبادی جنوبی افریقہ کے تجربات نے پیدا کیا ہے۔ اسمٹس حقیقت پرست ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بین الاقوامی معاملات میں سب سے زیادہ طاقتور قوموں ہی کو سب سے زیادہ کام کرنا ہے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سلطنت برطانیہ کے ملکوں جیسا آزادی، برابری اور دوستی پر مبنی تعاون بڑی طاقتوں کی حکمت عملی کو چھوٹی طاقتوں کے لئے یقیناً خوشگوار بنا دے گا۔ وہ ایسے ملک کے وزیر اعظم ہیں جس کے وطن پرست عناصر ہمیشہ سیاسی اتحاد کے لئے خطرہ بنے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ جنوبی افریقہ اور دوسرے سارے ملکوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے ہیں کہ ملک الگ الگ رہنا پسند نہ کریں بلکہ سارے آزاد ملک مل جل کر عمل کریں اور بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں پر حکم نہ چلائیں۔ انھوں نے سلطنت برطانیہ اور مغربی یورپ کی جمہوریتوں کے درمیان میل جول اور تعاون کے خیال کی ہمیشہ طرفداری کی ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ والوں کا نقطۂ نظر قدرتی طور پر کسی قدر مختلف ہے۔ انھیں پچھلی جنگ سے صاف پتہ چل گیا ہے کہ ان کی حفاظتی سرحدیں ساحل پر نہیں ہیں بلکہ دور بحر الکاہل کے جزیروں بلکہ ایشیا کی سرزمین خاص پر ہیں۔ آسٹریلیا اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہمیں امن کے متعلق سمجھوتوں خاص کر جاپان سے سمجھوتے میں اظہار رائے کا کافی حق ہونا چاہئے کیونکہ ہم نے بحر الکاہل کی جنگ میں بہت حصہ لیا ہے اور ہمیں مستقبل کے حفاظتی کاموں میں خاص دلچسپی ہے۔ یہی مطالبہ نیوزیلینڈ نے بھی کیا ہے۔ اس خیال نے مجموعی حیثیت سے سلطنت برطانیہ کی خارجی حکمت عملی پر اثر ڈالا ہے یعنی اب اگرچہ عموماً اپنی نوآبادیات سے مشورہ کرنے کے بعد برطانیہ ہی ساری سلطنت کی رہنمائی کرے گا لیکن جہاں کبھی برطانیہ کی جگہ کسی دوسری نوآبادی کا مفاد معرض بحث میں ہوگا تو وہی نوآبادی نمائندہ بن کر اظہار خیال کرے گا۔

آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ محض بحر الکاہل ہی کے متعلق سوچنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے خلاف آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا ایک اور امن ناقابل تقسیم ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ سمجھ کر کہ ہماری زندگی اور آزادی خطرے میں ہے سنہ ۱۹۱۴ء اور سنہ ۱۹۳۹ء میں گیارہ ہزار میل کا بحری سفر طے کر کے یورپ میں لڑائی لڑی۔ ایک مرتبہ آسٹریلیا کے موجودہ وزیر خارجہ نے کہا تھا "سلطنت برطانیہ کا مرکز یورپ ہے...... ہم یورپ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔"

اس لئے آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ یورپ سے نقل و حمل کے سلسلہ کے منقطع ہونے کو خود اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ سمندر اور فضا کی سب سے مختصر لائنیں بحیرۂ روم سے گزرتی ہیں۔ ان میں کوئی خرابی یا مشرق وسطی اور بحیرۂ روم میں بڑی طاقتوں کی جدید مداخلت ان کی تشویش کا باعث بن جاتی ہے۔ انھیں بحیرۂ روم، عرب ممالک یا خلیج فارس کی طرف روسی پھیلاؤ پسند نہیں ہے۔ ان کی نظر میں ایسا ہونے سے شکایات اور اختلافات گھٹنے کی بجائے بڑھ جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ روس کے خلاف ہیں۔ آسٹریلیا ادارہ اقوام متحدہ میں کئی مرتبہ برطانیہ کے خلاف روس کے حق میں رائے دے چکا ہے مگر ساتھ ہی وہ ہر بات میں روس کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ وہ لیبر حکومتیں ضرور ہیں لیکن ان کے نظریے خارجی حکمت عملی متعین نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوآبادیات بحیثیت مجموعی نہ کسی کے خلاف ہیں اور نہ موافق۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب تک بڑی طاقتیں محض بڑی ہونے کی وجہ سے اپنی باتیں منوانے پر مصر نہ ہو جائیں اور چھوٹی طاقتیں کمزور ہونے کی وجہ سے اپنے حقوق کو خیرباد نہ کہنے لگیں، رواداری کے جذبہ سے دنیا کو دشمن گروہوں میں تقسیم ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

آخری شکست

ڈرامہ

صدیق قریشی نلال

تعارف:- تاریخ عالم کے اس خطے کی تصویر جب شہنشاہ سکندر کے باپ فیلقوس شاہ مقدونیہ نے بڑھاپے میں ایک نئی شادی کر کے اپنے ہونہار فرزند کو برہم کیا۔

افرادِ تمثیل

سکندر اعظم .... المعروف
فیلقوس .... پدر سکندر
آم فیس .... سکندر کا محافظ سپاہی
سائپس .... سوداگر فیلقوس کا دوست
ایلیڈ .... سکندر کی پسندیدہ کتاب
خدام درباری .... ارکین مع استاد ارسطو وغیرہ۔
مقام .... مقدونیہ

پہلا منظر

محل سکندر اعظم:- آرائش..... زیبائش۔ اور خلوت ہے سکندر ایک گاؤ سے پر اوندھے منہ ٹانگیں پھیلائے ایلیڈ کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ آم فیس داخل ہوتا ہے۔

آم فیس۔ (ہاتھ اُٹھا کر سلام کر کے) آم فیس سلطان کی خدمت میں باریابی کا اُمیدوار ہے۔

سکندر۔ (متوجہ ہو کر۔ انگشت بدنداں) اجازت ہے... آم فیس تم نے ہمیں پہلی مرتبہ شاہانہ خطاب سے پکارا۔ بتاؤ تمہیں کیا لوں۔

آم فیس۔ عالیجاہ یہ بعد میں ہوتا رہے گا۔ ملکہ عالیہ یاد فرماتی ہیں۔

سکندر۔ (استفساریہ) ہیں۔ ماں نے!؟ ہم تیار ہیں۔ بولو انعام کیا چاہتے ہو

آم فیس۔ کیا عالم پناہ میری اس بات کی واقعی قدر فرماتے ہیں؟

سکندر۔ ہم نے دیا آم فیس.... جو تم نے مانگا.... لو۔ اب مانگو!

آم فیس۔ "ایلیڈ کی دو سطروں کا مطالعہ"۔

سکندر۔ (ہاتھ کر شانوں سے پکڑتے ہوئے) ہم خوش ہوئے آم فیس!

(سکندر کتاب رکھ کر ماں کی طرف جاتا ہے)

دوسرا منظر

محل ملکہ عالیہ:- ضروری زیب و زینت سے آراستہ ہے ملکہ مضطر صورت۔ قمیض کا دامن اُنگلی پر لپیٹتی ہوئی غم و غصہ میں ٹہل رہی ہے۔ سکندر داخل ہوتا ہے....

سکندر۔ ماں۔ ماں۔ ماں!!! (حسبِ معمول محبت سے چمٹ جاتا ہے)

ملکہ (دستِ شفقت سے پیار دیکر بکھرائے ہوئے منہ سے) میرا بہادر بیٹا۔

سکندر۔ (متعجب) ہیں؟ آپ کی آواز میں پریشانی ہو ماں؟

ملکہ۔ (جھلاتی ہوئی) سکندر کی ماں اور پریشانی؟ (چشم نم چھلکتا)

سکندر:- ہو سکتی ہے (ڈبڈبائی آنکھیں دیکھ کر) آنسو جو گرے پڑتے ہیں۔

ملکہ۔ (انتہائی ضبط سے) بیٹا آج کی پریشانی تو سب ہی پر عیاں ہے۔

سکندر۔ (دماغ اُنگلی سے چھو کر) او.... ٹھیک ہے۔ ہم سمجھے..... لیکن سکندر کی ماں ایک ایسا بہادر بیٹا جنتی ہے جس پر فیلقوس کو...... (نامکمل جملے پر فیلقوس محل میں داخل ہوتا ہے)...

فیلقوس:- اس محل سے..... فیلقوس۔ فیلقوس کی آواز کانوں میں کیسی آئی۔ (سکندر خاموش ہو جاتا ہے۔ فیلقوس بات جاری رکھتا ہے) ملکہ اور بہادر بیٹا۔ یونان کا بے نظیر فاتح... (سکندر کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے) ہم نے فتح یونان کی خوشی میں ایک نئی شادی رچائی... میرا بہادر بیٹا کیا مانگتا ہے۔ اس موقعہ؟

(سکندر خاموش ہے۔ توقف کے بعد بادشاہ پھر بولتا ہے).......

فیلقوس:- اگر کچھ نہیں تو ہمارے ساتھ رہو۔ ہم نے محفل طرب منعقد کی ہے۔ ہمارے ساتھ رہو۔ اس خوشی کی دعوت ہے۔ وہ۔

(باپ بیٹا آگے پیچھے محفل میں پہنچتے ہیں۔)

تیسرا منظر

محفل طرب۔ شاہی شان و شوکت سے صراحی پر صراحی کھڑک رہی ہے اور پیمانے پر پیمانہ چل رہا ہے۔ لال پری کے کشتے اب ارل زمین پہ لوٹتے پھرتے ہیں ارکین سلطنت کے علاوہ نئی دلہن کا چچا بھی موجود ہے۔ سکندر اور فیلقوس داخل ہوتے ہیں۔ سکندر محفل کے اس رنگ کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اور حاضرین کو نفرت سے تکتا ہے......

ایک بدمست خرابات:- (لڑکھڑاتے) شہزا۔ا۔ وہ جہاں بخت بنڈ ا-ا-ا۔ حیز آداب بجالاتا ہے۔

سکندر رعونک کر اچھا ہو کہ تم منہ سے بہے ہوئے لفظوں کو جان سکو

دوسرا:- ا-ا-ا-اور یہ ح ت ی ی ی۔ رہی۔

سکندر۔ اچھا کہا ہے تم نے اس کی نسبت۔

(سکندر باپ کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ دو خادم آتے ہیں اور شراب پیش کرتے ہیں۔.........

پھر جانے لگتے ہیں سکندر روکتا ہے...........

سکندر:- (ایک کے کان میں) کیا ہونے والی ماں کا رشتہ دار بھی موجود ہے یہاں؟

خادم:۔جی۔عالی کرم وہ جو جام۔بھر رہے ہیں ملک کے
(رقاصہ آتی ہے اور ناچتی ہے۔ساتھ ساتھ گاتی ہے)....

گانا

اے بیالا چوں صنوبر دے رخت چوں م۔ہ
زلف داری ہمچو عنبر لب چہ شش دک۔د۔ر
اے نگارا گر تو مارا یک شبے مہماں بری
نقل خواہم از لبانت ب۔و۔د۔وس۔د۔ہ

ایک رندِ مشرب:۔آ۔ہا۔ہا۔مئے خانہ اُڑ رہا ہے کیا ہا دلوں کی صورت
دوسرا:۔(جام رقاصہ کی طرف بڑھا کر) ساقی شراب لا دیکھیں ذرا سی لذت
(رقاصہ گانا جاری رکھتی ہے) ال۔و۔ب۔بہ۔ل و ب بنہادہ باشد تا سحر
م۔ی۔ر۔ر پیش باشد بستہ باشد د۔ر
(رقاصہ جاتی ہے)

تیسرا:۔(جام پیتے ہوئے) آ۔ہا۔ہا۔توبہ کو توڑ تاڑ کے لہرا کے پی گیا
چوتھا:۔(سکندر سے) شہزادہ سکندر کس منظر سے محظوظ ہیں...؟
سکندر:۔ہم ان پانی کے قطروں کی شرانگیزیاں دیکھ رہے ہیں۔
پہلا:۔تو۔ب۔پ۔پیو۔عالیجاہ۔پیو۔
(سکندر غصے میں بھر کر۔جام ہاتھ میں لے کھڑا ہو جاتا ہے)
سکندر:۔تم اپنی زبانوں کو اپنے لئے استعمال کرتے ہو۔
فسطاس:۔(نو عروس کا چچا) (ہنس کر) پیو.....پیو..... اے تقدیر کی دولت سے مالا مال انسانو۔پیو...تدبیر کی حکومت کے فرمانروا پیو۔اور یارو! دعا کرو! خدا اس ناکتخدا کو اولاد دے اور تخت کا حقیقی وارث پیدا ہو۔
(سکندر فرط غضب سے ہاتھ میں اُٹھایا ہوا جام اس کے مُنہ پر دے مارتا ہے)
سکندر:۔او انسان نما بھیڑیئے تو ہمیں حرامی گردانتا ہے۔اگر آج ہم بااختیار ہوتے تو اپنی فولادی انگلیوں سے تیری زبان نوچ لیتے
(فسطاس کا مُنہ زخمی ہو جاتا ہے۔فیلقوس یہ ماجرا دیکھ کر برہم ہو جاتا ہے۔)
فیلقوس:۔(گرج کر) الگزینڈر تم تہذیب و انسانیت کے جامے سے باہر جا رہے ہو۔
سکندر:۔اگر سکندر یہ جانتا باپ! کہ ایسی محفلوں میں مسرت و شادمانی کے بجائے رنج سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو سکندر ہوش سنبھالتے ہی ایسی تمام عمارتوں کی بنیادیں اُکھاڑ پھینکتا جن میں یہ قرار پائیں۔

فیلقوس:۔فقیر ہونے سے پہلے بد دعا دینا تم جیسے شیخی خورے نام کے بہادروں کا کام ہے۔
سکندر:۔یہ سکندر کی پہلی غلطی ہے۔جو اس قسم کی ناپاک تقریب میں شامل ہوا۔
فیلقوس:۔تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر کن کن غلطیوں کو پہلی غلطی کہو گے سکندر۔تمہاری ہر ہر قدم پر لغزش ہے۔جس کی نمود آرام چین کے لئے سم قاتل ہے۔
سکندر:۔اچھا ہوا کہ سکندر اس صفت کا موصوف بھی ہوا۔اور آئندہ بھی اپنے لئے آرام و راحت کو حرام قرار دیتا ہے۔
فیلقوس:۔بے ادبی۔سرکشی۔گستاخی۔!!! الگزینڈر (تلوار نکالتے ہوئے) تلوار نکالو!
سکندر:۔ہم اپنے بوڑھے باپ کے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں۔کاش آج یہ بازو لڑنے کی حالت میں لرز نہ جائیں۔
(سکندر بھی تلوار نکال لیتا ہے۔فیلقوس سکندر کی طرف بڑھتا ہے)
فیلقوس:۔آج سکندر کو میری تلوار کی چھڑی عزت کا سبق پڑھا کر ہی ہو گی سکندر دیکھ باپ آج اُستاد بن کر کیا کرے گا۔
سکندر:۔ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے باپ! جب ایک تلوار مقابلہ میں میان سے نکل آتی ہے۔
(سکندر تلوار اُٹھاتا ہے سب حاضرین خائف اور متعجب ہوتے ہیں)
سکندر:۔آج مقدونیہ کے رشتوں کی ڈوریں ایک سمت سے مضبوط اور دوسری طرف سے کٹ جانا چاہتی ہیں۔آج شاہی گھرانے کے باپ بیٹوں میں انصاف کے لئے کشتی ہوا چاہتی ہے......پہلا وار...مقدس باپ کو مبارک...
(فیلقوس غصے میں ایک قدم آگے بڑھ کر تلوار اُٹھاتا ہے۔اور گر جاتا ہے۔سب خدام فیلقوس کو اُٹھانے بڑھتے ہیں۔سکندر تلوار کو میان میں گراتا ہے۔)
سکندر:۔قسم ہے مجھے اپنی ماں کی۔جس نے مجھے عالم فانی میں بہادری کے نام کو پیدا کیا...... یہ وہی مقدونیہ کا بادشاہ فیلقوس ہے۔جو کل تمام ایشیا کو فتح کر کے اپنے آگے سرنگوں دیکھنا چاہتا تھا۔آج ایک ایک قدم پر سو سو ٹھوکریں کھا کر گر رہا ہے۔
(پیٹھ موڑ کر چل دیتا ہے اور پھر مڑتا ہے۔)
سکندر:۔مبارک اے مقدونیہ کے شاہی محلات کے خوشامدی ٹکڑا مو! مبارک میرے باپ کی صحبت تمہیں مبارک......
ایک خادم:۔(آگے بڑھ کر) جہاں بخت ناراضگی؟

سکندر:۔ (اُسے تھاپ دیکر) ہمیں تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے طوس! لیکن ہم اسی لمحہ مقدونیہ کا آب و دانہ اپنے لئے حرام کرتے ہیں تاوقتے کوئی خاطر خواہ اصلاح نہ کرلیں۔

(چلا جاتا ہے)

منظر چہارم

محل شاہی:۔ ملکہ عالیہ اور آم فیس سہاگن موجود ہیں

آم فیس ایلیڈ ملکہ کو پیش کررہا ہے۔۔۔۔۔۔

آم فیس:۔ ملکۂ عالیہ یہ کتاب شہزادہ جہاں بخت کی ہے

(سکندر ہڑبڑایا یکدم داخل ہوتا ہے)

سکندر:۔ ماں۔ ماں۔ ماں (توجہ کرتی ہے)

ملکہ:۔ الگزینڈر تم پریشان ہو؟

سکندر:۔ ہم باپ کے ملک میں ایک لمحہ بھی نہیں رہنا چاہتے۔ مقدونیہ عیش و راحت کی تعریف کرتا ہے۔ مقدونیہ آرام و چین کو اپنے لفظوں میں پسند کرتا ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد اس سے تو کہیں دور ہے۔ ماں! ہم چاہتے ہیں تم ماموں کے ہاں جاؤ اور ہم اسد زن جاتے ہیں۔

ملکہ:۔ جان مادر۔ برہمی کا باعث؟

سکندر:۔ جب کسی قوم پر دیوتاؤں کے عتاب کا وقت آتا ہے تو اس کے گھر میں نفاق کا ڈیرہ پڑ جاتا ہے۔ ماں اور بس۔

ملکہ:۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) اس کا مطلب ماں کے غم میں شریک ہوتا ہے، اور بس۔

(سکندر اپنے گھوڑے کی زین خود اٹھاتا ہے اور چلتا ہے)

سکندر:۔ ماں اور کوئی چیز اس محل سے ہم نہ اٹھائیں گے۔

سین پانچواں

محل کے صدر دروازے پر خدام کا جمگھٹ ملکہ سمیت بیٹے کو باپ کی طرف پیٹھ موڑے جاتے دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔

کچھ عرصے بعد

منظر چھٹا

دربار شاہی:۔ آراستہ ہے۔ اراکین و خدام حاضر ہیں۔

شہنشاہ فیلقوس تخت زرنگار پر مغموم جلوہ افروز ہے۔۔۔۔۔۔

ارسطو:۔ شاہی غم و اندوہ کے ساتھ۔ تمام مقدونیہ نے مسکرانا بند کردیا ہے شاہا!

فیلقوس:۔ اُستاد۔ ابدولت کی ملالت کا سبب کیا ہے۔ آج ہم بھی نہیں جانتے۔ دس ماہ گذر گئے۔ شادی کے دن سے اب تک دل کو ہر طرح بہلا کر بھی راحت نصیب نہیں ہوئی۔ شاید ہم نے شادی کی محفل میں مسرت کو مدعو نہیں کیا تھا۔ بلکہ رنج و غم کو ہی دعوت دی تھی

دربان:۔ (داخل ہوکر) یونانی سوداگر سائپس حاضر خدمت ہوا ہے ظل الٰہ

فیلقوس:۔ اُس سے شاہی محل میں ملاقات ہوگی (اہل دربار سے) ما بدولت دربار برخاست چاہتے ہیں۔ (اُٹھ کر محل کو روانگی)

نظارہ ہفتم

محل شاہ فیلقوس:۔ اسباب ضروری سے مزین ہے سوداگر سائپس حاضر ہے۔ بادشاہ کی آمد پر بہ نظر تعظیم کھڑا ہوجاتا ہے سلام پیش کرتا ہے۔

فیلقوس:۔ (مسند پر بیٹھ کر) ہمارے دوست کا یہ احسان چکایا نہ جائیگا۔

سائپس:۔ شاہ کی ذرہ نوازیوں پر غلام خود شرمندۂ احسان ہے عالم پناہ (بیٹھ جاتا ہے شاہ کو مغموم پاکر)

سائپس:۔ (استفسار یہ) عظمت آثار کچھ غیر معمولی الجھن میں؟ ۔۔۔

فیلقوس:۔ سائپس! ایک تو سکندر کا داغ مفارقت اور دوسرے آپکے قول کے مطابق کہ یونان میں بھی نفاق کی بنا پڑ رہی ہے سب سے بڑی بات فیلقوس کو یہ تنگ کررہی کہ فیلقوس ان گتھیوں کو سلجھانے کی سمجھ بھی کھو بیٹھا۔

سائپس:۔ جی عالی کرم یونانی حالات بہت نازک ہیں۔

فیلقوس:۔ سائپس ابدولت جاننا چاہتے ہیں کہ یہ نفاق کا فتنہ کیسے دب سکے۔

سائپس:۔ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ کہ جب مقدونیہ کے شاہی محلات کے نفاق نے باپ اور بیٹے کے بخت رشتہ کو توڑ دکھایا تو بیرونی حالات کے سنورنے کی کیا شکل ہوسکتی ہے۔

(بادشاہ اس بات سے مضطرب ہوکر یکدم اُٹھتے ہیں اور ٹہلنے لگتے ہیں فرط اضطراب اور پشیمانی سے مٹھیاں بند ہوجاتی ہیں اور ماتھے پر مارتے ہیں۔)

فیلقوس:۔ (مضطرب ہوکر) سائپس تم میرے حقیقی اور باوفا دوست ہو تم نے ابدولت کو ایسے خطرے سے خبردار کیا ہے جس کے نہ دور ہونے میں ہزاروں طوفانوں سے متاثر ہونا پڑتا۔۔۔۔ (سائپس کو شانوں سے پکڑ کر) سائپس تم ابھی اسلدون جاؤ اور سکندر کو یقین دلاؤ کہ فیلقوس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اس نے بڑھاپے میں یہ آخری شکست بھی مان لی ہے۔ سائپس تم اس سے کہنا۔۔ وہ کسی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوکر مقدونیہ پہنچ جائے (ٹھنڈی سانس لیکر) آہ مابدولت کی آج آنکھیں کھلیں جب سارے وقار کی دولت لٹ گئی۔

(سائپس جاتا ہے)

آخری منظر

شہر پناہ کے دروازے پر خدام سکندر سے لپٹے ہوئے شہنشاہ فیلقوس کو دیکھ رہے تھے جس کی آنکھیں اشک ندامت سے تر تھیں۔

———·×·———

چینا بھون

سنہ ۱۹۲۴ء میں جب گرو دیو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (آنجہانی) چین تشریف لے گئے تو انھوں نے وہاں کے لوگوں سے پُرنور الفاظ میں کہا کہ اپنے اسلاف کے روایتی تصورات کا لحاظ رکھا جائے۔ انھوں نے اس عہد زریں کی یاد تازہ کرائی جب چینی راہب اور زائرین ہندوستان آتے اور ہندوستانی زائرین و مبلغین چین جاتے اور اسطرح دونوں قوموں کے مابین ایک مستقل روحانی اور ثقافتی رشتہ استوار کرتے رہتے تھے۔ گرو دیو نے زور دیا کہ اہل چین نئے سرے سے کھوج لگائیں کہ اس راہِ عظیم پر دوبارہ گامزن ہوں، جو عرصۂ دراز تک بے تعلقی، بے نیازی اور علیحدگی پسندی کا گرد و غبار جمتے رہنے کے باعث بالکل مسدود اور روپوش ہو گیا ہے۔ انھوں نے اپنی خدمات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ وشوا بھارتی کے لئے دعوت دی جو ان کے ہاتھوں ہندوستان میں قائم کیا ہوا بین الاقوامی ثقافت کا مرکز ہے۔ ان کے اس مشورے کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ قبول کیا گیا اور اس طرح "سائنو انڈین کلچرل سوسائٹی" دائرۂ وجود میں آگئی جس کا مقصد یہ قرار پایا کہ چین اور ہندوستان کے مابین ثقافتی تعلقات نئے سرے سے قائم کئے جائیں۔ کیونکہ قدیم مذہبی اعتقادات مشترک ہونے کے باعث ان تعلقات کی جڑ بنیاد پہلے سے موجود تھی۔

اس "سائنو انڈین کلچرل سوسائٹی" نے سب سے پہلا اور نہایت اہم کام یہ کیا کہ شانتی نکیتن کے وشوا بھارتی میں ایک چینی ایوان تعمیر کرا دیا۔ اسکا نام "چینا بھون" رکھا گیا جو اب محتاج تعارف نہیں ہے۔ اسکا ذکر خیر مختلف لوگوں کی زبان و قلم سے مختلف حلقوں میں ہو چکا ہے۔ کئی زبانوں میں اس پر متعدد مقالے لکھے گئے ہیں اور ہندوستان و چین میں ثقافتی اور تعلیمی زاویہ ہائے نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

بنگالی نوروز کے موقع پر چینا بھون کی رسم افتتاح ۱۴ اپریل سنہ ۱۹۳۷ء کو خود گرو دیو آنجہانی کے ہاتھوں ادا ہوئی تھی۔ اس وقت موصوف نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک جگہ فرمایا:—

بلاشبہ یہ روز سعید میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے! اسے دیکھنے کی عرصۂ دراز سے تمنا تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی قوم کی جانب سے کوشش کرتے ہوئے ہندوستان اور چین کے باشندوں کے مابین اخوت اور دوستی کے اس رشتہ کو دوبارہ مضبوط کر دوں جس کو اٹھارہ سو سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد نے صبر و استقلال اور ایثار و قربانی سے کام لیتے ہوئے قائم کیا تھا!

ایک اور جگہ انھوں نے فرمایا: "یہ ایوان جسکا افتتاح آج ہو رہا ہے اس مفاہمت عظیم کا ابتدائی مرکز اور نشان تصور کیا جائیگا جو زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ پیدا ہو گی۔ سرزمین چین سے طلبا اور شائقین علم یہاں آئیں گے خود ہماری طرح رہیں سہینگے ہم اور وہ ایک دوسرے کے طریقۂ حیات کو اپنائینگے ہماری کوششیں ایک مقصد مشترک کے لئے ہونگی۔ ہم اپنی قوموں کے مابین اس مفید رشتۂ عظیم کو دوبارہ استوار کرنے کی کوشش کرینگے جو تقریباً ہزار سال سے منقطع ہو گیا ہے۔

گاندھی جی اس افتتاحی رسم کی ادائیگی کے موقع پر موجود نہیں تھے تاہم انہوں نے گرو دیو کو لکھا:— "اگر میں اس روز جبکہ آپ رسم افتتاح ادا کر رہے ہیں مجھے بنگاؤں جانا نہ ہوتا تو میں ضرور وہاں پہنچتا، اسمیں شرکت کرتا، آپ سے ملتا اور شانتی نکیتن کو دیکھتا جس کی زیارت کئے مجھے کئی سال ہو گئے ہیں۔ اس مجبوری کی حالت میں میری روح آپ کے ساتھ رہے گی۔ خدا کرے کہ یہ چینی ایوان ہندوستان اور چین کے ثقافتی تعلقات میں ایک نشان منزل ثابت ہو۔"

انہوں نے مجھے بھی تحریر کیا: "میں جلسے میں شرکت نہ کر سکنے کی مجبوری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے گرو دیو کو لکھ چکا ہوں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمیں دونوں قوموں کے مابین ثقافتی تعلق قائم کرنا چاہیئے۔ آپ کی کوشش لائق تحسین ہے۔ خدا کرے اسکا پھل جلد حاصل ہو۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اسوقت ہندوستان کی قومی کانگریس کے صدر تھے اس جلسے کی صدارت قبول کر لی تھی۔ لیکن بخار کا اچانک حملہ ہو جانے کے باعث وہ اس فرض کو انجام نہ دے سکے۔ تاہم انہوں نے ایک طویل اور موثر پیغام دیکر اپنی لڑکی کو وہاں بھیجدیا۔ انہوں نے پیغام میں لکھا:— "میں شرمسار ہوں کہ جسمانی علالت کے باعث اپنا وعدہ ایفا کرنے سے معذور ہوں۔ میں کل ایوان چین کی رسم افتتاح کے موقع پر شانتی نکیتن میں موجود نہیں ہو سکوں گا۔ میرے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا اور اسی لئے میں نے خوشی سے وعدہ کر لیا تھا مجھے کامل یقین تھا کہ میں اس عظیم الشان رسم کی ادائیگی میں ضرور شریک ہو سکوں گا۔ وہ رسم جسکی عظمت عہد رفتہ کی یاد تازہ کرتی ہے، وہ رسم جو ایک شاندار مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ وہ رسم جو چین اور ہندوستان کے تعلقات کو زیادہ استوار کرنیوالی ہے۔ دوستانہ تعلقات اور باہمی اثرات کا وہ عہد رفتہ کتنا عظیم الشان تھا جو سیاسی چپقلشوں اور ظلم و استبداد کی آلودگیوں سے بچا ہوا تھا۔ ہمارے خیال و تصور، صنعت و حرفت اور تمدن و ثقافت کے رجحانات ادلتے بدلتے رہے اور اسطرح ایک دوسرے کی پیشکش سے ہمارے خزائن معلومات میں اضافہ ہوتا رہا۔"

چین سے جنرلیسمو چیانگ کائی شیک نے گرو دیو کو بحری تار بھیجا: "میں ایوانِ چین کی رسم افتتاح کے موقع پر حد درجہ مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔ ہم مشرقی ثقافت اور تہذیب و تمدن کو ترقی دینے میں آپکے ساتھ ہیں تاکہ انسانیت کو امن و عافیت اور تہذیب و تمدن کو ترقی

توں یُن شن

دینے میں آپ کے ساتھ ہیں تاکہ انسانیت کو امن سلامتی اور مسرت کی فضا میں سانس لینا میسّر آ جائے اور اس طرح ساری دنیا میں ایک یکانگت عظیم پیدا ہو جائے۔ میں بڑے ادب کے ساتھ ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے آپ کی صحت و تندرستی کیلئے دست بدعا ہوں۔"

کاکر دتسا ئی یو آن پی اور ہزایکسیلنسی ڈاکٹر طائی چی تاؤ نے بھی چین کی سائنو انڈین کلچرل سوسائٹی کی جانب سے اسی قسم کے تار دئیے اور ایوانِ چین کے لئے کلماتِ خیر کہے۔ سیٹھ جگل کشور برلا نے تار کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ کا عطیہ بھیجا اور آئندہ امداد کا وعدہ کیا۔

چینا بھون کا مقصد اس کے قواعد میں پیش کیا گیا ہے (وشوا بھارتی کا بلیٹن ۲۴ چینا بھون اور سائنو انڈین سوسائٹی کا بلیٹن ۲ وشوا بھارتی چینا بھون ملاحظہ ہو)

وشوا بھارتی چینا بھون کے عام قواعد کی دفعہ ۱ میں مذکور ہے :۔ "اس شعبہ کا مقصد چین اور ہندوستان کے مابین ثقافتی تعلقات قائم کرنا اور انھیں ترقی دینا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں گی کہ چین کے شائقینِ علم ہندوستان آکر ہندوستانی زبان مذہب اور مختلف علوم فکریہ کا مطالعہ کر سکیں اور اسی طرح ہندوستان کے شائقینِ علم چین جا کر چینی زبان، مذہب اور مختلف علوم فکریہ کا مطالعہ کر سکیں۔ ان دونوں صورتوں میں بدھ مت مرکزی مذہب سمجھا جائیگا۔"

یہ مقصد ایک درخشاں مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ چینا بھون کے طفیل نہ صرف یہ کہ ہم اپنے قدیم ثقافتی تعلقات کو حیاتِ نو بخش سکیں گے بلکہ دونوں قوموں کے مابین ایک اور نیا قریبی رشتہ قائم ہو جائے گا جو تمام دنیا کے لئے مفید رہ سکیگا۔ اور ساری دنیا کے باشندے اس سے استفادہ کر سکیں گے۔

چینا بھون کی ایک وسیع دو منزلہ عمارت ہے اور فی الحال اس میں دو ہوسٹل اور دو کچن کے رہنے کی جگہ موجود ہے۔ اصل عمارت میں ایک بڑا ایوان اور دس وسیع اور رہائشی کمرے ہیں۔ ایک بڑی لائبریری کے علاوہ چار بڑے بڑے تحقیقاتی کمرے بھی ہیں۔ اوپر کی منزل میں دفاتر اور مطالعے کے کمرے ہیں۔ عمارت کی لاگت کا بڑا حصہ جز لیسمو اور مادام چیانگ کائی شیک کی طرف سے بطور عطیہ وصول ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ہم ان کے ہمیشہ شکر گذار رہیں گے۔

چینا بھون کی چینی لائبریری نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں اپنی نظیر آپ ہے بلکہ چین کے علاوہ کسی دوسرے ملک کو بھی ایسی نادر و نایاب چیز میسر نہیں ہے۔ اس میں دو لاکھ کے قریب چینی کتابوں کے نہایت اہم اور قیمتی نسخے موجود ہیں جو زیادہ تر چینی بدھ مت، چینی ادبِ عالیہ، چینی فلسفہ، چینی تاریخ، چینی ادبیات اور چینی فنون سے متعلق ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ظالم جاپانیوں نے چینی اداروں لائبریریوں اور عجائب خانوں پر مجرمانہ اور بے پناہ ہوائی حملے کرکے ان کتابوں کو تباہ و برباد کر ڈالا ہوگا اور اب وہ چینا بھون کے سوا کسی دوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہو سکیں گے۔

ہندوستان میں جو چینی کتابیں محفوظ ہیں وہ زیادہ تر چین کی سائنو انڈین کلچرل سوسائٹی کا عطیہ ہیں۔ بہت سے اہم مجموعوں سے قطع نظر لائبریری میں سنگ ایڈیشن (دسویں صدی عیسوی) اور بالکل حال کا مطبوعہ نسخہ جو ڈریگن ایڈیشن کے نام سے موسوم ہے موجود ہیں۔ چینی ادب کی قدیم کتابوں کے علاوہ جو گذشتہ چند سال میں وشوا بھارتی لائبریری میں جمع ہوتی رہیں "تری پٹک" کا وہ مکمل ایڈیشن بھی ہے جو شنگھائی میں چھپا تھا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں چینی کتابوں کا ذخیرہ بلا شبہ نایاب ہے۔ تبتی کتابوں میں کنجور اور تنجور یعنی دونوں شعبوں کی تبتی "تری پٹک" شامل ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ چینا بھون کا اصل مقصد ہندوستان و چین کی ادبیات کا مطالعہ اور تحقیقات ہے اس سلسلے میں حسب ذیل نصاب مرتب ہوا ہے :۔

(۱) زباندانی۔ اس ضمن میں چینی، تبتی، سنسکرت، پالی، ہندی، بنگالی اور ہندوستان کی دوسری جدید زبانیں شامل ہیں (۲) بدھ مت جس میں چینی، ہندوستانی اور تبتی نظریئے شامل ہیں۔ (۳) دوسرے مذاہب جن میں ہندو مت، جین مت، کنفیوشی مت اور تاؤ مت شامل ہیں۔ (۴) فلسفہ چینی اور ہندوستانی۔

قیدی بازو ۔۔ چینی شاعر لی پو

ایک شاہین کی مسرت پرواز
آسمانوں کی بلندی سے پرے
اس کی پرواز کا دور آغاز
ایک ابابیل کی دولت، آواز
خس و خاشاک سے بنتا ہے نشیمن اسکا
لیکن آزاد ہے اس کی آواز!
مگر انسان ہے کیوں محو نیاز
جبل و کوہ کی آزاد فضا کے باشی
(نہیں کھلتا ہے یہ راز!)
اپنے پربت کی بلندی سے اتر آتے ہیں
اور مغرور سے فاتح کے حضور
قید اور بند کی تکلیف سہے جاتے ہیں
اپنے مغرور سروں کو ہر روز
لغو و مجہول سے طالع کے حضور
بڑی ذلت سے جھکانے کیلئے آتے ہیں
یا الٰہی یہ عجب ہے اعجاز!

محمد حسن

(۵) ادبیات چینی اور ہندستانی (۶) ثقافتی علوم چینی اور ہندستانی، جدید و قدیم (۷) چینی اور تبتی مسودوں سے نایاب سنسکرت کتابوں کی اشاعتِ جدید۔ (۸) سنسکرت اور چینی زبانوں میں نئی کتابوں کی تدوین وغیرہ۔

اس سلسلے میں کارگذاریوں کا دائرہ حقیقتاً بہت ہی وسیع ہے اور بہت سے مفید کام کئے جاسکتے ہیں۔ اسکو عملی جامہ پہنانے میں کافی وقت اور محنت درکار ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک حصے کو لیجئے یعنی چینی اور تبتی مسودوں سے نایاب سنسکرت کتابوں کی اشاعتِ جدید۔ چینی زبان میں بدھی تری پٹک کی تقریباً سات ہزار جلدیں ہیں جو فی زمانہ نا پید ہیں یا دستیاب نہیں ہوتیں۔ تقریباً بارہ سو سال میں ان کتابوں کا ترجمہ سنسکرت سے چینی زبان میں ہوا تھا اور خاص مترجمین کے نام دو سو سے زیادہ ہیں جو سب کے سب بڑے ودوان اور گیانی تھے۔ ان میں چینی اور ہندستانی دونوں شامل تھے۔ ان میں سے زیادہ ترجمے چینی شہنشاہوں کی سرپرستی میں ہوتے رہے۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اس کارِ خیر پر کتنی رقم صرف ہوئی۔ اب ہمارے پیش نظر صرف یہی کام نہیں ہے کہ سنسکرت کی گم شدہ کتابوں کو دوبارہ شائع کریں بلکہ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ سنسکرت کتابوں کا چینی زبان میں اور چینی کتابوں کا سنسکرت اور ہندستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنیکا یہ لائحہ عمل کوئی آسان کام نہیں ہے اسکے لئے چینی، سنسکرت اور ہندستان کی دوسری زبانوں کا وسیع مطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ کافی وقت درکار ہے اسکا کسی قدر اندازہ غور و فکر سے لگایا جاسکتا ہے۔

چینا بھون کو قائم ہوئے تقریباً نو سال گذر چکے ہیں۔ نو سال کی یہ مدت طویل بھی ہے اور قلیل بھی۔ بہر حال مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابھی کوئی غیر معمولی ترقی نہیں کی ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابتدا نہایت معقول رہی ہے ہم نے اصل کام کی بنیاد رکھدی ہے اور اپنی کوششوں میں کبھی تساہل نہیں برتا ہے۔ ایک مشہور چینی مقولہ ہے "درخت پیدا کرنے میں دس سال لگتے ہیں لیکن انسان پیدا کرنے میں سو سال"۔ اصل ثقافتی مطالعے اور علوم و فنون کی تحصیل میں بڑا وقت لگتا ہے اور ہم ان کے سلسلے میں کسی قسم کی عجلت نہیں کرسکتے۔ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے وقت ہمیں اپنے راستے میں بہت سی رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ ضرورتیں محسوس ہوئیں۔ ہمارے بعض احباب کا خیال ہے کہ ہمارے پاس خواہ مخواہ ایک وسیع عمارت ہے لیکن ہمیں اپنے کام اور عملے کے لئے ابھی کئی اور کمروں کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس چینی اور تبتی زبان کی کافی کتابیں موجود ہیں لیکن ہمیں دوسری زبانوں کی ابھی اور بہت سی کتابیں درکار ہیں ہم نے چند وقتی عطیات حاصل کرلئے لیکن مستقل سرمائے کی کمی ہے۔ مختلف قوموں کے متعدد شائقینِ علم اور کارکن ہمارے ساتھ ہیں جو نہ صرف یہ کہ علمی قابلیت و استعداد کے حامل ہیں بلکہ پورے ذوق و شوق اور خلوص کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں چینا بھون صرف چین اور ہندستان کے علوم کا مرکز ہی نہیں ہے بلکہ اسکے ذریعہ دونوں ملکوں کے مابین دوستی اور خلوص کے رشتے بھی استوار ہو رہے ہیں۔ پھر یہ رشتہ صرف ان دو ملکوں تک ہی محدود نہیں رہیگا بلکہ ساری دنیا تک وسیع ہو جائے گا۔ میں ہر شعبۂ حیات میں حصہ لینے والی چین اور ہندستان کی بلکہ ساری دنیا کی لائق ہستیوں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ہمدردی اور اعانت کا جذبہ دل میں لیکر قدم بڑھائیں اور اس ادارے کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

دو غزلیں ⸺ ایلن حزیں سیالکوٹی

نہ خُم نہ جام نہ مینا سے کام رکھتا ہوں
پیئے بغیر سرورِ مدام رکھتا ہوں

سحر ہو شام ہو کوئے حبیب میں جاکر
نگاہِ شوق اٹھی سوئے بام رکھتا ہوں

مجال کیا جو نگاہیں کہیں بھٹک جائیں
کہ اپنے ہاتھ میں دل کی زمام رکھتا ہوں

ہو دن کہ رات درِ دل کشادہ رہتا ہے
کسی کی یاد میں یہ اہتمام رکھتا ہوں

مری جبیں بھی نگہ ہے مری زباں بھی نگہ
کہ اسمیں دونوں سلام و پیام رکھتا ہوں

نواز نا ہے جسے لامکاں کے عنقا نے
بچھائے شام و سحر میں وہ دام رکھتا ہوں

مری نظر ہے ایلن میری جستجو کا براق
اسی لئے تو فرشتوں کو نام رکھتا ہوں

✻

یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں
کہاں بہکا ہوں؟ بہکایا گیا ہوں

چھلک لالوں کی دکھلائی گئی تھی
مگر کانٹوں میں الجھایا گیا ہوں

تبسم لب پہ آنکھوں میں شرارے
یہ بہلایا کہ سہمایا گیا ہوں

نہ جانے دشت پیمائی ہے جینا!
کبھی کھویا کبھی پایا گیا ہوں

کہیں سے یوں مجھے پھینکا گیا ہے
کہ جیسے میں یہاں آیا گیا ہوں

جسے ہونا ہے پھر مٹی کا مٹی
وہ جامہ جن کے پہنایا گیا ہوں

نرالی ہے حوادث کی کٹھالی
ایلن میں جسمیں پگھلایا گیا ہوں

پارلیمنٹ کی چوبیس خواتین

یہ خیال کہ عورت کا واحد فرض پرورش اطفال ہے برطانیہ میں اتنی مضبوطی سے جڑ پکڑ گیا تھا کہ وہاں کی عورتیں گھر کے کام کاج سے بہت دیر میں اور دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ نکل کر بیرونی زندگی میں شریک ہوئی ہیں۔ جس وقت سے عورتوں کو پارلیمنٹ کی ممبری کا حق ملا ہے اس کے بعد سے بھی پارلیمنٹ میں عورتوں کی تعداد تعجب انگیز حد تک کم چلی آ رہی ہے۔

چھبیس سال ہوئے لیڈی ایسٹر نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ کہ پلی متھ سے منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں بحیثیت ممبر کے داخل ہوئیں اور چھ سو سہمی ہوئی اور حیرت زدہ مردانہ آنکھوں کی زد میں رہتے ہوئے بھی اپنی نشست پر جمی رہیں۔ مرد ممبروں کو سیاسی تاریخ کے بنانے میں عورتوں کا دخل ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

اس سال انگلستان کی چوبیس خواتین پارلیمنٹ کے انتخابات میں کامیاب ہوئیں اور ویسٹ منسٹر محل میں چھ سو سولہ مرد ممبروں کے ساتھ بیٹھیں۔ ان چوبیس ممبروں میں سے اکیس لیبر پارٹی کی ہیں اور ان میں سے اٹھارہ نئی ہیں۔ پرانی ممبروں میں سے جو تین خواتین اس مرتبہ بھی منتخب ہو گئی ہیں (اور جو لیبر پارٹی کی ممبر نہیں ہیں) ایک لیڈی ڈیوڈسن ہیں (کنسرویٹیو) دوسری لیڈی میگن لائڈ جارج (لبرل)، اور تیسری الینر راتھبون ایم۔ اے۔ لیبر پارٹی کی ممبروں میں سے تین خواتین الین ولکنسن، ڈاکٹر ایڈیتھ سمر اسکل اور جینی ایڈمسن جو اس انتخاب میں بھی کامیاب ہو گئی ہیں کافی شہرت پا چکی ہیں۔

لیبر پارٹی کی پالیسی سے اتفاق رکھنے کے علاوہ وہ اور کون سی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ خواتین اتنی بڑی تعداد میں پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے منتخب ہو گئیں؟ ان میں سے اکثر خواتین کو کونسلوں کی ممبری کے سلسلہ میں ذاتی تجربہ بھی تھا اور وہ مکانات کی فراہمی، تعلیم اور فلاح بچگان کے سلسلہ میں بہت کچھ کام بھی کر چکی تھیں۔ ان میں سے اکثر بہت عرصہ سے مزدور سبھاؤں کی ممبر بھی ہوتی آئی ہیں اور متوسط طبقہ کی افراد ہیں۔ اسی لئے وہ برطانیہ کی عام عورتوں کی ضروریات سے واقفیت رکھتی ہیں۔

میرین سلیٹر

نئے دار العوام کی سب سے کم عمر ممبر الیس بیکن ہیں۔ یہ بڑی خوش مزاج اور بے لوث کام کرنے والی تیس سالہ خاتون ہیں اور یارک شائر کے ایک مدرسہ میں استانی ہیں۔ ان کے والد ایک کوئلہ کی کان میں ملازم تھے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم پا کر سولہ سال کی عمر میں اسکول چھوڑا اور لیبر پارٹی کا کام بڑی سرگرمی کے ساتھ کرنے لگیں۔ اس وقت سے آپ نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ بہت سی انجمنوں کی طرف سے آپ نے باہر کے ملکوں میں جا کر بہت سی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ "نیشنل یونین آف ٹیچرز" (مدرسوں کی قومی انجمن) کی مقامی شاخ کی صدر رہ چکی ہیں۔ "لیبر پارٹی لیگ آف یوتھ" کی ممبر ہیں اور "سوشلسٹ یوتھ انٹرنیشنل" کی مجلس عاملہ میں بھی شریک ہوئیں۔ آپ کی قابلیت کا سب سے بڑا ثبوت ایک یہی ہے کہ تیس سال کی عمر میں لیبر پارٹی کی "نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی" کی ممبر ہو گئیں۔ گویا الیس بیکن برطانوی پارلیمنٹ کی لیبر ممبر بننے کی پورے طور پر مستحق ہیں۔ آپ کا یہ تجربہ اور خوبیاں صرف آپ ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ دوسری خواتین بھی آپ ہی کی طرح اس اعزاز کی مستحق ہیں۔

ایک دوسری نئی خاتون باربرا کاسل ہیں۔ یہ بھی ایک جوان، ذہین، مستعد اور خوش مزاج خاتون ہیں۔ آپ سولہ سال کی عمر میں لیبر پارٹی میں شامل ہوئیں اور چھبیس برس کی عمر میں "سینٹ پنکرس (لندن) برو کونسل" کی ممبر بنیں۔ آپ سول ڈفنس وارڈن رہ چکی ہیں اور لندن کے ایک روزانہ اخبار کے دفتر میں جرنلسٹ ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا آپ نے ایک جرنلسٹ ہی سے شادی کر لی۔ پارلیمنٹ کے پہلے ہی اجلاس میں آپ سر اسٹیفورڈ کرپس (صدر بورڈ آف ٹریڈ) کی پارلیمنٹری پرائیویٹ سکریٹری بن گئیں۔ ایک تینتیس سالہ خاتون کے لئے ترقی کی یہ رفتار قابل داد ہے۔

مسز مارگریٹ ہربیسن بھی کان میں کام کرنے والے ایک مزدور کی لڑکی اور ملازمت کے لحاظ سے استانی ہیں اور تقریباً تیس سال کی عمر ہے۔ آپ متعدد تعلیمی اداروں کی ممبر ہیں اور لیبر پارٹی کی پالیسی پر بہت سی تقریریں کر چکی ہیں اور تعلیمی اور تفریحی کیمپ کرنے میں بڑی خوشی محسوس کرتی ہیں۔ پارلیمنٹ میں آپ تعلیمات کے ہر شعبہ اور ہر پہلو پر پورے زور اور صحیح معلومات کے ساتھ تقریر کر سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ نے خود ابتدائی مدرسہ سے یونیورسٹی تک درجہ بدرجہ ترقی کی ہے۔

نئے دار العوام میں اس دفعہ بھی یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ میاں اور بیوی دونوں ممبر ہیں۔ ایسے جوڑے کئی ہیں۔ ایک جوڑا جینی لی اور اینورن بیون کا ہے۔ جینی بھی ایک کان کے مزدور کی بیٹی اور نئے وزیر حفظان صحت اینورن بیون کی بیوی ہیں۔ بیون بھی ایک کان کے مزدور کے بیٹے ہیں۔ جینی لی ایک خوبصورت خاتون ہیں۔ ان کے بال سیاہی مائل اور آواز بہت نرم ہے۔ لیکن آپ بڑی لڑاکا اور مستقل مزاج خاتون ہیں۔ اس دفعہ آپ دوسری بار ممبر ہوئی ہیں۔ پہلی دفعہ آپ ۱۹۲۹ء میں اپنے حلقے سے

منتخب ہوئی تھیں۔ جنگ کے زمانہ میں آپ برٹش منسٹری آف انفرمیشن اور منسٹری آف پروڈکشن میں کام کر چکی ہیں اور مغربی افریقہ، امریکہ، فرانس، آسٹریلیا اور روس کا سفر کر چکی ہیں۔ آپ نے اڈنبرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ کیا تھا اور دو پُر از معلومات کتابیں لکھ چکی ہیں۔ (۱) ٹوماروز اے نیو ڈے (کل کا دن ایک نیا دن ہوگا) (۲) آور الائی۔ رشیا۔ (ہمارا اتحادی روس) جینی لی کا دماغ، تجربہ اور معلومات پارلیمنٹ کی ممبر بننے کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ آپ کے شوہر کی شخصیت بڑی رنگین اور مزاج بہت مستحکم ہے۔ آپ حفظانِ صحت کے پہلے لیبر ممبر ہیں۔ غرض یہ جوڑا بڑا اچھا جوڑا ہے۔

ایسا ہی ایک اور جوڑا جان پٹن اور فلورنس پٹن کا ہے۔ یہ دونوں پہلی دفعہ منتخب ہوئے ہیں۔ مسز پٹن نے بھی ابتدائی اور سیکنڈری تعلیم پائی ہے اور آپ بھی استانی ہیں۔ آپ کی عمر ۴۵ سال کی ہے اور آپ لیبر پارٹی کی ممبر تقریباً تیس سال سے ہیں۔ اس سے پہلے دو دفعہ ممبری کی ناکام کوشش کر چکی تھیں۔

دو ممتاز خواتین

دو بڑی ممتاز خواتین جو لیبر ممبر ہوئی ہیں۔ لیڈی نوئل بکسٹن اور مسز باربرا آئرٹن گولڈ ہیں۔ لیڈی نوئل بکسٹن سابق لیبر ممبر اور وزیر برنارڈ نوئل بکسٹن کی بیوی ہیں۔ آپ کی پارلیمنٹ میں دلچسپی بہت پرانی ہے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں دارالعوام کی ممبر بنیں لیکن ۱۹۳۱ء میں ہار گئیں۔ آپ نے سینٹ جیمز اور لندن یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ آپ کئی بچوں کی ماں ہیں اور آپ کو اپنا کنبہ بہت عزیز ہے۔ آپ کو خاص دلچسپی فلاح بچگان سے ہے۔

باربرا آئرٹن گولڈ کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ آپ کی دلچسپیاں بے شمار ہیں۔ آپ بہت ہی زیرک ماں باپ کی بیٹی ہیں۔ آپ کے والد پروفیسر آئرٹن ایف۔ آر۔ ایس ہیں۔ اور آپ کی والدہ مسز مارتھا آئرٹن "انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل انجنیئرس" کی ممبر ہیں۔ لندن ہائی اسکول اور لندن یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد آپ لیبر پارٹی کی ممبر ہوگئیں۔ "نیشنل یونین آف جنرل اینڈ میونسپل ورکرس" کی اور اس کے لیبر اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" کی پبلسٹی منیجر۔

آپ بہت سے وفدوں کی بھی ممبر رہ چکی ہیں۔ مثلاً "نائل کمیشن آن دی سول سروس" (۱۹۲۹-۳۱ء) کی "لیبر پارٹی کمیشن آن دی ڈسٹرسڈ ایریاز" (۱۹۳۶ء) کی اور "لیبر پارٹی ڈیلی گیشن ٹو ری پبلیکن اسپین" (۱۹۳۸ء) کی۔ اس کے علاوہ آپ لندن کی "جسٹس آف دی پیس" "ورکرز فلم ایسوسی ایشن" کی صدر اور ایک مشہور گرامر اسکول کی گورنر ہیں۔ آپ کی دلچسپیاں صرف سیاسی ہی نہیں ہیں۔ آپ شاعر و ناشر جیرالڈ گولڈ کی بیوہ ہیں اور آپ کے ایک صاحبزادے آرٹسٹ ہیں۔ اور خود آپ میں ان دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ آپ پارلیمنٹ کی کارروائیوں میں بڑے شگفتہ دماغی سے کام لیں گی۔

پارلیمنٹ کی چند نئی ممبروں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ پرانی ممبر خواتین پہلے ہی سے کافی مشہور ہیں۔ نحیف الجثہ سرخ بالوں والی اور بڑی پھرتیلی خاتون ایلین ولکنسن وزیر تعلیمات ہیں۔ خوبصورت، خوش پوش اور قابل خاتون ڈاکٹر ایڈتھ سمر اسکل فوڈ منسٹری میں پارلیمنٹری سکریٹری ہیں۔

اب ان خواتین کا حال بھی سن لیجئے جو لیبر پارٹی میں سے نہیں ہیں۔ یہ بھی بڑی قابل، دور اندیش اور پُر از معلومات خواتین ہیں اور پارلیمانی امور کو بخوبی سمجھتی ہیں۔ لبرل خاتون میگن لائڈ جارج خوش اندام، گداز جسم اور بڑی خوش منظر ہیں۔ آپ برطانیہ کی مشہور لبرل وزیر لائڈ جارج آنجہانی کی صاحبزادی ہیں۔ آپ بڑی اچھی اور خوش آواز مقررہ ہیں اور ۱۹۲۹ء سے پارلیمنٹ کی ممبر ہیں۔ دیہاتی مکانات، نئی بستیوں، بے روزگاری، فلاح عامہ، ساؤتھ ویلز کے حالات، بھرتی اور کارخانوں کی پیداوار وغیرہ موضوعات پر بارہا پارلیمنٹ میں تقریریں کر چکی ہیں۔ آپ کی وسیع معلومات اور قابلیت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے۔

لیڈی میگن لائڈ جارج اوین گلن ڈور کے خاندان سے ہیں۔ ڈور ویلز کا آخری مطلق العنان حکمراں ہوا ہے۔ یہ ایک مشہور "مدبّر" تھا اور اسی کی طرح لیڈی میگن بھی "بارڈ آف ویلز" ہیں اور یہ ویلز کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

کنزرویٹو ممبر لیڈی ڈیوڈسن ۱۹۳۷ء میں آپ کے شوہر کو دارالامرا میں جگہ مل گئی تو ان کی جگہ لیڈی ڈیوڈسن دارالعوام کی ممبر ہوگئیں۔ آپ ایک دراز قامت، خوش سلیقہ اور بڑی شائستہ خاتون اور چار بچوں کی ماں ہیں۔ آپ کو خاص طور پر عورتوں کے معاملوں میں دلچسپی ہے۔ عورتوں اور مردوں کی مساوی تنخواہ، روزگار کی فراہمی، خانگی کام کاج خرید و فروخت اور عورتوں سے متعلق دیگر مسائل پر آپ اپنے ذاتی تجربہ سے بارہا تقریریں کر چکی ہیں۔

الینر راتھبون برطانوی یونیورسٹیوں سے منتخب ہوئی ہیں۔ آپ کی ذہانت اور حاضر جوابی بہت سے وزیروں کو لاجواب کر چکی ہے۔ آپ کے والد ۱۸۶۸ء میں لیورپول سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے تھے ۱۸۹۲ء میں کالج چھوڑنے پر آپ نے اپنے علاقے کے غربا کی تکالیف کا مطالعہ کیا۔ بندرگاہوں پر کام کرنے والے مزدوروں، سپاہیوں، بیواؤں اور یتیموں کے حالات میں آپ نے پوری دلچسپی لی اور اکثر اصلاحات کی محرک آپ ہی

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

پروان

افسانہ

موہن لال یاور

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی دوڑی جا رہی تھی سیکنڈ کلاس کا ڈبہ۔ جس میں میرے، ایک دوشیزہ اور اس کی بوڑھی ماں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور لڑکی کا بیضوی چہرہ، گندمی رنگ، موتی کے سے دانت، حیاناک آنکھیں اور سمور کا دل کش سوٹ۔ —— اور میں اس کی طرف کھنچا جاتا تھا مقناطیس اور لوہے کی حالت اس کی مسلسل خاموشی نے میرے سینے میں ایک کھلبلی مچا رکھی تھی۔ "یہ لڑکی ہنستی کیوں نہیں؟ بولتی کیوں نہیں؟" یہ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

جنوری کی سردی، جسم میں تیر کی طرح برمائے جاتی تھی۔ میں نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ لیکن وہ لڑکی لاجونتی سی بنی بیٹھی تھی۔ اور اس کی ماں، جس نے اپنے ارد گرد خوب اچھی طرح کمبل لپیٹا تھا، لیٹی ہوئی خراٹے لے رہی تھی۔ میں نے اس کھڑکی کو بند کر دیا۔ جو کھلی تھی۔ اور اپنے ہینڈ بیگ سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ جب کبھی میں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ تو یہی دیکھا کہ وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ ایک دو بار مجھے محسوس ہوا کہ وہ لڑکی مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن شرم اجازت نہیں دیتی۔ اور رہا میں۔ تو مجھ میں اتنی ہمت کہاں۔ آخر پانسا اسی کے ہاتھ رہا اور اس کا جگر میرے دل سے بازی لے گیا۔ اور اس نے کہا "کوئی اور کتاب بھی ہے آپ کے پاس؟"

"جی ہاں۔ لیکن کیسی کتاب پڑھنا چاہتی ہیں آپ؟"

"افسانوں کی" —— "افسانوں کی"

"جی ہاں۔ افسانوں کی" —— اس پر وہ بھی مسکرائی اور میں نے بھی ہنسنے کی کوشش کی۔ میں نے ہینڈ بیگ سے اسے "دو پٹے" نکال کر دی۔

اس کی ماں ابھی تک محوِ خواب تھی۔ اور وہ پاس بیٹھی "دو پٹے" پڑھ رہی تھی۔ اب تو نہ وہ حیاناک آنکھیں تھیں۔ نہ بدن چرانا۔ اب تو وہ کبھی کبھی کتاب پر سے نظر اٹھا کر میری طرف دیر تک دیکھتی رہتی۔ اور جب میں نظر اٹھاتا تو وہ نگاہیں کتاب پر جما دیتی۔

"یہ بتایئے کہ آپ کی نگاہیں مجھ میں کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟" اس نے اندازِ بے اختیاری سے کہا۔

"یہی کہ تکمیلِ حسن میں فطرت نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔" میں نے اسے دیدے پھاڑ کر جواب دیا۔ وہ کچھ کھو سی گئی۔ اور رسیلی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں پر قبضہ کر لیا۔ ہمارے بھاگ سو گئے اور اس کی ماں جاگ اٹھی۔

"کسم ——" اس کی ماں نے اٹھتے ہوئے کہا اور بیٹھ کر آنکھوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ لیکن کسم پڑھنے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"کسم!" اس کی ماں نے پھر کہا۔

"جی" کسم نے چونکتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"یہ کتاب کہاں سے لی؟" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"ان سے ——" کسم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی ماں نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کسم سے کہنے لگی۔ "تمہیں شرم نہ آئی۔ غیر مردوئے سے کتاب لیتے ——"

کسم کا جھکا ہوا سر اور بھی جھک گیا۔ میرا جی چاہا۔ کہ اس عورت کا گلا گھونٹ دوں۔ اور اسے ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔ مگر.......

"تو ہوا ہی کیا؟ اب سے دوران کی طبیعت ذرا بے مزہ تھی۔ میں نے جی بہلانے کو کتاب دے دی۔ فرمایئے اس سے آپ کا کیا بگڑا؟"

"لچا۔ شہدا۔ دور دفعان ہو۔ اپنے کام سے کام رکھ۔ نہیں تو زنجیر کھینچ کر......."

کسم نے میری طرف دیکھا۔ ان نگاہوں سے جن میں عجز و معذرت کے دفتر بھرے پڑے تھے۔ اگر کسم کی ماں زنجیر کھینچ کر —— توبہ! اس کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی ماں نے کتاب کسم سے چھین کر میرے منہ پر دے ماری۔ اس حادثے کے دوران میں کسم کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔ اور خاموش ٹیلیفون بر سرِ کار تھی۔ وہ معافی کی خواستگار اور میں بھی اسی کا طلب گار۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس سے قصور ہوا، اور میں سمجھتا تھا کہ یہ میری حماقت کا نتیجہ ہے۔ ڈبہ خاموشی میں ڈوب گیا۔ اور یہ تھسٹر شہرِ خموشاں بن گیا۔ کسم کی ماں پھر نیند کے حوالے ہو گئی۔ اور ہمارے ولولے پھر جاگ اٹھے۔

کسم نے کہا "مجھے معاف کر دو گے نا؟"

"اس میں معاف کرنے کی کونسی بات ہے۔ یہ پرانے سِکّے کی عورتیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتی ہیں کسم۔ میری ماں بھی اسی قبیل کی ہے۔"

"آپ کی ماں اور میری ماں —— دونوں ایک ہی قسم کی —— آہا ہا ہا ——" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے کہ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ گاڑی کا ایک ڈبہ ہے، اور سامنے اس کی ماں ہے۔ پرانی قسم کی عورت —— جس نے اسے پابندی کے زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

"یہ مائیں نہیں بلائیں ہوتی ہیں کسم۔ ہمارے ہاں محلے کی ایک لڑکی آیا کرتی تھی جس کا نام اوشا تھا جس کے بکھرے ہوئے بال، سیاہی مائل نیلی نیلی آنکھیں، ہنستا ہوا ماتھا، اور پتلے پتلے سرخ ہونٹ —— جب وہ

آتی میں ٹکٹکی باندھے گھنٹوں اسے دیکھتا رہتا۔ میری ماں مجھے کہتی "پورن۔ تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔ یہاں تمہاری بہن کے پاس اس کی سہیلی اوشا بیٹھی ہے" میں نہ جاتا۔ وہیں جما رہتا۔ وہ پھر کہتی "تمہیں شرم نہیں آتی پورن۔ لڑکیوں کے پاس بیٹھے رہتے ہو" تب میں دل پر جبر کرکے دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ ایک دن اوشا سیڑھیوں میں میرے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ میری ماں آگئی۔ اور ——— اور ——— اس کے بعد میری ماں نے اسے اپنے گھر نہ آنے دیا۔ اور وہ ابھی تک مجھ سے نہ مل سکی۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں اس بات کو۔

میں نے کتاب کی جلد پر "لیکن کسم بہت اچھی لڑکی ہے" لکھ دیا۔ اس نے پڑھا اور مسکرا دیا۔ اس کی ماں بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی نیند ہی میں ہماری زندگی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ اس کی نوجوان لڑکی ایک کچے، شہدے کے پاس بیٹھی ہیر وارث شاہ کی کہانی دہرا رہی ہے۔ ہاں! تو اس کی زنجیر یا اسکی ماں نے کروٹ لی۔ تو وہ اٹھ کر ماں کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے سوچا۔ کسم کتنی اچھی لڑکی ہے اور اس کی ماں۔ اوشا کتنی اچھی اور بھولی بھالی تھی اور میری ماں ——— "گاڑی دوڑی جا رہی تھی۔ میں نے ایک کھڑکی کھول دی۔ اور تیز ہوا کے جھونکے ڈبہ میں آنے شروع ہو گئے۔ باہر دھوپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نہ جانے سورج دیوتا کیوں منہ بدلیوں میں چھپا رہے تھے۔ سمجھا! اسے کسم کے نظارے کی تاب نہ تھی ——— ماں اور بیٹی سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔ میں نے دونوں کتابیں اٹھا کر ہینڈ بیگ میں رکھ لیں۔ اور کل کا ملا ہوا مسٹر نانک چند بار ایٹ لا کا خط ——— میں نے جیب سے نکالا اور پڑھا۔

مسٹر پورن ——— نمستے۔ چار پانچ روز سے ایک لڑکی کا معاملہ "شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" بن رہا ہے۔ کتنا رومانی۔ کتنا پاک۔ براہ کرم خط پڑھتے ہی یہاں پہونچئے۔ تفصیل میں جاؤں؟ معاف رکھئے۔ تمہارا نانک چند۔

مسٹر نانک چند کا خط۔ اور لڑکی کا معاملہ۔ اور یہ ہوائی جہاز کی طرح دوڑتی ہوئی گاڑی۔ ایک، پابندیوں میں جکڑی ہوئی لڑکی۔ دوسری بوڑھی ماں، پھر بچیرہ ——— لیکن کسم کی ماں پر پھر نیند طاری ہو گئی۔ شاید وہ کنبھ کرن کی اولاد سے تھی یا وہ ساری رات جاگتی رہتی تھی۔ اور اس کے خراٹوں کی آواز گاڑی کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اور کسم اپنی نشست پر سے اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے میرا ہاتھ کیسے اس کے ہاتھ میں آیا۔ وہ میرے ہاتھ کو دباتی رہی ——— "آپ بہت اچھے ہیں"

اچانک اس کی ماں جاگی اور اس نے ہم دونوں کو سر جوڑے دیکھ کر کہا۔ "شرم نہیں آتی تمہیں۔ اس بے حیائی سے غیر مرد کے پہلو میں بیٹھی ہو"

"مجھے شرم تو آتی ہے۔ لیکن دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ بے بس تھی"

اس کی ماں کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ پی گئی۔

اتنے میں گاڑی چیختی ہوئی لاہور اسٹیشن پر رکی۔ پلیٹ فارم پر خوانچہ والوں کا شور و غوغا گہما گہمی۔ لوگوں کا تانتا، قلیوں کی دوڑ دھوپ ——— اپنے رشتہ داروں کو گاڑی چڑھانے یا مدت سے بچھڑے ہوئے دوستوں کو متواتر خط لکھ کر بلانے والے لوگ، پلیٹ فارم پر کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ مگر مجھے کوئی اسٹیشن پر لینے نہ آیا تھا۔ حالانکہ مسٹر نانک چند نے مجھے خط لکھ کر تاکیداً بلایا تھا۔ اور یہی حالت میرے ہمراہیوں کی تھی۔ ان کا بھی کوئی استقبال نہ ہوا۔ جی ہاں! میں جواہر لعل نہرو نہ تھا۔ اور میری ہم سفر سروجنی نائیڈو نہ تھی۔ ہم علیحدہ علیحدہ اسٹیشن سے باہر آئے۔ بادل غائب ہو چکے تھے۔ سردی بھی کم ہو گئی تھی۔ اور سورج دیوتا مغرب میں ڈوبنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

جب میں نے تانگے والے کو مسٹر نانک چند بار ایٹ لا ۱۴ ارسر ہنگ روڈ کا پتہ دیا۔ تو میرے کان میں کچھ ایسی آواز آئی۔ کہ کسم کی ماں کسی اور تانگے والے کو یہی پتہ بتا رہی تھی۔ نہ جانے میرے کان بجے یا یہ کوئی آکاش بانی تھی۔ کسم کا تانگہ چلتا ہوا اور اس کے پانچ منٹ بعد میرا تانگہ بھی چل پڑا۔ بیس منٹ بعد مجھے "نانک چند بار ایٹ لا" کا بورڈ نظر آیا۔ اور ایک تانگہ واپس آتا ہوا ملا۔ سامنے برآمدہ میں مسٹر نانک چند آغوش محبت کھولے کھڑا تھا۔ مجھے اندر لے گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ کسم اور اس کی ماں بیٹھی ہیں۔

مسٹر نانک چند نے کہا "پورن! یہ ہے وہ لڑکی۔ جس کی نسبت میں نے تمہیں لکھا تھا۔ اور ماتا جی۔ یہ ہے وہ لڑکا۔ جس سے کسم کی شادی کے لئے میں نے آپ کو دعوت دی تھی۔ میں دونوں کا وکیل ہوں۔ اور میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ دونوں کو اس سے بہتر رشتہ ملنا معلوم ——— اس طرح مکان گھر بن گیا۔

پارلیمنٹ کی چوبیس عورتیں ——— بقیہ صفحہ ۱۵

تھیں۔ عرصہ ہوا سنہ ۱۹۳۲ء میں آپ نے ایک کتاب محروم الارث کنبوں اور انہیں سرکاری وظیفے دئے جانے کے بارے میں لکھی تھی جو مجوزہ قانون کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہ باتیں آپ کی زندگی کے مفید مشغلوں کا ایک شمہ ہیں۔ نارو آشتی کی پالیسی کی مخالفت میں آپ نے خانہ جنگی کے زمانہ میں اسپین، چکوسلواکیہ اور وسطی یورپ کے اکثر ملکوں کا دورہ کیا۔ ہسپانوی پناہ گزینوں کی امداد کی اور ایک کتاب لکھی "کیا جنگ کو روکا جا سکتا ہے؟"

آپ مجلس بین الاقوام کی یونین کی مجلس عاملہ کی بھی ممبر رہی ہیں۔ نازیوں کے ستائے ہوئے پناہ گزینوں کی امداد کا کام آپ نے بڑی مستعدی کیساتھ کیا۔ یونان کو خوراک رسانی کے مسئلہ پر آپ نے بڑی دور اندیشی اور جرأت کا ثبوت دیا۔ اس کے علاوہ قیدخانوں کی حالت، پیدائش کے مسائل، فوجی خواتین کی تعلیم اور دائیوں کی تنخواہ کے بارے میں بھی بڑی جد و جہد کی۔ دراصل آپ برطانوی پارلیمنٹ کے دار العوام کی خواتین میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

مصر کی بیمہ کمپنیاں

اسکندریہ میں مقیم ہندوستانی حکومت کے ٹریڈ کمشنر کی رپورٹ سے مصر میں بیمہ کے موجودہ حالات کے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس وقت مصر میں تقریباً ساٹھ کمپنیاں آتشزدگی، پینسٹھ کمپنیاں حادثات، چالیس کمپنیاں جہازوں اور پندرہ کمپنیاں زندگی کے بیمہ کا کام کرتی ہیں۔ ان میں سے اکثر انگریزوں کی ملکیت ہیں۔

"امریکن انشورنس ایسوسی ایشن" امریکی کمپنیوں کی نمائندہ ہے۔ یہ آتشزدگی جہازوں اور خشکی کے ذرائع حمل و نقل سے تعلق رکھتی ہے۔ آٹھ یورپی کمپنیاں ہیں۔ یہ زندگی، آتشزدگی، اور حادثات کا کام کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ چار مقامی کمپنیاں ہیں۔ ان کا تعلق بیمہ کے ہر شعبہ سے ہے۔ کچھ اور کمپنیاں جو "لائڈز" سے تعلق رکھتی ہیں آتشزدگی کے علاوہ ہر طرح کا کام کرتی ہیں۔

مصر میں بیمہ کے موجودہ قوانین کے مطابق بیمہ کے سارے اداروں کا لمیٹڈ کمپنیاں ہونا اور ان کے پاس کم از کم ایک لاکھ پونڈ (مصری) سرمایہ ہونا ضروری ہے۔ ہر کمپنی کو ایک لاکھ پونڈ کے سرمایہ میں سے زیادہ سے زیادہ تیس ہزار پونڈ کسی وزیر مالیات کے منظور شدہ بنک یا دوسرے نامی ادارے میں جمع کرنے ہوں گے (جہازوں کا بیمہ اس قید سے بری ہے)

دوسرے ملکوں کی بیمہ کمپنیوں کے چیف ایجنٹوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مصر میں سکونت پذیر ہوں۔ کچھ حالات میں بیمہ کرانا ہی ضروری ہے۔ زندگی سے متعلق ہر بیمہ کمپنی کو مصر میں جاری شدہ پالیسیوں کا ساٹھ فی صدی مصر ہی میں رکھنا پڑتا ہے۔

آتشزدگی کے بیمہ کی سب سے اہم چیز بھاپ کے ذریعہ دبائی ہوئی روئی کی گانٹھوں کے گودام ہیں۔ اس ذیل میں کارخانوں کی عمارتیں، روئی کے کارخانے، تیل کے کارخانے اور تجارتی مال کے ذخیرے آتے ہیں۔ یہ سب چیزیں روز بروز اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ مصر میں ایک فائر سنڈیکیٹ بھی ہے جو شرح کو کنٹرول کرتا ہے اور لندن کی "فائر آفس کمیٹی" سے برابر تعلق قائم رکھتا ہے۔ مصر میں آتشزدگی کے بیمہ کا کام کرنے والی ساری کمپنیاں اس سنڈیکیٹ کی ممبر ہیں۔ یہاں آتشزدگی کا کام بہت تسلی بخش رہا ہے۔

جہاں تک حادثات کا تعلق ہے، "موٹر انشورنس ایسوسی ایشن" اور "ورکمینز انشورنس ایسوسی ایشن" تمام شرحوں اور کام پر کنٹرول رکھتی ہیں۔ ان کا لندن کی "ایکسیڈنٹ آفسرز ایسوسی ایشن" سے تعلق ہے اور یہ کم و بیش انہی اصولوں پر کام کرتی ہیں۔ اس ذیل میں مزدوروں کی تلافی، موٹروں کی چوریاں، ذاتی حادثات اور بیماریاں، شیشے کا سامان، جواہرات اور چوریاں وغیرہ زیادہ قابل ذکر ہیں۔

جہازوں کے بیمہ کے سلسلہ میں اسکندریہ میرین انڈر رائٹرز ایسوسی ایشن کا "انسٹیٹیوٹ آف لندن انڈر رائٹرز" اور بمبئی کی "میرین ایسوسی ایشن" سے متصل تعلق ہے۔ یہی شرح اور کام کو کنٹرول کرتی ہے۔ جہازوں کی بیمہ کمپنیوں والے لڑائی سے پہلے اچھا کام کر رہے تھے۔ پچھلے چھ سالوں سے البتہ ان کا کام کم ہو گیا ہے اور اس کی وجوہات بھی ظاہر ہیں۔ چونکہ آنے والے سالوں میں مصری بیرونی تجارت کے کافی بڑھ جانے کی امید ہے اسی لئے اس کام میں بھی کافی اضافہ ہونے کا امکان ہے۔

مصر زیادہ تر زراعتی ملک ہے اور یہاں کی زیادہ آبادی زراعت ہی کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ اس لئے اوسط مصری کا معیار حیات بلند نہیں ہو سکتا۔ روزانہ ضروریات پوری ہونے کے بعد اس کے پاس بہت کم بچتا ہے۔ لہذا، جیسا کہ رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے معمولی حیثیت سے اس کے لئے بیمہ کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر بھی کچھ مالدار زمیندار اور تعلیمیافتہ مصری بیمہ کے فائدہ سے باخبر ہیں۔ اب مصریوں میں خصوصاً تعلیمیافتہ طبقہ میں بیمہ سے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

غرضکہ زندگی کے بیمہ اور روپیہ لگانے کے لئے بہت اچھے امکانات ہیں اور یہ روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ زندگی کا بیمہ کرنے والی ہر کمپنی ہر مہینے پچاس ساٹھ ہزار پونڈ (مصری) کا کام کر لیتی ہے۔ تعلیم بڑھنے اور معیار حیات کے بلند ہونے سے لوگ بیمہ کے فائدے کو محسوس کرنے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں مصر کی آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس میں سے دس لاکھ دوسرے ملکوں کے لوگ تھے۔

جہاں تک عام بیمہ کا تعلق ہے مال کے قوانین سے مزدوروں کے نقصانات کی تلافی اور موٹروں کے بیمہ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے کیونکہ اب مزدوروں کی تلافی اور موٹر لاریوں کا بیمہ کرانا ضروری ہو گیا ہے۔ لڑائی کی وجہ سے مصر میں صنعتوں نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ بعد جنگ کے زمانہ میں بھی اس رفتار کے قائم رہنے کی امیدیں ہیں اور جیسا کہ رپورٹ میں ذکر کیا گیا ہے، اس کی بیمہ کا کام بھی بہت بڑھ جائے گا۔

(انڈین انفارمیشن سے ماخوذ)

نقد و نظر

پنچم ملہم مصنف:- صاحبزادہ محمد عمر (نور الٰہی) ناشر:- سراج محل پبلشرز، جموں ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۸ صفحات۔ مجلد قیمت مبلغ دو روپے۔ محمد عمر نور الٰہی کے مشترکہ ناموں کی ترکیب اردو ادب میں اپنی قسم کی پہلی مثال اور نائک ساگر اس اتحاد خصوصی کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے نام یک جان ہو کر اس طرح ملے کہ ان میں سے ایک کے گذر جانے کے بعد بھی الگ نہ ہو سکے۔ چنانچہ یہ کتاب جو منشی نور الٰہی (مرحوم) کی وفات کے بعد شائع ہوئی اور صاحبزادہ محمد عمر کی تنہا کاوش کا نتیجہ ہے بدستور مشترکہ ناموں سے شائع ہوئی ہے۔ یہ وضعداری لائق تحسین ہے۔ یہ کتاب سات ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں سے تین تاریخی اور باقی خیالی ہیں۔ بلبدان، پورس اور زر پرست، ریڈیو سے نشر ہو چکے اور باقی بقول مصنف مختلف اسٹیشنوں سے رد کئے گئے ہیں۔ ان کی نامنظوری ڈراموں کے ادبی محاسن پر کوئی حرف نہیں آنے دیتی بلکہ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ ٹیکنیکل اعتبار سے ریڈیو کے لئے مناسب موزوں نہیں تھے۔ ان میں سے بعض ڈرامے اسٹیج کے موجودہ معیار پر پورے اتر سکتے ہیں لیکن سب کے سب ادبی لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں۔

بزمِ آخر مصنف:- منشی فیض الدین (مرحوم) ناشر:- کتب خانہ علم و ادب دہلی ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۲۶ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ منشی صاحب کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ دنیائے ادب میں ان کے ذکر خیر کو کوئی خاص درجۂ امتیاز حاصل نہیں تھا لیکن اب انکی یہ تصنیف جو عرصۂ دراز سے ناپید تھی، زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر انھیں شہرۂ آفاق کر دے گی۔ سید علی اشرف صاحب مالک کتب خانہ علم و ادب کی ادب نوازی لائق تحسین ہے کہ انہوں نے تلاش و تجسس کے بعد ایک دُرِ نایاب کو زینتِ محفل بنا دیا۔ اس کتاب میں شاہانِ دہلی کی آخری شمع کی جھلملاتی روشنی میں مغلوں کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور بول چال کی آن بان اس طرح اپنا رنگ جماتی نظر آتی ہے کہ اس عہدِ رفتہ کے مٹتے ہوئے نقوش نئے سرے سے اُجاگر ہو کر زندہ جاوید مرقع کی طرح آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ پچھلے طور طریقے، ہنگامے اور رسمیں جن کی محض ایک دلسوز یاد باقی ہے، نگاہوں میں پھر جاتی ہیں۔ اسلوب بیان اتنا شیریں، موثر اور دلفریب ہے کہ اس نوع کی تصانیف میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو بلکہ حقیقتاً یہ کتاب مشعلِ راہ تھی ان کے بعد کے لکھنے والے ادیبوں کے لئے جنہوں نے غدر اور غدر سے پہلے کی جھلکیاں دکھانے اور واقعاتِ روزمرہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ شامل ہے جس سے ان الفاظ و مصطلحات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے جن کے بولنے والے اب ناپید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مجربات کانفرنس مرتب:- زبدۃ الحکما حکیم محمد افضل۔ ملنے کا پتہ:- حکیم محمد علی صاحب۔ موہن سنگھ گیسٹ ہاؤس ... ۲۰×۳۰/۱۶ کے ... صفحات بلا جلد قیمت ڈھائی روپے۔ طبِ یونانی سے متعلق تقریباً پانچسو مجرب نسخوں کا یہ مجموعہ جس میں چند نامور اطبا کے مختصر حالاتِ زندگی اور فوٹو بھی شامل ہیں، پنجاب طبی کانفرنس کے جنرل سکریٹری صاحب نے ۱۹۲۹ء میں مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کرایا تھا۔ اس کی ایک جلد اب ۱۹۴۶ء میں برائے تبصرہ وصول ہوئی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت کاوش کے ساتھ ہندوستان بھر کے طبیبوں سے نسخے جمع کئے گئے تھے۔ ان کے مجرب ہونے کی بابت خود مرتب صاحب بھی قطعی رائے پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورت میں تبصرہ نگار جو علمِ طب سے ناواقف ہے، کس طرح اپنا صحیح خیال ظاہر کر سکتا ہے۔ مجموعے کے شروع میں کوئی فہرست موجود نہیں ہے۔ اگر اطبا کے اسمائے گرامی کے علاوہ نوعیتِ امراض کے لحاظ سے نسخوں کی فہرست مرتب کر دی جاتی تو مزید تمند حضرات کو ان سے استفادہ کرنے میں بڑی آسانی رہتی۔ امید ہے کہ ۱۹۲۹ء کے بعد منعقد ہونے والے اجلاس کے نسخوں کو کتابی صورت میں پیش کیا گیا تو اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا۔

ما بدولت مصنف:- جناب شوکت تھانوی۔ ناشر:- ادارہ فروغِ اردو لاہور ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۶ صفحات۔ مجلد قیمت ڈھائی روپے۔ ایک نہایت دلچسپ خود نوشتہ سوانح عمری ہے جسے شوکت صاحب نے کافی صداقتوں اور بے حجابیوں سے کام لیتے ہوئے قلمبند کیا ہے مگر کئی جگہ وہ ایمان تحمل کر باتیں کرتے نظر آتے ہیں کہیں کہیں تصنع اور بناوٹ سے کام لیا گیا ہے۔ بظاہر انہوں نے (بقولِ خود) اپنی بہت سی غلطیوں کا اعتراف کیا ہے مگر ایک ایسے انداز میں کہ وہ غلطیاں نہ تو صحیحاً غلطیاں معلوم ہوتی ہیں اور نہ اعتراف صحیح اعتراف کے درجے تک پہنچتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور بہت کامیاب ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے نجی اور ادبی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کا رنگ بھی اپنی جھلک دکھا رہا ہے جس کے باعث یہ کتاب محض دلچسپ ہی نہیں رہتی، مفید بھی بن گئی ہے۔ انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس پورے ماحول کا نقشہ کھینچا ہے جس میں وہ شروع سے اب تک سانس لیتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اس کتاب کے مطالعے سے صرف شوکت تھانوی ہی کو نہیں بلکہ موجودہ دور کی بہت سی شخصیتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تبویبِ حیدری مرتب:- جناب فضل اللہ احمد بی۔ اے (عثمانیہ)، ملنے کا پتہ:- گشتی کتب خانہ رسالہ عبد اللہ حیدرآباد دکن ۲۰×۲۶/۸ کے ۴۴ صفحات۔ بلا جلد قیمت ۱۲ر۔ اس کتاب میں فاضل مرتب نے جملہ علوم و فنون کو دس حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کو دس شعبوں میں منقسم کیا ہے۔ پھر ہر شعبے کی تقسیم دس ابواب میں کی گئی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے بالکل نئے اصولوں پر کتابوں کی ترتیب اور فہرست سازی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس کا لحاظ رکھا جائے تو لازمی طور پر وہ دقت دور ہو سکتی ہے جس کا سامنا اکثر لائبریریوں میں کتابوں کے انتخاب کے وقت کرنا پڑتا ہے۔

فسح

نیا راگ مرتبہ:۔ محترمہ ذکیہ سلطانہ ساغر ناشر:۔ میسرز تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹیڈ بمبئی ۲۰x۳۰/۱۶ کے ۱۰۳ صفحات۔ بلا جلد قیمت پونے دو روپے۔

"ایشیا" اپنی بے قاعدہ اشاعت کے باوجود اردو کا ایک اچھا معیاری رسالہ سمجھا جاتا رہا ہے کیونکہ اسے حضرت ساغر نظامی جیسے صاحبِ ذوق شاعر کی ادارت میں شائع ہونے کا فخر حاصل ہے بہیثیت اس کے مضامین نثر و نظم بلند پایہ در شائع رہے ہیں موجودہ دور کے تقریباً سبھی مشہور ادبا و شعرا کے افکار و خیالات اوراق "ایشیا" کی زینت بنے ہیں۔ اب اس رسالے کے منظوم حصوں کا انتخاب ساغر صاحب کی شریکِ حیات محترمہ ذکیہ سلطانہ نے جو خود بھی ایک اچھی شاعرہ ہیں، کتابی صورت میں مرتب کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس ترتیب میں بھی اسی سلیقے اور حسن کاری کی جھلک نمایاں ہے جو "ایشیا" کے لئے طرۂ امتیاز رہی ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی کے زیرِ تصنیف منظوم ڈرامے "حرفِ آخر" کے کئی بند شامل ہو جانے سے خاص طور پر اس کتاب کی خوبیوں کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ حسرت موہانی، سیماب اکبر آبادی، جگر مرادآبادی، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، نہال سیوہاروی، جاں نثار اختر، حیا لکھنوی اور خود ملیگ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ میسرز تھیکر اینڈ کمپنی نے جو اب تک انگریزی زبان کی کتابوں کے لئے مشہور تھے، اردو کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ چنانچہ یہ اس سلسلے کی دوسری کتاب ہے قیمت زیادہ ہے۔ ایک روپیہ مناسب تھی۔

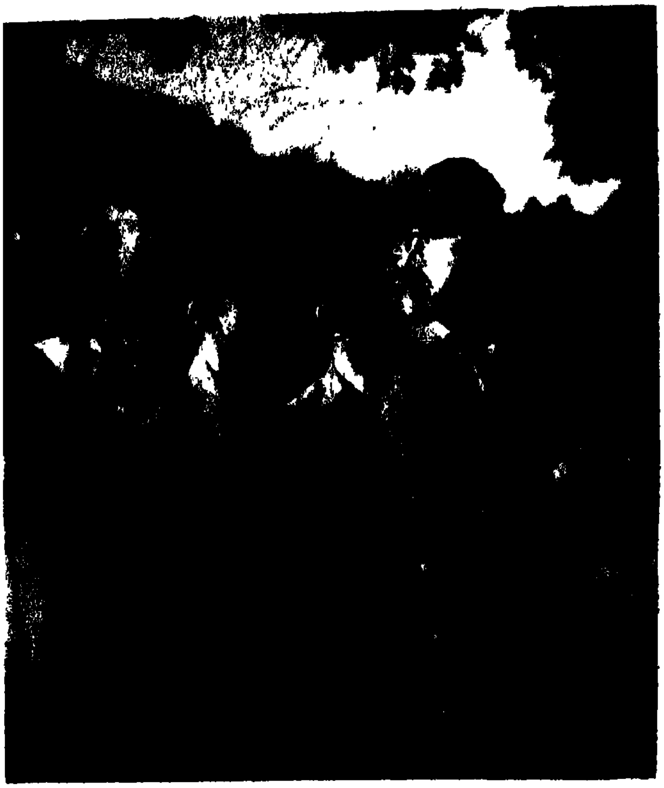
الاوجاع لاہور سے رسالہ الحکیم گزشتہ تین سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اس دوران میں وہ کئی خاص نمبر شائع کر چکا ہے۔ نومبر ۱۹۴۴ء میں اس کی اشاعتِ خاص "الاوجاع" کے نام سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ حکیم غلام محی الدین صاحب چغتائی نے جو رسالے کے مدیر اعلیٰ ہیں نہایت کاوش و کوشش سے ایسے مضامین مرتب کئے ہیں جن میں تمام اعضائے جسمِ انسانی کے دردوں کی حقیقت و کیفیت پر بحث کرنے کے علاوہ طریقہ ہائے علاج تجویز کئے گئے ہیں۔ جسم کا اندرونی یا بیرونی کوئی حصہ ایسا نہیں جس کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ دردوں کے علاوہ بعض اعضا کے ورم اور زخم بھی موضوعِ بحث بن گئے ہیں۔ طبی لٹریچر میں "الحکیم" کا یہ خاص نمبر ایک مفید اضافہ ثابت ہوگا۔ رسالہ کا سالانہ چندہ صرف دو روپے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر الحکیم۔ رفیق منزل۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

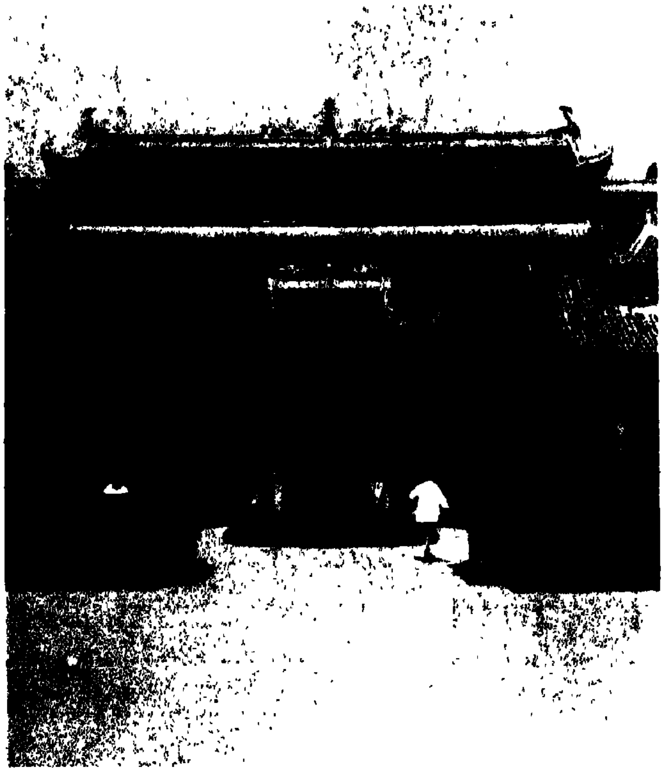
۱۔ غزل .... حضرت اثر لکھنوی ....
۲۔ اقبال میں تضاد نہیں .... ڈاکٹر تاثیر ....
۳۔ افغان آرٹ کی نمائش کلکتہ میں .... جناب ایم۔ ایم۔ تقی ....
۴۔ شہاب (افسانہ) .... جناب میرزا ادیب ....
۵۔ ہندوستانی ریاستوں کے معدنی ذرائع .... ماخوذ ....
۶۔ ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری (مع تصویر) .... جناب مظہر ممتاز (سحر صہبائی) ....
۷۔ چور (افسانہ) .... محترمہ جی۔ ایم درانی ....
۸۔ ایران کے مویشی .... جناب مقبول احمد ....
۹۔ ماں (افسانہ) .... پروفیسر سید محمد محسن پٹنہ ....
۱۰۔ افسانہ نگار .... جناب گریش چندر ....
۱۱۔ ڈاکٹر نیل رتن دھار (مع تصویر) .... جناب ڈی۔ راگھون ....
۱۲۔ فیض جھنجھانوی کی شاعری (مع تصویر) جناب ماہر القادری ....
۱۳۔ منظرِ شباب (نظم) .... جناب فیض جھنجھانوی ....
۱۴۔ برطانیہ کے کھیل .... جناب ایرک پارکر ....
۱۵۔ چند نشتر .... جناب اکبر فاروقی مرادآبادی ....

چینی طلبا

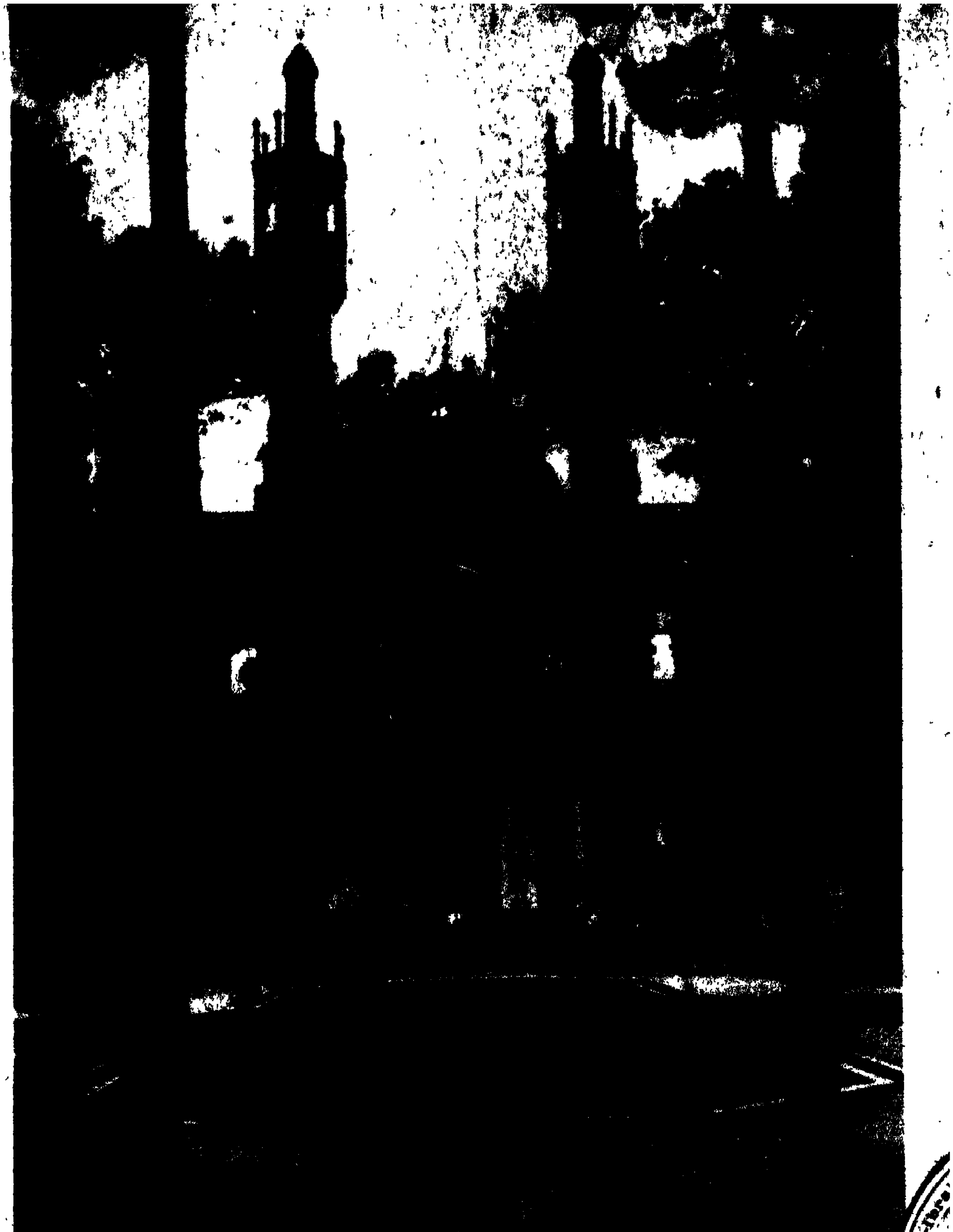
چین میں تعلیم کا بہت چرچا ہے۔ لڑکے اور ڑکیاں پڑھائی میں برابر کی دلچسپی لیتی ہیں۔ ابتدائی علیم کے اسکولوں کے علاوہ وہاں اعلیٰ تعلیم کیلئے بھی ئی یونیورسٹیاں ہیں جہاں ماہر پروفیسر مختلف ضامین پڑھاتے ہیں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود اور ام تفریح اور دلچسپی کے کاموں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ کھیل کے میدانوں میں نوٹس بورڈ ہوتے ہیں ن پر یونیورسٹی کے نوٹسوں کے علاوہ خاص خاص خبارات بھی چپکا دئے جاتے ہیں اور طلبا ان کو بڑی لچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔



یہ طلبا نن چنگ یونیورسٹی کے میدان میں ایک بورڈ پر چپکے ہوئے اخبار کو پڑھ رہے ہیں۔

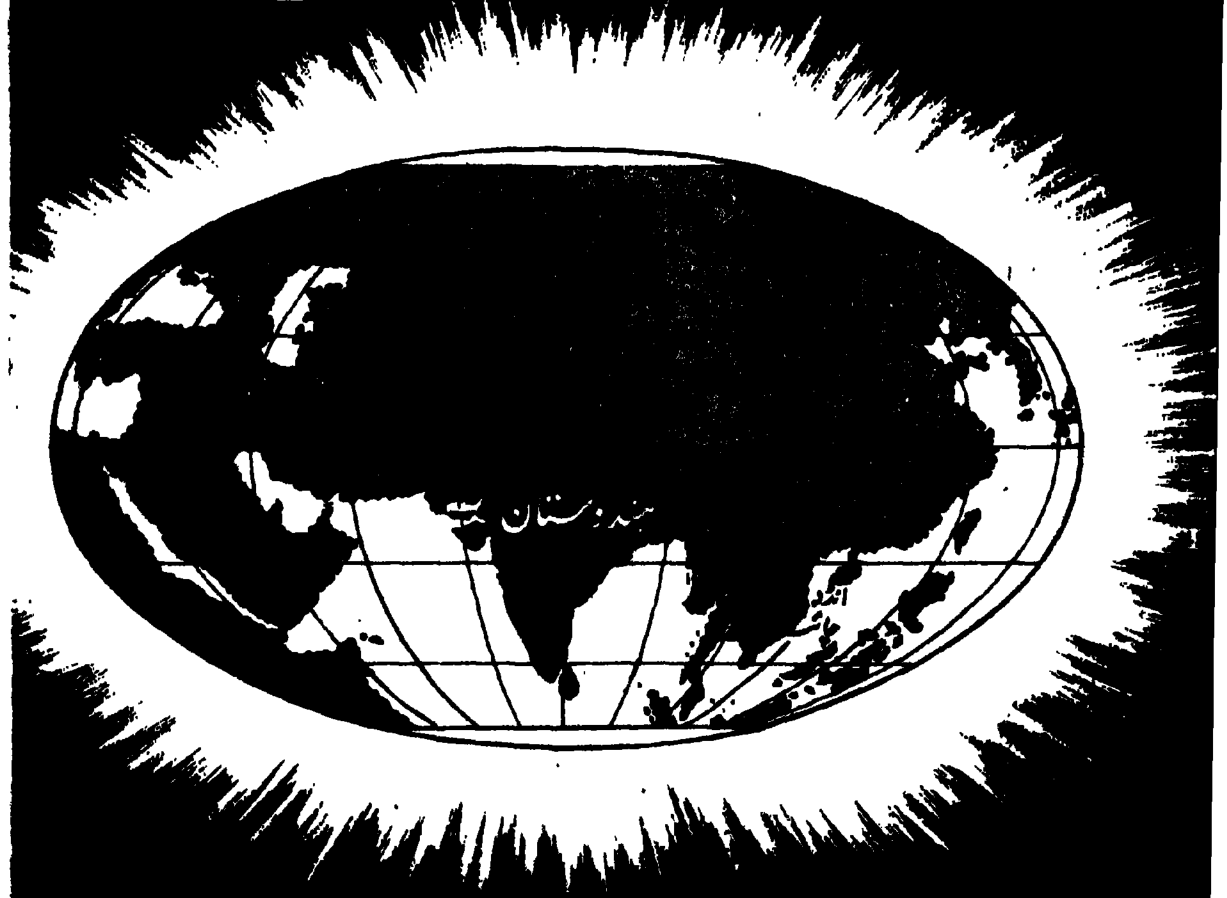






کرمان کی یہ پرانی مسجد فن تعمیر کا ایک بہت ہی اعلیٰ نمونہ ہے ۔ اسکے محل وقوع نے اسے اور بھی خوش منظر بنادیا ہے ۔ صحن میں ایک بہت صاف شفاف حوض ہے جسکے گرد بیٹھکر نمازی وضو کرتے ہیں ۔

آجکل



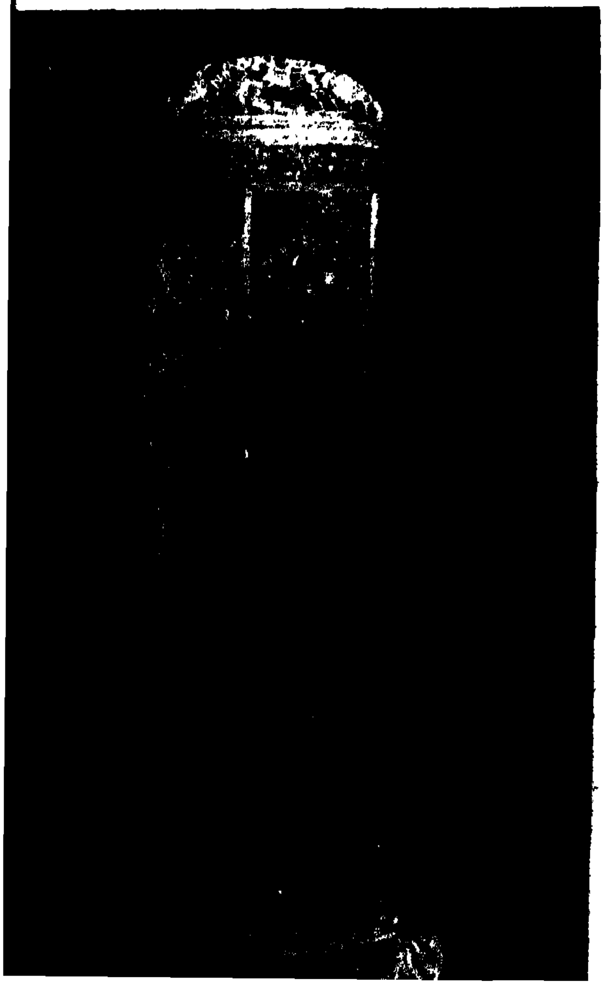


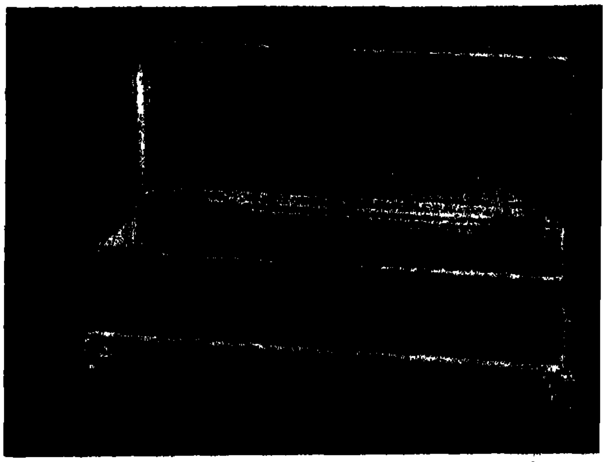
ھاتھی دانت کا کام

ھاتھی دانت کا کام ھندوستان میں
پرانے زمانہ سے ھوتا آیا ھے۔ پرانے
زمانے کے سیاحوں نے اسکا ذکر اور
تعریف کی ھے۔ اس کام کا سب سے
اچھا نمونہ وہ ھے جو بیجاپور کے محل
میں پایا جاتا ھے۔ یہ سولھویں صدی
کی یادگار ھے۔ یہ کام بہت محنت طلب
ہوتا ھے۔ اس میں باریکی، خوبصورتی
اور نزاکت کو بڑا دخل ھے۔

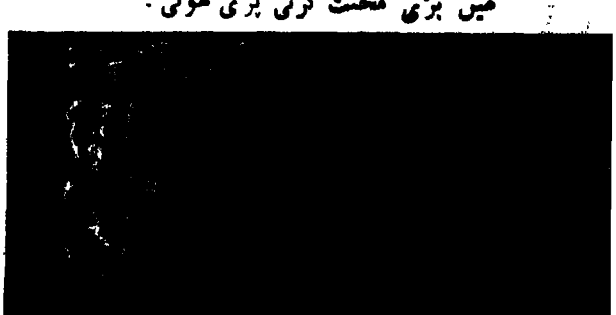
اتنا باریک اور مشکل کام کتنے سادہ اوزاروں سے کیا جاتا ھے!

AJKAL No. 20. Vol. IV. MARCH 15th.





یہ صندوقچی واقعی قابل تعریف ھے۔ اسکی جالی بنانے
میں بڑی محنت کرنی پڑی ھوگی۔



یہ دونوں ڈبے بڑے خوبصورت ھیں۔ کاریگر کی
ھوشیاری اور محنت داد طلب ھے۔

آج کل

اردو کا پندرہ روزہ
[illegible]

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۴ نمبر ۲۰ | فہرست | ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل۔ ایل۔ بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا ایم اے — فضل حق قریشی دہلوی — مشیر احمد ایم۔ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دھلی

رفتارِ زمانہ

قحط کے امکانات

جنگ کے ہاتھوں رونما ہونے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کا استیصال نہ ہونے پایا تھا کہ موسمی حالات کی خرابیوں، خصوصاً بارش کی کمی نے زراعتی پیداوار پر ناخوشگوار اثر ڈالا اور کئی فصلیں خطرناک بلکہ ہولناک صورت اختیار کر گئیں۔ جب اس سلسلے میں حکومتِ ہند کے ناظمِ زراعت کا بیان سنا گیا تو ہر طرف مایوسی اور افسردگی کے ساتھ تشویش اور پریشانی کی فضا طاری ہو گئی اور فوراً قحط زدگانِ بنگال کے ہیولے نگاہوں کے سامنے اپنی جھلک دکھانے لگے۔ ہر چند گذشتہ تین سال میں اناج کی مجموعی پیداوار بقدر پندرہ لاکھ ٹن بڑھی رہی ہے لیکن چونکہ ملک کی آبادی میں بھی اسی مدت میں ڈیڑھ کروڑ نفوس کا اضافہ ہو گیا۔ اس لئے بجائے فائدے کے الٹا نقصان رہا۔ اب اعداد و شمار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے محسوب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تیس لاکھ ٹن غذائی اناج کی کمی ہے اور اس مقدار کو کسی نہ کسی طرح پورا کر کے قحط کے احتمالات کا سدِّ باب کرنا ہے۔

اس وقت غریب ہم وطنوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور ضرورت ہے کہ امداد و تعاون اور ایثار و قربانی سے کام لیتے ہوئے مصائب و آلام کو مساوی طور پر تقسیم کر لیا جائے تاکہ اناج کی وقتی کمیابی کے احساس سے زیادہ کسی پر اثر نہ ہو اگر ایسا نہ کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کسی ایک صوبے کے باشندے یا کسی ایک طبقے کے افراد نشانۂ اجل بنیں گے اور باقی اس بلائے ناگہانی سے محفوظ رہیں گے۔ یہ غنیمت ہے کہ اس وقت راشن کا سلسلہ ملک بھر میں قائم ہے اور اس سے ایک بڑی حد تک نازک حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ وقت اور ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے حکومتِ ہند کے اربابِ حل و عقد نے مناسب تدابیر اختیار کرنی شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ پہلا قدم اس طرح اٹھایا گیا کہ روزانہ کے راشن میں تھوڑی سی کمی کر دی تاکہ محفوظ ذخیرہ جلدی ختم نہ ہونے پائے۔ اس کمی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ آدھے پیٹ بھوکے رہیں بلکہ وہ غذائی اناج کی بجائے دوسری چیزیں کھا کر آسانی سے گذارہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جلد پیدا ہو کر تیار ہو جانے والی فصلوں کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔ اس سلسلے میں فوج کے ذمہ دار افسران سے مشورہ کیا جا رہا ہے کیونکہ دورانِ جنگ میں وہ جلد اگ آنے والی ترکاریوں وغیرہ کے کامیاب تجربے کرتے رہے ہیں۔

اناج کے سلسلے میں ہندوستان کو امریکہ سے مدد مل سکتی تھی لیکن مشکل یہ آپڑی کہ قحط کا اندیشہ صرف ہندوستان ہی کے لئے لاحق نہیں ہے بلکہ یکساں اسباب کی بنا پر ساری دنیا میں اس وبا کے پھیل جانے کا امکان ہے۔ چنانچہ دوسرے ممالک بھی بیک وقت اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود حکومتِ ہند نے امریکہ سے درخواست کی ہے کہ تھوڑا بہت اناج اس ملک کے لئے دیا جائے۔ قوی امید ہے کہ اس درخواست کو رد نہیں کیا جائیگا۔ ادارۂ اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں بھی اناج کی کمی کا مسئلہ زیرِ بحث رہ چکا ہے اور عالمگیر پیمانے پر اس کو دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ادھر اپنے ملک میں ہز ایکسیلینسی وائسرائے ہند نے ماہرینِ زراعت و اربابِ سیاست سے ہر قسم کا خورہ شروع کر دیا ہے تاکہ مشکلات پر غالب آنے کے سلسلے میں کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو جائے۔ دور اندیشی کے طور پر فاقہ زدہ لوگوں کو طبی امداد پہنچانے کے لئے بھی ایک ادارہ قائم کر دیا گیا ہے تاکہ بھوک سے پیدا ہونے والی کمزوری یا خراب غذا کے برے اثرات کو دور کرنے کے لئے مناسب تدابیر ساتھ کے ساتھ عمل میں لائی جائیں۔

ہریجنوں کیلئے سرکاری وظائف

اچھوت ذات کے لوگوں کی تعلیمی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے خیال سے حکومتِ ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء کے دوران میں اس ذات کے ایسے طلباء کو وظیفے دئے جائیں جو برطانوی ہندوستان کے باشندے ہوں اور میٹرک پاس کرنے کے بعد کسی سائنٹفک یا ٹکنیکل مضمون کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔ یہ وظیفے صرف ہندوستان میں دئے جائیں گے کیونکہ بورڈ نے غیر ملکوں میں جا کر تعلیم پانے والے طلبا کو اس سال کوئی وظیفہ دینا منظور نہیں کیا ہے۔ ہر طالب علم کو دی ہوئی رقم اتنی ہوگی کہ اس سے ہر قسم کا تعلیمی خرچ جس میں کالج کی فیس اور دوسرے اخراجات بھی شامل ہوں، پورا کیا جا سکے۔ مختصر نویسی اور ٹائپ کا کام سیکھنے والے طلبا کو کچھ مدت تک کے لئے صرف بیس روپے ماہانہ دئے جائینگے۔

اس سلسلے میں حسبِ ذیل نصابات کا تعین کیا گیا ہے:۔ (۱) انٹرمیڈیٹ کسی سائنسی مضمون کے ساتھ (۲) بی ایس سی (معمولی یا اعزازی) (۳) ایم ایس سی (۴) انجنیرنگ (۵) ٹکنولوجی (۶) طبی (۷) زراعتی (۸) تربیتِ مدرسین اور (۹) مختصر نویسی

اور نائب۔ ایسی خواتین بھی وظائف کی مستحق قرار پاسکیں گی جنہوں نے ایف۔ اے یا بی۔ اے میں آرٹ کا کوئی مضمون لیا ہو۔ نیز وہ وعدہ کریں کہ کسی خاص قسم کی تعلیم پانے کے بعد وہ معلم بننے کی تربیت ضرور حاصل کرینگی۔ اگر انہوں نے اس شرط کو پورا نہ کیا تو وظیفہ کے طور پر دی ہوئی تمام رقوم ان سے واپس لے لی جائینگی۔

ہزار سال بعد پہنچنے والی کرنیں

برطانیہ اور امریکہ کے چند ماہرینِ فلکیات کچھ عرصہ سے ایک امریکی رصدگاہ کی دوربین کے ذریعہ مطالعۂ فلک میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ انہیں آسمان کے ایک حصہ پر نور برساتی ہوئی عجیب و غریب شعاعیں نظر آرہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس آتش فشانی کا نتیجہ ہیں جو آج سے ایک ہزار نوری سال پہلے ستاروں کے ایک جھرمٹ کے پھوٹ جانے سے عمل میں آئی تھی۔ یہ حادثہ ایک ایسے مقام پر ظہور پذیر ہوا جو کرۂ ارض سے تقریباً چھ سنکھ میل دور ہے۔ چونکہ یہ فاصلہ بہت زیادہ ہے اس لئے نور کی شعاعوں کو یہاں تک پہنچنے میں اتنا طویل عرصہ لگا۔ ماہرینِ فلکیات کے بنائے ہوئے پیمانۂ مسافت کی رو سے روشنی کی شعاع ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔

پچیانوے لاکھ تمغے

ہندوستانی سپاہیوں کو ان کی فوجی خدمات کے عوض تقریباً پچیانوے لاکھ تمغے دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ایک کروڑ اسی لاکھ تولے سے زیادہ وزنی دھات اور دو سو میل سے زیادہ لمبا فیتہ درکار ہوگا۔ یہ تمغے ان سپاہیوں کو دئے جائینگے جنہوں نے مختلف محاصروں یا معرکوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان میں سے بارہ لاکھ برما کی لڑائی اور دو لاکھ دو ہزار افریقہ کی لڑائی کے سلسلے میں ہونگے۔ ان سپاہیوں کو جنکی بہادری خاص طور پر قابلِ ذکر رہی ہے، ایک سے زیادہ تمغے ملیں گے۔ یہ تمغے ہندوستان کی مختلف ٹکسالوں میں ڈھالے جائینگے۔ پچھلی روایات سے قطع نظر اس دفعہ حاصل کرنے والوں کے نام ان کے تمغوں پر کھودے نہیں جائیں گے۔

ادارۂ اقوام متحدہ سے اسپین کی علیحدگی

متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی نے بہ اتفاق رائے اسپین کو ادارۂ اقوام متحدہ کی رکنیت سے علیحدہ کردیا۔ یہ صورت پوٹسڈم اور سان فرانسسکو والی کانفرنسوں کے ان الزامات کی روشنی میں پیدا ہوئی جو جنرل فرانکو کی حکومت کے خلاف عائد کئے گئے تھے۔ علیحدگی کی تجویز پاناما کے نمائندے نے پیش کی تھی اسکی تائید برطانیہ، فرانس، چین، امریکہ، روس، برازیل، ارجنٹائن اور چلی کی طرف سے ہوئی۔ اس موقعہ پر برطانوی نمائندے مسٹر فلپ نوئل بیکر نے فرمایا: "میری حکومت کو پورے وثوق کے ساتھ امید ہے کہ بہت جلد اسپین میں تغیرات رونما ہونگے ایسے تغیرات جو ان اصولوں کے مطابق ہوں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے اتحادیوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔" موصوف نے یہ بھی بتایا کہ پوٹسڈم اور سان فرانسسکو والی کانفرنسوں میں اسپین کے خلاف الزامات اسکی پچھلی دس سال کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے عائد کئے گئے تھے اور یہ کہ "ہم اس تاریخ کو ابھی بھولے نہیں ہیں۔"

ریڈیو کیلئے لسانی حکمت عملی

کچھ عرصہ ہوا حکومت ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات نے ایک خاص کمیٹی مقرر کی تھی جس سے کہا گیا تھا کہ وہ اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد مشورہ دے کہ اردو، ہندی کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو کی حکمت عملی کیا رہے۔ اب اس کمیٹی نے تین سفارشات پیش کی ہیں جنکا خلاصہ حسب ذیل ہے:- (۱) ایک عارضی مجلسِ مشاورت بنادی جائے جو آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کو مناسب الفاظ کے انتخاب میں صلاح دے سکے۔ آل انڈیا ریڈیو کی فرہنگ انگریزی کے ایسے آٹھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہو جو خبروں وغیرہ میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کے اردو اور ہندی معنے آسان اور عام فہم زبان میں لکھے جائیں۔ پھر وہ فہرست ملک کے ماہرین لسانیات کے پاس برائے تبصرہ بھیجی جائے۔ ان ماہرین میں مجلسِ مشاورت کے ارکین بھی شامل ہوں۔ انجمن ترقی اردو، ہندی ساہتیہ سمیلن اور ہندوستانی پرچار سبھا کے نمائندے اس مجلس میں شامل ہوں۔ (۲) خبروں کے علاوہ ایسے پروگرام جو بصورتِ الفاظ مرتب ہوتے ہوں ہندی اور اردو میں الگ الگ نشر کئے جائیں۔ کیونکہ کمیٹی کے نقطۂ نظر سے یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ دونوں زبانوں کی لسانی قوتوں کو مسدود کرنے کی بجائے پروان چڑھانے میں مدد دی جائے۔ (۳) الہ آباد میں ایک معاون اسٹوڈیو قائم کیا جائے جہاں بصورتِ الفاظ نشر ہونے والی ایسی چیزیں مرتب کی جائیں جن کو لکھنؤ اسٹیشن کے پروگرام میں شامل کیا جاسکے۔

فلسطین و مصر میں فلمی سرگرمیاں

"فلسطین اور مشرقِ وسطیٰ کی فلمی کمپنی" کے نام سے ایک نئے ادارے کا قیام دنیائے فلم میں ایک قابلِ رشک اضافہ ثابت ہورہا ہے۔ اس کمپنی نے فلسطین میں ذاتی نگارخانے بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ کہانیاں اور مکالمے لکھنے اور اداکاری کے جوہر دکھانے والے مقامی ماہرین کو دعوتِ شرکت دے رہی ہے۔ فلسطین میں یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور کامیابی کے زیادہ امکانات نظر آرہے ہیں، کیونکہ وہاں کی آب و ہوا کیلیفورنیا کے اس حصے کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے جہاں ہالی وڈ کے مشہور نگارخانے قائم ہیں۔ چنانچہ اس نئی کمپنی کو بھی تقریباً سارے سال کھلی فضا میں فلمی عکاسی کے مواقع مل سکیں گے۔ اس کے برعکس مصر میں فلمی صنعت کو دائرہ وجود میں آئے کافی عرصہ گذر چکا ہے اور اب اسے تعلیمی اور تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ چنانچہ مصر کے فلمی ادارے سماجی معاملات کی وزارت کے ماتحت ہیں۔ اس ملک کے نگارخانے اہرامِ مصر کے دامن میں تقریباً تین سو ایکڑ کے رقبے میں پھیلے پڑے ہیں۔ مصری فلم ان تمام ملکوں میں دکھلائے جاتے ہیں جہاں عربی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

موسمی ماحول کی مصنوعی کیفیات

لندن کے ایک ہسپتال میں چند کمرے نہایت دلچسپ تجربات کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ ان کمروں میں مصنوعی طور پر مختلف ملکوں اور علاقوں کے موسمی ماحول پیدا کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مختلف نسلوں اور مختلف پیشوں کے لوگوں پر ان اثرات سے کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کمرے میں صحرائے اعظم کی حرارت اور فضائی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ متعلقہ آلات کے حرکت میں آتے ہی وہاں شدید گرمی ہونے کے ساتھ ساتھ گرد و غبار کی آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔ ایک دوسرے کمرے کو برمی جنگلوں کے نمونے پر آراستہ کیا ہے۔ وہ نہایت گرم اور مرطوب ہے۔ ایک کمرے میں اتنی بارش ہوتی ہے کہ چراپونجی کی برسات بھی اس کے سامنے خشک سالی کا رونا رو سکتی ہے۔ ایک کمرے کو بالکل برف دان بنا کر کئی ہزار فٹ بلند پہاڑیوں کی سردی پیدا کی گئی ہے۔ ان کمروں میں ڈاک کے محرروں سے لیکر فوج کے جنگجو سپاہیوں تک سبھی قسم کے لوگ داخل کر کے ان کے متعلقہ کاموں میں مصروف کر دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے پہلے انکی صحت و تندرستی معلوم کرنے کے لئے طبی معائنہ کر لیا جاتا ہے۔ کام کے دوران میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بھی مقررہ ڈاکٹر قلب اور نبض کی حرکت، سانس کی کیفیت اور پسینے کی مقدار معلوم کرتے رہتے ہیں۔ ان ڈاکٹروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ان کیفیات میں مذکور تمام اثرات کا اندازہ لگا چکے ہوں۔ ان تجربات سے یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ فلاں قوم اور پیشے کے لوگ ایک مخصوص ماحول میں کن حالتوں اور آسائشوں کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں تاکہ اگر فوج میں بھرتی کر کے انھیں ان مقامات پر بھیجا جائے تو ہر قسم کی احتیاط کا لحاظ رکھا جائے۔ مثلاً ایک شخص کو ایک گرم کمرے میں چار گھنٹے تک رکھنے کے بعد جب معلوم ہوا کہ اس کے جسم سے تقریباً نو سیر پانی پسینہ بن کر نکل گیا ہے تو یہ اندازہ لگایا گیا کہ نمک کی کتنی مقدار اس طرح خارج ہو گئی جو جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھی۔ نیز یہ کہ اسے کونسی غذائیں اور دوائیں دیجائیں جو اس نمک کی کمی کو پورا کرتی رہیں۔ اس قسم کے تجربات زمانۂ جنگ کے علاوہ بھی مفید اور کارآمد ثابت ہو سکیں گے۔

ایک لاکھ یہودیوں کیلئے فردوسِ بریں

ویسٹ انڈیز کی جمہوریت ڈومینیکا نے یہودی فوج کو دعوت دی ہے کہ اگر آپ ہمارے ملک کو اپنا وطن بنانا چاہیں تو آپکو بخوشی نقل مکان کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ سانتو ریندرے پاستور یزلانے جو ڈومینیکا کے وزیر متعینہ برطانیہ اور ادارۂ اقوام متحدہ کے نمائندہ ہیں۔ امریکہ کے یونائیٹڈ پریس کو بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ "اس جنگ کے دوران میں بھی ان کی جمہوریت نے پانچ ہزار یہودی مہاجرین کو اپنی "فردوسِ بریں" میں رہنے کی اجازت دیدی تھی اور اگر وہ سلسلہ جاری رہتا تو پچیس ہزار مزید افراد کے قیام کا بآسانی انتظام ہو سکتا تھا۔ اب ہمارا ملک ایک لاکھ مہاجرین کے لئے فردوسِ بریں پیش کر سکتا ہے کیونکہ ہم ایسی قوم کے افراد کے لئے عرصۂ حیات وسیع کر سکتے ہیں جو ہم میں گھل مل کر رہ بس جائیں۔"

اس سرزمین کا رقبہ تقریباً ۲۰۰ مربع میل ہے اور ۱۹۱۷ء سے اس پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کا تسلط ہے۔

ترکی کے آئندہ منصوبے

ترکی وزارت رسل و رسائل نے ملک بھر میں ریلوں کے جال کو بہت وسیع پیمانے پر پھیلانے کے لئے دس سال کا ایک تعمیری خاکہ مرتب کیا ہے جو ترکی کی سماجی اور اقتصادی حالت کو ترقی دینے کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ دائرہ عمل میں آجانے کے بعد اس سے نہ صرف تجارت اور کاروبار میں آسانیاں پیدا ہونگی بلکہ ملک کو اپنی مدافعت کا موقع بھی مل جائیگا۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے میں ریلوں کا وجود لڑائی کے ہنگاموں پر غالب آنے کے لئے نہایت مفید اور ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ بحیرۂ اسود کے کنارے شہر فلیئر کے قریب ایک بندرگاہ تعمیر کرنے کے نقشہ جات بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ قیاس لگایا گیا ہے کہ یہ بندرگاہ ۱۹۴۹ء تک بن کر مکمل ہو جائیگی۔ اس کو جدید ترین لوازمات سے آراستہ کیا جائے گا۔ اس کے کنارے پانچ ہزار ٹن وزن کے بیس پچیس جہاز ٹھیر سکیں گے۔ نیز چار جہازوں سے سامان اتارنا اور چار جہازوں پر لادنا بیک وقت ممکن ہو گا۔

سعودی عرب میں ہوائی اڈا

حال ہی میں امریکی فوج نے سعودی عرب کے مشہور شہر "الظہران" میں ایک نہایت وسیع اور شاندار ہوائی اڈے کی تعمیر مکمل کی ہے۔ جو مشرق و مغرب کے درمیان فضائی مستقر کا کام دیگا۔ یہ مقام خلیج فارس کے ساحلِ عرب سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ شاہ ابنِ سعود کے ساتھ طے پانے والے معاہدے کی رُو سے اس ہوائی اڈے پر پورے تین سال تک امریکہ کا قبضہ رہے گا اور امریکی فوج اسے اپنا مستقر بنائے گی۔ اس کے بعد تمام میدان اور متعلقہ عمارتیں سعودی حکومت کی ملکیت ہو جائے گی تاہم امریکہ کے شہری ہوا باز ہوائی جہازوں کی دیکھ بھال اور انکی پرواز کے لئے پھر بھی متعین رہیں گے۔ تیل کے میدانوں کے باعث الظہران میں بہت پہلے سے امریکی باشندے کافی تعداد میں آباد ہیں ✽

غزل

اثر لکھنوی

شکار بے اثری ہے دُعائے نیم شبی
کہ ترک ہو نہ سکی دل سے خوئے غم طلبی

کہاں وہ گریۂ مستی کہ چشم میکش سے
بجائے اشک ٹپکتا تھا بادۂ عنبی

مذاق دید کی تکمیل ہو تو کیونکر ہو
حقیقتوں پہ ہے چھایا غبار بے سببی

کہاں سے لائیے وہ دل جسے ہو وصل کی تاب
وہی ہے ہجر کا عالم وہی ہے تشنہ لبی

کبھی کبھی تو یہ تمیز ہو گئی مشکل
نظر کے سامنے تم ہو کہ ماہِ نیم شبی

نہ دے فریب محبّت کہ یاد ہیں اب تک
شکست دل پہ ترے خندہائے زیر لبی

جگائے کون کہ حرماں کی پاسبانی میں
نصیب سو گئے زیر ردائے تیرہ شبی

نگار خانۂ عرفاں تھا دین جس کی جگہ
کئے ہیں وضع صنم خانہائے بو العجبی

یہ جانتے ہوئے نزدیک تر ہے شہ رگ سے
خدا کی سب کو طلب ہے بجائے خود طلبی

اگر ہے عشق، پئے اضطراب کافی ہے
ستارۂ سحری ہو کہ ماہ نیم شبی

نہ کم نگاہ ہے ساقی نہ تنگ ظرف ہے رند
ہزار جرعۂ بادہ، ہزار تشنہ لبی

اثرؔ یہ راز نہ سمجھا ہزار دانا تھا
کہ اضطراب کی تحریک ہے سکوں طلبی

پروفیسر نکلسن

کے اے خان

سرزمین انگلستان نے بہت سے مشہود معروف اور فاضل مستشرقین پیدا ہو چکے ہیں۔ ان میں سے جنہوں نے اسلامی ادب پر محنت اور کاوش کی ہے ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ اس کا احساس ہم کو اس وقت خاص طور پر ہوتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کتنی کتابیں خود تصنیف و تالیف کیں اور جو لوگ اسی ضمن میں بہت کچھ کر چکے ہیں اور سائنسی طریقہ پر اب تک جن کی کوششیں جاری ہیں وہ لوگ بھی ان سے کس قدر متاثر ہوئے۔ ای۔ جی براؤن، سر ڈینی سن راس، سر طامس آرنلڈ، سر جان مالکم اور سر ولیم جونس کے نام نامی ان کی عظمت پر دال ہیں۔ ان ہی فضلا کے گروہ میں مرحوم رینالڈ اے نکلس بھی شامل ہیں جن کا انتقال ۲۷ اگست ۱۹۴۵ء کو ہوا اور جن کے بارے میں مندرجہ ذیل سطور لکھی گئی ہیں۔

رینالڈ اے نکلسن ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ، آنریری ایل ایل ڈی (ایبرڈین) ایف۔ بی۔ اے شعبۂ عربی کے ایمیرٹس پروفیسر (پنشن یافتہ)، ٹرینٹی کالج (کیمبرج) کے فیلو، ایشیاٹک سوسائٹی (پیرس)، امریکن اورنٹیل سوسائٹی، رائل ڈینش اکیڈمی، ایرانی اور رائل سنیٹرل ایشین سوسائٹیز کے رکن اعزازی ۱۹ اگست ۱۸۶۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ہنری ایلین نکلسن ایم۔ ڈی، ایف۔ آر۔ ایس ایبرڈین یونیورسٹی میں تاریخ طبیعیات کے پروفیسر تھے۔ آپ نے ایبرڈین اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔ آپ نے ۱۸۸۸ء اور ۱۸۹۰ء میں یونانی زبان میں نظم کہنے پر انعامات حاصل کئے۔ ۱۸۹۰ء ہی میں "علوم قدیمہ" کا امتحان امتیازی شان سے پاس کیا اور ۱۸۹۲ء میں "السنۂ ہند" کے امتحان میں بھی اسی خصوصی شان کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ عربی آپ نے پروفیسر رابرٹسن اسمتھ سے اور پھر اسٹرسبرگ اور لیڈن میں پڑھی۔ لیکن "ادبیات اسلامی" کے مطالعہ کا مذاق کم عمری ہی میں آپ کے دادا نے جو عربی کے فاضل تھے اور پھر ای۔ جی براؤن نے پیدا کر دیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں آپ کا تقرر یونیورسٹی کالج لندن میں فارسی کی پروفیسری پر ہو گیا لیکن ۱۹۰۲ء میں آپ مستعفی ہو گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے لکچرار ہو گئے اور وہاں ای۔ جی براؤن کی ماتحتی میں ۱۹۲۶ء تک رہے۔ اس سال آپ ای، جی براؤن کی جگہ عربی کے "سر طامس آدم پروفیسر" ہو گئے۔ اس جگہ پر آپ ۱۹۳۳ء تک فائز رہے اس کے بعد آپ یونیورسٹی کی پروفیسری سے دست کش ہو گئے۔

آپ کے مطالعہ کا خاص مضمون اور موضوع "تصوف اسلام" تھا اور آپکا خاص لگاؤ جلال الدین رومی سے تھا جن کی مثنوی کو جامی نے "قرآن درزبان پہلوی" کہا ہے۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ نکلسن نے اپنی تحریرات کا آغاز مولانا رومی سے کیا اور پھر اختتام بھی انہی پر۔ آپ کی سب سے پہلی کتاب "انتخاب دیوان شمس تبریز" تھی جو ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی۔ اور آخری کتاب مثنوی شریف کے تیسرے اور چوتھے دفتر کی شرح تھی جو ۱۹۴۰ء میں چھپی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کے کارناموں کا سلسلہ اس جلد پر ختم ہو گیا کیونکہ مثنوی کے دفتر اول و دوئم کے متن کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مولانا جلال الدین رومی کی سوانح حیات اور ان کے زمانہ کے عام حالات لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کا ارادہ مثنوی کے لسانی، ادبی، تاریخی اور اعتقاداتی وغیرہ پہلوؤں اور حیثیتوں پر بھی بحث کرنے کا تھا۔ یہ جز اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ رومی پر نکلسن کی کتابیں آٹھ ہیں جو مثنوی کے متن، ترجمہ اور شرح پر مشتمل ہیں۔ یہ کتابیں بیس سال کے عرصہ میں مکمل ہوئیں۔ ان کے علاوہ تصوف پر آپ کی کتابیں مفصلہ ذیل ہیں: "تذکرۃ الاولیا" جس کے حصہ اول کا متن مع اشاریہ اور مختلف نسخوں کے ۱۹۰۵ء شائع ہوا اور حصہ دوئم کا ۱۹۰۷ء میں "کشف المحجوب" جس کا ترجمہ ۱۹۱۱ء میں، ابن العربی کی ترجمان الاشواق جس کا ترجمہ اور حاشیہ ۱۹۱۱ء میں، "صوفیائے اسلام" (Mystics of Islam) ۱۹۱۴ء میں، "کتاب اللمع" (جس کے مندرجات مختصراً انگریزی میں دیئے گئے ہیں) ۱۹۱۵ء میں، "اسرار خودی" (جو اقبال کے فارسی کلام سے مقتبس ہے) ۱۹۲۰ء (Studies in Islams Mysticism) ۱۹۲۱ء میں اور تصوف میں "ذات کا تخیل" ۱۹۲۳ء میں۔ آپ کی دوسری کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور "عربی ادب کی تاریخ" ہے جو ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔

مندرجہ بالا فہرست پر نظر ڈالنے سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی تصانیف ایک مستقل حیثیت کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ نکلسن نے بہت سے بڑے اہم طبعزاد مقالے بھی انسائکلوپیڈیا آف اسلام اور بعض موقر رسائل میں شائع کرائے جگہ کی قلت ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ ان مقالات کا مختصر طور پر ذکر بھی کیا جا سکے چہ جائیکہ ان پر تبصرہ ہو۔

نکلسن کی علمی فضیلت بے مثل تھی محنت، استقلال، قوت ممیزہ، استدراک، صحت پسندی، دیانتداری تبحر علمی، انکسار اور بے باکی آپ کی اپنی تصانیف میں اور ہمت افزائی اور شفقت دوسروں کے معاملہ میں یہ سب چیزیں آپ کا خاص جوہر تھیں اور اصل عالم کی بھی یہی خوبیاں ہوتی ہیں۔

جیسا کہ اشارۃً اوپر بیان ہو چکا ہے پروفیسر نکلسن نے اپنی تمام تر توجہ تصوف کے مطالعہ پر صرف کی۔ یہی وہ موضوع ہے جو مشرق و مغرب کے درمیان اصل اخوت کی روح قائم کئے ہوئے ہے۔ آپ نے اسلامی تمدن کا جس قدر گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسلامی ادبیات کی جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ان کو جس قدر بھی سراہا جائے وہ کم ہے۔ آپ نے تصوف پر متعدد کتابیں لکھ کر شاندار اسلامی

تمدن اور اسلام کے علوئے خیال پر بڑا احسان کیا ہے۔ آپ کو اس موضوع پر جو عبور حاصل تھا وہ ایک غیر ملکی کے لئے واقعی تعجب انگیز ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہ حیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے ماہر اسلامیات کے آپ کی شہرت لازوال اور ابدی ہے۔ السنۂ شرقیہ میں آپ عربی، فارسی، ترکی اور اردو سے بخوبی واقف تھے اس لئے اس موضوع پر آپ کا تبحر مسلم ہونا ہی چاہیے۔

قارئین کے سامنے میں پروفیسر نکلسن کے بارے میں چند وہ باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے تین سال کے ذاتی تجربہ پر مبنی ہیں۔ میں اس عرصہ میں آپ کا شاگرد بھی رہا اور ہم نشین بھی۔ آپ کے متعلق بحیثیت انسان کے آج جبکہ آپ کا انتقال ہو چکا ہے سچ سچ کہنا زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ اب کوئی شخص مجھ پر یہ الزام نہ لگا سکے گا کہ میں ایسا اس لئے کر رہا ہوں کہ اس میں میری کوئی ذاتی غرض مضمر ہے اور میں آپ سے کوئی خاص استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔

بظاہر پروفیسر نکلسن کسی قدر لئے دیئے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن آپ کے پہلو میں ایک دلِ گرم موجود تھا۔ آپ کی اندرونی گرمجوشی اور تپاک میل جول کے ساتھ اور زیادہ بڑھتا جاتا تھا اور مستقل ارتباط اور اختلاط کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ مثلاً اکتوبر ۱۹۴۲ء میں آپ نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ بورڈ آف ریسرچ اسٹڈیز نے آپ کو اجازت دے دی تھی کہ آپ میرا کام کیمبرج سے باہر رہنے کے زمانہ میں بھی دیکھتے رہیں مجھ کو تحریر فرمایا تھا "مجھے امید ہے کہ تم بھی اسی قدر خوش ہو گے جس قدر میں ہوا ہوں یہ معلوم کر کے کہ جو خوشگوار تعلقات میرے اور تمہارے درمیان اس زمانہ سے چلے آتے ہیں جب سے تم کیمبرج میں آئے ہو اب بھی بدستور قائم رہیں گے۔ مجھ کو بڑی مایوسی ہوتی اگر شعلہ میری اس دلچسپی میں جو میں تمہارے کام میں لیتا ہوں رخنہ اندازی میں کامیاب ہو جاتا۔ اس سلسلہ میں بھی اس کو وہی ناکامی ہوئی ہے جو اس کو اور دوسرے کاموں میں ہوگی۔" آپ نے یہ سطور شمالی ویلز کے اس قصبہ سے لکھی تھیں جہاں آپ جرمنوں کے حملوں کے زمانہ میں چلے گئے تھے۔ پھر مئی ۱۹۴۲ء میں آپ نے لکھا: "یہ بات میرے لئے ایک مستقل مسرت کا باعث رہے گی کہ میں تم کو نہ صرف ایک بہت اچھا شاگرد پاتا ہوں بلکہ ایک قابل قدر دوست بھی۔" پھر اسی سال ستمبر میں آپ نے لکھا: "یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تمہارے چلے جانے سے پہلے تم سے مل کر بہت خوش ہوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس سلسلہ میں کوئی دقت نہ اٹھاؤ۔ میں تم کو رخصتی سلام اس وقت تک نہیں لکھوں گا جب تک یہ ضروری نہ ہو جائے گا۔" یہ خط دیکھ کر میں نے آپ سے شمالی ویلز کے ایک ہوٹل میں ملاقات کی۔ جس وقت میں آپ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے لگا تو آپ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور آپ نے فرمایا (کس قدر صحیح تھی آپ کی پیشین گوئی!) "تم میرے آخری شاگرد ہو۔" میں نے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی یہ کہہ کر "خدا تعالیٰ آپ کو اپنا مفید کام تکمیل کو پہنچانے کے لئے زندہ و سلامت رکھے اور ابھی چند اور لوگوں کو بھی جنگ کے بعد آپ کی شاگردی کی سعادت حاصل کرنے کا موقع مرحمت فرمائے۔"

میں نے اس سلسلہ میں اپنی مثال اس لئے پیش کی ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ پروفیسر نکلسن کا طرزِ عمل اپنے شاگردوں کے ساتھ کیسا رہتا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر آربری کے متعلق آپ نے ۳ جولائی ۱۹۴۱ء کو لکھا تھا: "اس مہینے کے اواخر میں امید ہے کہ ڈاکٹر آربری سے ہماری ملاقات ہوگی۔ انھوں نے اپنی چھٹیاں گزارنے کے لئے اسی ہوٹل میں کمرے لئے ہیں۔" پھر ۱۶ جولائی ۱۹۴۱ء کو انھوں نے لکھا: "جگہ کی قلت کی وجہ سے ڈاکٹر آربری یہاں نہ آسکیں گے۔ یہ معلوم ہو کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ میری ملاقات ان سے سال بھر سے زیادہ سے نہیں ہوئی ہے۔" قارئین اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کے انتقال سے آپ کے دوستوں اور شاگردوں کو کیسا نقصان عظیم پہنچا ہے۔

اگرچہ آپ اکثر تصوف کے ایسے سنجیدہ کام میں لگے رہتے تھے لیکن کبھی کبھی مزاح کی طرف بھی آپ کی طبیعت مائل ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ آپ کے ایک حیدر آبادی قدردان نے آپ کو ایک حقہ پیش کیا۔ تھوڑے دنوں بعد آپ نے وہ حقہ پینا چاہا اور اس میں کوئلے اور پائپ کا تمباکو رکھ کر کش لئے لیکن آپ کو بڑا تعجب ہوا کہ وہ ایک کش بھی نہ لے سکے۔ جب میں نے آپ کو اس کی وجہ بتائی اور "حقہ کے اسرار و رموز" آپ پر منکشف کئے تو آپ خوب زور سے ہنسے۔ آپ رومی کی حکایات سے بہت محظوظ ہوا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "مولانا بھی بڑے بذلہ سنج اور ظریف الطبع تھے۔"

جگہ کی قلت مجھ کو اجازت نہیں دیتی کہ میں پروفیسر صاحب کی ایک ایک خوبی کی تفصیل دے سکوں۔ تمام بڑے آدمیوں کی طرح آپ کی طبیعت بھی سادگی اور عظمت کا امتزاج تھی۔ آپ ہر جگہ ہر شخص کی عظمت کی قدر کرتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ مجھ کو لکھا: "تم جب پھر ان کو خط لکھو تو پروفیسر شوستری کو میرا سلام لکھ دینا۔" حالانکہ پروفیسر سے آپ کی ملاقات صرف ان کی تصانیف کے ذریعہ ہی تھی۔

آپ کی شخصیت میں بین الاقوامی شان تھی۔ مجھ کو اپنی وہ حیرت اب تک یاد ہے جو مجھ کو اس وقت ہوئی تھی جب قونیہ (ترکی) کے عجائب خانہ کے مہتمم نے مجھ سے آپ کا پتہ دریافت کیا کیونکہ وہ آپ کو "مکتوبات مولانا" اور "مجالس سبع مولانا" کے تازہ نسخے بھیجنا چاہتا تھا۔

پروفیسر نکلسن کا انتقال تمام دنیا کے لئے ایک نقصان عظیم ہے اور ہم لوگوں کے لئے تو اور بھی زیادہ۔ آپ کی ذات ان چند برگزیدہ ہستیوں میں سے تھی جو زندگی کے اعلیٰ مدارج میں مختلف تہذیبوں اور معاشرتوں کے امتزاج کی قائل ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم پر واجب ہے کہ ہم آپ کی قدر اس لئے بھی کریں کہ آپ اقوام عالم کی زندگی میں ایک نیا باب کھولنے والوں کے پیش رو تھے۔ (بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

شہاب

ڈرامہ

افراد۔

شہاب:۔ اندھا موسیقار۔ ادھیڑ عمر

نرگس:۔ شہاب کی بیوی عمر پچیس سال کے لگ بھگ

جمال:۔ مصوّر۔ عمر تیس کے قریب۔

منظر

پہلگام سے دس بارہ میل کے فاصلے پر چندن واری گاؤں کے جنوبی حصے میں موسیقار "شہاب" کا مکان۔ اس مکان کی دوسری منزل کا پہلا کمرہ۔ دیواروں پر جابجا رنگین تصویریں لٹک رہی ہیں۔ جنوبی دیوار کے قریب ایک سنگین مگر بھیانک مجسمہ ایستادہ ہے۔

شام کا وقت۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق آلود شعاعیں کھڑکیوں پر لہراتے ہوئے ریشمین پردوں پر مبہم سے نقش و نگار بنا رہی ہیں۔ کبھی کبھی کسی پرندے کی دردناک آواز بھیانک فضا کو اور زیادہ بھیانک بنا دیتی ہے۔

اس وقت کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ چند لمحوں کے بعد آہستہ سے دروازہ کھلتا ہے۔ "نرگس" اندر جھانک کر دیکھتی ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے انتہائی مایوسی کے عالم میں دروازے کا سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ زندگی کے پے در پے تلخ تجربات نے اس کے چہرے پر سیاہ خطوط سے کھینچ دیئے ہیں۔ اور شام کی تاریکی میں یہ خطوط کافی گہرے ہو گئے ہیں۔

نرگس آگے بڑھتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے چاروں طرف دیکھتی ہے۔ اس کی نگاہیں سنگیں مجسمے پر جا کر خودبخود رک جاتی ہیں، جیسے تھک کر دم توڑ چکی ہوں۔ ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھر کر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور کمرے کے وسط میں پہنچ کر آرام کرسی میں گر پڑتی ہے۔

نرگس:۔ (خود بخود) کدھر جاؤں؟ (آواز میں غمناک لرزش) کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ کیا یہ سیاہ ڈراؤنی دیواریں مجھے اسی طرح پیس ڈالیں گی، کیا میں اسی طرح ختم ہو جاؤں گی۔ (زور سے گھڑیال کی آواز)
کتنا لمبا اور کٹھن ہے یہ دن۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت ایک تاریک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ نہ معلوم کتنے بوجھل، بے کیف دن ایک اتھاہ اندھیرے میں رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے ہیں (فوری جوش کے زیر اثر) اب یہ تنہائی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ میں بھاگ جاؤں گی۔ اس قید خانے سے۔ لوہے کی چار دیواری سے۔ میرے اللہ۔ (اس کی آواز شدت تاثر سے کانپ رہی ہے) اس طرح کڑھ کڑھ کر مر جانا۔ یہ برداشت نہیں ہو سکتا!

(کسی حد تک دور، شہاب کی آواز آتی ہے)

شہاب:۔ نرگس! (نرگس توجہ نہیں کرتی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپے چپ چاپ بیٹھی ہے۔) نرگس!! (نرگس بدستور چپ چاپ بیٹھی ہے) نرگس! کہاں ہو تم؟ تمہیں اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں اندھا ہوں۔ تم میرے لئے صرف ایک آواز بن کر رہ گئی ہو۔ یہ آواز بھی سنائی نہ دے تو پھر؟ (نرگس منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے۔ شہاب اندر آتا ہے۔ اس کا چہرہ سخت سیاہ اور خوفناک ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں وائلن ہے۔) میں جانتا ہوں تم یہیں ہو اس کمرے میں۔ (جمال دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے، اور نرگس کے پاس پہنچ کر رک جاتا ہے)

نرگس:۔ (بدستور منہ دوسری طرف) کیا ہے؟

شہاب:۔ مجھے معلوم ہے تم عام طور پر اسی کرسی پر بیٹھا کرتی ہو۔ اور ہاں ابھی تک جمال کیوں نہیں آیا؟ شام کی تاریکی میں کوہستانی مقام پر سفر کرنا کافی مشکل کام ہے۔ تاہم وہ آئے گا ضرور۔ ممکن ہے اس وقت سامنے پہاڑ کے دامن میں پہنچ چکا ہو۔ تمہارا یہ مصوّر استاد بڑا بہادر انسان ہے (طنز کو چھپانے کے لئے ہنستا ہے) ہے نا؟

نرگس:۔ میں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں میرے سامنے اس طرح نہ ہنسا کرو۔

شہاب:۔ اس طرح نہ ہنسا کروں۔ نفرت ہے میرے قہقہے سے؟

نرگس:۔ (ایک فوری اثر کے ماتحت) مجھے تمہارے قہقہے سے نفرت ہے۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔

شہاب:۔ (مطمئن انداز میں) نفرت بھی محبت کا ایک پہلو ہے۔ کبھی کبھی نفرت وہ چیز بن جاتی ہے جو محبت کبھی نہیں بن سکتی۔ میرا خیال ہے تم ابھی تک محبت اور نفرت کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکیں؟

نرگس:۔ مجھے ان باتوں سے نفرت ہے۔ (منہ پھیر لیتی ہے)

شہاب:۔ (مکمل اعتماد کے ساتھ) تمہارا دل تمہارے دماغ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر تمہارا مصوری کا استاد ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

نرگس:۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم نہیں جانتے تمہیں دیکھتے ہی میرے دل کی جلتی ہوئی آگ ایک دم بھڑک اٹھتی ہے۔

شہاب:۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ دوسروں کو سمجھنا زندگی کا ایک نہایت اہم مرحلہ ہے۔ کاش تم نے مجھے سمجھا ہوتا۔

نرگس:۔ خوب سمجھتی ہوں تمہیں!

شہاب:۔ میں جو کچھ ہوں اسے تمہارے دل نے سمجھا ہے۔ دماغ نے نہیں۔ دوسروں کو سمجھنے کے لئے صرف دل کافی نہیں ہے، دماغ بھی چاہئے! کتنا شدید طوفان ہے میرے دل کے اندر، کبھی سمجھا ہے اس طوفان کو بھی، کیوں ہے۔ کس لئے ہے؟

میرزا ادیب

ذرا دیکھو میرے دل کے اوپر ہاتھ رکھ کر! (اس کا ہاتھ پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ نرگس پیچھے ہٹ جاتی ہے) آج تم اس قدر اداس کیوں ہو اور تمہاری آواز سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی رو چکی ہو؟

نرگس:۔ قہقہے تو چھین لئے تم نے، آنسو بھی چھین لینا چاہتے ہو؟

شہاب:۔ میں نے تمہارے قہقہے چھینے نہیں۔ ؟ نرگس! حقیقت کو سمجھو۔

نرگس:۔ میری مسرت، میرے قہقہے، میری خوشی ہر چیز تم نے چھین لی ہے۔

شہاب:۔ کس قدر خوفناک واہمہ ہے یہ؟ ایک واہمے کو تم نے حقیقت بنا لیا ہے۔ حقیقت کی دنیا سے نکل کر سایوں کے پیچھے بھاگ رہی ہو؟

نرگس:۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔

شہاب:۔ جب جمال آگیا اس وقت تو تنہائی نہیں ہے گی۔

نرگس:۔ تم چلے جاؤ۔

شہاب:۔ کاش میں تمہیں مصوری سکھا سکتا۔ اگر میری آنکھیں جمال کی آنکھوں کی طرح دیکھ سکتیں تو ممکن ہے۔

نرگس:۔ (الفاظ کاٹتے ہوئے) بار بار جمال کا نام کیوں لیتے ہو؟

شہاب:۔ (بڑے نرم لہجے میں) اسے اب تک آجانا چاہئے تھا میں جانتا ہوں وہ ایک ماہر فن مصور ہے۔ اور تم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہو، بلکہ بہت کچھ سیکھ چکی ہو

نرگس:۔ تمہیں اس سے کیا؟

شہاب:۔ کچھ نہیں۔ یونہی دماغ میں ایک خیال آیا، کہدیا۔ ویسے تو دماغ میں ہزاروں خیال آتے رہتے ہیں مثلاً مجھے، کبھی کبھی وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب میری دونوں آنکھیں صحیح سلامت تھیں۔

نرگس:۔ یاد ہے وہ منحوس زمانہ؟

شہاب:۔ مجھے سن کر بڑی خوشی ہوئی تمہیں معلوم ہے میں دیر تک ٹکٹکی باندھ کر تمہیں دیکھا کرتا تھا، میری نگاہیں تمہاری غزالیں آنکھوں کی عمیق گہرائیوں میں نہ معلوم کیا کیا کرتی تھیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی شوہر بیخودی کے عالم میں اپنی بیوی کو دیکھتا رہتا ہو میری خواہش ہے کہ بصارت کی روشنی ایک بار پھر پیشانی کے نیچے ان بدنما گڑھوں میں پھوٹ آئے تا کہ میں ــ تمہارے شانوں پر بکھرے ہوئے ریشمیں بالوں کو دیکھوں، تمہاری ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھوں کو دیکھوں۔ تمہاری ــ

نرگس:۔ میں ایک خطرناک پاگل کے ساتھ اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتی!

شہاب:۔ خطرناک پاگل۔ (بھیانک قہقہہ) کون کہتا ہے میں پاگل ہوں۔ تم۔

نرگس:۔ تم پاگل ہو، وحشی۔

شہاب:۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ میرا ذہن ہر چیز کا پوری صحت کے ساتھ جائزہ لے سکتا ہے۔ میں سب کچھ سمجھ سکتا ہوں، ایک صحت مند انسان کی طرح۔ اندھا ہوں۔ ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہوں، مگر زندگی اپنے تمام نشیب و فراز کے ساتھ میرے سامنے موجود ہے۔ زندگی کا ہر گرم اور سرد سانس میرے ذہن کو چھو رہا ہے۔

نرگس:۔ مجھ سے بھی۔ میں اب زندگی کے اس ویران، لق و دق صحرا میں چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ اس زہریلی فضا میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور تم۔ تم ایک سلگتے ہوئے ناسور کی طرح مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہے ہو۔ اس منحوس گھر کے اندر زندہ لاش بن کر سانس لے رہی ہوں۔ تم چلے کیوں نہیں جاتے، کہیں دور، یہاں سے دور۔

شہاب:۔ ایک اندھے کے لئے دنیا کا ہر گوشہ تاریک ہے۔

نرگس:۔ تو یہاں رہ کر میری دنیا کو کیوں تاریک بنا رکھا ہے۔

شہاب:۔ اپنی دنیا کی تاریکی کا احساس تمہیں کب ہوا۔

نرگس:۔ مجھے ہر وقت اس کا احساس ہے۔

شہاب:۔ یہ احساس اس وقت ہوا جب تمہاری دنیا میں روشنی کی ایک نئی کرن پھوٹ پڑی۔

نرگس:۔ کیا کہہ رہے ہو میں نہیں جانتی؟

شہاب:۔ (ہنس کر) نہیں جانتیں؟ بہت خوب۔ میرا خیال ہے جمال آرہا ہے۔ میں اس کی آہٹ سن رہا ہوں۔ (نرگس کھڑکی کے باہر دیکھتی ہے۔ کھڑکی کا ایک پٹ بند کر دیتی ہے) مجھے جانا چاہئے؟ اپنی محبوب وادی میں وہیں بیٹھ کر وائلن بجاؤں گا۔

شہاب کمرے سے نکل جاتا ہے۔ وائلن کی آواز بلند ہوتی ہے اور پھر مدھم ہوتی ہوتی غائب ہو جاتی ہے۔ وقفہ ــ جمال آتا ہے۔ جمال اور نرگس، دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ جمال کچھ گھبرایا ہوا ہے)۔

نرگس:۔ (مسرت سے بیتاب ہو کر) آگئے جمال! اف کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی (گھبراہٹ میں) بات کیا ہے تمہارا رنگ کیوں پیلا پڑ گیا ہے؟

جمال:۔ میرا رنگ؟ تم ہر وقت کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہتی ہو۔

نرگس:۔ نہیں جمال! میری نگاہیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ تم واقعی پریشان نظر آرہے ہو۔ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آیا ہے۔

(اس اثنا میں بادل کی گرج، اور کھڑکیوں کے پٹ ٹکراتے رہتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً آندھی کی آواز بھی سنائی دیتی ہے)

جمال:۔ کوئی خاص واقعہ نہیں!

نرگس:۔ تم نے دیکھا ہے اسے راہ میں۔ ادھر ہی گیا ہے۔ وادی کی طرف، وہی اس کی محبوب جگہ ہے۔

جمال:۔ دیکھا تو ضرور ہے۔

نرگس:۔ دیکھا ہے۔ تم نے اسے بلایا ہوگا۔

جمال:۔ نہیں،

نرگس:۔ نہیں۔ اسے تمہاری موجودگی کی خبر نہیں ہوئی۔

جمال:۔ شاید۔
نرگس:۔ شاید؟
جمال:۔ ہاں شاید، ہم دونوں خاموش رہے، وہ وائلن بجاتا ہوا گزر گیا۔
نرگس:۔ وائلن بجاتا ہوا گزر گیا، مگر اسے ضرور معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم آ رہے ہو، تم اس کے قریب سے گزر رہے ہو۔ اس کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی ہے لیکن اس حس کے زائل ہوتے ہی اس کے اندر ایک نئی، ایک عجیب و غریب طاقت آ گئی ہے، ایک حیرت انگیز طاقت، وہ نہیں دیکھ سکتا مگر سب کچھ دیکھ لیتا ہے، سب کچھ، اس کے اردگرد جو کچھ ہوتا ہے، اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔
جمال:۔ ممکن ہے یہ ایک واہمہ ہو۔
نرگس:۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے کوئی چیز بھی واہمہ نہیں ہے۔
جمال:۔ تم اس سے ڈرتی ہو۔
نرگس:۔ ڈرتی بھی ہوں، نفرت بھی کرتی ہوں، بعض اوقات محسوس ہوتا ہے جیسے اس سے صرف ڈرتی ہوں، نفرت نہیں کرتی، اور بعض اوقات سوچتی ہوں، اس سے نفرت کرتی ہوں، اور یہ نفرت خوف میں تبدیل ہو گئی ہے۔
جمال:۔ خوب۔ یہ فلسفہ خوب ہے (ہنسی مگر اس ہنسی میں خوف کا شائبہ بھی ہے) ڈرتی بھی ہو اور نفرت بھی کرتی ہو۔
نرگس:۔ جمال! سچ کہتی ہوں بڑا عجیب انسان ہے اس کے مکروہ جسم میں ایسی قوتیں موجود ہیں جن سے عام انسان محروم ہیں۔
جمال:۔ واقعی؟
نرگس:۔ تمہارا رنگ اور پھیکا پڑ گیا ہے۔
جمال:۔ میں نے اسے دور سے دیکھا وہ وائلن بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔ میں دبے پاؤں چلنے لگا لیکن نہ معلوم کیا بات ہے کہ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ مکروہ اور بھیانک مسکراہٹ۔
نرگس:۔ اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم اس کے قریب سے گزر رہے ہو۔ وہ پاؤں کی ہلکی سے ہلکی چاپ بھی سن لیتا ہے۔
جمال:۔ یقیناً اس نے میرے پاؤں کی آہٹ سن لی ہوگی اسی لئے خود بخود کہنے لگا۔ آج سخت طوفان آ رہا ہے۔ (بادل کی گرج)
نرگس:۔ یہ الفاظ اس نے یہاں بھی کہے تھے۔
جمال:۔ اور طوفان آ بھی تو رہا ہے۔
نرگس:۔ جمال! تم نہیں جانتے وہ کتنا خطرناک انسان ہے۔ اندھا ہونے کے باوجود سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی (جذبات سے مغلوب ہو کر) جمال!
جمال:۔ کہو نرگس!

نرگس:۔ جمال! تم جانتے ہو اب تک جو کچھ میں اپنی آنکھوں کی زبانی کہتی رہی ہوں اسے اپنی زبان سے بھی کہہ دوں؟ تم آنکھوں کی زبان نہیں سمجھتے؟
جمال:۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں!
نرگس:۔ تو پھر۔ تو پھر جمال!
جمال:۔ میرا دل ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔ میرے دل کی دھڑکنوں نے کبھی مجھے اور تمہیں دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔
نرگس:۔ تم صرف ایک مصور ہو۔ دنیا کی ہر چیز کی تصویر کشی کر سکتے ہو، مگر ایک عورت کے دل کی تصویر کشی تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ کاش۔ تم
جمال:۔ (مسکراتے ہوئے لہجے میں) پھر وہی شاعری
نرگس:۔ تم حقیقت کو شاعری سمجھتے ہو۔ اپنا سینہ چیر کر کیونکر دکھاؤں تمہیں؟
جمال:۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے تمہارے دل کی کوئی کیفیت چھپی ہوئی نہیں ہے۔
نرگس:۔ چھپی ہوئی نہیں ہے؟ پھر بھی اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔
جمال:۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔
نرگس:۔ جمال! خدا کے لئے مجھے اس خوفناک تاریک ویرانے سے نکالو۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ چیخ چیخ کر مر جاؤں گی۔ یہ سنگین دیواریں، یہ کوچ، یہ خوفناک مجسمہ، یہاں کی ہر چیز مجھے کھائے جا رہی ہے بیدردی کے ساتھ کچل رہی ہے۔ یہ سارا بوجھ، میرے دماغ پر، میرے دل پر پڑا ہوا ہے۔ تم ہمت کر سکتے ہو، مگر محبت کے لئے کوئی قربانی نہیں کر سکتے۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو اس ظالم کے پنجے سے نجات دلانا تمہارا فرض نہیں ہے۔ کیا میں اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گی یہاں؟
جمال:۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔
نرگس:۔ صرف ہمدردی ہے۔ زبانی اور کچھ بھی نہیں۔ تم ڈرتے ہو اس سے؟
جمال:۔ ہرگز نہیں!
نرگس:۔ پھر تمہاری راہ میں کونسی دیوار حائل ہے؟
جمال:۔ یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔
نرگس:۔ شاید تم سمجھتے ہو۔ ہماری ہر روز ملاقات تو ہو ہی جاتی ہے۔ محبت میں باتیں بھی کر لیتے ہیں، اب بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یہ نہیں جانتے جب تم چلے جاتے ہو اور میں تنہا رہ جاتی ہوں تو میری کیا حالت ہوتی ہے۔ دل و دماغ میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی ہے جسم کے ذرے ذرے میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں جی چاہتا ہے کھڑکی سے چھلانگ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں، یا اس دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں۔ اور جب وہ میرے قریب آتا ہے تو میرا سینہ زہریلے دھوئیں سے بھر جاتا ہے۔ مجھے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے
جمال:۔ یہ تمہاری کمزوری ہے نرگس! آخر وہ ایک عام انسان ہی تو ہے۔ بلکہ

ایک عام انسان سے بھی کم تر۔

نرگس:۔ وہ اندھا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟

جمال:۔ ہاں۔ وہ آنکھوں کی روشنی سے بالکل محروم ہے۔ قدم قدم پر سہارے کا محتاج ہے

نرگس:۔ جمال! تم نہیں جانتے اس کی ایک حس ضائع ہو چکی ہے مگر باقی حواس خوفناک طور پر تیز ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس میں ایک نئی اور سخت خوفناک حس بھی پیدا ہو گئی ہے۔

جمال:۔ یہی تو میں کہتا ہوں تم نے اپنی کمزوری کی وجہ سے اسے بہت زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ شہاب وہ نہیں ہے جو اسے ہونا چاہئے بلکہ وہ ہے جو تمہارے وہم نے اسے بنا دیا ہے وہ اپنی دنیا سے نکل کر تمہارے وہم کی دنیا میں آگیا ہے تمہاری کمزوری نے، تمہارے وہم نے اسے ایسی خوفناک طاقتیں دے دی ہیں جو ایک ذی ہوش آدمی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتیں۔

نرگس:۔ میں اس سے خوفزدہ ضرور ہوں، لیکن اس کی وجہ نفرت ہے اور شاید ہر نفرت کی تہہ میں خوف ہوتا ہے۔

جمال:۔ ممکن ہے یہی ہو۔ مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں نفرت انسان کو زندہ رہنا سکھاتی ہے اور خوف موت کا سبق دیتا ہے۔

نرگس:۔ جمال! مجھے امید نہیں تھی تم اس طرح میرا مذاق اڑاؤ گے میں زندگی کی آخری حد پر پہنچ کر زندہ رہنے کا سہارا ڈھونڈ رہی ہوں اور تم ——؟ اور تم ایک فلسفی کی سی باتیں کر رہے ہو۔

جمال:۔ مجھے افسوس ہے تمہیں میری باتوں سے تکلیف پہنچی۔ دراصل میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ شہاب ایک معمولی انسان ہے۔

نرگس:۔ تنہائی میں سوچتی ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتی ہوں مگر جب اسے دیکھتی ہوں تو —— جمال! تم پھر فلسفی بن جاؤ گے! خدا کے لئے مجھے اس تاریک، اس خوفناک دنیا سے نکال کر کہیں دور لے جاؤ —— کہیں دور لے جاؤ۔

جمال:۔ نرگس! تم نے اب تک اس سے نجات پانے کی کوشش نہیں کی؟

نرگس:۔ دو مرتبہ۔ پہلی مرتبہ بھاگنے کی کوشش کی۔ یہاں سے دور ایک جہاز راں رہتا تھا ۔ اس نے مجھے سہارا دیا۔ جس رات ہم نے بھاگ جانے کا ارادہ کیا تھا اسی رات اس کا باپ فوت ہو گیا وہ اپنے شہر چلا گیا اور اب تک واپس نہیں آیا۔ اور اب اس کے متعلق میرے خیالات بھی بدل چکے ہیں۔

جمال:۔ اور دوسری مرتبہ؟

نرگس:۔ دوسری مرتبہ میں نے اس کی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی۔ دسمبر کی ایک تاریک رات تھی۔ وہ کہیں باہر سے آیا۔ اور آتے ہی اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر کے مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ جمال! نہ جانے اس وقت اس کی آنکھوں میں کیا تھا کہ میرے دماغ میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ مجھے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنی تصویر نظر آئی۔ ایک خوفزدہ، سہمی ہوئی، زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت کی تصویر۔ میں اس تصویر کو دیکھتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔ میں نہیں جانتی اس وقت میں کیا سوچ رہی تھی۔ یکایک میرے ذہن میں ایک ارادہ رینگنے لگا —— اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ارد گرد ہر چیز مجھے حقارت انگیز نظروں سے دیکھ رہی ہے —— میرے ذلیل وجود کا مذاق اڑا رہی ہے —— میری کمزوری پر قہقہے لگا رہی ہے —— وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ میں جاگتی رہی اور ایک نئی آگ کو اپنے دل میں، اپنے دماغ میں لئے ہوئے دیوانوں کی طرح کمرے میں گھومتی رہی۔

جمال:۔ پھر۔

نرگس:۔ پھر —؟ جب آدھی رات ہوئی میں نے اس کے بستر کو آگ لگا دی۔ اور اس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ وہ چیختا رہا، چلاتا رہا۔ میں سمجھ چکی تھی صبح تک اس کی راکھ ہی نظر آئے گی۔ لیکن وہ اپنے جھلسے ہوئے بدن کے ساتھ باہر آ گیا اور میرے قریب پہنچ کر دھم سے زمین پر گر پڑا۔

جمال:۔ اور آگ؟

نرگس:۔ چارپائی دیواروں سے دور تھی صرف اس کا بستر اور چارپائی راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔

جمال:۔ تمہاری یہ کوشش ناکام رہی!

نرگس:۔ ناکام رہی جب ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں سے پٹی اتارتے ہوئے کہا: "افسوس اب آپ کی آنکھوں کا علاج ممکن نہیں ہے"۔ تو وہ بے دم ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں اس کے پاس پہنچی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ "نرگس! افسوس اب میں تمہیں دیکھ نہیں سکوں گا"۔

جمال:۔ وہ جانتا ہے تم نے اس کی آنکھوں کو اندھا کیا ہے۔

نرگس:۔ شاید وہ جانتا ہے۔ مگر اس نے آج تک اس بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔

جمال:۔ حیرت ہے۔

نرگس:۔ جمال! یہ شخص تمہارے تصور سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ کئی بار سوچتی ہوں اسے یہ بات معلوم نہیں ہے۔ لیکن وہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ اور نہ کوئی بات پوشیدہ رہ سکتی ہے۔

جمال:۔ کچھ بھی ہو۔ اسے تم سے بے انتہا محبت ہے۔

نرگس:۔ شاید۔ تمہیں اس پر رحم آتا ہے۔

جمال:۔ رحم —؟ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ وہ کتنی تاریک دنیا میں سانس لے رہا ہے۔

نرگس:۔ میں خود بھی بعض اوقات یہی چیز محسوس کرتی ہوں لیکن جب وہ میرے

سامنے آتا ہے، مجھ سے باتیں کرتا ہے، میری کسی بے بسی پر قہقہے لگاتا ہے تو مجھے اس سے شدید نفرت ہو جاتی ہے۔ اتنی شدید نفرت کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ جیسے میرے دل و دماغ میں زہر آلود ریت کے کروڑوں ذرے اُڑ رہے ہیں۔ جیسے میرے سینے میں آگ کے آتشیں شعلے بھڑک رہے ہیں، جیسے ....، جیسے .... جمال! تم میری نفرت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

(دور سے وائلن کی آواز)

جمال:۔ وہ آ رہا ہے۔

نرگس:۔ ہاں۔ جمال!

جمال:۔ تمہارا رنگ۔ پھیکا پڑنے لگا۔ کیا ہوا تمہیں؟

نرگس:۔ کچھ نہیں، میں جاتی ہوں دوسرے کمرے میں۔

جمال:۔ بیٹھی رہو یہیں

نرگس:۔ نہیں۔ قہوہ بناتی ہوں۔ اتنی شدید سردی ہے آج اس کا خیال نہیں رہا!

(وائلن کی آواز بالکل قریب)

جمال:۔ جلدی آ جانا۔

نرگس:۔ جلدی؟

(وقفہ۔ وائلن کی آواز تیز ہو کر بند ہو جاتی ہے۔ شہاب اندر آتا ہے)

شہاب:۔ جمال صاحب ہیں۔! آ گئے آپ۔

جمال:۔ جی ہاں۔ آداب عرض۔

شہاب:۔ آداب عرض۔ آپ غالباً ابھی ابھی آئے ہیں؟

جمال:۔ جی ہاں۔

شہاب:۔ نرگس کہاں ہے؟ میرا خیال ہے وہ اس وقت کمرے میں نہیں ہے شاید قہوہ بنا رہی ہو۔ آج تو سردی اپنے پورے شباب پر ہے۔

جمال:۔ طوفان جو آ رہا ہے۔

شہاب:۔ ہاں طوفان آ رہا ہے۔

جمال:۔ آپ کہاں تھے؟

شہاب:۔ وہ سامنے دیکھ رہے ہیں نا ایک پہاڑ۔ اس کے دامن میں وائلن بجا رہا تھا۔ آپ نہیں جانتے شام کے وقت پہاڑ کے دامن میں وائلن بجانے سے کتنا لطف آتا ہے۔ پرندے کی میٹھی میٹھی بولی۔ چشمے کا ہلکا ہلکا ترنم ـــ پہاڑ کا دامن خوابوں کا جزیرہ بن جاتا ہے۔

جمال:۔ خوابوں کا جزیرہ۔ انداز بیان شاعرانہ ہے۔ مگر آپ کو طوفان میں کیا لطف آتا ہے۔ ڈر نہیں لگتا طوفان سے؟ میرا مطلب ہے، آپ دیکھ جو نہیں سکتے!

شہاب:۔ (ایک خاص جوش کے ساتھ) میں طوفان سے نہیں ڈرتا۔ میری زندگی ہر وقت کسی نہ کسی طوفان سے گذرتی رہتی ہے۔ اور میں ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ پر کھڑا ہوں۔ طوفان آتے ہیں اور طوفان کو بہا لیجانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ابھی کئی آنے والے ہیں، مگر سب ناکام رہیں گے۔

جمال:۔ (گھبرا کر) یقیناً ـــ آپ بہادر ہیں۔

شہاب:۔ بہادر؟ (ہنس کر) دنیا میں ہر وہ شخص بہادر ہے جس کی زندگی کو طوفان نے گھیر رکھا ہو۔ غور کیجئے کیا وہ اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش نہیں کرے گا ـــ اپنی عزیز ترین چیز کی حفاظت نہیں کرے گا۔

جمال:۔ ضرور۔

شہاب:۔ (بات کا رخ بدلتے ہوئے) آجکل آپ کی شاگرد ایک نئی تصویر بنا رہی ہیں۔ جسے ابھی تک مکمل نہیں کیا۔ مکمل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

جمال:۔ (سراسیمگی کے انداز میں) آپ کو کیونکر معلوم ہوا؟

شہاب:۔ وہ آجکل بڑی مصروف رہتی ہیں۔

(نرگس آتی ہے، برتن میز پر رکھ دیتی ہے۔ ایک پیالی میں قہوہ ڈالتی ہے)

نرگس:۔ (جمال سے مخاطب ہو کر) ایک چمچہ شکر۔

جمال:۔ شہاب صاحب کو دیجئے پہلے۔

شہاب:۔ میں نہیں پیوں گا قہوہ اس وقت، سوتے وقت پیوں گا۔ آپ پیجئے۔

جمال:۔ ایک پیالی ـــ

شہاب:۔ شکریہ۔ بہت کم پیتا ہوں ـــ جمال صاحب! مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ نرگس کی تصویریں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ تصویریں نہایت خوبصورت ہیں۔

جمال:۔ یقیناً۔

(نرگس قہوے کی پیالی جمال کی طرف بڑھاتی ہے)

نرگس:۔ لیجئے جمال صاحب!

(جمال پیالی لبوں سے لگاتا ہے)

شہاب:۔ جمال صاحب! آپ کی شاگرد آپ کی بڑی عزت کرتی ہے۔ اور کرنی بھی چاہئے!

جمال:۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔

شہاب:۔ نیند آ رہی ہے آنکھوں میں۔ سو جانا چاہئے! شب بخیر۔ تھوڑی دیر تک وائلن بجاؤں گا۔ سونے سے پہلے وائلن بجانے کی عادت سی ہے۔

جمال:۔ شب بخیر۔

شہاب:۔ نرگس! جلدی سو جانا۔ رات کو زیادہ دیر تک جاگنے سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اچھا شب بخیر۔

(شہاب کمرے سے نکل جاتا ہے۔ وائلن کی آواز بلند ہوتی ہے)

نرگس:۔ جمال

جمال:۔ کہو نرگس!

نرگس:۔ اس طرح نڈھال کیوں ہو گئے؟

جمال:۔ اس وقت یکایک مجھے رات کا سپنا یاد آگیا ہے۔ میرے بھائی کو مرے ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں۔ رات میں نے دیکھا کہ ایک جنگل میں سے گذر رہا ہوں کہ وہ کفن میں لپٹا ہوا میرے سامنے آجاتا ہے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔ میں جانا نہیں چاہتا لیکن وہ بار بار اشارہ کرتا ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ خواب زہریلا دھواں بن کر سارے دن میرے دماغ پر چھایا رہا ہے۔

نرگس:۔ یہ تو ایک سپنا تھا۔

جمال:۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔

نرگس:۔ سپنا — صرف سپنا۔

جمال:۔ کچھ نہیں۔ میرا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا ہے۔

(پس منظر وائلن کی آواز بتدریج مدھم ہو جاتی ہے)

نرگس:۔ ان باتوں کو چھوڑو جمال! — جمال!

جمال:۔ کہو نرگس!

نرگس:۔ جمال! دنیا بہت وسیع ہے ہم اس وسیع دنیا میں کہیں چلے جائیں گے۔ کہیں بہت دور۔

جمال:۔ آج مجھے اس کی باتوں سے خوف آنے لگا ہے۔

(وائلن کی آواز بند ہو جاتی ہے)

نرگس:۔ جمال! وہ سو رہا ہے۔ چند لمحوں میں ہم کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے۔

جمال:۔ نرگس!

نرگس:۔ جمال! تمہیں اپنا وعدہ یاد نہیں۔ بتاؤ — یاد ہے؟

جمال:۔ ہاں یاد ہے۔

نرگس:۔ تم نے کہا تھا ہم دونوں اس دنیا کے کسی دور گوشے میں چلے جائیں گے۔

جمال:۔ مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔

نرگس:۔ تو چلو! آج کی رات میری زندگی کی آخری بھیانک رات ہے۔ کل صبح نیا آفتاب میری زندگی کے افق پر طلوع ہوگا۔ تمہارے پہلو میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔ تاریک راتیں، تاریک دن۔ سب کچھ ایک سپنا بن کر ماضی کے اندھیرے میں غائب ہو جائے گا!

جمال:۔ وہ ابھی سویا نہیں

نرگس:۔ سو چکا ہے۔ وائلن کی آواز بند ہے۔

جمال:۔ چلیں۔

نرگس:۔ یہ لیمپ بجھا دیں۔ اب یہ لیمپ ہمیشہ بجھا رہے گا۔

(نرگس لیمپ بجھا دیتی ہے۔ اسے کھڑکی کے قریب رکھ دیتی ہے جمال جیبی لیمپ روشن کرتا ہے)

جمال:۔ اندھے کے لئے روشنی اور تاریکی — دونوں برابر ہیں۔

نرگس:۔ ذرا ٹھہرو میں کوٹ پہن آؤں۔ ابھی آتی ہوں۔

(نرگس کمرے سے نکل جاتی ہے۔ دوسرے لمحے واپس آجاتی ہے)

جمال:۔ میرے پیچھے پیچھے چلو۔ کہاں ہو تم۔

نرگس:۔ (دور سے) میں ٹھوکر کھا کر گر پڑی تھی۔ تم چلو، پیچھے، میں گھر کے ایک ایک کونے سے واقف ہوں۔

جمال:۔ یہ — کون ہے۔ تم ہو۔

نرگس:۔ میں تو یہاں ہوں — ؟

جمال:۔ یہ سایہ کس کا ہے — ؟ اوہ — شہاب — میری گردن — اوہ!

(جمال کے ہاتھ سے جیبی لیمپ گر پڑتا ہے۔ تاریکی چھا جاتی ہے)

نرگس:۔ جمال! (بادل کی گرج جس میں خرخر کی سی آواز ڈوب جاتی ہے — ایک دم قہقہے کی آواز) جمال — جمال!! (انتہائی گھبراہٹ میں) کہاں ہو تم جمال!

شہاب:۔ تمہارا جمال تم سے بہت دور چلا گیا ہے — اتنی دور کہ ساری عمر بھی اس کا تعاقب کرتی رہو گی تو اسے نہیں دیکھ سکو گی۔

نرگس:۔ کیا مطلب؟

شہاب:۔ میری دنیا کو اس طرح ویران نہیں کیا جا سکتا — وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔

نرگس:۔ ظالم — سنگدل (نرگس کی چیخیں — بادل کی گرج)

غزل

ضبط سوزِ عشق کرتے ہیں بڑی مشکل سے ہم — حسن کا دامن بچاتے ہیں چراغِ دل سے ہم
بیخبر کونین سے بیگانہ اپنے دل سے ہم — عشق میں آگے ہیں یعنی اب ہر اک منزل سے ہم
جب ہوئے مایوس لطفِ ساقیٔ محفل سے ہم — بھر کے جامِ تشنہ اٹھے رطلِ گرانِ دل سے ہم
دیکھنا مجبوریٔ عرضِ محبت دیکھنا — اب اٹھاتے ہیں نگاہِ شوق بھی مشکل سے ہم
تم کو تڑپانے میں ہم کو ہے تڑپنے میں مزہ — اپنی فطرت سے ہو تم مجبور اپنے دل سے ہم
ڈوبنے والے ہیں تارے بجھنے والے ہیں چراغ — ہچکیاں ہیں موت کی نزدیک ہیں منزل سے ہم
دل میں حسرت۔ اشک آنکھوں میں لبوں پر آہِ سرد — لیکے یہ سوغات اٹھے ہیں تری محفل سے ہم
رات کی تنہائیوں میں ہائے ری بیتابیاں — باتیں کرتے ہیں خدا معلوم کیا کیا دل سے ہم
جو مقدر میں لکھا تھا سامنے آکر رہا — بچ گئے طوفاں سے تو ٹکرا گئے ساحل سے ہم
بجلیاں سی پھر تڑپتی ہیں فرازِ طور پر — سنتے ہیں پھر لن ترانی کی صدائیں دل سے ہم

ٹھوکریں کھائیں اٹھائے رنج و غم لاکھوں حباب
منزلِ مقصود پر پہنچے بڑی مشکل سے ہم

ایران کے جانور

مقبول احمد

ایران ایک ایسا ملک ہے جس کا زیادہ حصہ پہاڑی، ریگستانی اور بنجر ہے۔ تھوڑا سا حصہ زرخیز اور زراعت کے کام کا ہے اور باقی چراگاہیں ہیں۔ بہت سی جگہوں پر پانی کی کمی ہے۔ اور ان جغرافیائی حالات کی وجہ سے شہر دور دور واقع ہیں۔ اناج کی کمی پورا کرنے کے لئے چراگاہوں میں بے شمار گائیں، بھیڑیں اور بکریاں پالی جاتی ہیں۔ ایران کے خانہ بدوشوں کی گزر اوقات انہی پر ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے سواری اور بار برداری کے جانور بھی موجود ہیں۔ ان میں گھوڑے، گدھے، خچر اور اونٹ شامل ہیں۔ یہ مویشی اس زمانہ میں بھی، جبکہ حمل و نقل کے بہت سے تیز رفتار ذریعے موجود ہیں، ایران میں آمد و رفت کا ایک ضروری ذریعہ ہیں۔

۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۳ء کے دوران میں یہاں مویشیوں کی تقریباً مندرجہ ذیل تعداد تھی:—

گھوڑے	۳،۲۸،۳۰۰
گدھے	۱۱،۴۵،۰۰۰
خچر	۵۰،۰۰۰
اونٹ	۶۷،۰۰۰
سانڈ، بیل اور گائیں	۲۵،۰۰،۰۰۰
بھیڑیں	۱،۴۰،۰۰،۰۰۰
بکریاں	۶۰،۰۰،۰۰۰

ایرانی نسل کے گھوڑے بہت مشہور ہیں۔ ان میں عام طور پر تین طرح کے گھوڑے شامل ہیں (۱) ترکمانی۔ یہ شمالی علاقے میں پایا جاتا ہے۔ لمبا اور تندرست ہوتا ہے اور بہت لمبا سفر طے کر سکتا ہے۔ لیکن خوبصورت نہیں ہوتا (۲) عربی۔ یہ جنوب میں ہوتا ہے اور خلیج فارس کے مغربی ساحل سے درآمد کیا جاتا ہے۔ یہ گھوڑا اگرچہ خالص عربی گھوڑے جیسا نہیں ہوتا مگر پھر بھی بہت کام کا ہوتا ہے۔ (۳) ایرانی۔ یہ دوسری نسلوں کے میل کا نتیجہ ہے۔ یہ سب نسلیں ایران میں حمل و نقل کا خاص ذریعہ ہیں۔

خچر اور گدھے بہت تندرست ہوتے ہیں۔ یہ تجارتی مال اور ذاتی اسباب لانے لے جانے کے کام آتے ہیں۔ ان کے قدم جمے ہوئے پڑنے کی وجہ سے یہ ناہموار زمین کے لئے بہت مناسب ہیں۔ خچر ایک دن میں پچیس میل سے تیس میل تک چلتے ہیں اور سفر کے ختم تک دو سو بیس سے تین سو پچاس پونڈ تک بوجھ لے جاتے ہیں۔ یہ خاص طور پر اصفہان، شیراز اور کرمان میں پالے جاتے ہیں۔ ریلوں کے کم اور مہنگے ہونے اور موٹروں کی قلت کی وجہ سے ایران کی ملکی تجارت زیادہ تر خچروں ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ خچربان علی الصبح سفر شروع کرتے ہیں اور مغرب کے وقت ختم۔ اس کے بعد وہ اکثر ایران کے رومانی تاروں بھرے آسمان کے نیچے فردوسی کے شاہنامے کی کہانیاں اور حافظ کی غزلیں گا کر تھکاوٹ دور کرتے نظر آتے ہیں۔

سیستان اور خراسان کے ریگستانوں میں صرف ایک کوہان کا ایرانی اونٹ ہی سواری اور بار برداری کا کام دیتا ہے۔ خراسان کا اونٹ لمبائی اور طاقت کے لئے مشہور ہے۔ یہ معمولی عربی یا ایرانی اونٹ کے مقابلہ میں سردی اور موسم زیادہ برداشت کر سکتا ہے۔ عنقریب ہوائی سفر کی ترقی اور دنیا بھر میں موٹروں کا روز افزوں استعمال خچروں اور اونٹوں کے ذریعے نقل و حمل پر اثر انداز ضرور ہوگا۔ لیکن سستے ذریعے نہ ہونے کی وجہ سے یہ مویشی ابھی کچھ عرصہ تک استعمال ہوتے رہیں گے۔

ایران کے مشہور قبیلے، کرد، لر، افشار، بختیاری، قشقائی، قریباً بھیڑوں اور چراگاہوں کی پیداواروں کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایران کی اقتصادی زندگی میں بھیڑوں کا بڑا حصہ ہے۔ یہاں کی تہائی آبادی کوئی تیس لاکھ آدمی خانہ بدوش ہیں اور ان کا پیشہ بھیڑیں پالنا ہے۔ وہ تمام سال اپنے گلوں کے لئے پہاڑیوں کے ڈھلانوں اور ترائیوں میں اچھی چراگاہیں تلاش کرتے پھرتے رہتے ہیں۔ یہ بھیڑیں اور دنبے مقامی آبادی کے لئے دودھ، مکھن اور اسی قسم کی دوسری چیزیں اور گوشت مہیا کرتی ہیں۔ ان سے اون، سمور، کھالیں، اور چیزیں ڈھکنے کے چمڑے بھی حاصل ہوتے ہیں جو برآمد کئے جاتے ہیں۔ بکریوں سے بھی بھیڑوں کا کام لیا جاتا ہے۔ دودھ کی پیداواروں کے علاوہ خانہ بدوش ان کے بالوں سے رسیاں اور ڈیرے بھی بنا کر استعمال کرتے ہیں۔

ایران میں لمبے پاؤں کی بالدار بھیڑیں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ گائنا کے لمبے پاؤں والی بھیڑوں اور ایرانی دمبوں کے میل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

ایران میں قالینوں، شالوں اور اون کی دوسری صنعتوں کا انحصار بھی بھیڑوں پر ہی ہے۔ اس کے خاص علاقے کردستان، آذربائیجان، کرمان شاہ، کرستان، فارس اور خراسان ہیں۔ اون بھی بہت زیادہ مقدار میں باہر بھیجا جاتا ہے۔ مردہ اور ذبح کئے ہوئے مویشیوں کی کھالیں بھی کما کر باہر بھیجی جاتی ہیں۔ یہ ایران کی بیرونی تجارت کا خاص جزو ہیں۔ ۱۹۳۷-۳۸ء میں

ان کی کل قیمت ۸۱،۸،۵،۰۰۰ ریال تھی۔ استراخاں کے قیمتی سمور حال ہی کے پیدا ہونے والے ایرانی میمنے "استراخاں" سے حاصل ہوتے ہیں۔ میمنے کا یہ نام دریائے دولگا کے اسی نام کے شہر پر پڑگیا ہے۔

ایرانی گائیں دودھ زیادہ نہیں دیتیں لیکن یہ اور بیل کھانے کے کام زیادہ آتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء-۱۹۳۶ء میں ان کے گوشت کی اوسط پیداوار ۵۵،۰۰۰ ٹن دھوٹے تھی۔ سانڈ اور بیل زمین جوتنے وغیرہ کے کام بھی آتے ہیں۔

ایرانی بلی پالنے کے بہت شوقین ہیں۔ جیسے اہل مغرب کتے پالتے ہیں ایسے ہی یہاں بلیاں پالی جاتی ہیں۔ ایرانی بلیاں دوسرے ملکوں میں کم سے کم سیامی بلی کے برابر مشہور ہیں۔ یہ سب رنگوں کی ہوتی ہیں اور انہیں چھوٹے بالوں والی بھی شامل ہیں اور لمبے بالوں والی بھی۔

جنگلی جانور زیادہ تر بحیرۂ خزر کے ساحلی علاقہ اور کوہ البرز کے جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ اہم شیر، چیتا، اودبلاؤ، ریچھ، مور، بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، خرگوش، اودجنگلی گدھا، جنگلی بھیڑ، پہاڑی بکری اور پہاڑی ہرن شامل ہیں۔

شیر ببر اب تقریباً ناپید ہوچکے ہیں۔ ایران کی جنگلی بھیڑیں دو طرح کی ہوتی ہیں (۱) جو البرز کے جنوبی ڈھلانوں پر پائی جاتی ہیں اور منتان کی پہاڑی بھیڑوں جیسی ہوتی ہیں (۲) جو پہاڑی کے شمالی حصہ میں ملتی ہیں۔ اب چکارا شاذ ہی نظر پڑتا ہے لیکن سرخ ہرن بحیرہ خزر کے ساحلی علاقہ میں ملتا ہے۔

ایران میں تقریباً چار سو قسم کے پرندے پائے جاتے ہیں۔ شکار کے پرندوں میں تیتر، سار، چکور، کبک اور ہندوستانی تیتر شامل ہیں۔ اسکے علاوہ سردیوں میں بے شمار شکاری پرندے، بلوہ، چہا، ایران میں آجاتے ہیں۔ خلیج فارس کے شمالی ساحلوں پر سمندر اور ماہی خور ملتے ہیں۔ ایران کی خشک آب و ہوا عمدہ قسم کے مرغ پالنے میں مدد دیتی ہے۔ ایرانی بلبل النغمہ سرا سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی شاعری میں اکثر گلاب کے پھول سے اس کے عشق کا ذکر کرتے ہیں۔

پروفیسر نکلس

بقیہ صفحہ ۷

ہمیں ایسے لوگوں کی واقعی ضرورت ہے تاکہ تمدن اسلامی کو دنیا میں زیادہ سے زیادہ ایک زندہ قوت بنائیں۔ مشرق کا مغرب میں ترجمان کرنے والوں میں آپ سب سے پیش پیش تھے اور آپکی کتابیں "صوفی ازم" میں تصوف ذات" اور "شرح مثنوی" اس خیال کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں کیونکہ یہ وہ کتابیں ہیں جو مغرب کو مسلمان عارفوں کے تصورات الامکانی اور جذبات معنوی سے روشناس کراتی ہیں۔ آپنے اپنے بہت سے شاگرد اور دوست اپنا ماتم کرنے کیلئے چھوڑے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم میں ایسی استقامت اور ایسی دماغی اور قلبی قوت پیدا ہو جائے کہ ہم آپ کے اسوۂ حسنہ پہ گامزن ہوں۔

عزم و عمل

پوچھتا کیا ہے تو اپنے عجز عبرتناک سے　　سرنگوں ہیں فرقتیں کس کی نگاہ پاک سے
تو ہے ناآشنائے قوت عزم و عمل　　پوچھ لے یہ راز بھی میرے دل بیباک سے
لے چکا ہے مرد مومن ماہ و پرویں سے خراج　　اور ابھی تک مانگتا ہے بھیک تو خاشاک سے
کھینچتا ہے شعاع مہر سے عشق تمام　　ہے تری امید البتہ زکواۃ تاک سے
چاند تاروں کو مسخر کر لیا تدبیر نے　　تو نکلتا ہی نہیں تقدیر کے پیچاک سے
طلب ہیں انسان کے ہیں قوتیں معراج کی　　تو مگر گذرا ہی کب ہے سرحد ادراک سے
گردش دوراں؟ یہ ہے پست ہمتی کا اختراع　　اور دلیل عجز ہے کرنا گلہ افلاک سے

فیض سے عزم و عمل کے قطرہ ہے طوفاں شعار
اور ذرہ خاک کا ہے حامل برق و شرار

قوت عزم و عمل کو ہے ازل سے یہ یقیں　　فرش ہے تا عرش سب کچھ ہو کے مر زیر نگیں
ہیں کبھی شکل نمو میں جلوہ فرمائے زمیں　　اور کبھی ہوں کہکشاں کے غرمنوں کی خوشہ چیں
وہ کوئی شے اور ہے عزم و عمل ہرگز نہیں　　آس کا دامن جو تھامے بیٹھ کر رہ جاتے ہیں
منزل آخر ہے جو وہم و گماں و فکر کی　　رہگذر ہے وہ میری اک چراغ اولیں
زندگی کو مانتی ہوں میں لباس عارضی　　اور اجل کو جانتی ہوں اک کنیز کمتریں
ہے ازل سے میری فطرت کوشش بے انتہا　　اور نتیجہ کوششوں کا قرب رب العالمیں
ماورا ادراک سے ہے وہ مقام بے نشاں　　میں جھکاتی ہوں جہاں پائے مشیت پہ جبیں

رنگ و بوئے گلستاں قائم مرے ہی دم سے ہے
یہ نظام دو جہاں قائم مرے ہی دم سے ہے

کنگرے سے عرش کے جب پرچم عزم و عمل　　شوق نے باندھا تھا بر طبل بادی صبح ازل!
لامکاں تک ہے رسائی ارتقائے عزم کی　　اور حاصل ہے اسے قرب خدائے عزوجل
ہے جہان ارتقا میں عزم کی جلوہ گری　　کرتے عزم و عمل نے عقدہ ہائے بیت حل
اک نظر عزم و عمل کی صبح کو کر دیتی شام　　گر اشارہ مہر کو کر دے کہ مغرب سے نکل
ہے مسلسل بیقراری فطرت عزم صمیم　　اس جہندہ برق کا ہے ہر اشارہ "دو قدم چل"
عزم کے ہر سانس میں ہے لمحۂ روح الامیں　　تیوری اس کی ہے اک تیر قضا پیک اجل
"آج" ہے روح روان گرمی عزم صمیم　　اس کے آگے ہے عدم کا دوسرا اک نام "کل"

عظمت عزم و عمل شاہنشہی کا تاج ہے
تاج کیا ہے؟ عظمت عزم و عمل معراج ہے

شہ زور کاشمیری

چند نشتر

(تنقید انتقاد)

اکبر مرادآبادی

غلط یہ لفظ وہ بندش بری یہ مضموں سُست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو (میرانیس)

اگست ۱۹۴۵ء کے "نگار" میں بعنوان "ماعلیہ" جناب سیمابؔ اکبرآبادی کی ایک غزل پر تنقید کی گئی ہے۔ یہ غزل "عالمگیر" کے سالانہ نمبر میں "چند نشتر" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ مطلع ہے ؎

فلک پہ چاند چھپتا جا رہا ہے
خیالِ صبحِ منزل آ رہا ہے

فاضل نقاد کا خیال ہے کہ:-

"منزل (بروزن محمل) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوچ کے بعد قیام کیا جائے، اس لئے صبحِ منزل کا خیال قطع سفر کے بعد ہی آنا چاہئے حالانکہ یہاں فلک پر چاند چھپنے کا منظر پیش کیا گیا ہے اس سے کوچ اور آغاز سفر کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے۔ اگر اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح چاند اپنی منزلیں طے کر چکا ہے اسیطرح ہم کو بھی منزل طے کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو پھر بجائے صبحِ منزل کے شامِ منزل کہنا چاہئے تھا۔ الخ"

مندرجہ بالا مطلع اپنی سلاست اور برجستہ اندازِ بیان کی وجہ سے جسقدر دلکش ہے، ظاہر ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ "محاکات" کی ایک بہترین مثال ہے۔ اور اس کا مفہوم بھی اسقدر بعید از قیاس نہیں جیسا کہ اوپر بیان کی ہوئی تشریح سے ظاہر ہوتا ہے۔ ردیف "رہا ہے" ایک استمراری کیفیت کی حامل ہے۔ اور شعر میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ مجموعی طور پر ہمارے خیال کو "کوچ" یا آغازِ سفر کی طرف منتقل نہیں کرتا بلکہ ایک قافلے کا آغازِ شب ہی مصروفِ سفر ہونا ظاہر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاندنی رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے لیکن ایک قافلہ منزلِ مقصود پر جلد پہونچنے کے خیال سے ہنوز مصروفِ سفر ہے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے اور طویل مسافت سے تھکے ہوئے مسافرین کو محسوس ہوتا ہے کہ ؎

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں (اقبال)

قافلے والے دوریٔ منزل سے بے خبر نہیں ہیں۔ ماہتاب کا قریب غروب ہونا صاف بتا رہا کہ منزل قریب ہے اور یہی خیال مسافرین کو باعثِ تسکین ہو کر منزل کے "امن و عیش" کا پتہ دیتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ انشاء اللہ صبح ہوتے ہوتے ہم منزلِ مقصود پر پہونچ جائینگے اور وہاں پہونچنے کے بعد صبح کا پرکیف سماں فضائے منزل پر محیط ہو کر رات بھر کی مسافت و شکستگی کو بالکل محو کر دے گا۔ چونکہ غروبِ ماہتاب خود صبحِ روشن کی دلیل ہے اسلئے یہ کہنا کہ "جس طرح چاند نے اپنی منزلیں رات بھر چلکر طے کیں اس طرح ہم بھی دن بھر چلکر شام کو اپنی منزل طے کر لیں گے اور اس صورت میں بجائے صبحِ منزل کے شامِ منزل کہنا چاہیئے" درست نہیں۔

معنوی لحاظ سے یہ شعر نہایت بلند ہے اور امید و مسرت کی جلوہ گری نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اصلی مفہوم یہ ہے کہ عشاقِ ستمکش نے جان کی بازی لگا کر محبت کی بہت سی منازل طے کر لی ہیں اور اب ان کے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ یعنی ؎

دو ہاتھ رہ گیا ہے اب دامنِ محبت

اسی غزل کا تیسرا مطلع ہے ؎

کبھی پنہاں کبھی پیدا رہا ہے   مگر جلوہ ترا جلوہ رہا ہے

نگار:- پہلے مصرعے میں ایک جملہ خبریہ ہے اس لئے دوسرا مصرعہ اس سے پیوند نہیں ہوتا۔ اگر پہلے مصرعے کا اندازِ بیان یہ ہوتا کہ "وہ پوشیدہ رہا ہو خواہ پیدا" تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

اعتراض "برائے بیت" معلوم ہوتا ہے۔ دونوں مصرعے بجائے خود جملہ فعلیہ خبریہ ہیں جنمیں سے ایک مستدرک اور دوسرا مستدرک منہٗ ہے اور حرف استدراک "مگر" سے مربوط ہیں اسلئے یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ ایک مصرعہ دوسرے مصرعے سے پیوند نہیں ہوتا۔ "پیدا" اور "پنہاں" کا تضاد اور حرفِ استدراک "مگر" سے جو زورِ بیان پیدا ہوا ہے وہ پورے شعر کے لئے باعثِ حسن ہے۔ مفہومِ شعر کا نہایت صاف ہے جیسا کہ جناب جگر مرادآبادی فرماتے ہیں ؎

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آ کے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

مدعا یہی ہوا کہ عشاق جلوۂ محبوب سے ہمیشہ سیراب ہوتے رہے "وہ پوشیدہ رہا ہو خواہ پیدا"۔ سیمابؔ کا پورا مرصع ہے اور کسی اصلاح کا محتاج نہیں۔ فاضل نقاد نے جو مصرعہ اولیٰ تجویز کیا ہے وہ شعریت سے خالی ہے۔

چوتھا شعر سنئے ؎

نہ پوچھ اس دل سے حالِ عیشِ امروز   جو مجبورِ غمِ فردا رہا ہے

نگار:- "اگر مقصود عیش کی فراوانی دکھانا ہے تو "رہا ہے" کی ردیف درست ہے۔ لیکن اگر مقصود عیش کی تلخی ظاہر کرنا ہے تو "رہا ہے" کی جگہ صرف "ہے" ہونا چاہیئے۔

اس شعر کا دوسرا مصرعہ "دل" کی صفت ہے جو مصرعۂ اولیٰ میں مذکور ہے

یہاں بھی ردیف "رہا ہے" ایک مستقل بلکہ دائمی کیفیت ظاہر کرتی ہے درآنحالیکہ معترض کا مجوزہ کلمہ "ہے" ایک وقتی حالت ظاہر کرے گا یعنی ایسا دل جو وقتی طور پر "مجبورِ غم فردا" رہا ہو۔ یہاں فی الواقعہ "عیش امروز" کی ہی مقصود ہے اور اس کا مقابلہ "غم فردا" کی فراوانی سے کیا گیا ہے۔ یعنی ایسے دل کو جو ہمیشہ مجبورِ غم فردا رہا ہو عیش امروز سے کیا حاصل ؎

کرتی ہے بوئے گل مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موجِ نسیم دمیدہ ہوں (میر درد)

پس یہ کہنا کہ عیش امروز کی تلخی ظاہر کرنے کے لئے صرف "ہے" کافی تھا صحیح نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب وقت تک دل عیش امروز سے دوچار نہیں ہوا تھا، مجبورِ غم فردا نہیں تھا بلکہ عیش امروز کے حاصل ہونے پر اس کو "غم فردا" کا احساس ہوا۔ علاوہ ازیں عیش کے ساتھ "امروز" کی تخصیص نے عیش کو محدود بنا دیا اس لئے فردا کی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ شاعر کی مراد یہاں ایسے دل سے ہرگز نہیں جو وقتی طور پر مجبورِ غم فردا رہا ہو بلکہ یہاں تو "محبت ازل سے مقدر پڑی تھی" (جگر) یا بقول حافظ ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

پانچواں شعر ہے اور خوب ہے ؎

کہاں طور اور کہاں سوز آشنا دل
یہاں برسوں دھواں اٹھتا رہا ہے

نگار:- اگر سوز آشنا کی صفت نہ ظاہر کی جاتی تو شعر زیادہ بلیغ ہو جاتا۔

شعر کی دلکشی، اسکی معنوی لطافت اور دلچسپ لفظی تناسب کے مقابلے میں مندرجہ بالا اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں۔ چھٹا شعر ہے ؎

تری خوئے تغافل کا گلہ کیا   محبت میں یہی ہوتا رہا ہے

نگار:- "اس شعر میں "ہوتا رہا ہے" بجائے "ہوتا ہے" کے استعمال کیا گیا ہے۔

"ہوتا ہے" معنوی لحاظ سے ماضی حال اور مستقبل تینوں پر محیط ہے۔ اس شعر میں "ہوتا رہا ہے" "ہوتا ہے" کے مرادف ہے اور صحیح ہے۔

آٹھواں شعر ہے ؎

نہ کر رسوا دلِ حسن آشنا کو   کہ یہ تیرا سراپردہ رہا ہے

نگار:- "اوّل تو سراپردہ کی تخصیص سمجھ میں نہیں آتی اور اگر محض پردہ کے معنی میں اس کو لیا جائے تو بھی دل حسن آشنا کا "پردۂ حسن" ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دل وفائے حسن کا پردہ تو ہو سکتا ہے لیکن محض حسن کا نہیں۔

اس شعر میں حسن سے مراد حسن محض نہیں ہے بلکہ مجازِ مرسل کی رُو سے حسن سے مراد حسن کے تمام جلوہ ہائے رنگا رنگ جو دل عاشق میں مستور ہیں۔

"دل حسن آشنا" اسلئے کہا گیا کہ اس میں حسن کی تمام نیرنگیاں پنہاں ہیں۔ اب رہا سراپردہ یہ لفظ محض پردہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ لفظ دلالتِ التزامی" کے تحت مستعمل ہوا ہے۔ یعنی پردہ دلالت کرتا ہے کسی شے کے پوشیدہ ہونے پر۔ اس شعر میں طنز کا ایک لطیف پہلو مضمر ہے۔ شاعر محبوب سے متمنی ہے کہ للہ "دل حسن آشنا" کو رسوا مت کرنا ورنہ حسن کی وہ تمام نیرنگیاں طشت از بام ہو جائیں گی جن کو دیکھکر دنیا ممکن ہے محبوب ہی کو "ستم پیشہ" اور قصوروار ٹھیرائے۔ اس ضمن میں جناب جگر مرادآبادی کا ایک شعر سنئے ؎

مجھے خاک میں تو نہ یوں ملا ہوں اگرچہ میں ترا نقش پا
ترے جلوے جلوے کی ہے بقا مرے شوق نام بنام سے

دسواں شعر ہے ؎

نگہدارِ شامِ غم میں ہا تی
فقط ایک صبح کا تارا رہا ہے

نگار:- "نگہدار" محافظ کو کہتے ہیں اس لئے اس لفظ کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس کی جگہ کوئی ایسا لفظ ہونا چاہئے تھا جو رفیق یا ساتھی کا مفہوم پیدا کرتا۔

"نگہدار" کے مجازی معنی "محافظ" کے ہیں۔ "نگہدار" اسم فاعل ہے مصدر "نگاہ داشتن" سے جس کے وضعی معنی نگاہ رکھنا یعنی "دیکھتے رہنا" اس لحاظ سے "نگہدار" کے وضعی معنی "دیکھنے والا" ہوئے اور اس شعر میں یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ شاعر نے "نگہدارِ غم" کے اشارے سے صبح کے تارے کو اپنا ہمدرد ثابت کیا ہے۔ شعر کا مضمون پرسوز ہے اور خوب ادا کیا گیا ہے۔ اسی غزل کا ایک دو شعر ہے ؎

یقیں رکھ حاصل لاحاصلی پر   یہاں جو کھو رہا ہے پا رہا ہے

نگار:- دوسرا مصرعہ بلحاظ مفہوم اپنی جگہ بالکل مکمل ہے اور اسمیں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، لیکن اگر پہلا مصرعہ محض تائید و تکرار ہی کے طور پر لکھا گیا ہے تو یہ مقصد اس سے پورا نہیں ہوتا کیونکہ کسی چیز کا کھونا اور لاحاصلی ان دونوں میں فرق ہے۔ لاحاصل کے معنے بے نتیجہ ہونے یا حاصل نہ کر سکنے کے ہیں اسلئے پہلے مصرعہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہماری سعی کا بے نتیجہ رہنا یا کچھ نہ پانا ہی عین حاصل ہے لیکن یہ کھونا نہیں ہے نہ پانا ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ علاوہ اس کے "یقین رکھ" کا ٹکڑا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

قطع نظر اس سقم سے دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ "یہاں جو کھو رہا ہے پا رہا ہے" چونکہ یہ دعوے اس عمومیت کے ساتھ صحیح نہیں اسلئے اس کو ایک ثبوت کی ضرورت ہے اور یہاں صرف دنیائے محبت ہی ایسی دنیا ہے جس کے کاروبار میں یہ دعوے ایک حد تک پورا اترتا ہے۔ اس لئے پہلے مصرعے میں اسکی

صراحت ضروری تھی مثلاً یوں سہ "عجب دنیا ہے دنیائے محبت"

راقم الحروف کے نزدیک مصرعہ ثانی میں کوئی دعوے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایک "امر مسلمہ" بیان کیا گیا ہے۔ اس شعر میں شاعر ایک ایسے حرماں نصیب عاشق سے مخاطب ہے جو اپنے استیشار کی لاحصلی پر تُف افسوس مل رہا ہو۔ کہتا ہے کہ اے راہِ محبت میں قربانیاں کرنے والے تو اپنی قربانیوں کے بے نتیجہ ہونے پر مایوس مت ہو۔ کیوں؟ اس کی وجہ مصرعہ ثانی میں بتائی گئی ہے۔ جو امر مسلمہ ہے اور کسی ثبوت یا صراحت کی ضرورت نہیں۔

نگار: اس غزل کے یہ اشعار نہایت پاکیزہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مقطع جو ایک استاد ہی کے قلم سے نکل سکتا تھا سہ

ہوا سنکی ہے بادل چھا رہا ہے ۔۔۔ جنوں انگیز موسم آ رہا ہے

یہاں جو ہے وہ ہے مجبور محتاج ۔۔۔ یہ تو دامن کہاں پھیلا رہا ہے

غم ان کا آئے بسم اللہ سیماب ۔۔۔ مگر اب مجھ میں باقی کیا رہا ہے

اشعار بالا کے متعلق ہم فاضل نقاد کی رائے سے متفق ہیں اور پر زور تائید کرتے ہیں۔

مضمون نگار حضرات مضمون صاف اور کاغذ کے ایک طرف لکھکر روانہ فرمائیں

ڈاکٹر نیل رتن دھار

ڈی راگھون

ڈاکٹر دھار نے اپنے دارالمطالعہ میں مجھ سے ملاقات کی جبکہ وہ مہاتما بدھ کی چھوٹی چھوٹی مورتیوں، اوتاروں کے رنگین مرقعوں اور سائنسدانوں کی تصویروں میں گھرے ہوئے تھے۔ اگر آپ سفر کے دوران میں ان سے ملیں تو ضرور یہ رائے قائم کریں کہ وہ کوئی خاص حیثیت کے انسان نہیں ہیں۔ انکی ہاتھ سے بُنے ہوئے کپڑے کی قمیض اور زدہ حال پتلون آپ کو یہ رائے قائم کرنے کی جرأت دے گی کہ وہ اصولی طور پر کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں ہیں۔ اور یہ کہ وہ ایسے کٹر قوم پرست ہیں جو ہمیشہ ماضی کے اس عہد زریں کے دلنشین خواب دیکھتے رہتے ہیں جب صنعتی کا دور دورہ تھا اور انسان مشین کے چکروں میں پھنس کر زندگی گذارنا نہیں جانتا تھا۔ یقین مانئے ڈاکٹر دھار کی زندگی سنیاسیوں جیسی سیدھی سادی ہے اور انھوں نے اپنے گرو سر پی سی رے کی طرح اپنی استعداد و صلاحیت کو صرف تعلیم و تعلّم کے لئے مخصوص کر رکھا ہے لیکن اگر ایک بار آپ ان کو آمادہ گفتگو کر لیں تو فوراً محسوس ہو کہ آپ کو ہندوستان کی ایک روشن خیال اعلیٰ دماغ ہستی کی صحبت کا فخر حاصل ہے۔ چند لمحے کی ملاقات ہی میں ان کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور ان سے مل کر کوئی شخص بھی انکی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ ان کے عزم و ارادے بالکل مثالی ہوتے ہیں تاہم تصورات کا تعلق علمی دنیا سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے خواب دیکھتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں تحقیقاتی مرکز اور تجربہ گاہیں قائم ہو گئی ہیں جو نت نئے مسائل حیات کا ساتھ دینے کے لئے نہایت ضروری ہیں اور جن کے طفیل ہندوستان کے قدیم دور کی بازگشت ممکن ہو سکتی ہے۔ سر سی پی رے نے ہندوستان کے لئے ایسے بے غرض اور بے لوث سائنسدان پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا جو اہل وطن کو غربت و افلاس کے آہنی چنگل سے نجات حاصل کرنے میں مدد دے سکیں جو کسانوں کو زیادہ اناج پیدا کرنے کے سلسلے میں مشورہ دے سکیں اور ڈاکٹر دھار موصوف کی اسی کاوش کا اولین ثمرہ ہیں۔ وہ نوجوان ہندوستانیوں کے اس پہلے گروہ میں سے ہیں جنھوں نے مغربی دنیا کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہندوستانی دماغ سائنس کے اسرار و رموز پر حاوی ہونے اور قدرت کے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کرنے کے زبردست اہل ہیں۔

گذشتہ جنگ عظیم کے بعد یہ ہالینڈ کا واقعہ ہے۔ خوراک کا مسئلہ اتنی نازک صورت اختیار کر گیا تھا کہ ہر قطعۂ زمین کو کام میں لانا ضروری تھا۔ ڈاکٹر دھار ولندیزیوں کے ایک بڑے مجمع میں شور زمین کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شیرے کی اس میل سے جسے فیکٹری والے بیکار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں زمینوں کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر ثابت کیا کہ بنجر زمین کو شاداب بنانے میں اس میل کو آسانی سے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ حاضرین کے لئے یہ انکشاف بالکل الہامی صورت میں رونما ہوا۔ تقریر ختم ہو جانے کے بعد صدر مجلس نے فرمایا "ہمارے ملک (ہالینڈ) کا نصف حصہ شور زدہ اور بنجر ہے۔ ایسی صورت میں کیوں نہ ہم ان ہندوستانی سائنسداں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس کے بنجر پن کو زرخیزی میں بدل لیں تاکہ اس کا ثمر ہمارے ملک والوں کی بقا کا باعث بنے؟"

ڈاکٹر موصوف سنہ ۱۸۹۲ء میں اوسط درجہ کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے چھ بھائی پہلے سے موجود تھے جو اپنی مرضی کے مطابق الگ الگ راستے پر چلتے چلے گئے۔ مگر نوجوان نیل رتن کو جلدی ہی سر سی پی رے جیسے رہنمائے اعظم کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔

سنہ ۱۹۰۵ء ہندوستان کی کیمیاوی تحقیقات کی تاریخ میں ایک قابل یادگار نشان منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اسی سال ہونہار طلبا کا ایک گروہ جنہیں آگے چل کر ہندوستان میں سائنسی تحقیقات کی ترویج و تجدید میں نمایاں حصہ لینا تھا کلکتے کے پریزیڈنسی کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہوا۔ ان طلبا میں سے جے سی گھوش، جے این مکرجی، پی بی سرکار، این این سہا، ایم ایل ڈے، اور نیل رتن دھار قابل ذکر ہیں جو ایک دوسرے کے رنج و راحت میں برابر کے شریک رہے اور جنہوں نے سر پی سی رے کی قیادت میں اپنی زندگی سائنس کی ترقی کے لئے وقف کر دی، جاہ اور مرتبے سے بالکل بے نیاز ہو کر وہ ہزاروں مسائل حیات پر بحث و تمحیص اور رموز کائنات کو بے نقاب کرنے کے لئے مصروف عمل رہے۔ اس سلسلے میں کہ ڈاکٹر دھار کو ان دنوں کس قسم کے موضوعات سے زیادہ دلچسپی تھی پی سی رے نے اپنی سوانح عمری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "سنہ ۱۹۱۹ء شروع ہوتے تک طبیعات نے اپنا سر بلند کر دیا اور علوم سائنس میں اپنی جگہ قائم کر لی۔ نیل رتن دھار کو یہ فخر حاصل ہوا کہ ہندوستان میں اس شعبۂ علم کا مطالعہ کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم انہی کا اٹھا۔ نہ صرف یہ کہ اس شعبہ میں تحقیقات کا کام انہوں نے اپنے لئے اختیار کیا بلکہ جے سی گھوش جے این مکرجی اور چند دوسرے سائنسدانوں کو بھی اس سلسلے میں اکسایا۔"

۱۹۱۵ء میں دھار بغرض تعلیم حکومت ہند کی طرف سے انگلستان تشریف لے گئے۔ انہوں نے امپیریل کالج اوف سائنس اور سوربون (فرانس) میں اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔ نہایت قابل تعریف مقالات لکھ کر پیش کرنے پر لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں سے موصوف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل ہوئیں۔ یہ مقالات اس کے بعد شائع بھی ہوگئے۔

۱۹۱۹ء میں ان کو انسٹیٹیوٹ اوف کیمسٹری کے فیلو کی حیثیت سے منتخب کیا گیا جس کے وہ آج تک رکن ہیں۔ ان کے ایک ہمعصر سائنسداں نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: "ان کی اعلیٰ دماغی ذہانت بڑی سرعت کے ساتھ بام عروج پر پہونچ گئی۔ انھوں نے طبیعات برقی کے میدان عمل میں بڑی سرگرمی اور عجلت کا مظاہرہ کیا"

ڈاکٹر اپنے شاگردوں میں بھی بہت زیادہ مقبول ہیں کیونکہ وہ انکے ساتھ خوب گھل مل کر رہتے ہیں۔ وہ اپنی اصل عمر سے بہت کم سن نظر آتے ہیں۔ نیز ان کے سادے طور طریق اور معمولی لباس کو دیکھ کر بھی طلبا کے کسی مجمع میں انہیں شان امتیاز نہیں دی جاسکتی۔ ان کی بابت بہت سی باتیں مشہور ہوگئی ہیں۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد نے ایک دلچسپ بات مجھے بھی سنائی۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر دھار نے کبھی کسی شخص کے اعزاز میں کوئی پارٹی نہیں دی کیونکہ وہ ایسی رسمی باتوں کو محض بے کار اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر دھار اسقدر علم پرور اور مفکر ہیں کہ وہ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو کبھی رونق محفل بنتے نہیں دیکھا گیا۔ وہ رسمی باتوں سے امن بچاتے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت مطالعہ اور تجربات میں گذرتا ہے۔ سائنس کے موضوعات پر دنیا بھر کی اہم مطبوعات ان کے پاس آتی ہیں اور وہ ان میں سے چند کی خود بھی قلمی اعانت کرتے ہیں۔ اکثر نابغوں کی طرح وہ اپنی سائنسی نگارشات کے ذریعہ اپنے وطن سے باہر دوسرے ملکوں میں زیادہ مشہور ہیں۔ جرمن فرانسیسی اور اطالوی جیسی یورپ کی اہم زبانیں جاننے کے باعث وہ سائنسی تحقیقات کی جدید ترین سرگرمیوں سے واقف رہتے ہیں۔ ہندوستان میں کولائڈل کیمسٹری کے موضوع پر وہ سب سے بڑی سند سمجھے جاتے ہیں۔ طبیعات کا یہ شعبہ سب سے زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق صابن، ٹوتھ پیسٹ، اور چند خاص ادویات کی تیاری سے ہے۔ ڈاکٹر دھار نے اس ضمن میں بہت سی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

حال ہی میں جب میں الہ آباد میں ان سے ملا تو وہ اپنے زراعتی تجربات کے بہترین نتائج پر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ زراعت کے موضوعات سے جو انہیں سب سے زیادہ مرغوب ہیں کبھی نہیں اکتاتے۔ وہ یہ بیان کرنے میں کہ ہندوستان کی اراضیات کو زیادہ سے زیادہ زرخیز بنانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں ہمیشہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہندوستان کے کھیتوں کی مٹی میں جو مختلف خصوصیات اور ماہیتیں ہیں انہیں خاکے کی صورت میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: "صوبجات متحدہ اور پنجاب میں کلر زمین بہت وسیع علاقے میں پائی جاتی ہے۔ صرف صوبجات متحدہ میں اس کا رقبہ تقریباً دس لاکھ ایکڑ ہے۔ وہاں کی زمین میں سوڈا کاربونیٹ کی موجودگی روئیدگی کو تباہ کرتی رہتی ہے۔ اگر زمین کے اتنے وسیع قطعات کو سستے داموں شاداب بنانے کا طریقہ معلوم کر لیا جائے تو ہندوستان کے مسائل اغذیہ کا حل ممکن ہوسکتا ہے۔ شیرے کا میل جسے اب تک بیکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا تھا کافی مقدار میں مل سکتا ہے۔ میں نے اس میل کے ذریعہ تیار ہونے والی کھاد سے ان بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے کا طریقہ معلوم کر لیا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ جون کے آخر میں بارش کے بعد زمین میں خوب ہل چلایا جائے۔ پھر ایک ایکڑ زمین کے لئے پانچ ٹن شیرے کا میل اتنی ہی مٹی میں اچھی طرح ملا کر جہاں تک ممکن ہو ہموار حالت میں بچھا دیا جائے۔ اس کے بعد ایک بار اور ہل چلایا جائے تاکہ مٹی کے ساتھ وہ بالکل ایک جان ہوجائے۔ اگر زمین میں کیلسیم یا چونے کا نمک موجود ہو تو شیرے کے میل سے ان کا تدارک ہوجاتا ہے۔ اس طرح مٹی کی ماہیت کے بدلنے میں چار پانچ

غزل

طاہر بریلوی

ابتدا میں انتہا کا خوف پیدا ہوگیا
رہرو راہِ محبت یہ تجھے کیا ہوگیا

میں ترے قربان جاؤں اے مری بزم خیال
اب وہ پردا کر چکے اب ان سے پردا ہوگیا

بخش دے یارب محبت کی یہ لغزش بخش دے
سامنے وہ آگئے اور ہم سے سجدہ ہوگیا

اپنی بربادی کا تو کچھ بھی نہیں مجھ کو ملال
اس کا رونا ہے کہ ان کو بھی گوارا ہوگیا

کیا کسی نے روئے روشن سے اٹھا ڈالی نقاب
دفعتاً کیوں چاندنی کا رنگ گہرا ہوگیا

اللہ اللہ یہ خدائی بھر پہ ان کی دسترس
جس طرف وہ ہوگئے سارا زمانہ ہوگیا

وہ چلیں ٹھنڈی ہوائیں وہ اٹھی اودی گھٹا
جام لا ساقی کہ فطرت کا اشارا ہوگیا

راہ سے کنج قفس کی تیلیاں ہٹ جائینگی
فطرت آزاد کا جس دن تقاضا ہوگیا

بننے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زمین گیہوں، جو اور چاول کی کاشت کیلئے موزوں ہو جاتی ہے۔ زمین کی زرخیزی کو قائم رکھنے کے لئے عام تجارتی کھادیں بھی ملائی جاسکتی ہیں۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ صوبجات متحدہ میں ایک ایکڑ زمین کو اس طریقے سے بہتر بنانے کے لئے پچاس اور سو روپے کے درمیان لاگت آسکتی ہے۔ اگر شکر کے کارخانے قریب نہ ہوں تو بنجر زمین کو کھل کی کھاد ملا کر زرخیز بنایا جاسکتا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں اس مقصد کے لئے گندھک کا سفوف استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ ہمارے جیسے غریب ملک کیلئے بہت مہنگا رہتا ہے۔"

زراعتی تجربات کی غرض سے ڈاکٹر دھار نے اپنے ذاتی خرچ پر محلات تعمیر کرائے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا تمام سرمایہ جو دو لاکھ روپے کے قریب ہے کلکتہ یونیورسٹی میں زراعتی شعبہ قائم کرانے کے سلسلے میں صرف کر دیا۔ وہ روزانہ صبح کے وقت الہ آباد کے مضافات میں گاؤں درگاؤں پیدل قدمی کرتے ہوئے پندرہ میل تک جاتے ہیں کیونکہ ان علاقوں میں ان کے تجرباتی کھیت پھیلے پڑے ہیں۔ ان کا دن صبح پانچ بجے سے شروع ہوتا ہے۔ وہ دن بھر مصروف عمل رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ قیلولہ کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ حد سے زیادہ پابند اوقات بھی ہیں چنانچہ بہت سویرے خواب گاہ میں چلے جاتے ہیں اور زیادہ دیر تک جاگتے نہیں رہتے۔ بیداری کے عالم میں ان کا کوئی لمحہ بیکار نہیں گذرتا۔

ان کے تعلیمی نظریے بہت زیادہ ترقی پسند اور اٹل ہیں۔ وہ ابتدائی جبری تعلیم کے زبردست حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ سائنسی تعلیم و تربیت کا بہت زیادہ لحاظ رکھا جایا کرے۔ جب سارجنٹ اسکیم کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ان کا خیال معلوم کرنا چاہا تو وہ ایک دم چمک کر بولے۔ "بلاشبہ سارجنٹ اسکیم بہت ہی مفید ہے لیکن ہمارے ملک کے لئے کسقدر گراں ہے۔"

وہ مخلوط تعلیم کے بھی زبردست حامی ہیں۔ وہ ہمارے ملک میں زنانہ تعلیم کے سلسلے میں بڑے ہی ترقی پسند خیالات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر دھار کی شریک حیات بھی ایک لائق خاتون ہیں۔ طبیعات میں اعلےٰ تعلیم حاصل کرکے ایم ایس سی کی ڈگری لے چکی ہیں۔ شادی ہونے سے قبل وہ دونوں استاد اور شاگرد ہونے کی حیثیت سے طبیعات کے ضمن میں اتنی عمیق دلچسپی لیتے رہے کہ آخرکار تعلیم و تعلم کا سلسلہ محبت اور ازدواج کا رنگ پکڑتا چلا گیا۔ مسز دھار ایک مثالی ہندوستانی استری ہیں تاہم کبھی کبھار وہ خوب لڑ جھگڑ کر ڈاکٹر دھار کو آمادہ کرتی ہیں کہ وہ انہیں تفریحاً سنیما ساتھ لے جائیں۔

ادارۂ اقوامِ متحدہ

پریتم سنگھ

دس جنوری سنہ ۱۹۴۶ء کا دن بھی تاریخ میں یادگار رہیگا کیونکہ اس تاریخ کو ادارۂ اقوام متحدہ کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا۔ دنیا کو محفوظ اور پرامن رکھنے کے لئے بین الاقوامی ادارہ قائم کرنے کی یہ دوسری کوشش ہے۔ ان میں پہلا ادارہ "انجمن اقوام" یا لیگ آف نیشنز تھا جو اپنے مقصد میں ناکام رہ کر ختم ہو گیا۔ ادارۂ اقوام متحدہ اس انجمن سے محض سطحی باتوں میں مشابہ ہے۔ انجمن کی طرح اس میں بھی آزاد اقوام رضاکارانہ شریک ہوئی ہیں۔ اس میں بھی ایک کونسل، ایک اسمبلی، ایک بین الاقوامی عدالت اور چند کمیشن ہیں۔ ان باتوں سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ادارۂ اقوام متحدہ، انجمن ہی کی نئی شکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ انجمن صلحنامہ ورسائی کا حصہ تھی اس لئے اس کے ساتھ سمجھوں اور تاوانوں کے بہت سے جھگڑے وابستہ تھے لیکن یہ ادارہ ان سے آزاد ہے۔ انجمن زیادہ تر یورپی قوموں سے متعلق تھی جبکہ ادارہ کے خاص ممبر امریکہ، چین، اور روس ہیں۔ ادارہ کے قیام سے ان قوتوں اور اثرات کا پتہ چلیگا جنہوں نے انسان کو صلح پسندانہ طریقوں سے اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے پر آمادہ کر کے دنیا کو آئندہ جنگ کے خطرہ سے بچانے کا تہیہ کیا ہے۔

ادارۂ اقوام متحدہ کے چھ بڑے حصے ہیں، جنرل اسمبلی، سلامتی کی کونسل، اقتصادی اور سماجی کونسل، متولی کونسل، بین الاقوامی عدالت اور سکریٹریٹ یہ چھ حصے بین الاقوامی تعاون کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں۔

اس ادارہ میں جنرل اسمبلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگرچہ اس کی نشست سال میں ایک مرتبہ ہوا کرے گی لیکن اگر ممبروں کی اکثریت چاہے تو درمیانی زمانہ میں اجلاس ہو سکتا ہے۔ ہر قوم پانچ نمائندے تک بھیج سکتی ہے۔ لیکن اسے حق ایک ہی رائے دینے کا ہوگا۔ اہم تجویزوں کی منظوری کے لئے دو تہائی قوموں کا حق میں ہونا ضروری ہے۔ معمولی باتوں کا محض اکثریت سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ جنرل اسمبلی کا کام غور، بحث اور سفارش کرنا ہے لیکن یہ سلامتی کی کونسل سے متعلق کسی معاملہ میں سفارش نہیں کر سکتی۔ اس شرط کو چھوڑ کر باقی باتوں میں اسمبلی کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔ اسمبلی اقوام متحدہ کی دوسری شاخوں کے مسائل اور اختیارات پر غور کر سکتی ہے اور ان کے ممبر منتخب کر سکتی ہے مگر اسے سلامتی کی کونسل کے متعلق ممبروں کے انتخاب کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس کا دنیا کے امن اور حفاظت کے سلسلے کے اصولی معاملات اور مختلف قوموں کے ہتھیاروں کی تخفیف سے متعلق ہے۔ اگر کوئی قوم کسی مسئلہ پر بحث کرانا چاہے تو اسے جنرل اسمبلی میں پیش کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ سلامتی کی کونسل کے زیر غور نہ ہو۔ لیکن اگر سلامتی کی کونسل کسی مسئلہ پر غور نہ کر رہی ہو تو جنرل اسمبلی اس کی توجہ اس طرف مبذول کرا سکتی ہے۔ ادارہ اقوام متحدہ کا کوئی شعبہ کسی ایسے معاملہ میں مداخلت نہیں کرے گا۔ جس کا تعلق کسی ایک ملک کے خالص خانگی جھگڑوں سے ہو۔ اسمبلی کو سماجی بھلائی کے سلسلہ میں بھی بہت کام کرنا ہے اور اپنے ماتحت ممالک کی حکومتوں کی خاص ذمہ داریاں بھی اسی پر ہیں۔ پہلا کام اقتصادی اور سماجی کونسل کا ہے اور دوسرا متولی کونسل کا۔ یہ دونوں اسمبلی کے ماتحت ہیں۔ اسمبلی میں نئے ممبر بھی شامل ہو سکتے ہیں اور اسے سلامتی کی کونسل کی مرضی سے ممبروں کو معطل اور برخاست کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔ غرض سلامتی کی کونسل کے حق میں کچھ پابندیوں کو چھوڑ کر جنرل اسمبلی اتحادی قوموں کی سب سے زیادہ با اختیار انجمن ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سلامتی کی کونسل جیسی چیز ابھی تک کبھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس کے ممبر بہت کم ہیں اس کے معنی ہیں کہ یہ جلد فیصلے کر سکے گی اور اسے بہت اختیارات حاصل ہیں یعنی یہ عمل کرنے اور فیصلوں کو منوانے کے قابل رہے۔ اس کی پہلی ذمہ داری جنگ اور ظلم کی روک تھام ہے۔ اس کے گیارہ ممبروں میں چین، فرانس، برطانیہ، امریکہ اور روس مستقل ممبر ہیں۔ ان کے علاوہ ممبروں کا انتخاب جنرل اسمبلی کرتی ہے۔ یہ انتخاب دو دو برس بعد ہوتا رہیگا۔ سلامتی کی کونسل مستقل طور پر کام میں رہتی ہے۔ جب کبھی یہ طے ہو جائیگا کہ امن کو خطرہ ہے یا کوئی ظلم ہوا ہے تو اسے کارروائی کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اس طرح کونسل فوراً عمل کرنے پر قادر ہے۔

یہ کونسل ہمیشہ جھگڑوں کے کھوج میں رہتی ہے اس لئے کونسل کے ممبروں یا ان کے نمائندوں کا ادارۂ اقوام متحدہ کے صدر مقام میں رہنا ضروری ہے۔ جب کسی دو قوموں کا جھگڑا کونسل کے سامنے پیش ہوگا تو یہ اپنے فیصلہ سے فریقین کو آگاہ اور اسے ماننے کی سفارش کریگی۔ اس طرح جھگڑا ختم ہو جائیگا اور اگر کوئی فریق مطمئن نہ ہو اور کوئی دوسری صورت نظر نہ آتی ہو تو یہ عارضی سمجھوتہ کے لئے سفارش کریگی جس سے کم سے کم جنگ کا خطرہ ہو جائیگا۔ اگر اس میں بھی کامیابی حاصل نہ ہو تو کونسل یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ جس قوم کی زیادتی نظر آئے یا جس کی وجہ سے امن کو خطرہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، ساری اقوام متحدہ سے سفارش کی جائے کہ اس سے تجارتی اور خشکی، بحری اور فضائی حمل و نقل ڈاک اور سیاسی تعلقات منقطع کر لیں۔ اگر اس بائیکاٹ سے بھی کام نہ چلا تو ہوا، سمندر اور خشکی کے راستوں سے حملہ کرنا پڑیگا۔ اس کا مطلب ہے کہ کونسل کو اپنے فیصلے منوانے اور صلح قائم رکھنے کے لئے تینوں طرح کی فوجیں رکھنی ہوں گی۔ ان کی وجہ سے یہ کونسل اس قدر اہم اور طاقتور جانی ہے کہ اقوام متحدہ کا ہائی کمان ان کاموں میں کونسل کی مدد کریگا۔ اس میں پانچ مستقل ممبروں، چین، برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس کے فوجی

افسر اس میں شامل ہونگے۔ ہائی کمان اقوام متحدہ کی فوجوں کی رہنمائی کریگا اور کونسل کے معاہدہ پر دستخط کریگا۔ یہ ہائی کمان یا بڑے فوجی افسروں کی کمیٹی ہمیشہ اپنی ٹیمیں تیار رکھتی ہے تاکہ تیزی کے ساتھ مناسب کارروائی کی جاسکے۔ غرض حق بجانب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ سلامتی کی کونسل ظالموں کو سزا دینے اور سچائی منوانے کے لئے قوت کا استعمال بھی کرے گی۔ تمام فیصلوں سے کم سے کم سات ممبروں کا متفق ہونا ضروری ہے۔ جن میں پانچوں مستقل ممبروں کا ہونا چاہئے، کیونکہ امن اس وقت قائم رہ سکتا ہے جب سب سے زیادہ طاقتور قومیں ہم خیال ہو کر عمل کریں۔

اقتصادی اور سماجی کونسل کا کام دنیا کی قوموں کی سماجی بھلائی کا خیال رکھنا ہے۔ جبتک عورتیں اور مرد اپنے ماحول سے مطمئن نہ ہوں اور جائز حقوق حاصل نہ کرلیں دنیا میں زیادہ زمانہ تک امن قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے ادارۂ اقوام متحدہ نے اپنا ایک ایسا شعبہ بھی قائم کیا ہے جس کا خاص کام استقلال اور خوشحالی کے حالات پیدا کرنا اور دنیا کو بہتر بنانا ہے۔ اقتصادی اور سماجی کونسل میں اٹھارہ ممبر ہوتے ہیں جنہیں جنرل اسمبلی تین برس کے لئے منتخب کرتی ہے۔ اس کونسل کے عام طور ہر سال میں تین اجلاس ہوا کریں گے۔

تمام اقوام متحدہ نے عہد کیا ہے کہ ہم معیار حیات بلند کرنے، سب کیلئے کام فراہم کرنے، مزدوروں کی حالت بہتر بنانے اور محکمہ حفظان صحت کو ترقی دینے کی کوشش کرینگے۔ اقتصادی اور سماجی کونسل کو ان باتوں پر عمل کرنے کے بہترین طریقے سوچنے پڑینگے۔ اس کام کے لئے وہ ہر قوم کے بہت سے کمیشن اور ماہرین مقرر کرسکتی ہے جو حمل ونقل، کام، اور پرورش بچگان وغیرہ پر غور کرکے کونسل کو رپورٹ پیش کریں گے۔ اس پر کونسل جنرل اسمبلی اور مختلف حکومتوں کو سفارش کرسکتی ہے۔ یہ کونسل متحدہ اقوام کے قومی اداروں، ٹریڈ یونینوں اور سوسائٹیوں اور مالکان کارخانہ جات سے بھی تبادلہ خیالات کرے گی۔ یہ واقعہ کہ سر راما سوامی مدالیر اس کونسل کے منتخب ہوئے ہیں انسان کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں ہندوستانیوں کی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔

امریکی صدر ابراہیم لنکن نے کہا تھا کہ انسان زیادہ زمانہ تک نیم غلامی کی حالت میں نہیں رہ سکتا۔ اگر سب کو غلامی سے بچنا ہے تو سب کو آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ اب تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک بین الاقوامی ادارہ زیر فرمان ملکوں کی حکومت کے اصول پر متفق ہوا ہے۔ ان ملکوں سے متعلق اقوام متحدہ نے یہاں کی آبادی پر اور سب باتوں سے زیادہ توجہ دینے اور ان کے مفاد کا خیال رکھنے کا تصفیہ کرلیا ہے۔ ان کی سیاسی اور تعلیمی ترقی اور سماجی اور اقتصادی زندگی میں مدد دینے اور یہاں خود اختیاری حکومتیں قائم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ جن ملکوں میں خود اختیاری حکومتیں نہیں ہیں وہ بین الاقوامی متولی کونسل کے ماتحت ہوں گے۔ ان میں تین قسموں کے ملک شامل ہوں گے۔

(۱) وہ ملک جن کا انتظام انجمن اقوام کے ہاتھوں میں تھا۔

(۲) کوئی بھی منظم حکومت اپنے ماتحت علاقوں کو اس کونسل کے زیر انتظام لا سکتی ہے۔

(۳) دشمن سے چھینے ہوئے علاقے بھی اس کے ماتحت آسکتے ہیں۔ متولی کونسل متعلقین سے سالانہ رپورٹ لیتی رہے گی۔ اور حالات دیکھنے کے لئے اپنے نمائندے بھیج سکتی ہے۔ ساتھ ہی یہ ماتحت ممالک کی عرضیوں اور شکایتوں پر بھی غور کرے گی۔

اب ادارۂ اقوام متحدہ نے کام میں پوری دلچسپی لینی شروع کردی ہے۔ اس کی کامیابی اور عمدہ کام پر دنیا کا مستقبل منحصر ہے۔ ایٹم کے اس دور زمانہ میں جنگ کے معنی سارے انسانوں کی تباہی ہیں۔ لڑائی بہت مہنگی پڑیگی۔ ان حالات میں چارہ کار صرف یہ ہے کہ ایک طاقتور ادارہ قائم کیا جائے جو ہر حالت میں امن قائم رکھ سکے۔ اس لئے ادارہ اقوام متحدہ معمولی سے معمولی شخص سے بھی اپیل کرتا ہے۔ مسٹر اٹیلی نے فرمایا ہے کہ "ادارہ اقوام متحدہ" کا تعلق محض حکومتوں، سیاسیات اور جنگ ہی سے نہیں ہے بلکہ ہر نسل اور قوم کے انسانوں کی بنیادی ضرورتوں سے ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کے معدنی ذرائع

"دی انڈین انڈیا" سے ماخوذ

بہت سی ہندوستانی ریاستوں میں خوش قسمتی سے سونے سے لے کر معمولی مٹی تک ذیل قسم کی قیمتی معدنیات کی بڑی بہتات ہے۔ تمام چھوٹی بڑی ریاستوں نے سائنسی طریقوں پر ان معدنیات سے فائدہ اٹھا کر اپنی مقامی صنعتوں کو بڑی ترقی دی ہے۔ ریاستوں کے شعبہ جات معدنیات نے اس دبی ہوئی دولت کا پتہ باقاعدہ ارضیاتی، معدنیاتی اور کیمیاوی کوششوں کے بعد لگایا ہے۔

کسی ملک کے معدنیاتی ذرائع سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کانوں وغیرہ کے کھودنے کے معقول قواعد بنائے جائیں۔ اکثر ریاستوں میں ایسا ہی کیا گیا ہے۔ کان کھودنے والی بہت سی کمپنیوں کو بہت سی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ گونڈل نے ایک سات میل لمبی ریلوے لائن کھولی ہے جس نے جال، شمبھالیا اور چھینی جھوڑا کی پتھر کی کانوں کو نکلی ہوتی کی مین لائن سے ملا دیا ہے۔ اندور کی "بورواہا آئرن ملز" کو ایک خاص چھوٹی لائن کے ذریعہ بروانا جنکشن سے ملا دیا گیا ہے۔ حیدر آباد میں ریلوے لائنیں سنگرینی، تندور اور ساستی کی کوئلوں کی کانوں تک بنی ہوئی ہیں۔ میسور کی "کولر گولڈ فیلڈس" میں میسور اسٹیٹ ریلوے موجود ہے۔ بہت سی ریاستیں مثلاً اندور کانوں میں کام کرنے والوں کو ایندھن اور پانی بہت سستے داموں میں مہیا کرتی ہیں اور کان کھودنے والی اور صنعتی کمپنیوں کو زمینیں بہت نرم شرائط پر دیتی ہیں۔

ہندوستانی ریاستوں میں کان کھودنے کی صنعت کا مستقبل بہت مستحکم نظر آتا ہے۔ جن معدنیات کا نکاس جنگی حالات میں بہت بڑھ گیا ہے ان میں خاص یہ ہیں: کوئلہ، کچا لوہا، منگنیز اور میکا۔

کوئلہ

آج حیدر آباد میں کوئلہ تریسٹھ لاکھ ٹن، کوریا میں گیارہ لاکھ بیس ہزار ایک سو بیس ٹن، ریوا میں تین لاکھ کتالیس ہزار آٹھ سو اکہتر ٹن، بیکانیر میں سینتالیس ہزار ٹن، اور رائے گڈھ میں تین ہزار نو سو ٹن سالانہ نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ اور جن ریاستوں میں کوئلہ پایا جاتا ہے یہ ہیں: بھوپال، سرگوجہ، کوچین اور کشمیر۔ کوریا میں پانچ بڑی کوئلہ کی کانیں ہیں۔ چرمیری، کھرسیہ، نئی چرمیری، جھگڑا کھنڈ اور نیا جھگڑا کھنڈ۔ دو اور نئی کانیں بھی دریافت ہوئی ہیں ابھی ان تک ریلوے لائنیں نہیں کھلی ہیں۔ اس کے بعد بڑے پیمانہ پر ان کی کھدائی ہو سکے گی۔ حیدر آباد کا کوئلہ بہتر کا ہے جو ریلوں اور کارخانوں میں کام آتا ہے۔ ریاست کی صنعتی ترقی کی خاطر نظام حیدر آباد نے حیدر آباد دکن کمپنی سے "سنگارینی کمپنی لمیٹڈ" کے بیاسی فیصدی حصے خود خرید لئے ہیں۔

منگنیز

ہندوستانی معدنیات میں کوئلہ کے بعد سب سے اہم چیز منگنیز ہے۔ ہندوستان میں اس کی پیداوار تمام دنیا کی پیداوار کا ½ ہے۔ برطانوی ہندوستان اور دیسی ریاستوں میں سنہ ۱۹۳۵ء میں اس کی پیداوار کی مقدار نو لاکھ اڑسٹھ ہزار ٹن تھی۔ اس میں سے دو لاکھ دو ہزار ٹن دیسی ریاستوں سے نکلا ہوا تھا۔ گذشتہ چند سالوں میں اس صنعت میں بڑی ترقی ہوئی ہے اور اب اس کی پیداوار کی مقدار تقریباً بیس لاکھ ٹن ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان سے منگنیز کی برآمد بہت بڑی مقدار میں ہوا کرتی تھی لیکن چونکہ دوران جنگ میں اس کی ضرورت خود ہندوستان میں بہت زیادہ رہی اس لئے لڑائی کے زمانہ میں منگنیز زیادہ تر یہیں کے کارخانوں میں کھپتا رہا۔ دھار، بودہ، بونائی، گنگ پور، کالا ہانڈی، کیونجھر، پٹنہ، میوربھنج، تلچر، سندور اور ایدر نامی ریاستوں میں بھی منگنیز کی کانیں دریافت ہوئی ہیں۔ کیونجھر میں منگنیز کی کل پیداوار تینتیس ہزار پانچ سو اٹھسٹھ ٹن ہے، بونائی میں اٹھائیس ہزار چھیانوے ٹن، سندور میں دس ہزار ٹن اور بانگیر میں بارہ سو ٹن۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کیونجھر، بونائی اور بانگیر کی ماہوار پیداوار دس دس لاکھ ٹن، اور تین لاکھ ٹن تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ منگنیز کی کانوں کی کھدائی کا کام میسور میں سنہ ۱۹۰۵ء میں شروع ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں یہاں پانچ ہزار پانچ سو اڑتالیس ٹن منگنیز نکلا۔ منگنیز کی برآمد سب سے زیادہ سنہ ۱۹۰۷ء میں ہوئی اور اس کی مقدار اکہتر ہزار سات سو پچپن ٹن تھی۔ اندور میں منگنیز کی کانیں علاقہ برواہا میں دریافت ہوئی ہیں۔ حیدر آباد میں بیدر اور نظام آباد کے ضلع میں اور ریاست ٹراونکور کے بعض حصوں میں اس کی بڑی بہتات ہے۔

لوہا

ہندوستانی ریاستوں میں جہاں لوہا بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے کیونجھر، میوربھنج، سندور، بھوپال، نیل گری، بونائی، رائے گڈھ، دھار، بستر، بودہ، کوردہا، تلچر، سرگوجا، منڈی، پٹیالہ، الور، جھالاوار اور نوانگر ہیں۔ کیونجھر میں اس وقت چار لاکھ بہتر ہزار نو سو نوے ٹن لوہا نکلتا ہے، نیل گری میں دس ہزار ٹن، میوربھنج میں چالیس ہزار ٹن، سندور میں پندرہ ہزار ٹن، اور رائے گڈھ میں گیارہ سو ٹن۔ ریاست میوربھنج کی تینوں کانوں (گروماہسانی، سلیپت اور بادام پہاڑ) میں کھدائی کا کام ٹاٹا آئرن اور اسٹیل کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔ بستیا اور نوانگر میں لوہے کی بڑی بہتات ہے لیکن ذرائع حمل و نقل نہ ہونے کی وجہ سے کھدائی بڑے پیمانہ پر نہیں ہو سکی ہے۔ اندور میں برواہا کا لوہا بہت بڑھیا ہوتا ہے۔ اس میں کسی حالت میں بھی سلفر اور فاسفورس نہیں ہوتا۔

۱۹۳۹ء میں میسور میں چھیالیس ہزار تین سو بہتر ٹن لوہا نکلا۔ حیدرآباد میں لوہے کی کانیں زیادہ تر عادل آباد اور نظام آباد میں ہیں۔

سونا

ہندوستانی سونے کا ۹۹ فیصدی میسور میں پایا جاتا ہے۔ میسور کا نمبر سونے کی پیداوار میں دنیا میں ساتواں ہے۔ سونے کی کھدائی میسور میں ۱۸۸۲ء سے شروع ہوئی ہے۔ اس وقت سے ۱۹۲۶ء تک یہاں سے کل سونا ڈیڑھ کروڑ آؤنس نکل چکا ہے۔ اس کی قیمت چھ کروڑ ستر لاکھ پونڈ سے زائد ہوتی ہے۔ سونے کی خاص کانیں میسور کے مشرق میں "کولر گولڈ فیلڈس" میں ہیں۔ یہ جگہ بنگلور سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

ایلومینیم

ہندوستان میں کام آنے والے برتنوں وغیرہ کے لئے ایلومینیم بہت عرصہ تک باہر کے ملکوں سے آتا رہا۔ لیکن اب اس کی کانیں بھوپال، یونائی، نندگاؤں، سرگوجا، کولھاپور اور گوالیار میں بھی دریافت ہوگئی ہیں۔ اگر یہاں کھدائی بڑے پیمانہ پر ہوگئی تو ایلومینیم کے برتن بنانے کی صنعت ہندوستان میں کافی ترقی کر جائے گی۔ گوالیار کا ایلومینیم بہت اچھا ہوتا ہے اور یہ گونا، شیوپوری اور بھلاسا میں پایا جاتا ہے۔

کروم

منگنیز کی طرح کروم بھی صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہندوستان کے تمام کروم کا نصف حصہ میسور میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر حسن، میسور اور شموگا کے اضلاع کے اردگرد پایا جاتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں میسور سے تیس ہزار سات سو آٹھ ٹن کروم نکلا۔ ایسی ریاستیں جہاں کروم پایا جاتا ہے یہ ہیں:۔ سیرئیکیلا، کیونجھر، اور ساونت واڑی سیرئیکیلا ایک ہزار ٹن کروم سالانہ نکلتا ہے۔

میکا

تجے پور، ٹونک، کوردھا، حیدرآباد، کشن گڈھ، میواڑ اور تلچر سے میکا کی برآمد بڑی مقدار میں ہوسکتی ہے۔ اور دوسری ریاستیں جہاں میکا پایا جاتا ہے یہ ہیں:۔ ٹراونکور، بھوپال، یونائی، بودھ، ریوا، پٹنہ، سیرئیکیلا، پٹیالہ، الور، کالاہانڈی، سرگوجا اور میور بھنج۔

مناسب ذرائع حمل و نقل کی کمی اور دوسری ٹیکنیکل دشواریوں کی وجہ سے ہندوستان میں میکا کی برآمد زیادہ بڑے پیمانہ پر نہیں ہوسکی ہے۔ ٹونک سے اس وقت دو ہزار تین سو اکتالیس ٹن اور تجے پور سے چوہتر ٹن میکا برآمد ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں یہ وارنگل اور نظام آباد میں پایا جاتا ہے۔ میواڑ کا میکا بھیل واڑہ، سہاڑن، بگزپور اور منشی میں پایا جاتا ہے۔ کشن گڈھ میں میکا شیشے کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ کشن گڈھ میں "دوصیا میکا مائنس" بہت بڑی ہیں اور یہاں یہ کام بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔

مونازائٹ

ٹراونکور کی مٹی "مونازائٹ" میں چونکہ تھوریم پایا جاتا ہے، اس لئے یہ بھی ایک نفع کی چیز ہے۔ تھوریم ایک بڑقیاتی چیز ہے اور ماہرین کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت یورینیم سے دوسرے ہی نمبر پر ہے اس مٹی کے ساتھ ساتھ المی نائٹ اور زرکسن بھی پائے جاتے ہیں۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ مونازائٹ کی صنعت کے سلسلے میں ہی المی نائٹ حاصل ہوجاتا ہے لیکن ۱۹۰۳ء سے اس کی پیداوار برابر بڑھتی جارہی ہے حتیٰ کہ یہ مونازائٹ اور زرکن سے بھی زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں اس کی پیداوار ڈھائی لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہوئی۔ لڑائی کے زمانہ میں اس کی بڑی مانگ رہی کیونکہ جنگی جہازوں اور دوسرے جنگی آلات پر پالش کرنے کے واسطے اس کی بڑی ضرورت تھی۔

تانبا

ان معدنیات کے علاوہ دوسری چیزیں جو ہندوستانی ریاستوں میں پائی جاتی ہیں یہ ہیں:۔ تانبا، سیسہ، ٹین، جست، ولفرام، اسبستوس، کاولین، لال اور زرد مٹی۔ اور نیل کا سرمہ۔

تانبا بہت زیادہ مقدار میں اندور، سکم، بیکانیر، کھرسوان، پٹیالہ، یونائی، میور بھنج، سرئیکیلا، گوالیار، الور، جھلاور اور کشن گڈھ میں پایا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں تانبے کی ایک کان نصف میل لمبی اور چار پانچ فٹ موٹی اندور میں قصبہ تخنام میں نکلی ہے۔ تانبا بہت بڑی مقدار میں سکم میں بھی موجود ہے لیکن چونکہ اس کی کانوں تک بہ آسانی پہنچ نہیں ہوسکتی اس لئے اس کی کھدائی نہیں ہوسکی ہے۔ پٹیالہ میں بھی یہ دھات کافی مقدار میں موجود ہے۔ ریاست کھرسوان میں تانبا لپسو ہل اور اکرشانی ہل کے شمال مغرب میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں تانبے کی مانگ ہمیشہ سے بہت زیادہ رہی ہے اور ہندوستانی کانوں سے اتنی مقدار میں یہ برآمد نہیں ہوسکا ہے جتنی یہاں کھپت ہوسکتی ہے۔

ہیرے

ہندوستانی ریاستوں میں جو قیمتی پتھر پائے جاتے ہیں ان میں ہیرے، جواہرات، نیلم، عقیق وغیرہ خاص ہیں۔ ہندوستان کے مشہور پتھروں میں سے اکثر دریائے کرشنا (حیدرآباد) کے شمالی ساحل سے نکلے ہوئے ہیں۔ وسط ہند کی ریاست پنا میں سے بھی مشہور عالم پتھر نکلے ہیں۔ سر سی۔ وی۔ رامن نے ہیروں پر ریسرچ کی ہے اور وہ اس کے لئے تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ کچھ جواہرات کشمیر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ذرا کم قیمت پتھر کشمیر میں دستیاب ہوتے ہیں۔

عمارت کا مسالہ

معدنیات میں تعمیری مسالے بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں دھول پور اور پروبندر کے پتھر اور مکرانا (جودھپور) کا سنگ مرمر تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ وائسرائے ہاؤس، امپیریل سکریٹریٹ، کونسل ہاؤس اور نئی دہلی کی اکثر سرکاری عمارتیں دھول پور ہی کے سرخ پتھر کی ہیں۔ ہندوستان کے پتھروں میں پوربندر کا پتھر بہت اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ بمبئی کی اکثر بڑی عمارتیں اسی کی بنی ہوئی ہیں۔ آگرہ کا تاج محل مکرانا کے سنگ مرمر کا ہے۔

غزل

تم کو بنا ما من ادھیکاری — میں نے جیتی بازی ہاری
ڈول گیا دل دیکھ کے مورت — بھولی بھالی سُندر پیاری
پریم نواسی کی دنیا ہے — کتنی سُندر، کتنی پیاری
پریم کی بازی میں نے اکثر — ہار کے جیتی، جیت کے ہاری
سرِ غزاں بھی منڈلاتی ہے — پھول رہی ہے کیا پھلواری
دینا لینا قسمت کا ہے — باقی سب ہے دُنیا داری
عشق میں گھاٹا ہی گھاٹا ہو — پھر بھی دنیا ہے بیوپاری
اُن کو نفرت، مجھکو اُلفت — مشکل آن پڑی ہے بھاری
جب وہ کرم پہ مائل ہوگا — آساں ہوگی ہر دشواری
جانِ بہار آ پہنچا شاید — کیفِ جنوں ہے باغ پہ طاری
دروازے سے ہی لوٹ آیا — اُف رے احساسِ خودداری
اُمڈا ہوا ہے دل میں سمندر — اشکوں کا پانی ہے کھاری
میخانہ بردوش گھٹا ہے — مستی کی ندی ہے جاری
دونوں بیگانہ ہیں خرد سے — حُسن کی دیوی، پریم پجاری

جس کو ضیا دیکھو ہے شاعر
بڑھتی جاتی ہے بیکاری

ضیا فتح آبادی

غزل

آلم مظفرنگری

نہ تو نالہ کرکے شعلہ بن نہ تو بار آہ و فغاں اُٹھا
فقط اپنی آگ سے کام لے یونہی لطفِ سوزِ نہاں اُٹھا

یہ کھلا کہ بحرِ حیات میں ہتی دے لہجے ہو سدا مجھے
جو تلاطموں کے ہجوم میں کبھی شورِ موجِ رواں اُٹھا

کہاں سوزِ غم کا مقام ہے مجھے بیخودی میں خبر نہیں
یہ کہاں سے شعلے بھڑک اُٹھے یہ کہاں سے دلمیں دھواں اُٹھا

یہ حریمِ ناز ہے بےخبر یہاں ذکر و فکر کو ترک کر
بگہِ شعور سے کام لے یہ قیودِ عرض و بیاں اُٹھا

کیا عذر سب نے ازل میں جب تو یہ مجھ سے دل نے مرے کہا
تو امانتِ غمِ عشق کا سرِ بزم بارِ گراں اُٹھا

ہوئے سجدہ ہائے یقینی مگر حرم اور دیر میں رائیگاں
کوئی پردہ چہرے سے یار کے نہ یہاں اُٹھا نہ وہاں اُٹھا

تجھے صاف آئیگا یہ نظر ہے وہ ذرے ذرے میں جلوہ گر
ذرا چشمِ دل کی نگاہ سے یہ حجابِ وہم و گماں اُٹھا

تپ و تاب شمع سے سیکھ لے یہ طریق مرگ و حیات کے
جلی بزمِ شوق میں تا سحر جو بجھی تو سر سے دھواں اُٹھا

وہ ہو شمع یا کہ پتنگ ہو وہ ہو دل کہ طورِ کلیم ہو
تری بزمِ ناز سے فتنہ گر جو اُٹھا وہ شعلہ بجاں اُٹھا

مرے آشیاں کی تباہیوں کا یہی ثبوت ہے ہم نفس
یہ دھواں سا اک جو ابھی ابھی سرِ شاخ لالہ ستاں اُٹھا

سحرِ وصال ضرور آلم ابھی ہوگی شام سے جلوہ گر
ہے قریب آمدِ فصلِ گل ابھی اور جورِ خزاں اُٹھا

برہن کا گیت

تم بن چاروں اور اندھیرا — دیکھ برہن دُکھ نے آگھیرا
میل پیا کب ہوگا تیرا — کس جا پہ ہے تیرا ڈیرا
ڈھونڈوں پر نہ ڈھونڈا جائے
پریم کی ناگن ڈستی جائے

آشائیں آ۔ آ گھبرائیں — ہردے میں طوفان اُٹھائیں
پل پل انکھیاں نیر بہائیں — نیر بہائیں جلتی جائیں
مُنہ سے نکلے ہائے ہائے
پریم کی ناگن ڈستی جائے

پھول کھلے اور بادل چھائے — پریتم سب کے گھر کو لوٹے
سب سکھیوں نے جھولے جھولے — پریت ملن کے گانے گائے
مجھ سے یہ نہ دیکھا جائے
پریم کی ناگن ڈستی جائے

دن تو پریتم جوں توں کر کے — کٹ ہی جاتا ہے مر مر کے
پر یہ کالی رات ڈراؤنی — ہول اُٹھیں اور منوا دھڑکے
نین سے نندیا گھبرائے
پریم کی ناگن ڈستی جائے

جاوید قمر

نئی دنیا کے معمار

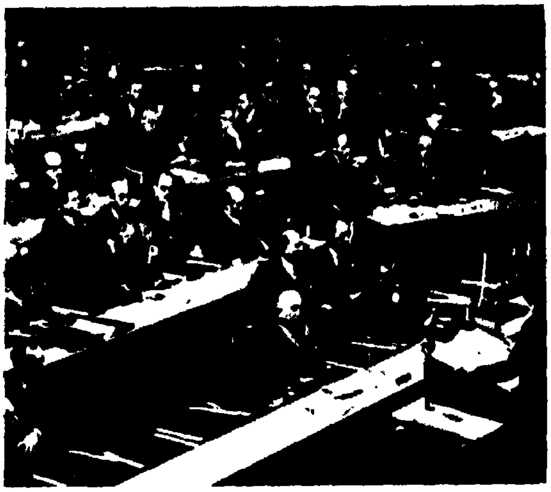


برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی تقریر کررہے ہیں۔

۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء تاریخ عالم کی ایک بڑی اہم تاریخ ہے۔ یہی ہے وہ دن جب "ادارۂ اقوام متحدہ" نے جنم لیا۔ یہ ادارہ اس لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ یہ دنیا میں ہمیشہ امن و امان قائم رکھے اور آئندہ جنگ کے تمام امکانات جاتے رہیں۔ آج کل اسکا اجلاس لندن میں ہو رہا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس [illegible]



ہندوستان کے نمائندے



کانفرنس کا ایک عام نظارہ۔ ہر ملک کا نمائندہ اپنی دی
جگہ پر بیٹھا ہے۔



عربستان کے نمائندہ امیر فیصل جنہوں نے اپنے [illegible]

زخموں کے ٹانکے

وں کی سلائی کرنے میں ایک خاص قسم کا بہت
ور مہین ریشم کا ڈورا استعمال کیا جاتا ہے. لڑائی
ہ میں زخمی سپاہیوں کے واسطے اس قسم کے ڈورے
ضرورت رہی. اس سے پہلے برطانیہ میں اس قسم کا
پین سے آتا تھا. لیکن چونکہ لڑائی کی وجہ سے
ے اس چیز کی درآمد مشتبہ ہوگئی اس لئے برطانیہ
ل پیدا ہوا کہ مصر کے محکمہ زراعت میں جو اس
یں ریسرچ کا کام ہو رہا ہے اس کو اور ترقی دی
چنانچہ تھوڑی ہی سی توجہ سے اس محکمہ کے
ہ کے زیر نگرانی جہاں ریشم کے کیڑوں پر ریسرچ کا
تا تھا بہت عمدہ ریشم تیار ہونے لگا. دوران جنگ
ر نے برطانیہ کو پچیس لاکھ مشرق وسطے کی
ی فوج کو دس لاکھ اور خود اپنے ملک کے
ں کو بیس لاکھ اچھیاں فراہم کیں. یہ صنعت
ید اور نفع بخش ہے





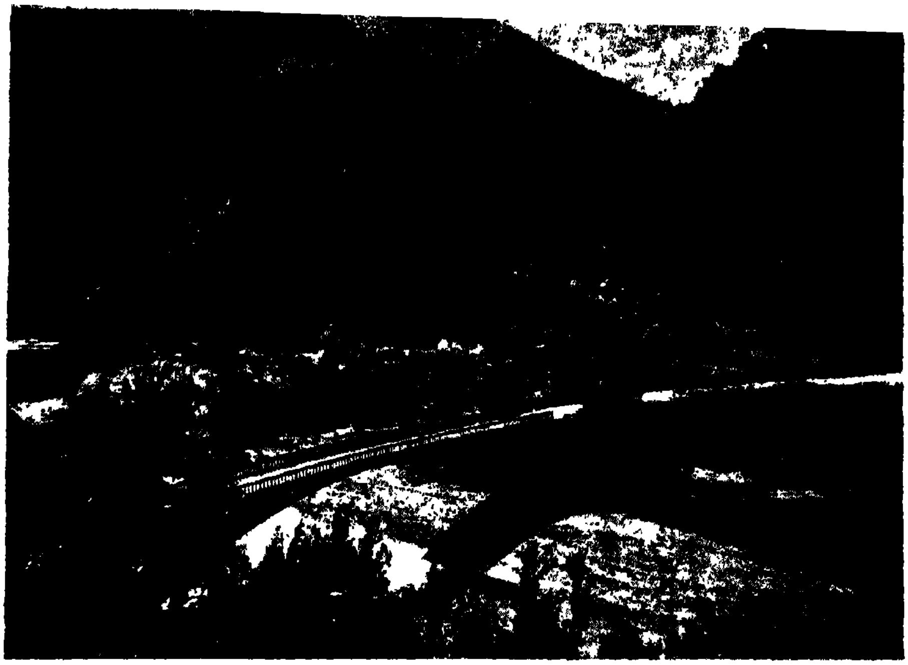
مصر کے محکمہ زراعت میں کچے ریشم کی کچھیاں آئی ہیں.
ڈاکٹر ان کا معائنہ کرکے انکو الگ الگ کرتا جا رہا ہے



پہلے ڈوروں کو سفید کیا جاتا ہے پھر ایک ہی لمبائی کے
ڈوروں کو ایک لچھی میں باندہ کر سیدھا کیا جاتا ہے. اسلئے
لئے لچھیوں میں بوجھ باندہ دئے جاتے ہیں.

ریشم کے ڈورے اب تیار ہیں. آنکھوں کے آپریشن میں خاص

ترکی کا پہاڑی علاقہ



زونگلداک کا یہ پل اور عمدہ سڑک اسے پہاڑی علاقہ میں بڑی تعجب خیز نظر آتی ہے

اشیائے کوچک ایک حدب ہے جو توزگل جھیل کی طرف ڈھلوان ہے۔ اسکے مغرب میں بہت سی کھوئیں ہیں۔ جنوب میں کوھستان طارس ہے جسمیں بہت سی گھاٹیاں ہیں اور جسکا سلسلہ بحیرہ روم کے ساحل تک پھیلا ہوا ہے۔ ترکی کی مشرق میں کچھ پہاڑ آتش فشاں ہیں جہاں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں کوھستان طارس کے قدرتی ، بہت خوبصورت ہیں۔ ترکی کی آب و ہوا میں یہ تاثیر کہ یہاں کے باشندے بہت طاقتور اور سڈول جسم ہوتے ہیں۔ یہاں کی بھیڑوں کے اون بہت ہوتا ہے بہت سے کاموں میں آتا ہے کاشتکاری زیادہ نہیں ہو سکی

کوھستان طارس میں درۂ بوزنتی۔ اسی جگہ کے پاس ایک مقام پر صدر جمہوریہ ترکی اور برطانوی وزیراعظم کی ۴۳ میں ملاقات ہوئی تھی۔





یہ عورتیں صبح کو سوداخریدنے نکلی تھیں تب ہی یہ لائبریری میں بھی چلی آئی ہیں اور اب اپنی اپنی پسند کی کتابیں مانگ رہی ہیں۔ آسانی کے خیال سے ممبروں کے نام حرف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیدئے گئے ہیں۔

مشرقی لندن کا ایک کتبخانہ

چرچ لین (مشرقی لندن) میں ایک میونسپل کتبخانہ ہے جو 'برو کونسل' کے قائم کردہ چار کتبخانوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب گھر انگلستان کے بہترین کتبخانوں میں سے ہے۔ یہاں کے باشندوں میں یہ کتبخانہ بہت مقبول ہے جسکا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ یہاں ہرروز تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابوں کی ادل بدل ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہر پبلک لائبریری کا قاعدہ ہے اس کتاب گھر سے بھی ہر وہ شخص کتابیں لے سکتا ہے جسکی عمر اکیس سال سے اوپر ہے اور جسکا نام اس 'برو' کے رائے دہندوں کی فہرست میں موجود ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبا بھی اس کے ممبر بن سکتے ہیں بشرطیکہ انکے ہیڈماسٹر یا پرنسپل ضمانت کرلیں۔

ہر ممبر کو دو ٹکٹ دئے جاتے ہیں۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک وقت میں جیسی چاہے دو کتابیں لے سکتا ہے۔



یہ ننی سی لڑکی ابھی کاونٹر تک ہاتھ بھی مشکل سے ... کتابوں کا شوق اسکو یہاں



لائبریری کے ہال میں مرد اور عورت یہاں لٹکی
ہوئی ایک تصویر کو بدل رہے ہیں۔ ہال کے بیچ
میں چند بالکل نئی کتابیں رکھی ہیں۔



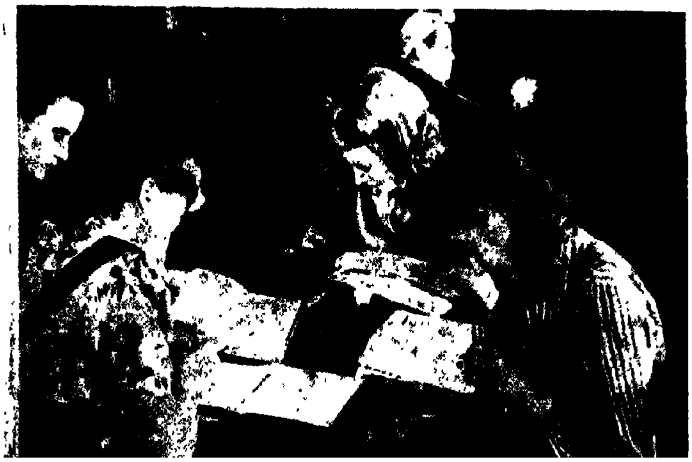
اخباروں کے کمرے میں یہ پنشنر ڈاکیہ لیبر پارٹی کا
اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" پڑھ رہا ہے (بائیں طرف)
بچوں کے اس گوشہ میں اسکول کے بچے عام طور پر

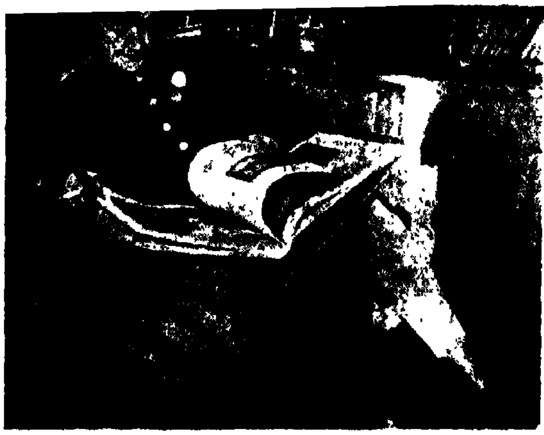


لائبریری کے ممبر۔ یہ شخص کسی اسکول میں استاد ہے۔ اپنے راستے
کتابوں کا انتخاب کر رہا ہے۔ اسکے پاس ہی اسکول کا ایک طالب
بیٹھا ہے۔ عورت الماری میں سے کوئی کتاب نکالنا چاہ رہی ہے



ہر ممبر کا نام کا ایک کارڈ رکھا جاتا ہے۔ کارڈوں کی اتنی بڑی تہ
دیکھکر صاف پتہ لگتا ہے کہ لائبریری کے ملازمین بڑے مصروف رہنے ہو

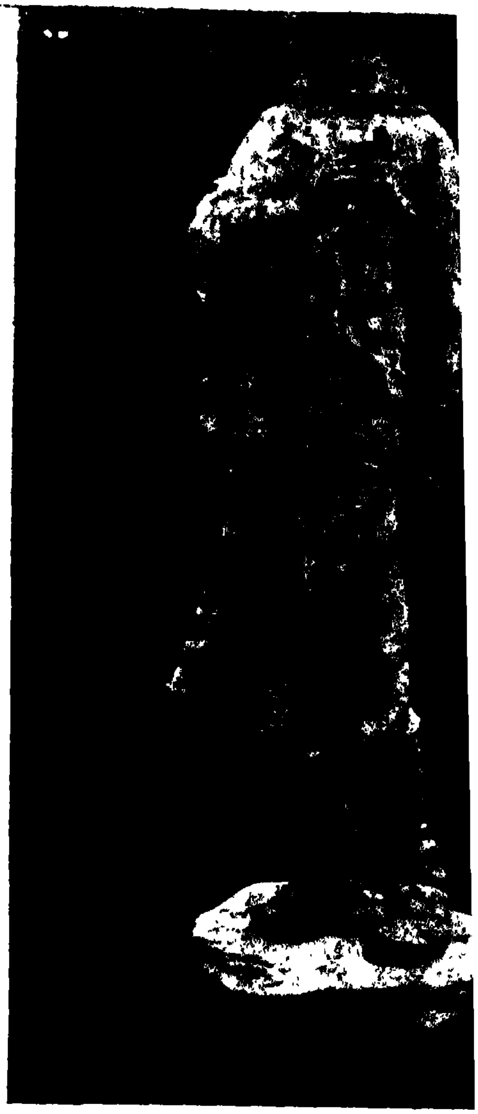




سوفیہ وشنیفسکایا



اولگا یانو فسکایا

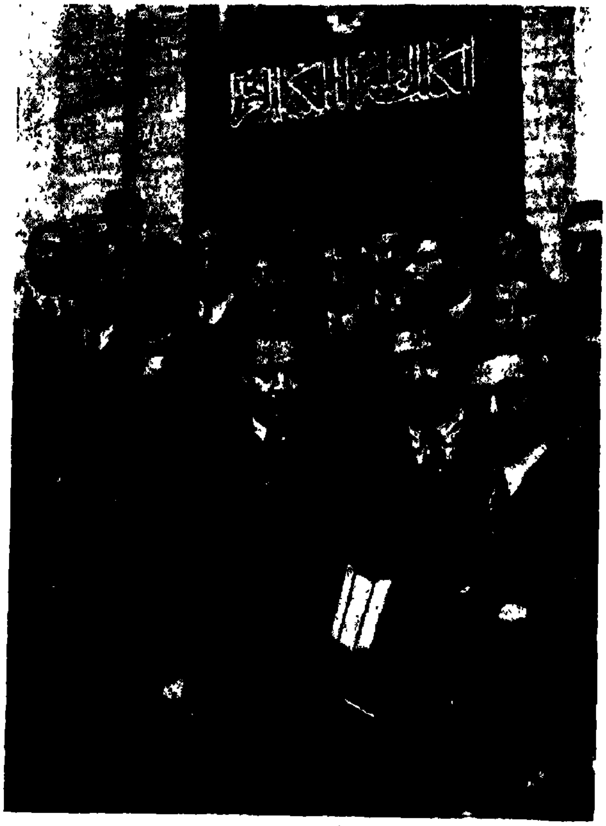


ی جسکو کوئی مغلوب نہیں کر سکتا۔
تھرین بیلا شوف کا بنایا ہوا مجسمہ



اسلم ضیا خاندان کی دو لڑکیاں۔ یہ دونوں بہنیں ہیں



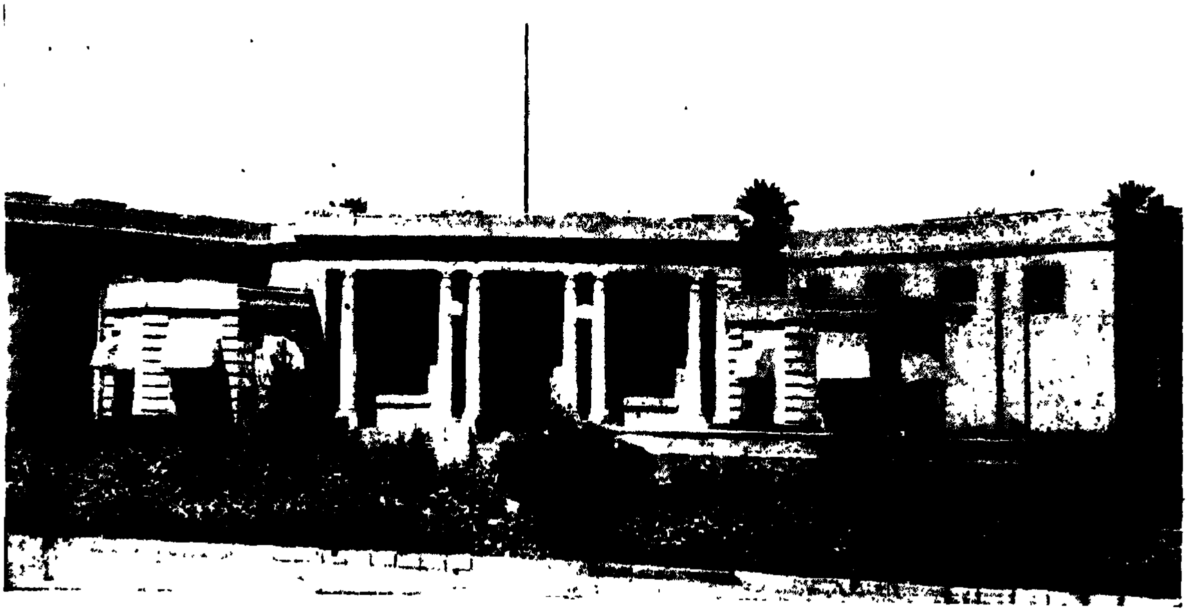


بغداد کے شاہی طبیہ کالج کے چند طلبا اور ہندوستانی سیاح

عراق میں طبی تعلیم

عراق اب ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ طبی دنیا میں اس نے خاص طور پر بڑی ترقی کی ہے یہاں اب بہت سے شفاخانے قائم ہو چکے ہیں جنمیں تمام جدید قسم کا سامان موجود ہے اور ڈاکٹر بھی اعلے درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔

عراق میں طبی بیداری کا دور ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا۔ اس سال برطانوی اور ہندوستانی ڈاکٹروں کا ایک وفد عراق گیا تھا۔ اس وقت بھی عراق میں اٹھائیس شفاخانے اور اکیاون دواخانے موجود تھے۔ جتنا زمانہ گذرتا گیا خود عراقی ڈاکٹری پڑھنے اور سیکھنے لگے اور عراق کے شفاخانوں میں عراقی ڈاکٹروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ عراقیوں پر جدید طریقہ علاج کی خوبیاں زیادہ واضح ہوتی گئیں اور بیماریوں کا سلسلہ کم ہوتا گیا۔ حکومت بھی اہل ملک کی صحت و تندرستی کا بڑا خیال رکھتی ہے بغداد کے شاہی طبیہ کالج میں صدہا لڑکے اور لڑکیاں اعلے طبی تعلیم پاتی ہیں۔



طبیہ کالج کا صدر دروازہ۔ عمارت بہت خوبصورت اور کشادہ ہے۔

چار مشہور ہستیاں

اس رسالے میں چار مشہور ہستیوں کی سوانح حیات اور انکے کارناموں پر چار مفصل مقالے شائع ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اے نکلسن مشہور انگریز مستشرق تھے۔ آپکو اسلامیات سے خاص دلچسپی تھی۔ حقیقت میں آپ نے اسلامی ادب کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر نیل رتن دھار صوبہ جات متحدہ کے محکمۂ تعلیمات کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ آپ ایک پکے وطن پرست اور ماہر تعلیمات ہیں۔ آپکو زراعتی مسائل سے خاص دلچسپی ہے۔ فیض جھنجھانوی اور احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔



احمد ندیم قاسمی







ڈاکٹر اے نکلسن

منظرِ شباب

فیض جھنجھانوی

نگاہِ آدم شہید تیری، دلِ فرشتہ ہلاک تیرا
طلوعِ صد آفتابِ محشر ہے چہرۂ تابناک تیرا
بھلا یہ خانہ خرابیوں کی ادائے رنگیں کہاں سے آتی
زمانے کے انقلاب میں ہے ضرور کچھ اشتراک تیرا

شراب و نغمہ کی بارشوں میں جوانی بے پناہ تیری
ہنسی اڑائے نہ جانے کس کس گنہ کی چشمِ سیاہ تیری
کسی کی تشنہ نگاہیوں میں ذرا سا رنگِ سوال پاکر
یہ کون خم ہوکے رہ گیا ہے، ہلالِ نو یا نگاہ تیری

شعاعِ اختر نگاہ تیری، شگفتِ غنچہ خطاب تیرا
جواں امیدوں کی انجمن میں یہ چہرۂ بے نقاب تیرا
ابھی ابھی تو نے جس نظر کو دیا ہے خلعت شرارتوں کا
اسی نظر کی شرارتوں سے بکھر رہا ہے شباب تیرا

صباحتِ چہرہ دن ہے تیرا، سیاہیٔ زلف رات تیری
مہ و ستارہ کی انجمن کیا، یہ محفلِ کائنات تیری
تخاطبِ بے توجہی سے جو خامشی کو زبان بخشے
عیاں ہے بے التفاتیوں سے وہ کوششِ التفات تیری

یہ غیر ممکن ہو عالمِ رنگ و بو میں کوئی حریف تیرا
لطافتِ گل، تبسمِ لالہ ہے مزاجِ شریف تیرا
تصادمِ ظلمت و تجلی سے کل نظامِ حیات بگڑے
اگر نہ ہو درمیانِ شام و سحر حجابِ لطیف تیرا

بہارِ جنت شباب تیرا، شباب جنت بہار تیری
پیمبرِ کفرِ عشق ہے ہر ادائے ایماں شکار تیری
جسے بعید از نظر تو نے بے التفاتیوں سے شکست دی ہے
مجل نہ آئے کہیں وہ پہلی نگاہ ہی رازدار تیری

صدائے ناقوس نبات تیری، اذانِ کعبہ پیام تیرا
مقامِ دیر و حرم سے کتنا بلند ہے ہر مقام تیرا
وہ دل ابھی تک جو مطمئن تھا گذارشِ آرزو پر اپنی
تبسمِ زیرِ لب سے سمجھا کہ سخت ہے انتقام تیرا

نگاہِ ساقی کی معرفت پاکے دعوتِ سوز و ساز تیری
بساطِ محفل پہ شیشہ و جام پڑھ رہے ہیں نماز تیری
فضا کی تاریکیوں سے میری شکستِ توبہ کو واسطہ کیا
پیمبرِ کفر ہے مسلسل گھٹا کہ زلفِ دراز تیری

شبابِ رنگینی و تبسم کا گلشنِ لازوال تیرا
یہ نرگسِ لاجواب تیری، یہ لالۂ بے مثال تیرا
کفِ حنائی سے میرے زانو عجیب انداز سے دبا کر
یہ کون پہلو سے مسکراتا اٹھا ہے تو یا خیال تیرا

بہشتِ حسن و جمال جس سے نگاہِ بادہ فروش تیری
شگفتہ غنچوں میں منعقد ہے وہ محفلِ نائو نوش تیری
کہیں جھجکتی ہوئی نظر ہی نہ آج افشائے راز کر دے
ذرا کچھ اور احتیاط برتے یہ گفتگوئے خموش تیری

گل و چمن کیا بہشت تیری، زمین کیا آسمان تیرا
دلِ فرشتہ ہے نقشِ سجدہ قدم قدم پر نشان تیرا
یہ چشمِ پر شوق تجھ کو سمجھے ہیں طرح ہم آغوش ہو گئی ہے
کہ اب نگاہوں کی آزمائش در اصل ہے امتحان تیرا

ترنمِ حسنِ شعر تیرا، تبسمِ روحِ داد تیری
ادائے رنگیں مزاج وجہِ شکستِ ہر اعتقاد تیری
ہنسی ہنسی میں تبسمِ لب جو پوچھ بیٹھے تو کیا بتاؤں
ابھی ابھی میرے دل میں کیا کچھ رہا تھا شرکِ یاد تیری

نظر میں برقِ جمال، قوسِ قزح میں رنگِ لباس تیرا
مقامِ ناز و ادا و غمزہ ہے ماورائے قیاس تیرا
شرافتِ ضبط نے بمشکل تمام روکا ہے وحشتوں کو
نہ جانے کیا انجمن پہ گزرے اگر نہ ہو دل کو پاس تیرا

فیض جھنجھانوی

یہ قول اپنی جگہ ہر آئینہ درست اور صحیح ہے کہ "شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا" مگر اس اعتراف کے باوجود یہ بات بھی مسلّم اور یقینی ہے کہ ہر وہبی شاعر کو بہر حال اکتساب کی وادیٔ دشوار گزار سے گزرنا پڑتا ہے۔ قدرت فطری شاعر کو شاعرانہ طبیعت، نکتہ آفریں دماغ اور لطیف وجدان دے کر دنیا میں بھیجتی ہے لیکن شاعر اگر مطالعہ، فکر و نظر سے کام نہ لے اوراقِ فطرت کے ساتھ اوراقِ کتابی کا مطالعہ نہ کرے تو قدرت کا عطا کیا ہوا جوہر زنگ آلود ہو جاتا ہے اور شاعرانہ استعداد کی پوری طرح نشو و نما نہیں ہوتی، کم سواد شاعر شعروں میں بہت سے بہت شوخی پیدا کر سکتا ہے مگر شعر کو بصیرت و حکمت کا مرقع نہیں بنا سکتا۔

حضرت فیض جھنجھانوی کا ان وہبی شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو قدرت کے عطا کئے ہوئے جوہر کو اکتساب کی آب دے کر اور زیادہ تابدار اور مجلّیٰ بنا دیتے ہیں فیض کا کاروانِ زندگی ایک طرف مصائب کے خارزار سے گزرا ہے اور دوسری طرف علم و فن کی وادیوں میں اس نے جادہ پیمائی کی ہے فیض کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انھوں نے فن شاعری کو سبقاً سبقاً پڑھا ہے، یہی وجہ ہے کہ فیض کے کلام میں استادانہ پختگی اور عالمانہ شان پائی جاتی ہے، زبان کی نزاکتوں پر بھی فیض کی نظر ہے اور ادب کے جدید و قدیم تقاضوں سے بھی وہ بے خبر نہیں ہیں فیض شعر و سخن کی وادی میں احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتے ہیں اسی حزم و احتیاط نے ان کی شاعری کو بے راہ روی اور لغزشوں سے بلند کر دیا ہے۔

خصوصیاتِ کلام

فیض پر شکوہ تراکیب اور نادر تشبیہات کے بادشاہ ہیں۔ ان کے کلام میں ہم کو بعض ایسی ترکیبیں ملتی ہیں جو قدیم و جدید شاعری میں نظر نہیں آتیں، تراکیب کی یہ ایجاد فیض کی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ وہ کہیں الفاظ سے کھلونوں کی طرح کھیلتے ہیں اور کہیں الفاظ کے ناتراشیدہ لعل و جواہر سے خوبصورت آویزے اور نگینے تراشتے ہیں۔

فیض کے کلام میں شکوہ و عظمت کے کوہ الوند جگہ جگہ نظر آتے ہیں پہلے دماغ مرعوب ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ دل متاثر ہوتا چلا جاتا ہے فیض کے بعض اشعار میں ادب عالیہ کی شان پائی جاتی ہے جس کا مطالعہ شعر و ادب کے طالب علموں کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوگا فیض جھنجھانوی کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت "صداقت" ہے۔ ان کی شاعری "زمانہ ساز" نہیں "زمانہ ستیز" ہے۔ انتہا یہ ہے کہ جہاں کہیں ان کے کلام میں "تکلف" اور "آورد" پیدا ہو گیا ہے وہاں بھی "صداقت" کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

فیض کی شہرت علمی حلقوں اور خاصانِ ادب تک محدود ہے اور وہ اس لئے کہ فیض نے ایک شعر بھی اس تصور کو ذہن میں رکھ کر نہیں کہا کہ شاہراہِ بازاری محفلوں میں ان کے اشعار طبلے کی تھاپ اور سارنگی کے زیر و بم پر گا کر تماش بینوں کو سنائیں فیض سستی شہرت اور بازاری قبولِ عام کے لئے اپنے بلند مقام سے نیچے آنا گوارا نہیں کر سکتے۔ وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو مشاعروں کی "واہ وا" کو باعث فخر و امتیاز سمجھتے ہیں، فیض ایک خاموش، سادہ مزاج اور قناعت پسند انسان ہیں، اس لئے ان کا کم مشہور ہونا حیرت انگیز نہیں ہے۔

ماہر القادری

منتخب اشعار

چاہتا ہوں کہ ان کے کلام کے مجموعے (آبشار) سے چند منتخب اشعار اربابِ ذوق کے سامنے پیش کر دوں، ان اشعار سے فیض کے شاعرانہ کمال کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائیگا۔ ایک نظم کا عنوان "برشگال" ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے:۔

جانبِ گلشن وہ بادل قبلہ رو ہو کر اٹھا
سبزۂ خوابیدہ چونکا باوضو ہو کر اٹھا

چونکہ بادل "قبلہ رو" ہو کر اٹھا تھا اس لئے اس کا "باوضو" ہونا ضروری تھا، بادل کو "باوضو" کہنا کتنی صداقت انگیز "صنعت تعلیل" ہے۔

زر بکف، گل پیرہن، رنگیں قبا، آتش بجام
ایک قطرہ سو طرح سے سرخرو ہو کر اٹھا

مصرعہ اولیٰ کا اہتمام دیکھئے محسوس ہوتا ہے کہ قاآنی بول رہا ہے دوسرے مصرعہ میں سچ مچ آبشار کی روانی پائی جاتی ہے۔ ایک قطعہ ہے:۔

محوِ لطفِ گل نہ وقفِ خطرۂ جورِ خزاں
چشم و دل وابستۂ صحرا نہ پابندِ چمن

میں گذر جاتا ہوں یوں ہر زندگی کی موڑ سے
جیسے کترا کر نکل جائے شکاری سے ہرن

فیض نے قطعہ نہیں کہا بلکہ ہر زندگی کو آئینہ دکھا دیا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر فلسفی سے بلند ہو جاتا ہے۔

"لمحہ سرشاری" کے موضوع پر فیض نے خاصی طویل نظم کہی ہے اس کے دو شعر یہاں اس لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ آپ بھی تھوڑی دیر کے لئے سرشار ہو جائیں:۔

وہ لمحۂ سرشاری جس میں ہر ذرہ حسین ہو جاتا ہے
اسرارِ شیت کھلتے ہیں ہر وہم یقین ہو جاتا ہے

ہر شاخِ گلستان پر نازل پھولوں کے صحیفے ہوتے ہیں
ہر غنچۂ دل افروز جوابِ خلدِ بریں ہو جاتا ہے

ان لوگوں پر جو اسباب و ذرائع کے مقابلہ میں خدا کی ذات پر نسبتاً کم بھروسہ کرتے ہیں، فیض کی "طنز" ملاحظہ ہو:۔

ناخدا کے شیوۂ نادستگیری پر تجھے
اس طرح افسوس ہے گویا خدا جاتا رہا

فیض کو دلی اور دلی کے آثار سے شغف نہیں محبت ہے ان کا بس چلے تو خاکِ دلی کے ایک ایک ذرے پر شعر کہیں اور دنیا پر اس حقیقت کا اظہار کر دیں:۔

ع دفن اتنا کہیں ہوگا نہ خزانہ ہرگز (حالی)

وہ آنکھ جو ہمایوں کے مقبرے کو دیکھ کر خون کے آنسو بہا چکی ہے، جامع مسجد کو کس عقیدت و محبت کی نگاہ سے دیکھتی ہے ؎

برس پڑا جو فلک سے وہ جلوۂ قدسی ٹھہر گیا جو زمیں پر وہ شاہکار جمال

یہ تو میں نے نمونہ کے طور پر ایک شعر پیش کر دیا ہے پوری نظم صنائع بدائع کا شاہکار جمیل ہے۔ لگے ہاتھوں ایک بند اور سنتے جایئے:۔

منار و گنبد و محراب و صحن و بارہ دری مقامِ چہرہ کشائی نشانِ جلوہ گری
یہ آب حوض میں ہے عکس نو عروس چمن کہ آئینہ میں کھڑی ہنس رہی ہے "لال پری"

ان کی ایک نظم کا عنوان "اقدام جارحانہ" ہے! شعروں کی لطافت، موسیقیت، نازکی اور روانی کا لحاظ کرتے ہوئے نظم کا عنوان "اقدام کافرانہ" یا کوئی حسین و جمیل نام ہونا چاہئے تھا۔ پوری نظم کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی ہے، کہتے ہیں:۔

یہ عارضِ گل کہ جس میں حوروں کی مسکراتی ہوئی جوانی
یہ دورِ ساغر کہ جس کی زد میں ہے قسمت گردش زمانہ

اس کے بعد کا شعر اور زیادہ اثر انگیز ہے:۔

شعاعِ مہتاب کے تبسم میں رندِ بادہ فروش گم ہے
وہ رندِ بادہ فروش جس کی نظر بنائے شراب خانہ

نظم تدریجاً اثر انگیز اور روشناس ترقی ہوتی چلی گئی ہے، فرماتے ہیں:۔

وہ جس کی تاریکیوں پہ صدقے چراغِ دیر و حرم کی جھلکی
وہ جس کی اک لغزشِ قدم پہ نثارِ سوز و جد صوفیانہ

جناب خواجہ محمد شفیع صاحب فیض کو "قاآنیٔ ہند" کہا کرتے ہیں مگر اس شعر میں تو "عراقی" نظر آتے ہیں۔

"نگاہ پردہ در" کی ایک جھلک دیکھئے:۔

شکستِ توبہ سے مجبور کیا میں دونوں عالم خراب کر دوں
جبینِ گل سے شراب برسے چمن کو غرقِ شراب کر دوں
وہ اور ہوں گے جو التجا میں رہیں گے حسن بہانہ جو کی
مری نظر وہ نظر ہے جس کو کہو اسے بے نقاب کر دوں

چوتھے مصرعے کا زور شاعر کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا بولتا ہوا مظہر ہے۔

مسلسل غزل کا ایک شعر ہے:۔

اک درد بھری آواز سی تھی، آوازِ شکستِ ساز سی تھی
پہلو میں یہ کیا پرواز سی تھی، خاکم بدہن دل ٹوٹ گیا

اگر محمود غزنوی زندہ ہوتا تو "خاکم بدہن" کے اس برمحل استعمال پر فیض کا منہ موتیوں سے پُر کر دیتا۔

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ غالبؔ مرحوم کے آثار سے فیض کو خاص تعلق خاطر ہے، اورنگ زیب کی چہیتی اور قابل بیٹی زیب النسا مخفی کی قبر شکستہ کو دیکھ کر فیض بے اختیار چیخ اٹھا ہے:۔

دیکھ وہ بکھری ہوئی سی خاک پھیلا سا غبار جانبِ مغرب سرِ میداں قریبِ رہگذار
مرقدِ زیب النسا ہے اور یہاں حال تباہ ہم بتانے پر بھی جس کو کہہ نہیں سکتے مزار

اس کے بعد سینۂ شاعر کی آہ "شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے:۔

جس سے برپا تھا کبھی ہنگامۂ حشر آفریں آہ اب اس کو میسر فاتحہ خواں تک نہیں

فیض نے زیب النسا کی اس شکستہ قبر کو جبین ہند پر "قحط مروت" کا داغ بنایا ہے۔

آپ کی آنکھیں اس نظم کے اشعار پڑھ کر آبدیدہ ہو گئی ہوں گی، میں آپ کو بہت دیر تک ملول اور افسردہ رکھنا نہیں چاہتا، آیئے فیض کی نظم "ابر سے فروش" کے ساتھ آپ بھی جھومئے اور گنگنایئے:۔

فرطِ طرب سے ریخ و بجن جھومنے لگے نیل و فرات، گنگ و جمن جھومنے لگے
نغموں کے زیر و بم سے چمن جھومنے لگے موروں کے کوکتے ہی ہرن جھومنے لگے

سبزہ لہک رہا ہے تہ ابر مے فروش
بشنو ز من حکایتِ جمشید و مے بنوش

اگر عالم برزخ کا تعلق اس ہماری دنیائے کون و فساد سے ہوتا ہے تو انیس کی روح ان اشعار کو سن کر جھومنے لگی ہوگی۔ ایک ایک مصرعہ رندانی کی جان اور شگفتگی کی روح ہے۔

فیض نے "آب جو" کے موضوع پر جو نظم کہی ہے اس کے چند شعر ہیں:۔

دھو ڈال مرے صفحۂ دل سے غم دنیا دنیا بھلی وہ دنیا کہ جو دنیائے کمینہ
نرگس کی بحو ہی ابھی آنکھیں نہ کھلی ہوں گل کو ابھی آیا نہ ہو ہنسنے کا قرینہ
افشاں نہ چھٹی ہو ابھی سبزے کی جبیں سے سوکھا ہو ابھی عارضِ گل سے نہ پسینہ

فیض نے رنگین و مترنم الفاظ کے امتزاج سے ہر شعر کو "موجۂ آبشار" بنا دیا۔

"بہار" پر صرف ایک شعر آپ کو سنایا جائے گا:۔

بن رہا ہے غازۂ حسنِ ازل رنگِ چمن چھن رہی ہے دامنِ نکہت میں شبنم کی ہوا

منظر نگاری کا یہی وہ مقام ہے جہاں مصور کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر پڑتا ہے۔

فیض کا ایک قطعہ جسے ایک بار پڑھ کر عمر بھر یاد رکھئے:۔

فرش ہے جلوہ گہ عرش بریں آج کی رات بوئے گل ہے نفسِ روحِ امیں آج کی رات
دامنِ ناز کی جنبش سے چٹک ہی جاتا غنچے میں رکھ نہ دیا قلبِ حزیں آج کی رات

فیض کی نزاکت خیال نے کتنی "عجیب شیشہ گری" کی ہے۔

غزل

فیض کی طبیعت کو نظم سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے، غزل کا ایک شعر ہے:۔

بیاں سے کیا خاک شدتِ سوزِ غم کا اندازہ ہو سکے گا
گزارشِ حالِ واقعی ہے مریض کا گفتگو نہ کرنا

"تمام واقعات نے شعر کو "ما فعیت" کی اس سطح بلند پر پہنچا دیا جہاں "روح القدس" کے شہپر کی آواز سنائی دیتی ہے۔

فیض کی غزلوں کے چند منتخب شعر پڑھیے اور جھومیے۔

کیا غضب تونے بیلے ذوق پشیماں کر دیا — میرا آنسوان کی آنکھوں سے نمایاں کر دیا
فکر نشیمن و غم گل سے نجات ہے — بجلی مرے لئے نگہ التفات ہے
اب خدا معلوم دل ہے کس مقام عشق پر — وہ جفاؤں پر جفا کرتے ہیں شرماتا ہوں میں
فقط لظر کو چراغ رہ طلب نہ سمجھ — فروِ گشدگی بھی ہے جستجو کے لئے
سر جمشید کو خشتِ خم صہبا سے ٹکرا دیں — گدائے میکدہ بھی کس قدر مغرور ہوتی ہیں
دل آشفتہ ساماں بار یا سودا نمن کیوں ہو — کہ اس کے رنج سے تیری خوشی شرمائی جاتی ہے
نبض پر ہاتھ نظر سوئے فلک ہر بلب — چارہ گر خیر تو ہے کچھ تو بتا کیا دیکھا
بجا سکیں گے نہ یہ نغمہ ہائے چنگ و رباب — سپر اٹھا کہ تو میدان کارزار میں ہے
ہر اک شے اس محیط زندگی میں — فریب موج ہے ساحل کہاں ہے

فیض کی غزل کے ایک ایسے شعر پر مضمون ختم ہوتا ہے جو شاعری کا کمال نہیں "معجزہ" ہے!

یہیں سے اک روز آفتاب حیاتِ نو کا طلوع ہوگا
اگر وہ تار نظر بھی بخشیں تو چاک دل کو رفو نہ کرنا

"آؤ — !"

نسیمہ سوز

تم بن موری دنیا سونی — من ہے سونا نین ہیں سونی
آؤ من مندر میں آؤ — آؤ اور نظروں میں سماؤ
یہ اودی اودی برکھائیں — ہلکی سی یہ پیاری فضائیں
آؤ من مندر میں آؤ — درشن کو نہ اب ترساؤ
بادل جب کہ ہوا پہ جھولے — دل بھی دھڑکے ہولے ہولے
آؤ من مندر میں آؤ — بیاکل جی کو چین دلاؤ
بھول رہی ہوں اپنا راگ — بجھ رہی ہے آشا کی آگ
آؤ من مندر میں آؤ — نینوں کا سپنا بن جاؤ
آتی ہیں یہ موجیں منہ کو کھولے — پریت کی نیا ڈگ مگ ڈولے
آؤ من مندر میں آؤ — نیا اپنی پار لگاؤ

تضمین

بر غزل

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن و برار

خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

شاطر حکیمی

جگر میں درد ہے باقی نہ کچھ لب پر فغاں باقی — نہ اس کا ہے نشاں باقی نہ اسکا ہی گماں باقی
بقا ہر رہ گئی ہے ایک مرگ ناگہاں باقی — محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و تواں باقی
ابھی حصہ میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی

نمایاں ہو رہی ہے ہر در و دیوار سے وحشت — جہانِ رنگ و بو کی یا الٰہی کیا ہوئی حالت
کہے کس منہ سے کوئی ان دنوں افسانۂ راحت — گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہوگئے رخصت
فقط بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغاں باقی

تغیر ہو نہیں سکتا کبھی قانون قدرت میں — شریک غم کسی کا کون ہوتا ہے مصیبت میں
بھنور سے ہم کہاں جائیں نکل کر ایسی حالت میں — خدا ہی کشتیٔ دل کا ہے حافظ بحر الفت میں
نہ لنگر اس کا باقی ہے نہ اس کا بادباں باقی

خرام ناز! وہ بھی دلستاں! میں کیا کہوں ساقی — تصدق ہے زمیں کیا آسماں میں کیا کہوں ساقی!
یہ عالم ہے نہیں کھلتی زباں میں کیا کہوں ساقی — حسینانِ جہاں کی شوخیاں میں کیا کہوں ساقی!
شب آخر ہوگئی لیکن ابھی ہے داستاں باقی

ریاض دہر میں تا زندگی تو پھول پھل عثماں — دکھا دے چشم شاطر کو رہ علم و ہنر عثماں
زمانے میں ہے تیرا بول بالا آج مثل عثماں — سلاطین سلف سب ہوگئے نذر اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

چور

افسانہ

عائشہ جمال

"آپا! ارے اے آپا! سنتی ہو۔" ساشو نے ظل کو گود میں لے کر کان میں تیل ڈال لیتی ہو؟

میں نے تلاوت آئینہ سے فرصت پاکر آپا پر پھٹکارنا شروع کیا۔

"کیوں کان کھا رہی ہو کچھ بکو تو آخر بات کیا ہے؟"

آپا نے اپنے ننھے پر قربان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں جا رہی ہوں شمیم سے ملنے"

"خدا کے لئے جا بھی چکو" انہوں نے بڑے انہماک سے چٹا چٹ ننھے کو پیار کرنا شروع کر دیا۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ آؤ گی کس وقت؟"

"اب مجھے کیا معلوم وہ کب آنے دے۔ اور تم نے یہ تو سنا ہی ہوگا۔ آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت"

میں نے اپنی ساری کی چنٹیں درست کرتے ہوئے آئینہ میں اپنا سراپا دیکھا۔ سرمئی ساری آج واقعی میرے جسم پر بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی —— آسمان پر دو چار سرمئی سے ابر کے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے تھے۔ میں سوچنے لگی کہ کہیں راستے میں بارش نہ ہو جائے۔ لیکن یہ چھٹے چھٹے دو چار ابر کے ٹکڑے بھلا کیا برسیں گے بس یونہی ایک دوسرے سے مل کر جدا ہوتے رہیں گے۔ ممکن ہے دو چار آنسو بکھیرتے ہوئے بہہ جائیں تو اس کے لئے اپنے ساتھ چھتری لئے جاؤں گی اگر آج نہ گئی تو شمیم کو حیران کیسے کیا جائیگا مجھے دیکھکر کمبخت اچھل ہی تو پڑے گی —— میں جلدی سے چھتری بغل میں دبا کر نیچے اترنے لگی۔ توبہ بمبئی کی بلڈنگیں بھی کس قدر پہلوان نواز ہوتی ہیں۔ ورزش کرنے کو جی چاہے یا نہ چاہے مگر جناب پچاسوں سیڑھیاں آپ کی اچھی خاصی ورزش کرا چھوڑیں گی۔ اور تیسری چوتھی منزل پر رہنے والوں کی تو بس موت ہی ہے یا ممکن ہے یہی زندگی ہو۔ مگر مجھ جیسی حال وارد بمبئی کے لئے تو مصیبت ہی تھی۔ سیڑھیاں طے کرنے سے کمبخت سانس لوہار کی دھونکنی ہو رہی تھی اور آسمان پر چھوٹے چھوٹے بادل آپس میں مل کر کسی خاص جشن کی تیاری کر رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی چلی تھی کہ ایک دم بارش شروع ہو گئی میں نے اپنی ساری کی حسن گت بنتے ہوئے دیکھکر چھتری میں پناہ لی۔ لیکن توبہ بمبئی کی آڑی ترچھی بوچھاڑ تاک تاک کر مجھے ہی نشانہ بنا رہی تھی نئی مخملی چپل پانی میں شرابور ہو کر کمبخت نکال چکی تھی اور میری ریشمی ساری پانی میں بھیگ کر میری نفاست کا خون کرتے ہوئے زمین پر لوٹ رہی تھی۔

میں تیز چلتے چلتے تقریباً بھاگنے لگی۔ لیکن شمیم کی بلڈنگ میں پہنچتے پہنچتے میدان کی بندھی ہوئی بکری کی طرح بالکل نہا گئی۔ میں نے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اپنا حلیہ دیکھا تو بے ساختہ شمیم کے لئے میرے دل سے بددعائیں نکل گئیں۔ ساری بالکل ستیاناس ہو گئی تھی اب کہوں گی اس کمبخت سے کہ مجھے دے اسکے بدلے میں دوسری ساری تجھی سے ملنے آئی ہوں ورنہ میری ساری —— میں کمرے کے بھڑے ہوئے دروازے کو کھول کر اندر گھسی اور دھم سے صوفے پر گر پڑی۔ اچھا ہے اسکا نیا صوفہ بھی بھیگ جائے میرے گیلے کپڑوں سے۔

شمیم کمرے میں نہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ جانے کیا عادت ہے اس شمیم کی کہ روز روز کمرے کی سجاوٹ میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہے۔ بڑا تلون ہے اس کے مزاج میں۔ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میں جھٹ سے صوفے پر اوندھی گئی اس خیال سے کہ شمیم کو ایک دم "ہو" کر کے ڈراؤں گی۔ "خوب!" ایک بھاری آواز میں نے سنی۔ اے لو شمیم مجھے الٹا ڈرا رہی ہے۔ میں نے اچک کر اس کا گلا دبوچنا چاہا۔ لیکن وہ شمیم نہیں تھی بلکہ کوئی اور تھا میں ایک دم ہڑبڑا گئی۔

"معاف کیجئے ——" میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مجھے کچھ کچھ خیال آیا کہ شاید میں تیسری منزل کے بجائے دوسری ہی پر آگئی ہوں۔

"معاف ایک کوڑی نہیں ہو گی۔ یہ چوری کا پیشہ بہر صورت ناقابل معافی ہے" اس کمبخت نے چہرے پر سختی پیدا کرتے ہوئے کہا اور مجھے جیسے آگ سی لگ گئی کہ یہ کون سی شرافت ہے۔ اگر غلطی سے کوئی کسی کے گھر آجائے تو اسے چوری لگا دی جائے۔

"میں چور نہیں ہوں جناب"۔ میں نے بھی ذرا سختی اختیار کی۔

"مگر جناب اس کا ثبوت کیا ہے؟" اس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔ اور ادھر میری ساری ہمت و دلیری ایک دم رفو چکر ہو گئی۔

"دیکھ لیجئے میں کتنی شریف ہوں"۔ میں سٹپٹا کر صرف اتنا ہی کہہ سکی لیکن فوراً ہی مجھے اپنے گھبراہٹ آمیز معصوم فقرے پر غصہ بھی آگیا۔

"جی! بڑی شریف ہیں آپ۔ جب ہی تو دن دہاڑے گھر میں گھس آئیں۔ وہ تو کہو میں آگیا ورنہ آج گھر کا صفایا ہی ہو جاتا"

"غلطی سے میں ——" "ہاں ہاں غلطی سے چوک گئیں آپ۔ میں سمجھتا ہوں" اس کی آنکھوں سے سخت شرارت ٹپک رہی تھی۔ اب مجھے اپنی بزدلی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

"بڑے ذلیل ہیں آپ۔ شرم نہیں آتی آپکو"۔ اور میں باہر جانے کے لئے بڑھی۔

"ٹھہریئے!" وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "غیر مہذب"۔ میں زور سے چیخی۔ "زیادہ بات نہ کیجئے۔ زیادہ بات نہ کیجئے۔ ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔ وہ آپ کی اچھی طرح سن لیگی اور خوب سمجھ لے گی" وہ مجھے گھورتے

ہوئے ریسیور اٹھا کر نمبر ملاتے ہوئے بولا۔

"ہلو۔ ہلو۔ ایک چور —— ڈاکو ہے ڈاکو۔ ہاں ہاں۔ اجی جناب ایک خوبصورت سی لڑکی۔ ہاں ہاں ڈاکو ——" میں نے چیل کی طرح جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ ہوش گم تھے اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ پہلی دفعہ اراکر تنہا نکلی تھی جس کی سزا یوں بھگت رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے غصے اور رنج سے کانپ کر اپنا منہ چھپا لیا اور روتے ہوئے دل ہی دل میں اسے کوسنے لگی۔

"چوری اور سینہ زوری!" وہ طنز سے بولا اور میرے قریب صوفے پر دھنس گیا۔ میں ملبلا کر ایک طرف سمٹ گئی۔

"دیکھئے اب ایسی حرکت نہ کیجیے گا۔ لوگ بڑی محنت سے جمع جتھا کرتے ہیں۔ شاید آپ نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کی۔ چلئے میں معاف کرتا ہوں۔"

وہ میرے قریب کھسکا۔

"چوری؟ چوری میں نے کب کی؟" میں نے نفرت اور غصے سے اور بھی سمٹ کر کہا۔

"کی کیسے نہیں ہوگی۔ یہ سب تو آپ کی تلاشی لینے پر معلوم ہوگا۔" اس نے کہا۔ اور میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جی میں آیا کمبخت کا سر اپنے سر سے لڑا کر شہید ہی کر ڈالوں۔

"خیر! آنکھوں ہی آنکھوں میں رحم کی اپیل نہ کیجیے۔

"لیجیے یہ کھائیے۔" یہ کہتے کہتے اس نے چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی پلیٹ سے کپڑا اٹھا دیا اور کچھ پھل میرے سامنے تھے۔

لیجیے انہیں کھائیے۔ مجھے احساس ہے کہ اس زمانے میں عورتیں بھی تعلیم حاصل کر کے بے روزگاری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اسی۔ لئے تو میں عورت کو تعلیم دلانے کے بجائے شادی کر لینے کا حامی ہوں۔ اب دیکھئے نا آپ ہی کی مثال سامنے ہے۔ اچھی خاصی تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور پیشہ یہ"

وہ بڑی سنجیدگی سے بکواس کئے جا رہا تھا اور میں مردہ بدست زندہ کی سچی تصویر بنی اسکے سامنے بیٹھی تھی۔ حرکت کرتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ خرد ماغ اقدام قتل کا مجرم ابکی دفعہ نہ ٹھہرا دے۔

"کھائیے اسے۔" وہ مجھے گم سم بیٹھے دیکھکر ذرا رعب سے بولا۔

"میں نہیں کھاتی۔" مجھے بھی غصہ آ گیا۔ "اچھا تو مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کا سرکاری راشن بند کروا دیا جائے۔ بہر حال بھوکے کو یوں تو نہ چھوڑنا چاہیئے۔" وہ اٹھکر ٹیلیفون کی طرف بڑھا اور میں بدحواس ہوئی۔

"اچھا میں یہ کھائے لیتی ہوں!" میں نے جلدی سے کہا۔ اور وہ دوبارہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"یہ انگور لیجئے —— اور آپ نے سیب کو ہاتھ لگانے کی قسم کھائی ہے۔" وہ بڑی بے تکلفی سے کہتا رہا۔ جیسے میں اس بدتمیز انسان کو ہمیشہ سے ہی جانتی ہوں۔ میں اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ کر رہ گئی۔ "اچھا اجازت دیجئے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"جی تو نہیں چاہتا لیکن خیر، مگر دیکھئے میرا مشورہ ہے کہ آپ میرے ہی جیسے کسی شریف آدمی سے شادی کر لیجئے۔ اس چوری چکاری میں کبھی دھر لی گئیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

میں جھپٹ کر کمرے سے نکل آئی تو ایسا محسوس ہوا کہ پھانسی کے پھندے سے گلا چھوٹا۔ اب وہ میرا کر ہی کیا سکتا ہے۔ میں نے اسے ہنستے دیکھکر پوری طاقت سے گھورا اور پھر منہ ہی منہ میں سینکڑوں سنائیں۔ وہ اپنے دروازے پر کھڑا مجھے دیکھ دیکھ کر شرارت آمیز ہنسی ہنستا رہا۔ میں بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح تیسری منزل کی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

"مر جائے خدا کرے"۔ میں کوسنے لگی۔ دیکھو ابھی شمیم کے ابا سے کہکر کتنے جوتے کھلواتی ہوں اسے۔ مگر نہیں بھئی یہ شمیم ہے ویسے ہی اول درجے کی شریر۔ نہ جانے کیا بات کا بتنگڑ بنا دے اور خواہ مخواہ میری بدنامی ہو جائے۔ نہیں ابھی میں کسی سے نہ کہونگی۔ ایسی بات اپنے تک ہی رہنا چاہیئے۔

قطعات —— نہال سیوہاروی

طوفان کے رخ کو موڑ ڈالوں گا میں
ظلمت کی قبا جھنجوڑ ڈالوں گا میں
یہ بندِ الم جہاں میں وہ بندِ الم
ہر بندِ الم کو توڑ ڈالوں گا میں

*

تخئیل میں ضو ہے چاند تاروں کی قسم
فطرت میں ہے جوش آبشاروں کی قسم
اس سختی دوراں پہ بھی اب تک ہوں جواں
رنگین و طرب خیز بہاروں کی قسم

*

آفات کے پُر ہول نظارے سے نہ ڈر
طوفان کے تند و تیز دھارے سے نہ ڈر
ہے ضامن سود نقدِ ہمّت تیرا
بازارِ حیات میں خسارے سے نہ ڈر

شمیم۔ اوشمیم! اس دفعہ ڈر کے مارے بے دھڑک اندر نہیں گھس کر گیا جاتے یہاں بھی کوئی گل کھل جائے۔

"اوہ لو! نسرین تو تو چلی گئی تھی اب کہاں آ ٹپکی؟" اسنے مجھے دیکھتے ہی بھینچ لیا اور پھر گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔

"بیٹھ شریر۔ اب بتا تو نے تو لکھا تھا کہ میں گھر جارہی ہوں"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ میں آئی کیوں؟ لو جاتی ہوں"

"نہیں یہ بات نہیں۔ مگر یہ شرارت کیا تھی۔ میں تو دہلی کے پتے پر ایک خط بھی ڈال چکی ہوں" "اچھا!" میں خوب ہنسی کیونکہ شرارت کامیاب رہی تھی۔ لیکن پھر ہنستے ہنستے ایک دم اس واقعہ کا خیال آگیا اور جیسے میں بجھ کر رہ گئی۔ توبہ ہے کتنی عجیب پوزیشن ہو کر رہ گئی تھی۔ خدا نے بڑی خیر کی۔ ورنہ اسوقت جانے کہاں ہوتی۔ میں سوچنے لگی۔

"اسے تم چپ کیوں ہوگئیں؟"

"کچھ نہیں تیرے الوپن پر رونا آرہا ہے"

"اچھا" وہ لگی مجھے گدگدانے۔ اور پھر جو ہم لوگوں نے ہنسنا شروع کیا تو شمیم کے ابا ساز و کے کمرے سے گھبرا کر نکل آئے۔

چلتے وقت شمیم کہنے لگی۔ "کل آنا ریگل میں بڑی اچھی تصویر لگی ہے چلیں گے دیکھنے" میں نے وعدہ کرلیا۔ دوسرے دن میں بڑی احتیاط سے سیڑھیاں گنتی ہوئی اس کے گھر پہنچ گئی۔

"آگئیں تم؟ اچھا بیٹھو میں ذرا نہالوں"

وہ مجھے صوفے پر دھکیل کر غسل خانے میں گھس گئی اور لگی پانی کی دھار کے شور پر گانے۔

اک بات بتا دو ہمیں گوری   کس نے سکھائی تمہیں چوری

دروازہ آہستہ سے کھلا اور وہی ساہو صاحب ایک شاندار سوٹ میں ملبوس اندر گھس آئے۔ اور مجھے فوراً ہی اپنی کل والی بے بسی یاد آگئی۔

"آپ! منہ میں رام رام بغل میں چھری" میں ایکدم آپے سے باہر ہی ہوگئی۔ "کہہ دیجئے کہ آپ اس وقت بالکل صاف نیت سے یہاں چپ چاپ گھس آئے ہیں۔ آئیں"۔ "مگر سنئے تو محترمہ"۔ اس کی آنکھوں میں ہنسی جھانک رہی تھی۔

"جی نہیں ہم اس لائق کہاں کہ آپ جیسے ساہو کی سنیں" میں نے ٹیلیفون کے قریب جاکر کہا۔ لیکن وہ ڈھیٹ بجائے سراسیمہ ہونے کے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور لگا سگرٹ کے دھوئیں سے چھلے بنانے۔ میرا مارے غصے کے برا حال ہوگیا۔ کچھ کچھ تو یہ سمجھ میں آگیا کہ یہ حضرت شمیم کے کوئی نہ کوئی ضرور ہیں ورنہ اس ڈھٹائی کے کیا مطلب۔ میری ہمت نہ پڑی کہ پولیس کو آنے کی زحمت دوں۔ ۲

تکتے تکتے راہ تمہاری

چندا ڈوبا تارے ڈوبے   جو جو ابھرے سارے ڈوبے
ڈوب سکی نہ برہا ماری
تکتے تکتے راہ تمہاری

اک جگ بیتا دو جگ بیتے   ہار گئی ہوں جیتے جیتے
پھر بھی ہری ہے جیون ڈاری
تکتے تکتے راہ تمہاری

آس کا دامن چھوٹ رہا ہے   پیت کا ناتا ٹوٹ رہا ہے
چھیڑ رہی ہیں سکھیاں ساری
تکتے تکتے راہ تمہاری

اب جو ساقی ساجن آئیں   آکے جب وہ موہے بلائیں
کہنا وہ تو کب کی سدھاری
تکتے تکتے راہ تمہاری

ساقی صدیقی

"میں پوچھتا ہوں مجھے لوٹ کر آپ کا جی نہیں بھرا جو یہاں بھی آدھمکیں" وہ بڑی شان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ اور میرے ایسی مرچیں لگیں کہ بس۔ جی میں آیا کہ منہ نوچ لوں کمبخت کا۔ میں نے اسے دھمکانے کے لئے ٹیلیفون اٹھایا۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور میرے ہاتھ سے ریسور چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس چھینا جھپٹی میں ایک گلدان گر کر چھن سے ہوگیا اور ——— اور اس کی جلتی ہوئی سانس مجھے اپنے چہرے پر ایک لمحے کو محسوس ہوئی۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور شمیم تولیہ میں لپٹی نظر آئی۔

"چور" میں نے چیخ کر اس سے کہا "چور"۔ وہ بھی ہنستے ہوئے چلا یا شمیم تمکنت سے ہنستی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکر کھڑی۔

"اوہ! عرفان ڈارلنگ دیکھئے آپ کی ٹائی کو کیا ہوگیا۔ بہت شریر ہیں آپ۔ اور تم نسرین ذرا اپنے بال درست کرو۔ دیکھو نا یہ عرفان کتنے برے ہیں کیسے میری زندگی بسر ہوگی ان کے ساتھ" اور وہ اسٹول پر بیٹھ کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ عرفان کو دیکھا جو مجھے اب واقعی اپنا چور معلوم ہو رہا تھا جانے کیوں میری طبیعت سخت مکدر ہو رہی تھی۔ شمیم بال سنوار رہی تھی اور عرفان اطمینان سے بیٹھا سگرٹ کے دھوئیں کے چھلے بنا رہا تھا اور میرا موڈ کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے کسی کو نوچ کھاؤں گی۔

موجودہ روس کی کچھ فنکار عورتیں

گذشتہ چند سالوں میں ہم روس کی جنگ جو عورتوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں بلکہ ان کی تعریف کرنے لگے ہیں۔ لیکن روسی عورتوں کے فنی کارنامے کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ روسی عورتوں کے فن کی اہم خصوصیات موضوعات کی وسعت اور جدت ہیں۔ روسی قوم کی خصوصیات شدت جذبات، ضبط اور محبت ان کے مجسموں اور تصویروں سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ویرا مخینا کی مجسمہ سازی سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ اسے "روس کی قومی مجسمہ ساز" کا خطاب مل چکا ہے۔ یہ مختلف فنون کی ماہر ہے اس نے شہر کی منصوبہ بندی، قدرتی مناظر جیسے باغ لگانے، قومی عمارتوں کے سامنے کے حصوں کی اور اندرونی سجاوٹ اور تھیٹر کے لباس تیار کرنے میں بھی خاص حصہ لیا ہے۔ مگر اسے سب سے زیادہ دلچسپی مجسمہ سازی ہی میں ہے۔ جنگ سے پہلے وہ "مادر وطن" نامی ایک یادگار مجسمہ تیار کر رہی تھی۔ "مادر وطن" گویا ایک ۳۲ میٹر کی عورت ہے جو ایک ہی پتھر سے بنائی گئی ہے۔ اس کے پھیلے ہوئے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ایک کارخانہ ہے جو سویٹ صنعت کی نمائندگی کرتا ہے اور داہنی طرف "مادر وطن" کے محافظ سرخ فوج کے سپاہی کا چھ میٹر کا دھات کا بنا ہوا مجسمہ ہے۔ دوران جنگ میں اس کے دو تاریخی مجسمے قابل ذکر ہیں، ایک "وطن پرستوں کی جنگ" اور دوسرا سیباستوپول کی حفاظت کے متعلق ہے۔

اگرچہ ویرا مخینا کو تاریخی مجسموں میں خاص دلچسپی ہے پھر بھی اس نے چند خاص نیم تنہ مجسمے بھی بنائے ہیں۔ اس کے ہمعصر روسیوں کے اسٹوڈیو میں ایک رقاصہ کا نیم تنہ مجسمہ ہے۔ یہ کسی خوبصورت رقاصہ کا مجسمہ نہیں ہے جو سنگت ناچ کا لباس پہنے ہوئے ہو بلکہ اس سے رقاصہ کی شخصیت، روح اور اپنے فن پر کامیاب دسترس کا شعور ظاہر ہوتا ہے۔ موضوع کی داخلی گہرائیوں کی تصویر کشی ہی ویرا مخینا کے مجسموں کو زندگی اور اصلیت بخشتی ہے۔

اسی طرح سارا لیبدیوا بھی اپنے مجسموں کی روحانیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ میرے مجسمے اسٹوڈیو کے مقابلے میں ٹھیک میں رکھے ہوئے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ گھر پر کام کرنا پسند کرتی ہے تاکہ اپنے موضوع کی نفسیاتی باریکیوں کا احساس کر سکے۔ اسٹوڈیو کی اس تصویر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

کیترینیا بیلاشووا کے فن کا خاص موضوع بہادر اور ناقابل تسخیر روسی قوم ہے۔ اس کے ایک بہترین مجسمہ کا نام "ناقابل تسخیر لڑکی" ہے۔ یہ ایک جوان لڑکی کا مجسمہ ہے۔ جو بے پروائی اور بے خوفی سے کھڑی ہے۔ اس کے نازک جسم کی شان و شوکت، ہاتھ اور نرم چہرہ کا خاموش مگر عزم اور لباس اور جوتوں کا گھٹیا پن اس ناقابل تسخیر اسپرٹ کا پتہ دیتے ہیں جو مصیبتوں کے زبردست طوفان سے فنا نہیں ہو سکتی۔ یہ حملہ آوروں سے لڑنے والی ہزاروں روسی لڑکیوں کی نمائندہ ہے۔ اس سال بیلاشووا زویا کو سمودیمیانسکایا کا مجسمہ تیار کر رہی ہے۔ یہ لڑکی چھاپا مار فوج سے تعلق رکھتی تھی اور اس نے اپنی قوم کی بھلائی کے لئے جان دی۔

قوم کے تحمل کے احساس اور اظہار کی خواہش روس کی مجسمہ ساز عورتوں کی طرح وہاں کی مصور عورتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ماسکو آرٹ یونین میں بہت سی نقاش عورتیں بھی شامل ہیں۔ اونگا نیبودسکیا کا فن سویٹ عہد میں پھلا پھولا ہے۔ اس کی تصویریں روس کے روزانہ اہم مسائل کی مصوری کی عمدہ کوششیں ہیں۔ اس کا فن جاندار اور وسیع ہے۔ وہ کپڑے کی بڑی چادر پر تصویر بنانا پسند کرتی ہے۔ شدید حملوں کے زمانہ میں وہ ماسکو ہی میں رہی اور اس زمانہ میں اس نے "چھت پر لڑکیاں" نامی تصویر بنائی۔ یہ آتش زدگی کی نگران دو نوجوان لڑکیوں کی تصویر ہے۔ ۱۹۴۲ء کی گرمیوں میں اس نے کچھ چھاپہ مار لڑکیوں کی نیم تنہ تصویریں کھینچیں جو سویٹ مصور عورتوں کی گیلری کی رونق بڑھاتی ہیں۔ حال میں وہ کپڑے کی چادر پر مشہور روسی شاعر لرمونتوف کے شباب کی تصویر کھینچنے میں مصروف ہے۔

مریم اسلامزیان اور ایرانوش اسلامزیان ارمنستان کی مصور عورتیں ہیں۔ ان کی اکثر تصویروں کے موضوعات بالکل نئے ہیں۔ مریم اسلامزیان کی ایک نئی تصویر "بہادر کی واپسی" ہے اس میں ایک نوجوان ماں اپنے بچہ کو اس کے بہادر باپ کے سامنے پیش کر رہی ہے جو محاذ سے ابھی واپس آیا ہے۔ ایرانوش اسلامزیان نے گھر اور محاذ دونوں کے کارناموں کی تصویریں کھینچی ہیں۔ ان بہنوں کا کہنا ہے کہ "ہم نے بہت سی نیم تنہ اور مناظر قدرت کی تصویریں بھی کھینچی ہیں۔ کیونکہ ارمنستان کے مناظر قدرت بہت ہی دلکش ہیں۔ تیز نیلے رنگ کا آسمان، سبز وادیاں، نیلی جھیلیں اور تیز سرخ رنگ کے پہاڑ جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں، اس قسم کی مصوری کے لئے کافی مواد مہیا کرتے ہیں ان کے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

ایس کچلو

ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری

موجودہ انتشار اور غارت گری کے عبوری دور میں ہندوستانی شعر و ادب نے جو نیا نیا رنگ اختیار کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ ترقی پسند ادب کے عنوانات سے جتنے نقوش آج تک پیش ہو چکے ہیں وہ سب کے سب جدت اور ندرت کے حامل ہیں، اور یہ نقوش اتنے صحت مند، اتنے خوبصورت ہیں کہ قدیم نقوش ان کے آگے پھیکے اور کمزور دکھائی پڑتے ہیں۔ اور ان ہی نقوش کو دیکھکر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی زندگی ہندوستانی سماج، ہندوستانی تہذیب اور معاشرت سب کچھ بدل چکی ہے۔ ہر ایک شے نے نیا نیا لباس پہن لیا ہے اور یہی تبدیلیاں ادب میں روز بروز ترقی حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ اگر زمانے نے موجودہ ادیب اور شاعر کی خفیہ نبضوں میں لپکتی دوڑتی گرمی نہ پیدا کی ہوتی تو نہ جانے ہمارے یہ ادیب اور شاعر کب تک حسن و عشق کی رنگینیوں میں جھومتے رہتے، کب تک ماہ و سیندور کے سایوں میں اونگھتے رہتے!!

مگر زمانے کے نقاد نے خود ان کو میٹھی نیند سے بیدار کر دیا ہے۔ "اے نوجوانو میں نے اپنا بوسیدہ چولا اُتار پھینکا ہے تم کیوں نہیں اُتار پھینکتے میرے آغوش میں سانس لینا ہو تو آؤ۔ ہند کی آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دو۔ یہاں کی بلکتی سسکتی زندگیوں پر رحم کھاؤ ان کے ناسوری زخموں کو مندمل کرو۔ سماج کے مظالم سے بچاؤ۔ غریب مزدوروں کی چیخوں کو سنو۔ بیواؤں، طوائفوں کی آوازوں کو سنو۔ ان کی مدد کرو اے نوجوانو، میں تمہارے ساتھ ہوں میں نے دنیا کو ایک رنگ میں کبھی نہیں رکھا تم جیسے نوجوانوں نے ہی میرا ساتھ دیا ——"

زمانے کی للکار نے ہمارے ہندوستانی نوجوانوں ادیب اور شاعر کے ذہنوں میں بھونچال سا پیدا کیا اور وہ اپنے ذہنی زلزلوں کو ملک اور سماج کے سامنے پیش کرنے لگے اور کر رہے ہیں۔ غرض زمانے کے تقاضے کے مطابق زندگی کی ہر شے تبدیل ہو چکی ہے ہر طرف تبدیلی، ہر طرف تغیر رونما ہو چکا ہے اور نہ جانے آنے والے دنوں میں کتنے تغیرات رونما ہوتے جائیں گے!!

موجودہ مختصر افسانہ نگاری کی جو تصویریں ہماری نگاہوں کے سامنے آتی جا رہی ہیں ان کو دیکھکر ہم خوش ہیں کہ اب ہمارے افسانے کافی ترقی کر رہی ہے اور وہ غیر ممالک کے افسانوں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔

پریم چند کے بعد سے دیہاتی ماحول کی عکاسی جس گروہ نے کی وہ قابل قدر ہے مگر اب اس گروہ نے بھی اپنی پگڈنڈی تبدیل کر لی ہے۔ ندیم قاسمی کی شخصیت اس گروہ کے افراد سے بلند و بالا ہے، کیونکہ ندیم دیہاتی ہے اور وہ دیہات کو دیہاتی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کو اپنے دیہات کی ہر شے سے محبت ہے اس کو اپنے دیہاتیوں سے محبت ہے اور وہ فقر دیہات کو پس منظر بنا کر اپنے افسانوں کو سنوارتا ہے دیہاتیوں کی زندگیوں کے تجزیئے کرتا ہے!!

ندیم کی افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۳۶ء سے مستقل طور پر شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترقی پسند تحریک ہندوستان میں ابھی ابھی شروع ہوئی تھی اور اتنی ترقی حاصل نہ کی تھی جتنی آج کل حاصل کر رہی ہے۔ اس نے سب سے پہلا افسانہ "بت تراش" لکھا جو قدیم اسلوب اور پلاٹ کا آئینہ دار ہے مگر اس کے بعد سے اسکی نگاہوں میں گہرائی اور وسعت پیدا ہو گئی۔ مطالعہ اور مشاہدہ نے اسکی جدت ندرت پسند فطرت کو ابھارا اور وہ اپنے آپ میں نئی نئی تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ اب اس کی نگاہوں کے زاویوں میں نیا تغیر رونما ہو چکا اس کی سوچ کی اڑانیں بدل گئیں جیسے وہ جوان ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گاؤں کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا اس نے دیکھا کہ ہزاروں زندگیاں کچے گھروں میں بلک رہی ہیں تنگ گلیوں میں غریب لاشیں رینگ رہی ہیں غلیظ جوہڑوں میں انسانی جسم لت پت ہوئے ہیں، ہر طرف چیخ ہر طرف آہ —— اسکا دل دہکتا ہوا انگارہ بن گیا اس نے ان تمام کی عکاسی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ "راگ کا جادو" میں اس نے ہلکے رنگ سے دیہات کی عکاسی کی ہے مگر چوپال کے تمام افسانوں میں وہ اپنے دل کی آگ کو دکھلا سکا ہے۔ گو کہ اس میں رومانیت کی چاشنی بھی شامل ہے کیونکہ اس وقت ندیم نوجوان تھا اس کے دل میں میٹھی میٹھی امنگیں تھیں، پیارے پیارے ارمان تھے۔ چنانچہ پہلے پہل رومانی زندگیوں کا اس نے تجزیہ کیا۔ بعض نقادوں نے اس کے چند افسانوں کو عریاں افسانے بھی کہا ہے لیکن یہ انکی بھول ہے۔ ندیم کا مقصد ہرگز عریاں نگاری نہیں رہا اور نہ اب ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ موجودہ دور میں کوئی ادیب مقصد کے طور پر عریاں نگاری نہیں کرتا۔ عریانیت صرف ذریعہ ہوتی ہے جو حقیقت کے بیان کرتے کرتے آ جاتی ہے۔ ورنہ کسی ادیب کا مقصد عریاں نگاری نہیں۔ نہ منٹو، نہ عسکری، نہ عصمت۔ میں کسی کو عریاں نگار نہیں کہتا اسلئے کہ ان کا مقصد عریاں نگاری نہیں۔ عریانی کو دور کرنا ہے ——!!!

غرض ندیم چوپال میں کچھ ڈھونڈتا نظر آتا ہے اور وہ جو نقوش دل پر رقم ہوتے جاتے ہیں ان کو جوں توں بیان کرتا جاتا ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہی چوپال کا انسان بگولے میں آگ بگولہ بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں بگولے اُٹھ رہے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ سماج کو ان بگولوں میں سمیٹ کر کہیں دور لامحدود دھندلکوں میں پھینک دے تاکہ اس دنیا پر امن و امان کی سہانی بدلیاں منڈلاتی رہیں، سکھ چین کی مینہ بھری ہوائیں ہوا کریں، خوشی و مسرت کی

سحر صہبائی

سلونی بہاریں اچھالتی پھریں۔ اب ندیم کے تجربے اور مشاہدے اور زیادہ گہرے ہو چکے ہیں۔ اب اس میں جو پالک کی سی خیرپنی اور رومانیت بھی باقی نہیں۔ اب اسکے بیان میں تلخ کرب ناکی سما چکی ہے۔

بگولے کا انسان ہم کو ایک اذیت زدہ انسان نظر آتا ہے جس کے چار جانب تلخی ناکامی اور نفرت کی چنگاریاں سلگی ہوئی ہیں۔ "محبت اور بھوک کا تضاد، محبت اور حکومت کا تضاد، ظالم مرد کی بربریت، عورتوں کی غلامانہ ذہنیت، کشمکش حیات، مجبوری، یاس، آرزو سب اپنی بنیادی سچائی کے ساتھ اس کے ان افسانوں میں جلوہ گر ہو سکتے ہیں"

اور وہ ان افسانوں سے یہ دکھلانا چاہتا ہے کہ سماجی مظالم معاش کی تنگدستی۔ ہمیشہ محبت، زندگی اور انسانی خوشی کی راہ میں حائل ہوا کرتے ہیں۔ اداسی انسان کی فکری تلخی، طلوع و غروب میں اور بھی زہر خند بن جاتی ہے۔

اکثر نقادوں نے ندیم کو محدود قسم کا افسانہ نگار بتلایا ہے کہ وہ اپنے مخصوص دیہاتی ماحول سے باہر نہیں نکلتا۔ مگر وہ ان نقادوں سے مرعوب نہیں ہوتا وہ اپنے آپ کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ اس کے نقادوں کی شکایت ہے کہ اسنے سارے پنجابی دیہاتوں کے متعلق افسانے لکھے۔ بعض کہتے ہیں شمال مغربی پنجاب کی سطح مرتفع اور مغربی پنجاب کے ٹھلوں میں محدود ہو کر رہنا نہیں چاہئے۔ مشرقی پنجاب، جنوبی پنجاب کے متعلق بھی کہانیاں لکھنا چاہئیں کیونکہ ان افسانوں میں مقامی رنگ کی اتنی افراط ہوتی ہے کہ دوسرے علاقے کے پنجابی ان سے لطف اٹھا نہیں سکتے۔ مگر یہ کوئی صحیح تنقید نہیں۔ اس نے خود ان کا جواب دیا ہے "مشرقی پنجاب کے دیہات میرے افسانوں کے لئے صرف پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ اس میں رہنے بسنے والے انسان میرے افسانوں کے کردار ہیں۔ انسانی دل کی دھڑکن دنیا کے ہر حصے میں یکساں ہے۔ دکھ سکھ کا قانون ہندوستان کے دیگر حصوں اور دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی وہی ہے جو ان دیہاتوں میں رائج ہے۔

پہاڑوں کی پگڈنڈیوں اور ریگزاروں کے ٹیلوں کے ذکر سے میرا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ یہاں کے رہنے بسنے والے آدم کی نسل کے بجائے دوسرے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

اور حقیقت یہ ہے کہ ندیم کا دل خلوص، سچائی اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہے وہ جھوٹ موٹ بیان اور خالی خولی گرانی سے پرہیز کرتا ہے۔ موجودہ افسانہ نگاری خالی خولی قصہ گوئی نہیں رہی۔ موجودہ ادب نے حقیقت کو اپنایا ہے۔ ندیم چونکہ حقیقت نگار ہے اور حقیقت اسوقت ہی قابل اطمینان اور موثر ہو سکتی ہے جب تک کہ انسان کو مشاہدات تجربات حاصل نہ ہوئے ہوں ورنہ اس کے افسانے محض ہڈیوں کے ننگے ڈھانچے بنکر رہ جائیں گے اور پھر ترقی پسند ادیب تو صرف انسانی زندگی کی عکاسی کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی افسانہ نگاری وہی قدیم رجعت پسندانہ ہو گی جس میں زندگی کی مختلف کیفیتیں نہیں ہونگیں۔ ندیم کے تمام افسانے حقیقت نگاری کے بہترین مرقع ہیں اور اس نے نئے نئے رجحانات سے ان مرقعوں کو سنوارا ہے اور اسکی حقیقت نگاری میں سچائی کی وجہ سے ہی جاذبیت اور اثر موجود ہے۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتا ہے ان کو جوں کا توں بیان کر جاتا ہے اور وہ ایسا کرنے پر فطرتاً مجبور ہے لیکن اس نے حقیقتوں کی حدوں میں رہ کر زندگی کی تصویریں کھینچی ہیں!!!

اور پھر ایک ایسے انسان سے جس کا مشاہدہ شمال مغربی پنجاب کے دیہاتوں سے زیادہ ہو اس سے دوسرے علاقوں کے متعلق لکھنے کی تمنا کرنا بے سود ہے اور پھر اس سے دیہات میں رہ کر شہری افسانے لکھنے کی آرزو کرنا محض نادانی ہے۔ وہ خود کہتا ہے "میں نے بھٹے ہوئے ہونٹوں سے آہوں کے دھوئیں اٹھتے دیکھے ہیں۔ میں نے موت کی چڑیلوں کو تیرہ نصیب مریضوں کے سرہانے دانت کچکچانے اور انگلیاں چٹخاتے دیکھا ہے۔ میں نے زندگی کی لاش کو گلتے سڑتے دیکھا ہے۔ میں نے پھول کی نرم پتیوں پر کانپتے ہوئے اوس کی بوندوں کو اسقدر غور سے نہیں دیکھا جتنا گرد آلود پلکوں میں اٹکے ہوئے دھندلے آنسوؤں کو۔ میں نے کلکاریاں مارتے ہوئے ان امیرزادوں کی

ذوق و شوق

سفر دراز، قدم سست، اور مقام گناہ
اگر زمیں سے پیوست ہے غنودہ دماغ
بلندیوں کی جھلک ہے اگر ارادوں میں
کہ عزم پختہ ہو، وہ شعلۂ دریدہ زباں
غرض تلاش ہے مقصود، وہ ملے نہ ملے
اگر ہے روح میں اس کا تصورِ تاباں
مجھے یقین ہے یہ قافلہ نہ بھٹکے گا
طلب کی شمع چمکتی رہیگی نس نس میں
یہ کہسار، یہ میدان، یہ گھنے جنگل
کہ جب دلوں میں بھڑکتے ہیں ولولوں کے چراغ

الٰہی قافلۂ زندگی رواں ہی رہے
نگاہِ راہرواں سوئے آسماں ہی رہے
گلہ فضول سمجھتا ہوں نرم گامی کا
جسے شعور نہیں دردِ ناتمامی کا
ملے تو اسکا کرم، ورنہ میرا بس کیا ہے
تو نکہتِ چمن و ظلمتِ قفس کیا ہے
بھٹک گیا تو نہ چھوڑے گا جستجو اسکی
کہ زندگی کا سہارا ہے آرزو اسکی
یہ ذوق و شوق کی شدت یہ زہر کھاتے ہیں
تو ظلمتوں کے کلیجے جھلستے جاتے ہیں

احمد ندیم قاسمی

طرف زیادہ توجہ نہ دی جو گھر کے ہنڈولوں میں جھولتے ہیں بلکہ میں نے غریبوں کی اس معتی ملکتی اولاد کو نہایت قریب سے دیکھا ہے جس کی دھجیوں سے کچھ بدبو آتی ہے جس کی آنکھوں سے کئی دن کا متعفن خیز میل چپکا رہتا ہے جس کی ہستی میں مجھے غم و اندوہ کے بھتنے تالیاں بجاتے نظر آتے ہیں"

ندیم ہی پنجاب کا وہ پہلا کامیاب اور بڑا افسانہ نگار ہے جس نے پریم چند کی طرح اپنے پنجابی دیہاتوں کو اپنا محبوب موضوع بنالیا۔ ندیم سے پہلے کسی نے بھی پنجابی دیہاتوں کی اتنی اچھی تصویریں نہیں کھینچی تھیں۔ مگر ندیم نے اس کمی کو پورا کردیا۔ گو کہ ندیم کے ذہن میں دیہاتی افسانے لکھنے کی خواہش پریم چند کے افسانوں کے مطالعے سے پیدا ہوئی اور چوپال کے بعض افسانے پریم چند کی تکنیک پر لکھنے کی کوشش بھی کی ہے اور کامیاب رہا ہے مگر اس کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے اس کے کردار پریم چند کے کرداروں سے جدا ہیں۔ اس کی کہانیوں میں پلاٹ، موضوع، مقصد، زبان، اسلوب۔ سب کچھ پریم چند سے الگ ہے۔ مگر پھر بھی وہ پریم چند کی تکنیک کو ابتدائی دور میں آزماتا رہا — اور تیز ندی کی طرح آگے بڑھتا ہی گیا۔

ندیم کو اکثر نقادوں نے رومان پسند بھی کہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں کیونکہ اس کے بعض افسانوں میں رومانیت کی کرنیں جھلملاتی رہتی ہیں تو اس کا مقصد رومان پسندی نہیں اور پھر یہ رومانیت اتنی تلخ ہوا کرتی ہے کہ ہم ان افسانوں کو رومانی افسانے نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے تمام رومانی افسانوں میں رس اور مٹھاس کے بجائے کڑواہٹ اور تلخی ہوا کرتی ہے۔ "طلاقی مہر" "رانجھا" "تانو کی میاں" "جوانی کا جنازہ" "طلوع و غروب" "محدب شیشے میں سے"۔ ان تمام افسانوں میں رومانیت کی چاشنی ضرور مل جاتی ہے مگر ہر افسانے کے انجام میں تلخ ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اس کے رومانوں میں سنہری فضا کا ماحول نہیں ہوتا۔ ان میں خزاں کی سی ویرانی روتی رہتی ہے اور یہی ویرانی ندیم کو رومان پسند بننے سے جدا کرتی ہے۔

افسانہ "السلام علیکم" کی تلخی کو جس انداز سے اس نے ظاہر کیا ہے اس کی افسانہ نگاری کی خاص خصوصیت ہے۔ اس نے اس افسانے میں ایک انسان کی کمزور ہوس کا تجزیہ کیا ہے جو خود تو اپنی ہوس کاری کی خاطر غیر عورت سی پردیس میں ہم آغوش ہوتا ہے مگر جب خود اپنی بیوی کو غیر کے آغوش میں دیکھتا ہے تو چراغ پا ہو جاتا ہے۔ یہ مرد کی بہیمیت کا ثبوت ہے۔ اگر اس حقیقت نگاری سے کسی کا دل کڑھتا ہے تو کڑھا کرے ندیم اس کی پروا نہیں کرتا وہ خوش ہے کہ اس نے ایسے کمزور انسان کی کمزوری دکھلا دی!!!

ندیم کے اکثر افسانے عورت کی کمزور فطرت کا عکس کھینچتے ہیں اور عورت کی تباہی کی آواز لگاتے ہیں لیکن اس کے بیان میں خلوص ہے وہ عورت سے نفرت نہیں کرتا اور نہ اسکو ناگن جیسے زہریلے القاب سے مخاطب کرتا ہے۔ بگولے اور طلوع و غروب میں بھی اکثر جگہ اس نے عورت کی بربادی کا ذکر کیا ہے۔!!!

افسانہ "میرا دیس" میں ندیم نے ایک مجبور بے بس کسان کی لڑکی کا واقعہ بیان کیا ہے۔ جب لڑکی یہ جان جاتی ہے کہ اس کی زندگی صرف زمیندار جی کی ہوس کے سہارے زندہ رہ سکتی ہے تو وہ زمیندار کی ہوس کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے لیکن یہ کسی نفسی جذبے کے تحت نہیں کرتی۔ صرف مجبوری، بے بسی کی زنجیروں نے اس کو مجبور کردیا اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ندیم نے اس کے دل کی نفرت کو یوں بیان کیا ہے۔ "زمیندار جی آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ آپ میری جوانی چاہتے ہیں — تو لیجئے میری جوانی اور مجھے رخصت کیجئے کہ میرے بوڑھے ماں باپ کراہ رہے ہونگے۔ آپ کی یہ مہربانی کیا کم ہے کہ شام کی اس ذرا سی جسمانی محبت کا صلہ آپ یوں دے رہے ہیں کہ میرے بوڑھے باپ کو ایک بیگھہ زمین کاشت کے لئے دے رکھی ہے"

افسانہ طلوع و غروب میں بھی عورت کی بربادی کا بیان ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد کی ہوس ہی عورت کو بیسوا بنا دیتی ہے۔ اور کنبے کی شریف زندگی سے بازار کی آوارہ زندگی پر مجبور کردیتی ہے۔ مرد کی بیوفائی ہی کے یہ نمایاں نقوش ہیں۔ مرد اپنی جھوٹی فریب کارانہ محبت سے بھولی بھالی عورتوں کو اپنے قبضہ میں کرلیتا ہے اور پھر اس سے رس چوسنے کے بعد زندگی کی گندی نالی میں پھینک دیتا ہے۔ ندیم کے الفاظ میں "حقیقت یہ ہے کہ اب میں نرگس سے تنگ چکا تھا۔ فطرت انسانی سکون کی شیدائی ہوتے ہوئے بھی ایک خاص وقت میں سکون سے فرار بھی چاہتی ہے مجھے اس کے نرم بازوؤں میں فولاد کی سی سختی محسوس ہونے لگی جب اس کے بال میری باہوں پر لہراتے تو میرے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ جاتی جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہیں"

بعض نقادوں نے ندیم کو صحیح ترقی پسند نہیں کہا ہے ان کو شکایت ہے کہ ندیم "ادب برائے حیات" کی پوری پوری توضیح نہیں کرتا وہ ادب برائے فن کی طرف زیادہ مائل ہے۔ نقادوں کے اس بیان میں سچائی اور واقعیت ہے اور خود ندیم کو بھی اسکا اعتراف ہے کہ اس کے افسانوں میں کوئی سیاسی عقیدہ کارفرما نہیں ہوتا لیکن وہ ادب برائے حیات سے بھی دور نہیں۔ چوپال سے لیکر آنچل تک تمام افسانوں میں انسانی زندگی کے ہی واقعات تڑپتے نظر آتے ہیں۔ فن کی چابکدستی کے حسین جوہر بھی نمایاں ہیں اور ہر افسانہ نکھار اور جدت کا بہترین نمونہ ہے۔ بقول محترمی عبادت بریلوی "ندیم کے افسانوں کی تکنیک میں زیادہ نکھار ہے، زیادہ حسن ہے زیادہ سنبھلی ہوئی کیفیت ہے۔ اس کے فن میں وہی ایک سادگی معصومیت پائی جاتی ہے جو اسکے موضوع کی خاص خصوصیت ہے"

ندیم کے پچھلے تین مجموعے جن میں دیہات کا تذکرہ زیادہ ہے"۔ نوجوان گڈریوں اور دہقانی دوشیزاؤں کی غم گزیدہ مسکراہٹوں، آہوں، ناامیدیوں اور کھوکھلے

پھولوں میں جذبات کی حدت سے تپتے ہوئے دلوں اور وسیع کھیتوں کی ہریاول کے پردے میں آگ اور لہو کے سمندر۔ چمکنے والی دھندلی آنکھوں کے حسرت ناک تجزئے ملتے ہیں۔ ہر افسانے میں نوجوان دوشیزاؤں کے مثالی حسن کا بھی بیان ملتا ہے۔ دیہاتی نوجوانوں کے سینے میں تڑپتے ہوئے جذبات کی تصویر بھی ملتی ہے "وہ کہیں پر بدمست گھونگھٹ والیوں کا تذکرہ کرتا ہے جن کے کانوں کو نیلی نیلی بالیاں چومتی رہتی ہیں جن کی زلفوں میں گھٹاؤں کا سا رنگ ہے آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک ہے جن کے چلنے میں ہواؤں کا سا انداز ہے جن کے سینے چھلکتے ہوئے میکدے ہیں اور کہیں ایسے نوجوانوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کے انداز میں بانکپن جن کے افعال میں سادگی ہوتی ہے"۔

ندیم کے افسانوں میں اچھوتی پیاری پیاری تشبیہوں کی جدت بھی خوب ہوا کرتی ہے۔ وہ نئی نئی عجیب عجیب تشبیہوں سے افسانوں کو سنوارتا ہے۔ چند تشبیہیں ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) چوکیدار کی لڑکی بہت شرمیلی سمٹی سمٹی تھی جیسے گلاب کی کلی جو سورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے نجانے پتوں میں چھپ چھپ جائے (۲) اسکے گورے گورے پاؤں میں سبز جوتوں کے اوپر ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجن جو ہر قدم پر ایسا دلآویز چھناکا پیدا کرتی ہیں جیسے بے شمار کوئلیں نیم کے چھتناروں میں چھپی رک رک کر کوکو پکار رہی ہوں (۳) لڑکیوں کی تپلی تپلی آوازیں بلند ہوئیں جیسے کوئی سازندہ آٹھ دس سارنگیاں گود میں دبائے بیک وقت آٹھ دس تار کو جھنجھنا رہا ہو (۴) اس کی ہتھیلی کنول سے زیادہ گداز، اس کی انگلیاں نرگس کے ڈنٹھلوں سے زیادہ نازک تھیں ان میں ایسی ہی تھی خنکی بھی جیسے اس کے ہاتھ کی ساری رگیں لرز رہی تھیں اور میں اس کی لرزش کی آواز تک سن سکتا تھا جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کا طواف کرتے ہوئے سرسراتی بھنبھناتی ہیں (۵) اسکا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پچھلے سال بادلوں کے جھرمٹ میں عید کے چاند کا باریک تیلا تارہ (۶) بادل اس زور سے کڑکا جیسے سیلاب کی زد میں پہاڑ بہہ نکلے (۷) شانوں کی مچھلیاں ابھر آئیں جیسے لوہے کے تسمے لپیٹ دئے ہوں (۸) کنول کے ڈنٹھلوں میں نیلے بازوؤں کا لوچ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ساری کائنات اس کی باہوں کے گھیرے میں چھپے ہونے سے پریشان دل کی طرح دھڑک رہی ہے (۹) اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ یوں رکھے جیسے کانچ کی چوڑی پر کانچ کی چوڑی رکھی جاتی ہے (۱۰) اسکی دوشیزگی میں اچھوتا پن ہے جیسے اسے چھو لینا اس کی موت ہے (۱۱) جب بجلی چمکی تو مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے شیش محل پر پانی بھر گیا ہے (۱۲) گوندوں کے انبار سے صابی یوں نکلی جیسے گرد آلود صدف سے موتی اچھل پڑتے ہیں (۱۳) میں نے ہنسنا چاہا مگر گلے میں جیسے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی کرچیاں اٹک گئی ہوں۔ غرض اسکے اکثر افسانوں میں نئی نئی تشبیہیں ہوتی ہیں اور افسانہ ان ہی تشبیہوں سے حسین بنتا جاتا ہے۔

ندیم موجودہ افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ (اگر ادب میں صف اول کے واقعی کچھ معنی ہیں تو موجودہ مختصر افسانہ نگاری کی صف اول میں تین افسانہ نگار کرشن چندر، ندیم قاسمی اور سعادت حسن منٹو آسکتے ہیں"۔ اور یہ صرف میری اپنی پسند ہے کیونکہ ان تین افسانہ نگاروں نے موجودہ ہندوستان کی صحیح تصویریں پیش کی ہیں۔ اگر کسی بیرونی ملک کے نقاد کو ہندوستانی زندگی سے واقف ہونا ہو تو ان تینوں کے افسانوں کا مطالعہ کرے وہ ہندوستان کی غربت، افلاس، ہندوستانی حسن، دیہاتی شہری زندگی، مجبور عورت۔ غرض تمام زندگی کے پہلو وہ ان تینوں کے افسانوں میں پاسکیگا)

ندیم نے جتنا کچھ پنجابی دیہات کی افلاس، غربت، مجبوریوں کو بیان کیا ہے وہ ابھی بہت کم ہے کیونکہ ابھی زندگی کے بہت سے پہلو باقی ہیں۔ مگر افسوس کہ اس کے اس مختصر بیان پر بھی بعض نقاد اس کو محدود قسم کا افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اور اکثر نقادوں نے پیرزادہ سمجھ کر واعظ کا بھی خطاب دے رکھا ہے۔ مگر وہ واعظ نہیں اور نہ اس کے افسانے واعظانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اس نے خود لکھا ہے "میں نہ فلسفی ہوں، نہ سیاست داں، نہ واعظ۔ میں کہانیاں لکھنے والوں کے ہجوم کا ممبر ہوں۔ کہانیاں اسلئے لکھتا ہوں کہ لکھنے پر مجبور ہوں"۔

ندیم کے دیہاتی افسانوں میں دوشیزاؤں، نوجوانوں کی محبت، ناکامی کے علاوہ مختلف دیہات کے سماجی کارکنوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو غریبوں کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ "ندیم کے افسانوں میں غریب مزدور کا ذکر، پولیس کی ستم آرائی، سیٹھ ساہوکار کا ظلم، کسانوں کی مجبوری سے تمام مسائل اس کی افسانیت میں سما جاتے ہیں لیکن اس کے فن میں تصنع بناوٹ کا احساس تک نہیں ہوتا کیونکہ وہ صرف اپنے مشاہدات کو ہی بیان کرنیکا روادار ہے اور اس حقیقت نگاری سے ایسی بے ساختگی کا پتہ چلتا ہے جسکا خالق اسکا احساس اس کا خلوص ہے"۔

ندیم آج کل چونکہ معاش کی تنگدستی کی وجہ سے لاہور میں مقیم ہے اسلئے اس کے موجودہ افسانے دیہاتی ماحول کی عکاسی نہیں کر رہے ہیں کیونکہ اسکے مشاہدات آجکل صرف شہر کی فضاؤں میں ہوا کرتے ہیں اس لئے اس نے شہر کی زندگیوں اور فریب کاریوں کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ گرداب، سیلاب اور آنچل میں زیادہ تر شہری پس منظر کے تانے بانوں پر ندیم نے اپنے نئے افسانے سجائے ہیں۔ اب اس کی تکنیک میں بھی کافی نکھار اور تبدیلی ہوگئی ہے۔

اور اس نے کچھ المیہ افسانہ نگاری سے ہٹ کر مزاح نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ مگر اس کی یہ کوشش ناکام ہے۔ اس نے خود لکھا ہے "دراصل دھندلی سوچوں اور ذہنی پریشانیوں نے مجھے غیر محسوس طور پر مزاح نگاری کی طرف توجہ دلائی۔ میرے ابتدائی افسانے حزنیہ قصے تھے جن میں فریادوں اور موتوں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ دراصل ناکامیوں نامرادیوں کے (باقی صفحہ ۳۲ پر)

جب دہلی میں غدر پڑا تو

دہلی کے باکمال پیسہ پیسہ کو محتاج ہوگئے تو وہ راز جو صدیوں سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے بھوک سے لاچار ہوکر انھوں نے بتلانے شروع کر دیئے۔ غدر کی مصیبتیں اور فاقوں سے تنگ آئے ہوئے اہلِ کمال اپنا ہنر اور راز کوڑیوں میں فروخت کرتے پھرتے تھے۔ مغل بادشاہوں کے دسترخوان کے کھانے بھی راز تھے۔ اُس زمانے کے بڑے بڑے رؤسا اور جاگیردار اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح شاہی باورچی سے ان کھانوں کی ترکیبیں دریافت کریں۔ مگر وہ ناکام رہتے تھے:۔

رضیہ کا شاہی دسترخوان

بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے جو شاہی باورچی سے حاصل کی گئی تھی۔ اب اس کتاب کو جدید انگریزی و دیسی کھانوں کو ملا کر شائع کر دیا گیا۔ اسمیں ہر قسم کے ناشتے، آئس کریم، فالودہ، کیک، شاہی ٹکڑے، مختلف قسم کی لذیذ روٹیاں، مزیدار پوریاں، پکوان، حلوے بیسیوں قسم کی دالیں، کھچڑی، انڈے، خاگینہ، قورمہ، کباب، مرغ مسکار، یخنی، دہلی کی مشہور نہاری، سبزیاں، نرگسی کوفتے، مچھلی کے سالن اور کباب، قیمہ، پلاؤ، مختلف اقسام، انگریزی و دیسی مٹھائیاں، نشاستہ، حلوہ سوہن، پھینیاں، سب قسم کے مربے اور چٹنیاں، بیسیوں قسم کی چائے، کافی، شربت، ۴۰ قسم کے انگریزی کھانے، گوشت کی مٹھائیاں، کیلے کا سالن، شاہی مچھلی، غرضکہ کھانا پکانے کی ایک بہترین کتاب ہے۔ ڈھائی سو صفحات۔ قیمت :۔ مجلد۔ ڈھائی روپے (عہ۸)

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری کشیدہ کاڑھنے کی بہترین کتاب جسمیں سینکڑوں قسم کے پھول بوٹے، اور کشیدہ کے سینکڑوں نمونے اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔ قیمت: مجلد تین روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک۔

رضیہ کے خطوط :۔ زنانہ خطوط بہ طرز جدید۔ لکھائی، چھپائی نہایت عمدہ۔ قیمت:۔ ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ۸) محصول بذمہ خریدار

نیا کتاب گھر۔ اُردو بازار (اے۔ سی) دہلی

برطانیہ کے کھیل

ایرک پارکر

کبھی کبھی یہ بات دوسری قوموں کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ انگریزوں میں میدانی کھیلوں کا شوق اہم قومی خصوصیت بن چکا ہے لیکن اس کی وجوہات بہت معمولی ہیں۔ انگریز قوم جسمانی قوت اور تندرستی کو پسند کرتی ہے۔ انہیں کھلی ہوا میں کسرت کرنے میں بڑا لطف آتا ہے وہ ہاتھوں کی پھرتی اور صفائی، بینائی کی تیزی اور تیز رفتاری کی بہت قدر کرتے ہیں۔ کھیل میں ان تمام صلاحیتوں کا امتحان دینا ہے سب طبقے کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انگلستان کے اسکولوں میں انہیں ترقی دی جاتی ہے۔ خود لڑکے ان میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ انہوں نے ہی کھیل ایجاد کئے ہیں اور نسل بعد نسل رائج چلے آتے ہیں۔ یہ ان کا طبعی شوق ہے جس پر اسکولوں کے ماسٹر نہ صرف جسمانی بلکہ اخلاقی اہمیت کی وجہ سے زور دیتے ہیں۔ اسطرح سارے انگلستان کے لڑکوں اور نوجوانوں میں کھیلوں کا شوق، دیانتداری اور تعاون کا احساس پیدا کرایا گیا ہے اور پھر کھلے میدانوں میں کھیلنے سے مردوں اور عورتوں کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے صحتمند جسم میں صحتمند دماغ کا یونانی مطمع نظر ایک اوسط انگریز سے زیادہ کسی کو مرغوب نہیں ہے۔ ہر انگریز موت کے دن تک کسی نہ کسی طرح کی ورزش کرتا رہتا ہے۔

برطانیہ میں جو کھیل کھیلے جاتے ہیں ان میں خاص خاص یہ ہیں۔

کرکٹ۔ سب کھیلوں میں کرکٹ کا کھیل برطانیہ سے خاص نسبت رکھتا ہے یہ کھیل کب کھیلا جانا شروع ہوا اس کا پتہ تو نہیں چل سکا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ شروع شروع میں لڑکوں اور مردوں کا سیدھا سادا کھیل ہوگا۔ یعنی ایک گیند اور اس کا نشانہ لگانے کے لئے ٹھنٹھ اور گیند کو مارنے کے لئے لکڑی کا ڈنڈا وغیرہ استعمال ہوتے ہوں گے۔ قدیم زمانہ کا یہ سیدھا سادا کھیل ترقی کرتے کرتے موجودہ حالت کو پہنچ گیا ہے۔ یہ دو سو برس سے زیادہ زمانہ سے مخصوص قواعد کے مطابق کھیلا جا رہا ہے اور کھیل کے سامان کی پیمائش بھی مقرر ہے۔ برطانیہ میں گرمیوں بھر ہر جگہ کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ یہ کھیل برطانوی نوآبادیات میں بھی ہر جگہ کھیلا جاتا ہے اور وقتاً فوقتاً انگلستان آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، جنوبی افریقہ اور مغربی جزائر الہند کے درمیان میچ بھی ہوتے رہتے ہیں۔

فٹ بال۔ فٹ بال برطانیہ میں نہ جانے کب سے کھیلی جا رہی ہے لیکن شروع شروع میں اس کی کوئی ترقی یافتہ صورت نہیں تھی اور نہ کچھ قواعد تھے۔ بہت سے کھلاڑی دو پارٹیوں میں بٹ جاتے تھے۔ ایک طرف کے کھلاڑی غلط یا صحیح طریقوں سے غرض جس طرح بھی ہو سکتا تھا گیند کو زمین کے ایک حصہ سے، جو گول کہلاتا تھا، گزارنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری طرف والے انہیں ایسا کرنے سے روکتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کھیل میں باقاعدگی آتی گئی اور حادثات اور بے ڈھنگا پن دور ہو گیا۔ یہ عوام کے اسکولوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا جنہوں نے اپنے قواعد بنائے اور ضابطے قائم کئے۔

آجکل برطانیہ میں دو طرح کے قواعد کے مطابق فٹ بال کھیلی جاتی ہے (۱) رگبی (۲) الیوسی ایشن۔

ان دونوں میں خاص فرق یہ ہے کہ رگبی کے قواعد کے مطابق گیند کو پیروں اور بازوؤں دونوں سے لیجایا جا سکتا ہے لیکن الیوسی ایشن کے قواعد کے مطابق صرف پیروں سے کھیلا جاتا ہے۔ رگبی کے مطابق صرف غیر پیشہ کھیلتے ہیں جبکہ الیوسی ایشن کے قواعد کے مطابق پیشہ ور اور غیر پیشہ ور دونوں کھیلتے ہیں۔ پیشہ ور کھلاڑی اداکاروں کی طرح اپنے کھیل کی نمائش ہی سے روزی پیدا کرتے ہیں۔ انگلستان میں اس قسم کے میچ بڑے شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس سال کے سب سے بڑے میچ میں جس میں دو بہترین ٹیمیں کھیلی تھیں، ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی موجود تھے۔

گالف۔ برطانیہ میں گیند کے دو اور کھیل ہر دلعزیز ہیں۔ ان میں ایک گالف ہے جس کی ابتدا شاید ہالینڈ میں ہوئی تھی لیکن یہ سولھویں صدی سے اسکاٹلینڈ میں کھیلا جا رہا ہے۔ پہلے زمانے میں اسکاٹلینڈ کی ملکاؤں اور بادشاہوں کو اس کھیل کا بہت شوق تھا اسلئے یہ ایک زمانہ سے شاہی اور قدیم کھیل کہلاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی انڈیا ربڑ کی گیند اور طرح طرح کی چھوٹی بڑی لکڑیوں سے کھیلا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا کہ کم سے کم ٹھوڑے مار کر گیند کو زمین سے چار میل لمبے راستے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا جائے۔ یہ کھیل برطانیہ میں ۱۸۸۰ء کے بعد سے زیادہ مشہور ہوا ہے لیکن تب سے اس نے بہت ترقی کی اور اب یہ برطانیہ کی طرح امریکا اور دوسرے ملکوں میں بڑے شوق سے کھیلا جاتا ہے۔

لان ٹینس۔ لان ٹینس کا کھیل بھی برطانیہ میں بہت ہر دلعزیز ہے۔ یہ ایک قدیم فرانسیسی کھیل کی میدانی نقل ہے جو گھر میں کورٹ بنا کر کھیلا جاتا تھا۔ لان ٹینس گھاس کے کورٹ پر کھیلا جاتا ہے جو ۷۸ فٹ لمبا اور ۳۶ فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ بیچ میں تین فٹ اونچا جال لگتا ہے۔ انڈیا ربڑ کی گیند کو جال کے اوپر سے گزارنا ہوتا ہے جس طرف گیند رہ جاتی ہے وہ ہار جاتا ہے لان ٹینس ٹورنامنٹ ہر سال لندن کے قریب ومبلڈن میں ہوتے ہیں جن میں ساری دنیا کے کھلاڑی شریک ہوتے ہیں۔

گھوڑ دوڑ۔ گھوڑ دوڑ کا ذکر کئے بغیر برطانوی کھیلوں کا ذکر ناقص رہ جائیگا۔ ڈربی میں دنیا کی سب سے عظیم الشان گھوڑ دوڑ ہوتی ہے۔ پہلے پہل لوگوں میں سترھویں صدی میں گھوڑ دوڑ کا شوق تمام ہوا کیونکہ چارلس دوم (۱۶۶۰ - ۱۶۸۵ء) خود اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر دوڑ میں حصہ لیا کرتا تھا۔ ڈربی میں زمانہ امن میں ہر سال گھوڑ دوڑ ہوتی ہے۔

باقی صفحہ ۸۲ پر

زمانۂ جنگ میں مشرقِ وسطیٰ سے ہندوستان کی تجارت

مشرقِ وسطیٰ کے مختلف ملک کے اعداد و شمار سے محسوب کرتے ہوئے کل رقوم کو روپے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

ا۔ عراق

سال	ہندوستان سے	ہندوستان میں
۴۰-۱۹۳۹	۵۹,۷۰,۶۸۲ روپے	۹۸,۷۰,۸۱۳ روپے
۴۱-۱۹۴۰	۹۲,۵۳,۳۹۶ 〃	۴۸,۸۲,۴۹۰ 〃
۴۲-۱۹۴۱	۳,۲۵,۲۶,۷۵۴ 〃	۱,۰۲,۸۴,۰۶۹ 〃
۴۳-۱۹۴۲	۷,۹۴,۰۷,۰۰۴ 〃	۲۲,۹۰,۷۳۵ 〃

ب۔ شام

سال	ہندوستان سے	ہندوستان میں
۴۰-۱۹۳۹	۱۹,۳۳,۷۰۲ روپے	۱۱,۷۵۱ روپے
۴۱-۱۹۴۰	۳,۲۸,۰۰۱ 〃	۴,۵۸۵ 〃
۴۲-۱۹۴۱	۷۲,۲۰,۴۵۷ 〃	۲۱ 〃
۴۳-۱۹۴۲	۲,۱۹,۶۵,۴۲۰ 〃	.... 〃

ج۔ فلسطین

سال	ہندوستان سے	ہندوستان میں
۴۰-۱۹۳۹	۲۸,۵۴,۰۷۸ روپے	۱,۵۰,۸۲۹ روپے
۴۱-۱۹۴۰	۳۷,۳۰,۸۴۶ 〃	۱,۹۰,۵۲۹ 〃
۴۲-۱۹۴۱	۲,۴۶,۵۸,۲۳۳ 〃	۱,۳۰,۷۳۷ 〃
۴۳-۱۹۴۲	۱,۹۷,۲۱,۵۰۳ 〃	۸,۹۲,۱۱۴ 〃

د۔ ترکی

سال	ہندوستان سے	ہندوستان میں
۴۰-۱۹۳۹	۲۶,۱۰,۵۷۹ روپے	۱,۶۵,۹۸۲ روپے
۴۱-۱۹۴۰	۱۸,۰۱,۵۲۶ 〃	۲۸,۲۶۴ 〃
۴۲-۱۹۴۱	۴۸,۱۳,۱۱۴ 〃	۷,۴۲۸ 〃
۴۳-۱۹۴۲	۱,۵۹,۶۵,۹۳۱ 〃	....

ہ۔ ایران

سال	ہندوستان سے	ہندوستان میں
۳۹-۱۹۳۸	۶۸,۳۷,۱۵۱ روپے	۳,۴۸,۸۴,۲۰۸ روپے
۴۰-۱۹۳۹	۶۹,۴۳,۴۸ 〃	۳,۱۰,۱۹,۴۰۶ 〃
۴۱-۱۹۴۰	۵۷,۱۸,۱۱۶ روپے	۳,۴۰,۴۵,۶۳۸ روپے
۴۲-۱۹۴۱	۱,۲۳,۹۴,۹۳۵ 〃	۶,۰۳,۸۹,۵۶۰ 〃
۴۳-۱۹۴۲	۴,۲۵,۶۹,۶۲۱ 〃	۱۷,۸۰,۸۶,۹۱۸ 〃

و۔ بحرین

سال	ہندوستان سے	ہندوستان میں
۳۹-۱۹۳۸	۲,۳۳,۶۹,۱۳۰ روپے	۱,۶۶,۸۴,۲۹۰ روپے
۴۰-۱۹۳۹	۱,۷۹,۹۳,۰۳۰ 〃	۹۹,۹۱,۱۳۰ 〃
۴۱-۱۹۴۰	۱,۴۵,۹۰,۷۹۰ 〃	۸۸,۷۵,۹۲۰ 〃
۴۲-۱۹۴۱	۱,۴۴,۰۸,۱۴۰	۱,۱۱,۰۸,۳۹۰ 〃

ز۔ مصر

سال	ہندوستان سے
۱۹۳۹	۷۹۲,۰۰۰ پونڈ
۱۹۴۰	۱,۲۴۶,۱۳۱ 〃
۱۹۴۱	۳,۱۸۲,۰۹۱ 〃
۱۹۴۲	۷,۶۰۰,۶۲۷ 〃

ح۔ سوڈان

سال	ہندوستان سے	ہندوستان میں
۴۰-۱۹۳۹	۲۵,۹۸,۴۲۶ روپے	۱,۲۴,۱۳,۳۱۱ روپے
۴۱-۱۹۴۰	۲۸,۷۳,۳۰۱ 〃	۲,۰۶,۴۱,۱۲۳ 〃
۴۲-۱۹۴۱	۱,۳۳,۵۲,۰۲۳ 〃	۳,۶۶,۷۶,۹۲۷ 〃
۴۳-۱۹۴۲	۲,۰۰,۵۶,۲۵۴ 〃	۳,۰۵,۱۳,۷۹۲ 〃

ط۔ عرب

	۴۲-۱۹۴۱		۴۳-۱۹۴۲	
	ہندوستان سے	ہندوستان میں	ہندوستان سے	ہندوستان میں
سعودی عرب	۷۷,۶۰,۸۴۲	۲,۹۸,۳۳۲	۱,۳۸,۲۹,۹۱۶	۳,۰۷,۹۶۸
یمن	۸۰,۸۶۹	....	۲۰,۵۶۰	....
کویت	۵۹,۱۴,۲۸۰	۳,۵۱,۲۱۶	۱,۰۳,۳۴,۱۲۶	۶,۲۹,۹۲۹
مسقط و عمان	۶۰,۹۴,۹۹۴	۲,۴۰,۵۱,۶۹۳	۱,۶۳,۴۸,۹۸۶	۲۳,۲۸,۸۰۶

(”انڈین ٹریڈ بلیٹن“ سے ماخوذ)

ماں

افسانہ

محمد محسن

ماں کی اچانک موت نے اس کے حواس مختل کر دیئے تھے۔ نہ جانے اس کے قلب میں یک بیک کیا روگ ہو گیا تھا؟ چند گھنٹے تو وہ بیمار رہی۔ وہ اچھی طرح علاج نہ کرا سکا۔

ماں کے سوا دنیا میں اس کا کون تھا۔ باپ اسے ماں کے پاس چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ اپنی تنہا نشانی! جبھی تو ماں اسے اس قدر چاہتی تھی۔ ایک لمحہ کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ اس کی پڑھائی بھی اسی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔ محلہ والوں سے اس کی ملاقات بس باہر باہر سے تھی۔ جب ماں زندہ تھی اسے کسی کی حاجت نہ ہوتی تھی

جب اس کا باپ مرا تھا وہ ایک سال کا ہی تو تھا۔ باپ کے وجود کا اسے حس تک نہ تھا۔ وہ صرف ماں ہی کو جانتا تھا۔ ماں ہی اس کی دنیا تھی۔ ماں نے اسے پروان چڑھایا تھا۔ لیکن اب ماں بھی چل بسی تھی۔ دنیا میں اسے تنہا چھوڑ کر! وہ گھر سے بیزار ہو گیا تھا۔ گھر کا چپہ چپہ اسے ماں کی یاد دلاتا رہتا۔ ایک دل خراش یاد! جیسے اندھیری رات میں تند ہوا کی کراہ فضا میں لرزہ پیدا کر دیتی ہو۔ گھر اسے کاٹنے لگا تھا۔ اژدہے کی طرح بھیانک! اس نے اس کی ماں کو ہضم کر لیا تھا۔ اسی گھر کے اندر تو اس کی ماں آنکھیں موند کر کھو گئی تھی!

وہ دن دن بھر گھر سے باہر آبادی سے باہر سنسان میدانوں میں مارا مارا پھرتا۔ لیکن ماں کی یاد ایک منٹ کے لئے اس سے الگ نہ ہوتی۔ بازار کی سڑکوں سے گذرتے ہوئے سودا والوں کی چیخ پکار اور میدان میں آزاد ہواؤں کے شور سب کے اندر اسے ماں کی آواز سنائی دیتی جیسے یہ سب اس کی ماں کو نگل رہے ہوں اور اس کی کراہ فضا میں تڑپ رہی ہو۔ وہ اندھیری رات میں آنکھیں پھاڑے ندی کے پل پر پہروں بیٹھا رہتا جیسے کسی کا منتظر ہو یا کسی دور سے آنے والے کو تک رہا ہو۔ ندی کا سست رفتار پانی اپنی مدھم سروں میں اس کی ماں کی ہمنوائی کرتا ہوتا۔ مرغابیوں اور لطخوں کی آواز میں اسے اپنی ماں کی پکار سنائی دیتی پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اسے چوکنا کر دیتی۔ اسے ماں کی آہٹ سنائی دیتی!

وہ شہر شہر گھومتا پھر رہا تھا۔ بنارس، لکھنؤ، الہ آباد، کانپور کہیں بھی اس کا جی نہ لگا تھا۔ تاج محل کی عالمگیر دلفریبی بھی اس کا غم نہ غلط کر سکی۔

وہ پرانی دلی میں کھنڈروں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ دھنسے مقبروں اور شکستہ حال مسجدوں کے گنبد کے نیچے وہ پہروں بیٹھا رہتا۔ ویسی ہی ایک قبر میں اس کی ماں بھی تو سما گئی تھی۔ قبروں کے شکم سے اس کی ماں کی روح اسے پکارتی سنائی دیتی۔ وہ محویت کے عالم میں ماں کی آواز پر کان لگا دیتا۔

یونہی مارا مارا پھرتا وہ نظام الدین اولیا کی طرف آ نکلا تھا۔ ایک شکستہ حال کھپریل سائبان کے سامنے لکڑی کے دو بنچ اور ٹین کی تین کرسیاں پڑی تھیں۔ بنچ پر دو بڈھے بیٹھے ٹانگیں ہلا رہے تھے۔ ان کی خمدار ٹانگیں ننگی تھیں اور کرتے کی جگہ میل کی کھر دری تہہ نے لے رکھی تھی۔ پسلیوں کی ہڈیاں ابھرے ہوئے خطوط کی طرح پھیلتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی سے مل کر چیک ڈیزائن بنا رہی تھیں میل کے رنگ کے ڈھیلے پائجامے کمر سے لٹک کر زمین کی سطح پر پاؤں ملا نے وقت جھاڑو پھیر رہے تھے۔ سائبان میں دیوار کے بکس پر پانچ چینی کی چیٹ لگھڑی چائدانی، چائے کی تین پیالیاں اور ایک چینی کا مرتبان رکھا تھا۔ چینی کی مٹی سطح پر چیونٹوں کی لاشیں بے ترتیب ابھری ہوئی تھیں۔ پیٹ کی آگ نے انھیں بھی موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ برفانی میدانوں میں لڑنے والے سپاہی بھی اسی طرح برف کی سفید چادروں سے ہاتھ پاؤں نکالے الٹے سیدھے پڑے رہتے ہوں گے!

دونوں نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "درگاہ شریف کی زیارت کو آئے ہو؟ کچھ کھاؤ گے بھی؟ ٹھنڈا گرم گوشت روٹی ہمارے یہاں ہر وقت تیار رہتا ہے"۔ ایک بڈھے نے ذرا رعب ڈالتے ہوئے کہا۔ آخر وہ ہوٹل کا مالک تھا!

اس نے ایک گلاس شربت پیا اور درگاہ کے رستہ کا نشان لے کر آستانہ پر آکر ٹھہر گیا۔ ماں سے اس نے حضرت نظام الدین اولیا کے کرامات کی بہتیری داستانیں سنی تھیں۔ وہ سب ایک ایک کر کے اس کے حافظہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت اس کے دماغ سے ماں کا خیال نکل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ جیسے کوئی سفر کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہو۔ اس کے دل میں عقیدت کی حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ درگاہ کے آستانہ پر ہی زندگی گزار دے۔

درگاہ کا مجاور آنکھوں پر ہاتھ رکھے درگاہ کے سائبان میں چت پڑا تھا۔ اس کا سر نہ تو پورا گنجا تھا اور نہ پورے سر میں بال تھا بلکہ تھوڑی تھوڑی دور پر بال کی کھونٹیاں جمی ہوئی تھیں۔ جیسے ندی کے رتیلے ساحل پر سرکنڈوں کی جھاڑیاں دور دور پر اگ آتی ہیں۔ پائجامہ کی مہریاں اوپر تک اٹھی ہوئی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس کی سوکھی سوکھی ٹانگیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک ٹانگ گھٹنہ سے مڑی ہوئی سیدھی کھڑی تھی اور دوسری زاویہ بناتی ہوئی ایڑی کے سہارے پہلی کے گھٹنہ پر ٹکی ہوئی تھی۔ جیسے کسی شکستہ قلعہ کا صدر دروازہ جس کے اوپر کا ستون بے قاعدگی سے نیچے کے کھمبوں کے سہارے پڑا ہوا ہو۔ شاید وہ اپنی خستہ حالی کا نشان بنائے ہوئے تھا! وہ اپنی تنگ حالی پر ہی تو غور کر رہا تھا! ڈیڑھ سیر کا چاول ڈیڑھ روپیہ

گزار کیں۔ جیسے ایک بیوی گھر کی چھپر پر برسات کی پہلی جھڑی کی منتظر۔ جوان بیٹی بر کی تلاش بہ زمانہ کا رنگ۔ وہ سوچتا تھا اور تھوڑی دیر پر کھمبوں سے دق آکر ہاتھ کی گردش سے ایک نیم دائرہ بناتا جاتا۔ اتنے کھانے والے اور اس کی ایک ذات کے سہارے! اس پر لوگوں کی عقیدتمندی کو کچھ اس بری طرح گھن لگ رہا تھا کہ دو دو چار چار دن نہ کوئی زیارت کو آتا نہ منت مراد پوری کرنے۔ اسے وہ ملا یاد آ گیا۔ اونچی مہریوں کا پائجامہ پہنے لمبی ڈاڑھی کو جنبش دیتا ہوا اندر نیاز کے خلاف وعظ کہہ رہا تھا۔ آواز کیسی بھدی تھی اس مردود کی جیسے برسات میں بینگ ٹر ٹر ا رہا ہو۔ ان وہابیوں سے خدا سمجھے۔ جانے انھیں بزرگان دین سے کون سی للّہی عداوت چلی آتی ہے۔ کمبختوں نے ایسا جال پھیلا رکھا ہے کہ صوفیائے کرام کی رہی سہی وقعت نگاہوں سے گرتی جا رہی ہے۔ بڑھے کے وعظ کا وہ حصہ نشتر کی طرح اس کے دماغ پر ابھرنے لگا۔ ان خانقاہوں میں قبر پرستی ہوتی ہے۔ شرک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بدعتوں کا رواج پڑتا ہے۔ جیسے مذہب کی ٹھیکہ داری انھیں کے حوالے کی گئی ہے۔ قرآن حدیث طوطے کی طرح رٹ کر قابل بنے پھرتے ہیں۔ دنیا میں جیسے کوئی اور کام نہیں کہ بیچارہ جھاڑ کر ہم مجاوروں کی روزی کے پیچھے پڑے ہیں۔ آخر یہ دھندا بند کر دیں تو انھیں پوچھتا ہی کون۔ پکڑ پکڑ کر کوٹھریوں میں انھیں بند کر دیا جائے تب انھیں معلوم ہو کہ غریب مجاوروں کو بھی بھوک ....

ایک مکھی اس کے بھنچے ہوئے لبوں کے درمیان کی کھائی میں سیر کرتی ہوئی کھجلاہٹ پیدا کرنے لگی۔ جیسے ٹینک چلنے میں زمین کانپنے لگتی ہو۔ خیالات کی رو دفعتاً رک گئی اور اس نے اپنے منہ پر چپٹ سے ایک طمانچہ لگایا۔ وہابیوں کے خلاف بھڑکے ہوئے جذبات کی تسکین کے لئے کوئی سبیل تو ہونی ہی تھی!

وہ درگاہ کی چوکھٹ سے لگا محویت کے عالم میں کھڑا تھا۔ مجاور کی نظر جو ہاتھ اٹھانے کی وجہ سے آزاد ہو گئی تھی اس پر پڑی وہ سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور للکار کر کہنے لگا۔ آیئے آیئے۔ مولا کا دربار ہے۔ اندر داخل ہو جیئے مزار شریف کی زیارت کیجئے۔ کچھ نذر چڑھایئے۔ میں الائچی دانوں کا انتظام کر دوں گا۔ یا جیسی آپ کی مرضی۔ اس دربار سے آج تک کوئی محروم نہیں گیا جو آیا منہ مانگی مراد پائی۔ مجاور نے اس کے قیافہ سے اس کی عقیدت کا جوش بھانپ لیا تھا۔ حضرت کے نام پر کچھ رقمیں اینٹھ لینے کی امید اس کے چہرے پر چمکنے لگی۔ ایسے ہی سادہ لوح عقیدتمندوں کی کمی کا تو وہ دکھڑا رو رہا تھا۔

وہ مجاور کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ مجاور نے اسے قبروں کی تفصیلات بتائیں۔ وہ حضرت اولیا کی قبر کے پاس کھڑا ہو کر مشتاقانہ نگاہوں سے جالیوں کے سوراخ سے تاکنے لگا جالیوں میں زنگار رنگ چیتھڑے بندھے تھے۔ لال پیلے ہرے اور جانے کتنے رنگوں کے۔ رنگ رنگ کی آرزوئیں بھی تو ان سے لپٹی ہوئی تھیں! بلکتا بسورتا گھناؤنا لوتھڑا گود میں ڈھوئے پھرنے کی آرزو۔ دولت اور ہوسناکی کی قربانگاہ پر کمسن دوشیزاؤں کی بھینٹ قبول ہونے کی تمنا۔ بیواؤں کا مال ہڑپ کرنے کے لئے شوہر کی عدالتی کارروائیوں میں کامیابی کے ارمان۔ ایسے ہی کتنی تمنائیں تھیں جو اپنی تسکین کے لئے مضطرب مقبرہ کی فضا میں گڈمڈ ہو کر ایک انتشار سا پیدا کرتی رہتی ہوں گی۔ جیسے کہیں نئے کھیل کی آمد پر سینما میں تھرڈ کلاس کے ٹکٹ خریدنے والے۔ بعض پر حضرت اولیا کی نظر کرم ہو جاتی ہو گی لیکن زیادہ تر مچل مچل کر جالیوں کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر ہی تمام ہو جاتی ہوں گی۔ اس بدنصیب ملک میں ان کراہتی دم توڑتی پامال آرزوؤں کی بہتات فضا کے ذرات سے بھی اوپر ہے۔ آرزوؤں کے کھیت کے کھیت ہیں۔ مزدوروں کی آرزوئیں کسانوں کی آرزوئیں۔ یتیموں کی آرزوئیں۔ بیواؤں کی آرزوئیں اور جس طرح جنگ کا عفریت ہری ہری فصلوں کو بیدردی سے روندتا ہوا نکل جاتا ہے اسی طرح یہ آرزوئیں بھی کچلی جا کر پھولنے پھلنے سے پہلے مدفون ہوتی چلی جا رہی ہیں....

قبر پر تازہ پھولوں کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ فضا ان کی شمیم سے معطر ہو رہی تھی پھولوں کی خوشبو اس کے دماغ میں رس کر ایک غیر معمولی بہجت اور سکر کی کیفیت پیدا کر رہی تھی جیسے وہ کسی ایسے ذہنی عالم میں پہنچا دیا گیا ہو جہاں حسیات کی مکمل بیداری سوجھ بوجھ اور فکر کی پراگندگی کو بھٹکنے نہ دیتی ہو۔ ایک وجدانی کیفیت کی سرشاری!

اسے اپنی داہنی جانب سے دفعتاً ایک آہٹ سنائی دی۔ ایک سیاہ پوش عورت اس کے بازو سے لگی کھڑی تھی اس کے سر کے بال پشت پر لہرا رہے تھے اور اس سادہ لیکن نظر فریب صورت پر خلوص اور عقیدت کی چمک نمایاں تھی۔ وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جالی پکڑے قبر کو ٹکٹکی لگائے تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو قندیلیں پھوٹ رہی تھیں۔ سورج کی ایک بیباک کرن ان میں ہیرے کی چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔ وہ چھپکلی کی طرح جالی سے چمٹی ہوئی تھی۔ اگر جالی اسے روک نہ دیتی تو شاید وہ قبر سے جا کر لپٹ جاتی۔

وہ اس عورت کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق کی جھلک تھی جیسے کوئی بھولا بسرا سپنا دوبارہ تازہ ہو رہا ہو یا اسے کسی دوسرے عالم میں پہنچا دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی ہو رہی تھیں اور لب کھلے ہوئے تھے۔ پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں اور چہرہ پر استعجاب نے ہلکا چمپئی رنگ بھر دیا تھا اسے عورت کے چہرہ سے ایک روشنی دائرہ بناتی ہوئی فضا میں پھیلتی دکھائی دے رہی تھی! وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ ماں کا غم، مقبرہ کی عظمت، اولیا کا تقدس!

عورت تھوڑی دیر میں واپس جانے لگی۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے چلنے لگا جیسے وہ کسی غیر محسوس طریقہ سے عورت کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔

عورت درگاہ سے نکل کر تانگہ پر سوار ہو گئی وہ بھی ایک دوسرے خالی تانگہ پر بیٹھ کر عورت کے پیچھے لگ گیا۔

عورت کا تانگہ چاوڑی میں آ کر رکا۔ اس نے بھی اپنا تانگہ روک دیا۔ عورت تانگہ سے اتر کر سڑک کے کنارے ایک دوکان کی بغل سے تنگ دروازہ میں داخل ہو گئی اور سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ اس نے اسے سیڑھیوں سے چڑھتے دیکھا اور تانگہ چھوڑ کر وہاں سے واپس ہو گیا۔ نہ جانے تانگہ والے نے اسے پاگل سمجھا یا اوباش!

وہ چند قدم چل کر پھر دفعتاً عورت کے کوٹھے کی طرف مڑ گیا اور نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ایکبارگی اس کے پاؤں تھام لئے گئے ہوں۔ وہ دیر تک دروازہ سے لگا کھڑا رہا۔ سیڑھیوں کو آنکھیں پھاڑے تکتا ہوا۔ جیسے سمندر پار سے ٹوٹا ہوا سپاہی ساحل کی بندرگاہ کو دور سے نظریں جمائے دیکھ رہا ہو۔ پھر اس کی ٹانگوں میں یکایک حرکت پیدا ہو گئی اور سیڑھیوں سے اوپر چڑھنے لگا۔

شاما بیٹھی اپنی زندگی کو سوچ رہی تھی۔ اس قسم کے دن بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ مشکل سے کوئی بھولا بھٹکا گاہک اب آ نکلتا تھا۔ روٹی چلنا دشوار تھا۔ ایک اندھی ماں اور دو یتیم بھائیوں کی پرورش۔ تہوار کو چند ہی دن تو رہ گئے تھے۔ دونوں بچے صبح شام قمیص اور جوتوں کے لئے اس کی جان کھائے ہوئے تھے۔ آخر وہ انھیں کب تک یوں بہلاوہ میں رکھ سکے گی؟ ماں کے طعنے الگ سننے پڑتے تھے کہ اسے پیشہ کا ڈھنگ نہیں آتا۔ کاش ماں کی آنکھیں ہوتیں اور وہ اس غبار کو دیکھ سکتی جو اس کی اُمڈتی ہوئی جوانی اس کے چہرہ پر چھوڑتی جا رہی تھی۔ مینا کون بڑی آنکھ ناک کی ستھری ہے کہ جب دیکھو اس کے کوٹھے پر ٹھٹ لگا رہتا ہے۔ کوئی آدمی آپ اپنی تقدیر کے پیچھے لگ جائے تو اس کا کیا علاج؟ لیکن ماں بھول گئی تھی کہ مینا اس سے دس سال چھوٹی تھی۔ وہ ماں کو یہ بات تو کبھی نہ کہہ سکتی تھی۔ اپنی عمر کو سوچتے ہی اس کا سر چکرانے لگتا تھا۔ وہ اسے زبان تک کس طرح لا سکتی؟ ان بچوں کو وہ آج کس طرح ٹالے گی۔ آج تو وہ روپیہ لئے بغیر اس کی جان نہ چھوڑیں گے۔ وہ انھیں دے گی کہاں سے؟ کیا یہ بیاہی بھی انھیں نئے جوڑے نصیب نہ ہوں گے؟ اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ڈھلک کر اس کی گود میں سما گئے۔ کرایہ ابھی تو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کئی ماہ سے وہ ایک کوڑی نہ دے سکی تھی۔ اب کے نہ دے سکی تو شاید کوٹھا چھوڑنا پڑے۔ پھر ماں اور بچے کہاں رہیں گے؟ وہ خود کہاں رہے گی؟ کسی تنگ و تاریک گلی کے اندر۔ وہاں اس کا روزگار کیونکر چلے گا۔ یہاں تو روٹی کا خرچ کسی طرح نکل آتا ہے۔ وہاں؟ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ کون جانے ممکن ہے قلعہ کے نیچے میدان ہی میں بسیرا ڈالنا پڑے۔ پھر گوروں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر گاہک کھڑا کرنا۔ ان سے ہنٹر کھا کر پیٹھ ادھیڑی کرانا۔ نشہ میں چور تو رہتے ہیں وہ۔ لیکن اس کے دماغ پر امید کی چمک پیدا ہونے لگی۔ وہ حضرت اولیا کے آستانہ سے مرادیں مانگ کر لائی تھی۔ اب اسے بدنصیبی کا منہ نہ دیکھنا پڑے گا۔ حضرت اس کی مرادیں رد نہ کریں گے۔ اس کے چہرہ پر یقین کی شادابی پیدا ہو گئی۔

شاما اسے دیکھ کر خواہ مخواہ مسکرا دی اور اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ حضرت اولیا کے لئے جذبۂ شکر اُن میں چھلکنے لگا!

شاما نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عقیدت کے جوش سے اس کی زبان نہ کھل سکی وہ دم بخود بیٹھ گیا۔ اس کے لب سلے ہوئے تھے۔ لیکن نگاہیں کام کر رہی تھیں گھبرائی گھبرائی سی متوحش نگاہیں۔ وہ غیر معمولی اشتیاق کی نظروں سے آنکھیں پھاڑے۔ شاما کو تک رہا تھا! شاما اس کی وحشی نگاہوں کے اثر سے کچھ ڈر سی گئی لیکن پیٹ کی مار آئے ہوئے شکار کو ہاتھ سے کیوں کر جانے دیتی۔

شاما نے اس سے جلد ہی کاروباری باتیں شروع کرنا مناسب سمجھا۔ "دس روپیہ" شاما نے انگلیوں سے بتاتے ہوئے کہا۔ شاید وہ بہرا ہو۔ اس نے دس روپے شاما کے آگے رکھ دیئے۔ شاما اسے بازو کی کوٹھری میں لے گئی۔ پلنگ پر سفید چادر بچھی تھی۔ شاما نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاما اس کے قریب بیٹھ گئی لیکن اس نے نہ کوئی بات کی نہ کسی طرح کا اقدام۔ شاما پر پھر خوف کی جھرجھری پھیل گئی۔ دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ شاما کو اس سے ڈر لگنے لگا لیکن اس نے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کی اور قریب ہو کر اسے چھیڑنے لگی۔ وہ جلد ہی اس سے فارغ ہونا چاہتی تھی لیکن اس کے اندر کوئی حرکت نہ پیدا ہوئی۔ وہ ویسا ہی بے حس بیٹھا رہا۔ صرف آنکھیں چہرے شاما پر نگاہیں جمائے۔ جیسے اس کے جسم کی روح نکل کر آنکھوں میں وداعی چمک پیدا کر رہی ہو۔ شاما نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنے گال اس کے لبوں کے قریب کرنے لگی۔ اس نے ایک چیخ ماری "ماں" اور ننھے بچے کی طرح شاما کی گود میں سسکیاں لینے لگا!

ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری :-

——— بقیہ صفحہ ۴۷

خود آسودہ احساسات مجھے اکثر مجبور کرتے تھے۔ اس لئے برسوں میں اس قسم کی کہانیاں لکھتا رہا لیکن ہوتے ہوتے یہ احساس میرے دل میں گھر کرنے لگا کہ زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے اور زندہ رہنے کے لئے قہقہہ بہت ضروری ہے۔"

"کیسر کیاری" جو اس کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے بالکل روکھا پھیکا سا ہے اس نے خواہ مخواہ قہقہے لگانے کی کوشش کی ہے اور وہی خزینہ افسانہ نگاری کے میدان میں کامیاب ہے۔ مزاح نگاری کا میدان اس کی فطرت کے خلاف ہے!

غرض ندیم موجودہ دور کا بہترین اور مقبول افسانہ نگار ہے اس کی افسانہ نگاری ہر خاص و عام میں شہرت پا چکی ہے۔ اس کی افسانہ نگاری بقول عبادت صاحب "پیاری زبان، دلکش انداز بیان، روانی، بے ساختگی، شگفتگی، ان تمام کے حسن امتزاج سے نکھر رہی ہے۔ اس کے موضوعات کے اعتبار سے اس کے ہاں تنوع ہے"۔ اور اس کی افسانہ نگاری ایک اتھاہ سمندر ہے۔ وہ بڑا افسانہ نگار ہے جس کا فن اپنی خاص خصوصیت کے اعتبار سے منفرد ہے!!!

افسانہ نگار

کرشن چندر

افسانے تو آپ سب شوق سے پڑھتے ہیں لیکن شاید آپ نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ عموماً طور پر ایک افسانہ نگار کی شخصیت افسانے سے بھی زیادہ دلچسپ اور پراسرار ہوتی ہے۔ میں اس مضمون میں سرسری طور پر ایک افسانہ نگار کی زندگی کا جائزہ لونگا تاکہ آپ کو اس کی شخصیت کے سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

ایک افسانہ نگار کی پہلی خصوصیت اس کا لاابالیانہ پن اور وہ سوز اور درد ہے جو اس کی ذات میں پنہاں ہوتا ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر حساس اور ایک اضطراری فطرت کا مالک ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ فلاں شخص ایک پیدائشی شاعر یا ادیب ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ماں کے پیٹ سے ہی شعر کہنا یا افسانے لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ بلکہ صرف یہ ہے کہ جس ماحول میں وہ پلا ہوتا ہے اس میں وہ ایسے واقعات اور حادثات سے دوچار ہوتا ہے جو اس کے جذبات میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیتے ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا! ان واقعات کا اس کے دل و دماغ پر مستقل اثر پڑتا رہتا ہے اور وہ اپنے محسوسات کو اپنے تخیل کی مدد سے چھوٹی عمر ہی میں شعر یا افسانے کی صورت میں ڈھال لیتا ہے۔ گویا بچپن سے ہی اسے اپنے ماحول کو غور سے دیکھنے اور سمجھنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور سوچنے کا روگ لگ جاتا ہے۔ پھر جوں جوں عمر بڑھتی ہے اس کا مشاہدہ اور مطالعہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور وہ بڑا ہو کر زندگی کے مختلف اعلیٰ اور خارجی پہلوؤں پر ایک حقیقت نگار کی طرح روشنی ڈال سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کی جگہ کوئی اور بچہ ہوتا جس کی قوتِ احساس اتنی تیز نہ ہوتی اور جس کا دماغ صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر ہوتا تو ہرگز ایک شاعر یا ادیب نہ بن سکتا! پس ایک افسانہ نگار بننے کے لئے پہلے حساس طبیعت اور اعلیٰ تخیل کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تعلیم، مطالعہ اور مشق۔ اگر کسی شخص کی تعلیم ناقص ہے تو وہ اپنے تاثرات کا اچھی طرح اظہار نہ کر سکے گا اور اس کی لفظی تصویر میں گرامر اور فن کے لحاظ سے بہت سی خامیاں رہ جائیں گی۔

ایک اچھا افسانہ نگار اپنے تخلیق کردہ افسانہ نگاروں کو نہایت محنت سے پالتا پوستا ہے، انہیں بڑا کرتا ہے، ان سے محبت اور نفرت کرتا ہے، ان کے ساتھ ہنستا ہے اور روتا ہے، جیتا ہے اور مرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی ذہنی شخصیت اس کے کرداروں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسا کرنے میں اس کی ساری قوتِ عمل اور قوتِ تخیل صرف ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ ایک "چیز" مکمل کر لیتا ہے تو اسے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ ایک ماں کو بچہ پیدا کر کے ہوتی ہے اور یہ خوشی اس کی تھکاوٹ اور کاوش کا اثر کسی حد تک زائل کر دیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تمام فن کار اپنے وقت سے بہت پہلے ہی مر جائیں۔ پھر بھی وہ اپنے وقت سے پہلے بوڑھے تو ضرور ہو جاتے ہیں! میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ انہیں اپنے بال بہت پیارے لگتے تھے، چنانچہ وہ اپنے بالوں کی خاص دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ اسی اثنا میں ان کے سر پر افسانہ نگاری کا جنون سوار ہوا۔ چنانچہ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ان کے بیشتر بال جھڑ چکے ہیں اور شاید بہت جلد ہی وہ بالکل گنجے ہو جائیں گے!

ایک مبتدی جب پہلے پہل افسانے لکھنے شروع کرتا ہے، تو اس کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے اپنے احساس پر قابو نہیں ہوتا، وہ شدتِ جذبات سے نڈھال ہو جاتا ہے، افسانے کا پلاٹ اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور ایک بخار سا چڑھا رہتا ہے۔ رات بھر وہ سو نہیں سکتا۔ اور صبح جب بستر سے اٹھتا ہے تو آنکھیں سرخ ہوتی ہیں، چہرا اترا ہوا ہوتا ہے۔ ماں حیران ہو کر پوچھتی ہے۔ "تو بیمار ہے بیٹا؟" اور بیٹا کہتا ہے "نہیں ماں! میں بالکل ٹھیک ہوں" اور جھٹ لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس دھن میں کھانا پینا سب بھول جاتا ہے۔ پہلے چند دن تو ماں بہت پریشان رہتی ہے لیکن بعد میں سمجھ جاتی ہے کہ یہ بھی ایک لاعلاج مرض ہے!

ایک اچھا افسانہ نگار عام طور پر خوش خلق، منکسر مزاج، ملنسار، سنجیدہ اور شائستہ ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کی رگوں میں کوئی پلاٹ گردش کر رہا ہو اس وقت وہ کسی سے بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ ایسی حالت میں ایک افسانہ نگار کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک گلاس بھنگ پی کر آئینے میں اپنی شکل دیکھئے (کیونکہ افسانہ نگار اس وقت کمرہ بند کئے لکھ رہا ہوتا ہے۔ آپ اس سے نہیں مل سکتے!) کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھئے گا کہ افسانہ بھنگ پی کر لکھا جاتا ہے۔ نہیں! وہ سارا "نشہ" صرف پلاٹ کا ہوتا ہے۔

عام طور پر افسانہ نگاروں کو دو بیماریاں ہوتی ہیں۔ "دھڑکے" کی بیماری یا دیرینہ کھانسی! وجہ یہ ہے کہ جب ان کی سمجھ میں کوئی پلاٹ آتا ہے تو فرطِ جذبات سے دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ ... چونکہ ایسے موقعے بہت جلد جلد آتے ہیں یہ دل کا "دھڑکنا" ایک مستقل بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کھانسی کی وجہ اغلباً یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت نفیس طبع اور نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ذرا گرمی سے سردی میں گئے یا سردی ... گرمی میں آئے کہ زکام ہو گیا۔ زکام بڑھتے بڑھتے کھانسی ہو جاتا ہے اور کھانسی دھیرے دھیرے پرانی کھانسی بن جاتی ہے۔

پژمُردہ الوجود اور کاہل ہوتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا پسند نہیں کرتے۔

افسانہ نگار حضرات کے چلنے کے طریقے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ بعض حضرات اوپر نیچے، آمنے سامنے ہر چیز کو گھورتے ہوئے چلتے ہیں۔ بعض اسطرح گردن جھکائے چلتے ہیں جیسے ابھی ابھی جیل سے چھوٹ کر آ رہے ہوں اور بعض اپنی افسانہ نگاری کے زعم میں گردن اکڑائے بغیر کسی کی طرف دیکھے، ناک کی سیدھ میں چلتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح ان کی فطرت بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ ایک وہ ہیں جو فطرتاً سیلانی ہوتے ہیں۔ جب تک وہ سیر نہ کریں ان کے ذہن میں کوئی پلاٹ ہی نہیں آتا دوسرے وہ جو دن رات اپنی کوٹھری میں گھسے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ بعض قدرتی مناظر میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر موسم خوشگوار ہوا اور آپ ان سے ملنے جائیں تو اکثر اپنے مکان کی چھت پر ملیں گے اور آپ کو دیکھتے ہی ہنسنے لگیں گے "ہاہا!!" ایسی صورت میں آپ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ آپ بھی "ہاہا" کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

میرے ایک دوست ہیں جب تک انھیں غصہ نہ آئے وہ افسانہ نہیں لکھ سکتے۔ لہٰذا جب وہ افسانہ لکھنا چاہتے ہیں تو اپنے سب سے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا کر چمکارتے پچکارتے بیوی کے سامنے جاتے ہیں ——— وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے ——— پھر وہ زور سے بچے کے گال پر ایک چانٹا رسید کرتے ہیں۔ وہ بیچارا بلبلا کے رونے لگتا ہے۔ اس پر بیوی کو غصہ آتا ہے اور میاں کو خوب صلواتیں سناتی ہے۔ میاں بھی غصے میں آ کر بیوی سے الجھنے لگتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ دماغ خوب گرم ہو گیا تو جھٹ اپنے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگا لیتے ہیں اور افسانہ لکھ ڈالتے ہیں!

میرے ایک اور افسانہ نگار دوست ہیں۔ وہ بہت باریک بین واقع ہوئے ہیں۔ انہیں کیڑے مکوڑوں سے عشق ہے۔ برسات کے موسم میں وہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے پکڑ لاتے ہیں اور انہیں میز پر رکھ کر اوپر سے شیشے کا گلاس اوندھا دیتے ہیں اور دیر تک بیٹھے بیٹھے تماشہ دیکھا کرتے ہیں۔ جب مکڑی شکار کرنے کے لئے آہستہ آہستہ دیوار پر سرکتی ہے اور پھر تیز دیک کر ایک جست میں مکھی کو جا دبوچتی ہے تو وہ بے اختیار ہو کر چلا اٹھتے ہیں "وہ مارا۔ شاباش!" ان کے افسانوں کے عنوانات اکثر ایسے ہوتے ہیں "جھینگر کا جنازہ" ——— "مکھی کا شکار"! ——— "چیونٹے کی برات" وغیرہ۔ اور تشبیہیں اس قسم کی:۔ "اس کے بائیں رخسار پر وہ بڑا سا تل یوں نظر آتا تھا جیسے گڑ کی بھیلی پر ایک مکھی بیٹھی ہو!" یا "اس کے گالوں سے طلائی بُندے یوں لٹک رہے تھے جیسے سورج مکھی کی پنکھڑیوں سے دو بھڑیں

جھول رہی ہوں!" ———

اب آپ کی سمجھ میں بخوبی آگیا ہوگا کہ افسانہ نگار ہر چیز کو غور سے دیکھتا ہے اور اپنے افسانوں کے لئے مواد فراہم کرتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ عادت نہایت ہی نازک صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ اپنی آپ بیتی سناتا ہوں۔ ایک شام کو میں باغ میں بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نہایت بدصورت لڑکی، توے جیسی کالی کچھ فاصلہ پر کھڑی تھی۔ اس کی صورت کچھ اس قدر بھونڈی تھی کہ میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ میں کوئی پندرہ منٹ تک غور سے اسے دیکھتا رہا اور اپنے ذہن میں اس کے چہرے کا نقش کھینچتا رہا ——— وہ بھی مجھے دیکھتی رہی ——— جب ذرا اندھیرا ہو گیا تو وہ لپک کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی: "میں جان گئی!" میں نے گھبرا کر پوچھا: "کیا؟" ۔ وہ بولی "تم مجھ سے پریم کرتے ہو!" اور یہ کہہ کر اس نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں!

* * *

آج کل افسانہ نگار حضرات دو خاص گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جو "ترقی پسند" کہلاتے ہیں اور "فن برائے زندگی" کے اصول میں یقین رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہیں پہلا گروہ "تنزل پسند" کہتا ہے اور جو "فن برائے فن" کے اصول پر قائم ہیں۔ اور ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غیر جانبدار ہیں اور چپ چاپ اپنا دم کئے جاتے ہیں۔

معیار کے لحاظ سے افسانہ نگار حضرات تین خاص درجوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں:

افسانہ نگار درجہ اول یہ آسمان ادب کے وہ درخشندہ ستارے ہیں جن کی گھر گھر دھوم مچی ہوئی ہے۔ یعنی

ہر بزم میں چرچا ہے ترا کون و مکاں میں

لیکن ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے۔ اگر خرافات لکھ کر بھی کسی رسالے کو بھیج دیں تو وہ بھی چھپ جاتی ہے کیونکہ کوئی انہیں ناراض کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس کی کتابیں دھڑا دھڑ بکتی ہیں۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ انگریزی فرانسیسی اور روسی افسانوی ادب اس نے اچھی طرح پڑھا ہوتا ہے۔ لکھنے کے علاوہ وہ خوش اسلوبی سے غیر زبان کے افسانوں کا ترجمہ بھی کر سکتا ہے۔ عموماً مغربی رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ اکثر سیکنڈ کلاس میں سفر کرتا ہے۔ سوٹ بوٹ پہنتا ہے نکٹائی لگاتا ہے۔ بہترین سگرٹ، سگار یا چرٹ پیتا ہے۔ رات کو شب خوابی کے لباس میں سوتا ہے۔ صبح کی چائے بستر میں پینے کا عادی ہوتا ہے۔ روزانہ صبح شیو کرتا ہے۔ ہوٹلوں میں چھری کانٹے سے کھانا پسند کرتا ہے۔ گرمیوں میں بیئر اور کاک ٹیل پیتا ہے۔ اور سردیوں میں وسکی اور اگر زکام ہو جائے تو برانڈی۔ کپڑے لانڈری سے دھلواتا ہے۔ گرمیوں میں میدان میں

زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے پہاڑ پر چلا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ کنواری لڑکیوں کی صحبت زیادہ پسند کرتا ہے۔ آج کل بال روم کے ناچ میں زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے۔ زیادہ تر ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھتا ہے!

افسانہ نگار درجہ دوئم

ان کی تعداد کافی ہے۔ یہ زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں۔ افسانہ نگار درجہ دوئم انگریزی اور دیسی دونوں قسم کا لباس پہنتا ہے۔ اس کے افسانے اکثر دوسرے اور تیسرے درجے کے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ کتابیں بکتی کم ہیں لیکن بک سٹالوں کی زینت بنی رہتی ہیں۔ چونکہ صرف افسانے لکھ کر گزارہ نہیں ہو سکتا اس لئے عام طور پر کلرکی بھی کرتا ہے۔ بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے۔ کپڑے دھوبی سے دھلواتا ہے۔ ریل گاڑی میں اکثر تیسرے درجہ میں اور کبھی کبھی ڈیوڑھے درجے میں سفر کرتا ہے۔ "پاسنگ شو" سگرٹ پیتا ہے۔ آملہ ہیر آئل درجہ دوم استعمال کرتا ہے۔ حجامت ایک دن چھوڑ کر بناتا ہے۔ دوسروں کی لکھی کتابیں بھی پڑھتا ہے اور کچھ نہ کچھ انگریزی ادب کا مطالعہ بھی کر لیتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں سے کوئی ٹکڑا بھی پی لیتا ہے۔ اپنے سے بہتر لکھنے والوں کے نام سے چڑتا ہے۔ اگر آپ اس سے ملنے جائیں تو پہلے وہ آپ کو اپنی کہانی کا خلاصہ سنائے گا اور اس کے بعد جب تک آپ شروع سے آخر تک اس کا مسودہ نہ پڑھ لیں گے آپ کی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ تر مشاہدے کی بنا پر لکھتا ہے۔

افسانہ نگار درجہ سوئم

یہ افسانہ نگاروں کا "پرولتاریہ" یا عوامی طبقہ ہے۔ مجھے ان سے بہت ہمدردی ہے۔ (اور آپ کو بھی ہونی چاہئے!)۔ اس درجے کے فنکار حشرات الارض کی طرح کثیر التعداد ہیں۔ زیادہ تر قصبوں میں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں رہتے ہیں۔ ان کے نام عموماً بہت لمبے چوڑے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ نام کے ساتھ اپنا سارا حسب و نسب لکھتے ہیں۔ مثلاً۔

شری مان وچترا نند جیٹو پادھیائے چنکار۔ چمپا پوری۔

مولانا غ۔ غ۔ غیاث الدین غزنوی سلیمانی۔ (صرف "آنجہانی" کی کسر رہ گئی!)

یہ فنکار گنی گولڈ سگرٹ اور مدراسی بیڑی پیتا ہے۔ اس کے سر پر ایک بوسیدہ سی ٹوپی جسم پر اٹھارھویں صدی کی شیروانی اور پیوند لگا ہوا پاجامہ اور پیروں میں گھسی ہوئی جوتیاں ہوتی ہیں۔ گرمیوں میں گڑ کا شربت پیتا ہے اور جاڑوں میں گڑ کی ریوڑیاں کھاتا ہے۔ کپڑے اس کی بیوی دھوتی ہے۔ اور اگر بیوی بیمار پڑ جائے تو خود دھوتا ہے۔ سر میں سرسوں کا تیل ڈالتا ہے۔ ساتویں دن ڈاڑھی مونڈتا ہے۔ افسانہ نگاری کی دھن میں بیوی بچوں کو بھول جاتا ہے۔ لکھنے میں اول اور دوئم درجہ کے لکھنے والوں سے کم نہیں لکھتا۔ گو اس کے افسانے چھپتے بہت کم ہیں۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ رسالوں کے ایڈیٹر یا تو اس کی چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو حسد کی وجہ سے اور مقابلے کے ڈر سے نہیں چھاپتے۔ بہر حال وہ ہمت نہیں ہارتا۔ لکھتا ہی جاتا ہے۔ اور اکثر مٹھی بھینچ کر ماں سے کہتا ہے: "ماں! تم دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میں ایک مشہور ادیب بن جاؤں گا۔ پھر یہ سارے رسالے والے اور پبلشر میرے پیچھے پیچھے پھریں گے!" ماں یہ سن کر بہت خوش ہوتی ہے۔

وہ افسانے لکھنے کے علاوہ ان پڑھ لوگوں کے کارڈ اور خطوط بھی لکھتا ہے اور اس طرح کچھ پیسے کما لیتا ہے۔ دراصل اس کی آمدنی کا یہی ایک مستقل ذریعہ ہوتا ہے!

وہ مہینے ڈیڑھ مہینے بعد کسی بڑے شہر کا چکر ضرور لگاتا ہے۔ شام کو چونی کا ٹکٹ خرید کر "پریت کی ریت" یا اسی قسم کی کوئی فلم دیکھتا ہے۔ رات کو تنور پر روٹی کھاتا ہے اور سرائے میں جا کر سو رہتا ہے۔ اور دوسرے دن علی الصباح پہلی لاری سے اپنے گھر واپس آ جاتا ہے اور لوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھ کر افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

"وہ دونوں باکس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پردے پر ایک چنچل سی لڑکی گا رہی تھی "آکاش سے لائی توڑ کے تارے!" گانے کے مدھر بول سرتیش کے دماغ میں گونجنے لگے۔ اس نے بے اختیار ہو کر شیلا کی کمر کے گرد بازو ڈال دئے اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کچھ دیر دونوں سر سے سر جوڑے فلم دیکھتے رہے۔ پھر سرتیش بھی ایک لمحہ کے لئے شاعر بن گیا۔ اس نے کہا "شیلا! اگر اس وقت ہمارے پنکھ لگ جائیں تو ہم بھی آکاش کی طرف اڑ چلیں اور بادلوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے آسمان سے تارے توڑ لائیں!"

شیلا جھنجھلا کر بولی: "ہے ہے میں کہوں ہوں تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ اتنا تو سوچو کہ ہم سینما ہال میں بیٹھے ہیں اگر ہم آسمان کی طرف اڑیں گے تو چھت سے ٹکرا کر ہمارے سر پھوٹ جائیں گے اور پنکھ زخمی ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ اور ہم بھرے ہال میں دھم سے لوگوں کے سروں پر جا گریں گے اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ لیکن تم چٹکی کیوں کاٹ رہے ہو؟؟"

افسانہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا جاتا ہے اور ختم اس وقت ہوتا ہے جبکہ شو ختم ہونے کے بعد بھنگی جھاڑو لگانے آتا ہے اور سرتیش اور شیلا کو

دیکھ کر چونک پڑتا ہے۔ وہ دونوں بھی اسے دیکھ کر چونک پڑتے ہیں.... تب انہیں ہوش آتا ہے کہ سنیما تو کب کا ختم ہو چکا اور وہ دونوں ہال میں بیٹھے رہ گئے ہیں ——!!

اس کے بعد ایک وضاحتی نوٹ لکھا جاتا ہے جس میں افسانے کی فنی خوبیوں پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ افسانہ نہایت کاوش اور سر دردی سے لکھا گیا ہے۔ (اس میں کسی کو شک ہی کیا ہو سکتا ہے!) اور آخر میں درخواست کی جاتی ہے کہ اسے ضرور رسالہ میں شائع کر دیا جائے۔ اور پھر یہ افسانہ مع خط بذریعہ رجسٹری کسی رسالے کے ایڈیٹر کو بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پانچ چھ یاددہانی کے خطوط بھیجے جاتے ہیں۔ اوّل تو کوئی جواب ہی نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو ساڑھے چار مہینے کے بعد وہ مسودہ جوں کا توں واپس آ جاتا ہے!

اور پھر ایک دن لکھتے لکھتے افسانہ نگار صاحب جنت کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ اور کریا کرم ہو جانے کے بعد ان کے قیمتی مسودات ڈھائی تین روپے کے عوض کسی ردّی کے سوداگر کے ہاتھ بیچ دیے جاتے ہیں ——!!

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے

نقد و نظر

عہد نبوی کے میدان جنگ

مصنف :- جناب محمد حمید اللہ استاد قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ۔ ناشر :- حیدری گشتی کتب خانہ رسالہ عبد اللہ۔ حیدر آباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۸ کے ۸۰ صفحات علاوہ کئی درجن تصاویر و نقشہ جات۔ بلا جلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اس کتاب میں ان تمام لڑائیوں، معرکوں اور محاصروں کے مفصل حالات درج ہیں جو ظہور اسلام سے لے کر وفات رسول اللہ صلعم تک مسلم و غیر مسلم قوموں کے مابین ہوتے رہے۔ یہ کتاب صرف تاریخی اعتبار ہی سے مفید نہیں ہے بلکہ اس زمانے کے عسکری نظام اور سپہ سالاروں کی فنی استعداد کو بھی اس کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ لائق مصنف نے بڑی خوبی کے ساتھ اس راز کو منکشف کیا ہے کہ آخر کیوں اور کس طرح مسلمانوں کو اپنے حریفوں پر جن کی تعداد ہمیشہ دگنی تگنی اور بارہا دس بارہ گنی رہی، ہمیشہ ہر مقام پر فتح حاصل ہوئی اور وہ مٹھی بھر انسان ایک محدود علاقے سے اٹھ کر دس لاکھ سے زیادہ مربع میل کے رقبہ پر چھا گئے اور لاکھوں نفوس کو اپنا محکوم بنا ڈالا۔ ہر چند اس زمانہ میں طیاروں، طیارہ شکن توپوں اور ایٹم بموں نے جنگ کی نوعیت بدل دی ہے۔ تاہم لڑائی کے جہاں تک داؤ پیچ اور اس کی گھاتوں کا تعلق ہے، اس کتاب کا مطالعہ اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کتاب میں شامل تصویروں اور نقشوں سے نفس مضمون کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ہمارے حسینؑ

مرتب :- جناب شیش چندر سکسینہ طالب دہلوی۔ ملنے کا پتہ :- سید ہادی حسین رضوی۔ ۹۹۔ تھومسن روڈ نئی دہلی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۸۰ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت سوا روپیہ۔ شہید کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھے ہوئے مرثیے، سلام اور قطعات و رباعیات کو جو غیر مسلم حضرات کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے یہ خدمت بجائے خود لائق تحسین ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً سبھی مشہور اور بلند پایہ شعرا شامل ہیں اور ان کے کلام میں حسن بیان کے ساتھ ساتھ عقیدت کی رنگینی کارفرما ہے۔ دوسروں کے بزرگان دین کی قدر و منزلت کا یہ جذبہ اگر ہندو مسلمان اور دیگر اقوام میں صحیح خلوص کے ساتھ پیدا ہو جائے تو باہمی اختلافات کا استیصال ممکن ہے۔ اسی مجموعے کے اصول پر طالب صاحب "ہمارے کرشن" "ہمارے نانک" اور "ہمارے عیسیٰ" مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ خدا ان کے عزم و ارادے کو کامیاب بنائے۔ کتاب کی قیمت زیادہ ہے۔

(TEN GEMS FROM GHALIB)

ناشر :- "ٹین جیمز فروم غالب" نمبر ۲ جوبلی ٹینک۔ مرشد آباد۔ ۲۰×۳۰/۴ کے ۴۰ صفحات۔ رنگین کور۔ قیمت ساڑھے تین روپے نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر چھپا ہوا یہ رنگین مرقع تین معزز نامور ہستیوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ غالب کے دس اشعار کا انگریزی منظوم ترجمہ جناب شہاب الدین رحمت اللہ نے، اردو سے بنگلہ منظوم ترجمہ راجا راؤ ڈی این رے نے، اور بیگم شہاب الدین رحمت اللہ نے حرفوں سے متعلق دس تصاویر بنائی ہیں۔ انگریزی ترجمے میں کہیں کہیں اصل الفاظ سے دور ہٹ کر محض مفہوم کی ترجمانی کی گئی ہے اور ایک آدھ جگہ اس سے بھی گریز کیا گیا ہے۔ تصاویر میں خامکاری کا رنگ جھلک رہا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

کا نقش تو صد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اردو اشعار جن کو بلاک کے ذریعہ چھاپا گیا ہے اگر صحت و خوشنمائی کے ساتھ لکھوائے جاتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ ایک شعر کی کتابت تو بالکل ہی غلط ہوئی ہے۔ اشعار کے انگریزی اور بنگالی ترجموں کے علاوہ ان کو رومن حروف میں بھی لکھا گیا ہے۔ وہ بھی تصحیح طلب ہیں۔

نثر ریاض خیرآبادی

مرتب :- جناب عقیل احمد جعفری۔ ناشر :- نفیس اکیڈمی۔ عابد روڈ حیدر آباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۵۰ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈھائی روپے۔ حضرت ریاض خیرآبادی جن کو بجا طور پر "خیام الہند" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، سرمستیوں سے لبریز اپنے کلام رنگین اور اچھوتے انداز بیان کے اعتبار سے شعرائے اردو میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ ایک بلند پایہ اور صاحب طرز نثار بھی تھے۔ اور نقد و تبصرہ کی دنیا میں بھی ان کو ایک شان امتیاز حاصل تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی نثر نگاری ایک خاص مدت تک محدود رہی اور ان کی شاعری کا سکہ آخر وقت تک جما رہا، اسی لئے نئے دور کے لوگ ان کی ادبی زندگی کے ایک رخ سے کم واقف رہے۔ کچھ عرصہ ہوا صفحات نگار میں موصوف کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی مگر اس کی اشاعت بھی ایک محدود طبقے میں رہی۔ جناب عقیل احمد جعفری کی یہ ادب نوازی کہ وہ ایک حد تک ان گم شدہ اوراق کی تلاش و تجسس کے بعد منصۂ شہود پر لے آئے، لائق تحسین ہے۔ اس مجموعے میں ریاض مرحوم کے ادبی اور تنقیدی مضامین کے علاوہ نادر و نایاب خطوط بھی شامل ہیں جو مکاتیب غالب کی طرح اردو زبان کے لئے بڑی نعمت ہیں۔ فاضل مرتب نے موصوف کے مختصر حالات زندگی بھی قلمبند کئے ہیں۔

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔ — منیجر

کلکتہ میں افغانی فنون کی نمائش

ایم ایم تقی

افغانی فنون کی جو نمائش کلکتہ میں ۹ ... ۲۶ جنوری کے ... اور ہندوستان نے ان ... کی یاد تازہ ہو گئی جو ان دونوں ملکوں کے درمیان اب سے دو ہزار سے بھی زیادہ سال پہلے قائم تھے۔ جو نوادر اس نمائش میں دکھائے گئے ان میں پتھر کے مجسمے بھی تھے، مخطوطات بھی، نقاشی کے نمونے بھی تھے اور دھات کی چیزیں بھی۔ یہ چیزیں افغانستان کے ممتاز ماہر آثاریات ڈاکٹر احمد علی کہزاد کی لائی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر کہزاد وہی ہیں جنہوں نے سر ولیم جونز کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی دو صد سالہ سالگرہ کے موقع پر آکر ہندوستان میں افغانستان کی نمائندگی کی تھی۔ ڈاکٹر کہزاد جو کابل کے عجائب خانہ کے ڈائرکٹر اور افغانستان کے شعبہ ہسٹوریکل ریسرچ کے ڈائرکٹر جنرل بھی ہیں، اپنی ان کارگزاریوں کے لئے، جو انھوں نے افغانستان اور شمالی ہندوستان کے راجگان خاندان کشان کی قدیم راجدھانی بیگرام کاپیسی میں سرانجام دیں، مشرقی اور مغربی حلقوں میں کافی مشہور ہیں۔ علاوہ اور کاموں کے آپ کا وہ کارنامہ جو آپ نے سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں فرانسیسی اثریاتی وفد اور یوسف ہاکن کی معیت میں سرانجام دیا ہندوستان کے لئے بڑا اہم ہے اس لحاظ سے کہ اس سے ودیسا ریاست گوالیار کے موجودہ بھلسا) کے ہاتھی دانت کے کاریگروں کی صنعت پر نئی روشنی پڑتی ہے۔

ان کارخانہ جات میں جو کام ہو چکے ہیں وہ سرزمین ہندوستان میں اب نا پید ہو چکے ہیں۔ مگر بیگرام کی دریافتوں سے ایسی سینکڑوں ہاتھی دانت کی پلیٹیں اور نمودار ہوئی ہیں جن پر ایسے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں جو ہندوستان اور قدیم افغانستان کے باہمی تعلقات کو روشن تر اور مستحکم تر ثابت کرتے اور ہندوستانی اور افغانی فنون کی تاریخ کی کئی گتھیوں کو سلجھاتی ہیں۔

اس نمائش سے ہندوستانی ساونتوں اور عام پبلک میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ نمائش میں جو چیزیں دکھائی گئیں وہ دوسری صدی سے لے کر سولھویں صدی کے اواخر تک کی تھیں ان سے ثقافتی اثرات کا ایک وسیع پیمانہ پر اظہار ہوتا ہے۔ پرانے زمانہ میں افغانستان پر ساری دنیا کے تمام بڑے بڑے ثقافتی رجحانات کا اثر پڑا۔ ان ملکوں میں ایران، یونان، ہندوستان، چین، بابل اور (بالواسطہ) مصر بھی شامل ہیں۔

اکثر ماہرین کی ابتک یہی رائے ہے کہ بدھ کا مجسمہ سب سے پہلے ہندوستان میں نہیں بلکہ افغانستان میں بنا۔ سنہ عیسوی سے پہلے پنجاب اور گندھارا کے ہند و یونانی اور ہند و تاتاری راجا ہندوستانی مذاہب سے اثر پذیر ہو گئے تھے۔ اس کا ثبوت اس مینار سے ملتا ہے جو ٹکسلا کے راجہ انیتا لکی داس کے سفیر ہیلیوڈورا نے سنہ ۱۲۶ ق-م میں واسدیو (کرشن جی) کے اعزاز میں تعمیر کرائی تھی۔ ہیلیوڈورا خود کو بھگوت (وشنو) کہلاتا تھا۔ بدھ یونانی "سنگتراشی کی تاریخ غیر متعین ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتدا پہلی صدی قبل مسیح میں ہوئی، اور راجہ کنشک کے زمانہ میں یہ فن انتہائی عروج کو پہنچا۔ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں افغانستان اور کشمیر میں یہ فن زیادہ سے زیادہ ہندوستانی اثرات قبول کرتا رہا۔

گندھارا دبستان کے جو فن پارے کلکتہ کی نمائش میں دکھائے گئے ان سے ہندوستانی تمدن مغربی لباس میں نظر آیا۔ گندھارا دبستان کے نمونے فنی اعتبار سے تو کچھ کچھ لیکن تراش کے لحاظ سے پورے طور پر یونانی فن مجسمہ سازی کا مقامی مظاہرہ ہیں لیکن ان کے بنیادی موضوع ہندوستانی ہیں۔ بدھ کے مجسموں کے سروں میں اور سورج بلی دیوتا کی سنگ مرمر کی مورتیوں میں جو جلال آباد، ہڈا اور بیگرام سے برآمد ہوئی ہیں یونانی اور ہندوستانی فنی فرق صاف طور پر نمایاں ہے۔ گو ان میں دونوں صنفوں کا امتزاج ضرور ہے لیکن ہندوستانی عنصر زیادہ اجاگر ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گندھارا دبستان کی بنی ہوئی بدھ کی مورتیاں فنی اعتبار سے تو یونانی وضع کی ہیں لیکن ان کی تراش ہندوستانی ہے کیونکہ مورتی کا آسن بالکل ایک ہندوستانی جوگی کا سا ہے اور نشست کا یہ طریقہ مغرب میں ناپید اور غیر متعارف ہے۔ جو عنصر صحیح معنوں میں یونانی ہے وہ ہے "ماڈل" جو چوتھی صدی میں عہد گپت کے فنی اوضاع کا پیش خیمہ بنا۔ جیسا کہ اے۔ کے کمارا ناڈمی نے کہا ہے "گندھاری مجسمہ ساز نے (زمانہ کے تقدم کا بھی لحاظ رکھتے ہوئے) اپالو کو اتنا بدھ کے سانچہ میں نہیں ڈھالا جتنا بدھ کو اپالو کے میں"۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ گندھاری فن نے ہندوستان کی ادبی اور زبانی روایات کا تتبع کرتے ہوئے شمالی ہندوستان اور خاص طور پر متھورا کے بدھی فنون پر اور عہد گپت کی فنکاری پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

اسلامی عہد کی چیزیں جو اس نمائش میں دکھائی گئیں وہ گیارھویں صدی تک کی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ کانسی کے وہ مجسمے ہیں جو گیارھویں اور تیرھویں صدی کے درمیانی عہد کی یادگار ہیں، حال ہی میں برآمد ہوئے ہیں اور پہلی دفعہ ان کی نمائش ہوئی ہے۔ کھدی ہوئی چیزوں میں کوفی رسم الخط کے کتبے ہیں سطریں سادہ اور اقلیدسی ہیں اور پھول پتیاں بہت نازک۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپی کی چیز پانی کا چھلانگ مارتا ہوا ایک شیر ہے جس سے اسلامی عہد وسطیٰ میں قدیم تورانی اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مخطوطات کا ذخیرہ زیادہ تر ہرات کا تھا۔ ہرات ہی تیموری عہد کی

سب سے بڑی یادگار ہے۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں ہرات میں نقاشی اور خوش نویسی کا ایک نیا دبستان قائم ہوا تھا جس نے عرصہ تک ایران پر اپنا اثر قائم رکھا۔ عہد اسلامی میں ہرات ایرانی ثقافت کے اس بڑے دائرہ کا ایک بڑا جزو تھا جو ترکستان اور کاکیشیا تک پھیلا ہوا تھا لیکن ہرات کے دبستان نے ہمیشہ اپنی عظیم انفرادیت کو قائم رکھا جس نے ترقی کر کے بہزاد جیسے مشہور ترین ایرانی فنکار کو جنم دیا۔ بہزاد کے فوراً ہی بعد جس فنکار کا نام آتا ہے وہ روح اللہ میرک ہے۔ روح اللہ اور اس کا شاگرد قاسم علی بھی ہرات ہی کے تھے۔

فن خطاطی کے سب سے بڑے ماہر میر علی، علی حسین، محمد محسن اور سلطان علی بھی ہرات کے تھے۔ متعدد قلمی نسخے تاریخ ہند سے متعلق تھے مثلاً امیر خسرو دہلوی کا خمسہ جو محمد بن علاء الدین کا لکھا ہوا ہے اس کی تکمیل خواف صوبہ خراسان میں ہوئی اور یہ اکبر اعظم کی خدمت میں پیش کئے جانے کے لئے لکھا گیا تھا۔

ایک دوسری چیز اپنی خمسہ نظامی ہے جس میں بہزاد کے ہاتھ کی تصویریں ہیں موجودہ عہد کے فنکاروں کو اس مشہور عالم نقاش کی بنائی ہوئی اصل تصویریں دیکھنے کا موقع دیا۔ ہندوستانیوں کی دلچسپی کی ایک اور چیز "المواہب اللدنیہ" کا مخطوطہ تھا جو اورنگ زیب کے استاد حاجی ابراہیم کا لکھا ہوا ہے شہنشاہ اورنگ زیب نے خود اپنے ہاتھ سے تصدیق کی ہے کہ وہ کتاب حاجی ابراہیم کی لکھی ہوئی ہے۔

ان اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے افغانی اور ہندوستانی فنون کا رعایاتی امتزاج (زمانۂ اسلام اور قبل از اسلام میں) ثابت ہوتا ہے۔ ان کے پس منظر میں ان معاشرتی روابط کا تسلسل کارفرما نظر آتا ہے جو دو ہزار سال پہلے ان دونوں ملکوں کے درمیان شروع ہوئے تھے اور جن کا سلسلہ اب تک ویسے زور کے ساتھ جاری ہے۔

برطانیہ کے کھیل

بقیہ صفحہ ۲۹

اصل جگہ ایپسم لندن سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے اور اپنے بانی ڈربی کے بارہویں ارل کے نام پر ڈربی کہلانے لگی ہے۔ گھوڑ دوڑ کا آغاز ۱۷۸۰ء میں ہوا ایک جگہ تین سال کے بچھڑوں اور بچھڑیوں کی دوڑ کے لئے ہے جس کا آغاز بھی ۱۷۷۹ء ہی میں ہوا۔ یہ لارڈ ڈربی کے مکان اوکس کے نام پر ہے۔ یہ گھوڑ دوڑیں گرمیوں میں ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لئے جزائر برطانیہ کے ہر حصہ سے آتے ہیں۔ دوسری گھوڑ دوڑوں میں اکلپس اسٹیکس شامل ہیں۔ ان کے انعامات دس ہزار پونڈ اور سنہری کپ (پیالہ) ہیں۔ یہ قصر ونڈسر کے قریب اسکوٹ میں ہوتی ہیں اور ان میں عموماً ملک معظم اور ملکہ معظمہ موجود ہوتی ہیں۔ شہنشاہ جارج ششم کے پاس بھی دوڑ کے گھوڑے ہیں جیسے کہ ان کے والد جارج پنجم اور دادا ایڈورڈ ہفتم کے پاس تھے موخر الذکر کے مشہور گھوڑے "ڈائمنڈ جوبلی" نے ۱۹۰۰ء میں ڈربی کی دوڑ جیتی تھی۔

موجودہ روس کی کچھ فن کار عورتیں

بقیہ صفحہ ۲۳

علاوہ پھل اور پھول یہ سب چیزیں اتنی خوبصورت ہیں کہ خواہ مخواہ منظر کشی کو جی چاہتا ہے۔"

ان تیز رنگ کے مناظر کے خلاف سینئر لفٹنٹ صوفیہ دشینے ٹیکایا کی جنگ زدہ لینن گراڈ کی تصویریں ہیں۔ یہ لینن گراڈ میں بحیرۂ بالٹک کی فوج سیاسی محکمہ کی فن کار رہے۔ لینن گراڈ گھرنے کے بعد پہلی سردیوں میں اس مصیبتوں اور تباہ کاریوں کے خوفناک مناظر کی تصویریں کھینچیں مثلاً دریائے نیوا کی برف پر کشتیوں اور جہازوں کا چڑھ آنا، شہر میں آگ لگنا اور سڑکوں کے عام مناظر۔ جب دشمن کو لینن گراڈ کی فصیلوں کے قریب سے بھگا دیا گیا تو اس نے موقعوں کا معائنہ کیا جہاں سے دشمن نے شہر پر گولہ باری کی تھی اور تباہ شدہ دیہاتوں کے خاکے بنائے۔

یہ فن کار عورتیں ان میں سے چند ہیں جو ادب، فن، موسیقی اور بیلے کے ذریعہ سوویٹ روس کے ترقی پذیر تمدن کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پچھلی صدیوں میں روس نے دنیا کے تمدن کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے یہ اسے بے مایہ نہیں سمجھتی بلکہ اس خیال کے خلاف ہیں کہ تمدن اوپر کے طبقوں کی ملکیت ہو کر رہ جائے۔ روس کا نیا تمدن مزدوروں کی آزادی کے لئے جدوجہد کا اظہار اور معمولی مردوں اور عورتوں کی خوشیوں اور غموں کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ دو غزلیں .... پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی ..
۲۔ مہاتما ہنس راج جی (مع تصویر) ... پروفیسر جگن ناتھ ....
۳۔ فرقۂ صابیہ .... جناب رشید احمد ارشد .....
۴۔ اقبال میں تضاد نہیں .... ڈاکٹر تاثیر ....
۵۔ ہندوستانی ثقافت پر ایرانی اثرات ... جناب معظم علی ....
۶۔ خاندانی مرض (افسانہ) ...... جناب م۔ اسلم ....
۷۔ قاضی نذر الاسلام .... جناب فرخ سیوہاروی ...
۸۔ ایٹم بم کے اصول .... ڈاکٹر رضی الدین صدیقی .....
۹۔ ہندی کے مسلمان شاعر ..... جناب بالمکند عرش ملسیانی ..
۱۰۔ صوبجاتی انتخابات ...... جناب پی گنگولی .....
۱۱۔ ردِ عمل (ڈرامہ) .... جناب آئی۔ اے چودھری ...
۱۲۔ رائل جیوگرافیکل سوسائٹی ..... مسٹر جی۔ آر کرون .....
۱۳۔ لیمو کا درخت (روسی افسانہ) ... محترمہ اناانسیوفا .....
۱۴۔ الاؤ (افسانہ) .... جناب دینا ناتھ گوسائیں ...